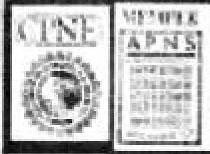


خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ
جنوری 2015
WWW.PAKSOCIETY.COM



جلد 45 • شمارہ 01 جنوری 2015 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے بس وپیش، چپ وراست اور پست وبلندی کی صورت گری کرنے، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر پچھتانا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے بچے رونے لگتے ہیں۔

اب ہم سب سرزمینِ عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آ کر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سربلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی اگلی ہی رو میں ادھڑنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جا سکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفتر داری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفتروں کے کام نہ آئے۔

تمہارے شہروں کے باہنر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو للچائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

"میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہلِ ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے میرے اہلِ دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت گار قرار پائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمائے گا اور یہ ذلت، ندامت اور نکبت کی کمائی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دستبردار ہو جائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔"

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو بھی بھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سہی توکل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں، وہ بھی فضول ہیں اور جو ان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھاٹے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ بپھر کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آ گئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ......

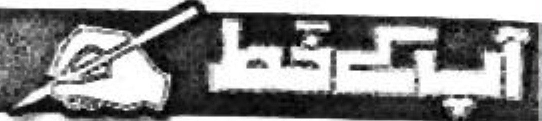
اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جوہر دار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کشکولوں کی بھیک اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دولتی ہے۔ ہاں، اے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔













محترم قارئین
السلام علیکم!

جنوری 2015ء کا شمارہ نئے سال کی نوید اور تمام اہالیانِ وطن کے لیے امن وسلامتی کی بے شمار دعاؤں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہے۔ گزشتہ سال کے آخر میں اگرچہ کچھ اقدامات مثالی کیے گئے جن میں پیٹرول کی قیمتوں میں دو بار نمایاں کمی بھی شامل تھی مگر ساتھ ہی افسوس اس بات کا ہے کہ اس کمی کا ثمر عوام کو اب تک نہ مل سکا...... ہنوز دلّی دور است کے مصداق دودھ اور دیگر اشیا خورونوش کی قیمتیں اب تک آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔ حکومتی اداروں کو اس طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت تو ہے مگر صاحبِ اقتدار کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ ان باتوں پر بھی کچھ وقت صرف کرلیا جائے۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے، جہاں اتنی تبدیلی آئی وہاں اور بھی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اگر اردگرد کے ماحول پر ذرا سنجیدہ نگاہ ڈالیں تو کئی ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو رونگٹے کھڑے کردیتے ہیں، جانے ہمارا معاشرہ اتنا شدت پسند کیوں بنتا جارہا ہے۔ گویا برداشت بالکل ختم ہوکر رہ گئی ہے۔ وہ صبر اور برداشت کرنے کا ڈھنگ جانے کہاں گم ہوگیا ہے۔ یہاں تک کہ ازدواجی رشتوں میں بھی قتل وغارت گری آگئی ہے۔ وہ جوڑے جو پیار سے گھر بساتے ہیں وہاں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوکر اپنے معصوم بچوں کو بھی نظر انداز کردیتے ہیں۔ ایسے واقعات اچانک رونما نہیں ہوتے بلکہ ان جذبات کی پرورش دھیرے دھیرے ہم خود اپنے منفی رویوں سے اور دل کی کدورتوں کے ذریعے کررہے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو طول دینے کے بجائے اگر اسی وقت سمیٹ کر نظر انداز کرنے اور جارحانہ رویوں میں تبدیلی لانے کی کوشش کریں تو شاید ایسی نوبت نہ آنے پائے۔ کہیں دولت کی زیادتی نے اور کہیں معاشی طور پر تنگ دستی نے ہماری خوش اخلاقی کو نگل لیا ہے شاید اس موضوع پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن صفحات کی کمی آڑے آتی ہے۔ لہٰذا مثبت رویوں کی خوش امیدی لیے ہم چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں ”عہدِ حاضر کے جدید ترین تقاضوں کو اگر کچھ دیر کے لیے ملحوظِ نگاہ رکھ لیا جائے تو سرورق اس لحاظ اور معیار کے عین مطابق نہیں تھا لیکن ہمیں دوشیزہ سرورق کے سادہ حسن کی تاب وتمکنت نے ازحد متاثر کیا۔ ماہر جناب مرحوم ومغفور جون ایلیا کے انشائیہ سلامتی کی راہ نے دعوتِ فکر کا خصوصی اہتمام کیا۔ ملکی حالات کو دیکھیں تو یہاں پر بے روزگاری دوبالا ہوتا ہے۔ کمزور معیشت کی نحیف ونزار کمر پر بے حس حکمرانوں کے اغراض ومقاصد اور مکروہ مفادات کا ناقابلِ برداشت بوجھ وطنِ عزیز کے امن وترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آپ کے خط میں آپ کا اداریہ حسبِ روایت معاشرے کی تلخیوں کا مجموعہ تھا۔ تختِ طاؤس پر لاہور سے انتہائی منفرد شخصیت زویا اعجاز کو شاہانہ کروفر کے ساتھ براجمان پایا۔ بہترین تبصرے کو اعزاز مقبولیت حاصل ہونے پر تہِ دل سے مبارکباد۔ خانیوال سے بہت پیارے بھائی محمد قدرت اللہ نیازی نے وزارتِ عظمیٰ کے فرائض نہایت احسن انداز میں سرانجام دیے۔ محمد قاسم رحمان اور یوسف سانول یقیناً اچھا اضافہ ہیں۔ سرگودھا سے اسد عباس کو تہِ دل سے خوش آمدید۔ کراچی سے رضوان سلطان تنولی بھی میلا لوٹنے میں کامیاب رہے۔ دبئی میں مقیم اپنے عزیز ازجان دوست سید تکمیل کی خوشگوار وغیر متوقع آمد وشرکت باعثِ صد مسرت ثابت ہوئی۔ ماہا ایمان اینڈ آسیہ چودھری کے وارنٹ جلد از جلد جاری کیے جاتے ہیں۔ ماضی کے آئینے میں خزینۂ کتب تواریخ سے مرحوم الیاس سیتاپوری کا ایک اور گوہرِ نایاب اور بہترین تحریر وتحقیق، عشق ناتمام نے معلومات میں بیش قیمت اضافہ کیا۔ بہترین وکہنہ مشق مصنف ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شاندار کہانی سودائے جنوں، اسٹوری آف دی منتھ قرار پائی۔ بے شک باطل جتنا بھی طاقت ور ہو اسے حق وصداقت کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ باطل ہمیشہ نیست ونابود ہوکر مثالِ عبرت بن جاتا ہے ملک صفدر حیات کی ڈائری سے ایک اور دلخراش واقعہ صابری کے وحشیانہ قتل نے بے حد افسردہ کردیا۔ گویا ثابت ہوا کہ محبت اندھی بھی ہوتی ہے اور بہری بھی۔ حنیفو کمہار نے کمینگی وشقی القلبی کی انتہا کردی۔ تلخ وترش لہجے کے منفرد مصنف منظر امام کا آخری صفحات پر توشۂ خاص ایک مسموم وسفاک تحریر۔ سیلاب لے گیا۔ عمل، مکافاتِ عمل اور قوانینِ الٰہی کا چشم کشا وعبرت اثر ماجرا۔ بے شک وہی ناظمِ لیل ونہار اور مالک ومختارِ لوح وقلم ہے برکھا کا حسن پرفسوں اور کالو ماچھی کی لازوال محبت نے متاثر کیا کالو کا انجام یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ قاسم ڈاکو نے کفارہ ادا کرکے راہِ آخرت کو ہموار کرلیا۔ منفرد اسلوب کے بہترین مصنف طاہر جاوید مغل کی دل فگار تحریر دو ڈائریاں دل کی آنکھوں سے پڑھی۔ انسان زندگی کے تعاقب وجستجو میں اتنا سفر کرتا ہے کہ مرجاتا ہے۔ انیس بھی جینے کا خواہش مند اور خوشیوں کا طلب گار تھا کہ ابھی جامِ عمر بھرا نہ تھا کفِ دستِ ساقی چھلک پڑا۔ پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی نہایت دلچسپ وسنسنی خیز تخلیق وتحریر بدنام۔ حصولِ زر کے لیے چند زر پرستوں کا ماجرا نے عبرت نہایت اثر انگیز رہا۔ خیر اس طرح تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اثر انگیز تحریر عطر شیشہ بھی خوب رہی۔ سلیم انور کی نرم گوشہ کے کیا کہنے۔ فی زمانہ ایسے لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں جو اوروں کے لیے اپنا سب کچھ تج کرکے رکھ دیتے ہیں۔ تنویر ریاض کی قدرے دلچسپ کوشش پاگل عورت بھی کامیاب رہی جبکہ راز اور ملاپ نے بھی بور نہیں کیا۔ ش م جمیل کی تحفہ بھی دلچسپ تھی۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سوانح حیات کے ایمان افروز سلسلے کی ایک اور کڑی۔ تصوف کی زبان ایک نادر ونایاب تحریر ثابت ہوئی۔ کترنوں میں رضوان تنولی کی محنت قابلِ داد ہے۔ بزمِ شعروسخن میں باذوق قارئین کا عمدہ ومنفرد انتخاب۔ اپنی مثال آپ ہوتا ہے آخر میں...... آخری صفحات کے لیے ہم ادارے سے تہِ دل سے ملتمس ہیں کہ ناصر ملک



اور مریم کے خان سے ضرور لکھوائیں۔“ (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے)

✠ **محمد یوسف سانول**، نور پور تھل، ضلع خوشاب سے تشریف لائے ہیں ”بہت ہی خوب صورت سرورق تھا۔ پھر فہرست کو ملاحظہ کیا اور سلامتی کے داعی ایلیا صاحب کا سلامتی کا سبق پڑھا۔ یہ ہی سچ ہے جو ایلیا صاحب کہہ رہے ہیں۔ محفلِ یاراں میں انٹری۔ ہمیشہ کی طرح۔ اداریہ قیمتی لفظوں کی مالا تھی۔ زویا اعجاز لاہور سے کرسیِ صدارت کی حق دار ٹھہریں۔ خدا ان کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ محمد قدرت صاحب بھائی کی صحت یابی کی دعا کے لیے شکریہ۔ ویسے میرے تصور میں آپ کا خاکہ بن گیا ہے کہ آپ بہت ہی اچھے ہوں گے۔ عشق ناتمام بہت ہی اچھی تاریخی کہانی ہے۔ ہارون کا کردار بہت پسند آیا۔ نرم گوشہ سلیم انور نے عمدہ لکھی۔ واقعی پولیس ڈاکو، چور سب کے جذبات ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کاشف زبیر کی بدنام ریمنڈ آرسل کی چالاکی نے کہانی کو چار چاند لگادیے سودائے جنوں، ڈاکٹر صاحب میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ بہت اچھا لکھا لیکن پڑھ کر دل اداس ہوا۔ اسرائیل امریکا بھارت تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ظلم جب بھی ہوتا ہے مسلم امہ پر ہوتا ہے کیوں؟ دو ڈائریاں طاہر جاوید مغل نے میرے زخم تازہ کردیے کیونکہ پچھلے دنوں C.M.H. میں عاطف نامی جوان جو کہ پنڈی کا رہائشی تھا، ڈیڑھ ماہ ایڈمٹ ہونے کے بعد فوت ہوگیا۔ 31 سال کا جوان مجھ سے کافی انسیت ہوگئی تھی وہ یاد آگیا۔ جگادری ملک صاحب نے ایک بار پھر کیس کے اصل مجرم کو پکڑلیا۔ ویسے ملک صاحب سفر ہمیشہ گھوڑے یا تانگے پر ہی کیوں کرتے تھے؟ (یہ اس وقت کی بہترین سواری تھی) عطر شیشہ، ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بہت ہی باریک بینی سے اس موذی مرض پر لکھا جس کی وجہ سے ہزاروں گھر برباد ہورہے ہیں۔ محفلِ شعروسخن میں عاصم اقبال جسپال کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ پاگل عورت بس واجبی سے کہانی تھی کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ ماروی اپنے تیرھویں دور کو مکمل کرچکی یعنی جوان ہوچکی ہے۔ بہت بہتر انداز میں جاری ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی تصوف کی زبان بہت اچھا لکھا پڑھا ایمان تازہ ہوا۔ راز، بابر نعیم کا واقعی راز تھا بہت اچھا لکھا۔ دسمبر کے شمارے کی بیسٹ کہانی سیلاب لے گیا، اس کہانی میں برکھا اور کالو ماچھی کی محبت ایک آفاقی محبت کا مظہر تھی اور قاسم جیسے ڈاکو کا کردار متاثر کن تھا۔ فضل داد جیسے وڈیرے ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کترنیں اچھی تھیں۔ C.M.H. سے ڈسچارج ہوکر اچھی جاب پر ہوں۔ تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے ہمارے لیے دعا کی اور ادارے کا بھی شکریہ۔“

✠ **شاداب اینڈ ماہ تاب گل رانا**، راجن پور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اپنا پیارا سسپنس اس مرتبہ سابقہ تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے حیرت انگیز طور پر 18 نومبر کو ہی مل گیا۔ ہے نا کمال کی بات......؟ سادہ سی فہرست کی رونق بڑھانے والے تمام ہمیں بھی خوشی دے گئے کہ تقریباً سارے پسندیدہ رائٹر حاضر ہیں۔ انشائیہ کا ایک، ایک لفظ موتیوں میں تولے جانے کے قابل تھا۔ انکل جی کا اداریہ اس مرتبہ امید کے دیے جلاتا ہوا محسوس ہوا اور جناب محفل کی صدارت اس مرتبہ ایک قابل اور علم دوست شخصیت زویا اعجاز کے سپرد تھی۔ مبارکباد جی! تبصرہ واقعی بہترین تھا۔ محمد قدرت اللہ ذرہ نوازی ہے جناب کی۔ انکل جی! یہ ساری سوہنی، سوہنی کڑیاں کہاں گم صم ہیں۔ محفل کی رونق بڑھانے والے رنگ برنگے آنچل کہاں ہیں واپس آئیں نا بھئی۔ کہانیوں کی ابتدا اتفاق سے معمول عشق ناتمام سے کی۔ الیاس سیتاپوری صاحب نے قلم کا جادو ہم پہ بھی چلا دیا۔ پھر کاشف زبیر صاحب کی بدنام پڑھی اور ہمیشہ کی طرح پسند آئی۔ اب بات ہوجائے اسٹوری آف دی منتھ جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کے قلم سے لکھی گئی سودائے جنوں کی۔ اس تحریر نے تو آغاز ہی میں اپنے سحر میں جکڑ لیا اور بہت مشکل موضوع پہ اتنا اچھا لکھنا اور اس کو آگے لے کر چلنا واقعی کمال کی بات ہے اور امید ہے کہ آگے چل کر یہ کہانی مزید نکھرنے والی ہے۔ دو ڈائریاں جناب طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر دل پہ اثر کرگئی اور ایک ماں کے خواب آنکھوں میں آنسو لانے کا سبب بنے۔ بہترین تحریر تھی۔ عطر شیشہ اپنے موضوع کی حساسیت کے حساب سے چھوٹی تحریروں میں نمبرون رہی۔ شعروں میں اسد عباس اور زوہیب احمد ملک کے اشعار بہترین تھے۔ پاگل عورت، تنویر ریاض صاحب کا انتخاب بھی اچھا لگا۔ بابر نعیم کا راز واقعی راز رہا جو کہ بالکل آخر میں افشا ہوا۔ تحفہ ش م جمیل کی زبانی پڑھ کے مزہ آیا اور ہنسی بھی۔ بلاشبہ کرنل کا منصوبہ بہترین تھا اور آخری صفحات پر منظر امام صاحب کی سیلاب لے گیا اچھی کاوش تھی۔“

✠ **سید محی الدین اشتیاق**، فتح پور، لیہ سے حاضر ہیں ”ٹائٹل خاص نہ ہوتے ہوئے بھی خاص تھا۔ جون ایلیا ایک بڑے برے معاشرتی عیب کی طرف توجہ دلواتے نظر آئے۔ زویا اعجاز اپنے منہ میاں مٹھو بنتی نظر آئیں۔ بہرحال مبارکباد قبول کریں۔ ابرار وارث یار ہمیں تو اکثر شمارہ لیٹ ملتا ہے آپ کو ٹائٹل گرل سوسو کیوں لگی؟ اچھی خاصی تو تھی۔ طاہر جاوید مغل کی دو ڈائریاں دل میں اتر جانے والی تحریر تھی۔ ماروی نے نیا رنگ بدلا ہے اور مراد کا بیٹا اس کی گود میں ہے اور محبوب علی چانڈیو کو لگتا ہے اکیلا ہی رہنا ہوگا۔ تصوف کی زبان میں ضیا بلگرامی صاحب آئے۔ خدا کی محبت اور عشق میں سب کو بھلا دینے والے بزرگ ابوسعیدؒ کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سیلاب لے گیا میں منظر امام صاحب آئے اور چھا گئے۔ خدا ان آفات سے بچائے۔ اپنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا قیامت ہے۔ قاسم ڈاکو کی احسان دوستی نے برائی میں اچھائی کو واضح کردیا۔ مصنف نے کمال کردیا ہے۔ برکھا واپس لوٹ گئی۔ ایک نئی ہمت کے ساتھ اور عبید کو چھوڑ گئی۔“

✠ **ابرار وارث**، سندیلیانوالی سے چلے آرہے ہیں ”سسپنس اس دفعہ بہت جلدی... مل گیا۔ رسالے کا آغاز حسبِ معمول آخری صفحات والی کہانی سیلاب لے گیا سے شروع کی۔ ہوس زن اور ہوس زر پر دوسروں کا استحصال کرنے والوں کی عبرت انگیز داستان پڑھنے کو ملی۔ فضل داد کا انجام اس سے بھی برا ہونا چاہیے تھا۔ برکھا بے چاری کو بچے تو مل گئے لیکن شوہر...... اسے چاہیے تھا کہ عبید کا ہاتھ تھام لیتی۔ ماروی کی یہ قسط انتہائی فضول تھی۔ سوائے اس جگہ کے جہاں نماز کا اہتمام مراد کرتا ہے۔ واقعی نماز ہی اسے بے حیائی اور برے کاموں سے بچاسکتی ہے۔ دوسری سلسلہ وار کہانی سودائے جنوں پڑھی جہاں صیہونی طاقتوں کے مکروہ عزائم اور گندے چہرے دیکھنے کو ملے۔ امریکا جو خود کو سپر پاور اور امن کا پرستار کہنے کا دعویٰ کرتا ہے کیسی کیسی

بزدلانہ حرکات کر رہا ہے۔ خیر جو بھی کریں مسلمانوں کے دل اسلام کے پرچم تلے اکٹھے دھڑکتے ہیں اور ایک دوسرے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے دھڑکتے رہیں گے۔ سب سے زیادہ خوب صورت تحریر دو ڈائریاں تھی۔ ایک بچے کی زندگی کا احاطہ کرتی خوب صورت تحریر جو ہمارے لیے کئی قسم کے سوالات پیدا کر گئی۔ کاش کوئی اسپتال تو ہوتا ”گرین ہوپ اسپتال“ نہ جانے کتنے انیس روزانہ ہی ایسی موت مرتے ہوں گے۔ خطوط میں زویا اعجاز کا بہت خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ کرسیٔ صدارت مبارک ہو۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے جس نظریے پر بھی بات کی ہو کہ استاد و شاگرد زیادہ آ گئے ہیں وہ ٹھیک ہوگی لیکن میں جواب دینا لازمی سمجھتا ہوں کہ علی رحمٰن اپنی کلاس میں اور اول کلاس سے فرسٹ پوزیشن لیتا آ رہا ہے۔ ڈائجسٹ کا شوق اسے بہت زیادہ ہے۔ اس کی پڑھائی پر اس بات کا (شکر ہے خدا کا) کبھی اثر نہیں پڑا۔ خود الحمدللہ میں BSC کا اسٹوڈنٹ ہوں اور کلاس میں اول ہوں۔ ڈائجسٹ نے کبھی اثر نہیں ڈالا ہم پر...... کاشف زبیر کی کہانی بدنام، اپنوں کی چاہت اور تلاش میں بھٹکنے والی لڑکی کی ایک زبردست کتھا مزہ دے گئی۔ تمام قارئین کو دل سے نیا سال مبارک ہو اور اللہ سے دعا ہے کہ ہم سے ماہ نومبر میں بچھڑنے والوں کی مغفرت فرمائے۔ خاص طور پر واہگہ بارڈر پر 60 شہیدوں اور ایک مایہ ناز رائٹر فرحانہ ناز ملک کو۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید صاحب کو لائیں پلیز...... بس اتنا ہی پڑھ سکا ہوں باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ نئے سال میں سسپنس کا نام کسی اور انداز میں آنا چاہیے اور پورا رسالہ ہی خوب صورت ہونا چاہیے۔“ (ان شاء اللہ)

※ **طالب حسین طلحہ**، نیو سینٹرل جیل ملتان سے محفل میں شریک ہیں ”سسپنس کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ کبھی اشعار اور تحریریں بھی بھیج دیتا ہوں اور آپ کی نوازش سے شائع بھی ہو جاتی ہیں۔ قید تنہائی اور ڈیتھ سیل میں بیٹھا ہوں۔ دسمبر 2014ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سوچا کہ آج خطوط کی محفل میں قسمت آزمائی کی جائے یہی سوچ کر کاغذ، قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔ قارئین سسپنس میں سے کسی مہربان نے مجھے جیل میں دعاؤں سے مزین خط وظیفہ بھیجا ہے میں ان کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی دعاؤں سے نوازتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور خوش رکھے۔ آمین۔ نیا سال مبارک ہو۔ شمارے کی ورق گردانی کی۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھنے کے بعد آپ کی خوب صورت اور فکر انگیز باتیں پڑھیں۔ خطوط کی محفل میں سب دوستوں نے خوب تبصرے کیے۔ تاریخی کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ ملک صفدر حیات کی کہانیوں کے کیا کہنے۔ تصوف کی زبان پڑھ کر ایمان کی کیفیت بہتر ہوئی۔ ماروی بھی بہتر رہی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا پہلا حصہ پڑھا، لبوں سے مجاہدین اسلام اور فلسطینی مجاہد بھائیوں کے لیے دعائیں نکلیں۔ محفل شعر و سخن میں دوستوں کا انتخاب اچھا لگا۔ کترنیں اس بار بھی خوب رہیں۔ باقی سسپنس زیرِ مطالعہ ہے۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سزائے موت کی چکیوں میں بند دیگر اسیران خوابوں کی وادیوں کی سیر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ قارئین سسپنس اور سسپنس کی پوری ٹیم کو نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔“ (آپ کو بھی مبارک ہو اور جلد از جلد رہائی نصیب ہو)

※ **زویا اعجاز**، لاہور سے تبصرہ کر رہی تھیں ”سوشل میڈیا کے تیز ترین نیٹ ورک کی بدولت انتہائی مختصر دورانیہ [illegible] تبصرہ بے پلس کرتی صدارت کی خبر 14 نومبر کی شام ہی jdpfanclub میں بریک ہو چکی تھی اور سسپنس جی جلوہ افروز ہوتے پورے محفل پر [illegible] الخلوق محترمہ کی طرف خواب و حسرت زدہ آنکھیں ہی پسند آئیں۔ فہرست کا انداز قدرے انوکھا اور نیا تھا۔ جون ایلیا کی بیان شدہ سلامتی کی راہ عصر حاضر کی بدگمانیوں، نفرتوں، افراتفری، بے حسی اور خود غرضی کی دبیز دھند نے یہ راہ کہیں گم کر دی ہے۔ اداریہ پر نظر دوڑائی تو خوش خبریوں کی فصل بہار نظر آئی۔ یوم عاشورہ کا خیریت سے گزرنا، کرکٹ ٹیم کی صفوں میں اتحاد اور فتوحات کا خوش کن سلسلہ واقعی کسی بمپر پرائز سے کم تو نہیں۔ اس ماہ کی بہترین تحریر مغل اعظم کی دو ڈائریاں تھیں۔ لفظ لفظ درد اور سطر سطر بے چارگی کا منظر نامہ پیش کرتی یہ تحریر ایسے سوالوں کی بازگشت چھوڑ گئی ہے جس کا جواب ارباب اقتدار کی خفیہ تجوریوں میں پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی عطر شیشہ گو کہ پچھلے ماہ کی کہانی کا موضوع لیے ہوئے تھی لیکن اختتام بے حد دل گرفتہ تھا۔ منظر امام کی سیلاب لے گیا چند ایک جھول ہونے کے باوجود دل کو چھو گئی۔ قاسم کا ڈاکو بننا متضاد بیانات کا حامل نظر آیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ناول سودائے جنوں سامنے آیا اور کیا خوب آیا۔ موت کے سوداگر کے بعد حساس عالمی موضوع کا احاطہ کسی ناول نے نہیں کیا۔ مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کے نجس عزائم آشکار کرتی یہ تحریر لاجواب رہی۔ ماروی میں محبوب کا بھڑکنا اور ماروی پر غصہ اس کے کردار کا پہلا فطری پہلو لگا ہے ورنہ ہر کردار ایک غیر فطری زندگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے ذرا یہ تو بتائیں ملک صفدر حیات کی زنبیل میں مزید کتنے کیس باقی ہیں؟ اکیسویں صدی میں بیٹھے ہوئے ہم انیس سو پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے یکساں قتل و غارت کیس پڑھ کر اب اتنے ایکسپرٹ ہو چکے ہیں کہ دوسرے ہی صفحے پر قاتل کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ الیاس سیتاپوری کی عشقِ ناتمام پر تبصرہ اگلے ماہ تک محفوظ ہے۔ کاشف زبیر کی بدنام کافی تھرلنگ تھی۔ تصوف کی زبان کافی پیچیدہ موضوع کا بیان تھی۔ نرم گوشہ کے نرم دل پولیس آفیسر اور اس کی قربانی نے کافی حیران بھی کیا اور متاثر بھی۔ اشعار اس دفعہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آخر میں یہ عرض کرنی ہے کہ ڈائجسٹ آتا ایک ماہ بعد ہے جبکہ ایک ہی بیٹھک میں ختم بھی ہو جاتا ہے...... کیا کریں ہم۔“ (صبر اور اگلے شمارے کا انتظار)

※ **محمد قدرت اللہ نیازی**، جیم ٹاؤن خانیوال سے شریکِ محفل ہیں ”دسمبر 2014ء رواں برس کا آخری شمارہ بروقت مل گیا۔ سرورق پر حسینہ ہمارے سپنوں میں کھوئی نظر آئی تاہم ابھی مصروفیت بہت ہے اس لیے تھوڑا اور انتظار کہہ کر فہرست کی جانب چل دیے۔ کرسیٔ صدارت پر زویا اعجاز کو موجود پایا۔ مبارک ہو جی آپ کے صدارت نامہ کا ابتدائیہ گزشتہ خطوط کی طرح تھا۔ برائے مہربانی اس کو تھوڑا تبدیل کریں تاہم باقی تبصرہ زوردار تھا۔ محمد قاسم رحمان خوش آمدید۔ تبصروں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اسد عباس محفل شعر و سخن کے بعد محفل یاراں میں آپ کی شمولیت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ علی رحمان! آپ کا اسٹوڈنٹ سا تبصرہ کیوٹ لگا۔ محمد صفدر معاویہ! اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ خودکشی جیسا فعل وہی کرتے ہیں جو اللہ کی ذات سے مایوس ہوتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو آزمائش سے بچائے۔ سید عقیل! بیٹی کی پیدائش مبارک ہو۔ احسان سحر! آپ کا تبصرہ شاعرانہ رنگ لیے ہوئے

نظر آیا۔ آمنہ ضیا! ہم آپ کی تحریروں کے منتظر ہیں بھئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں، فلسطین کے پس منظر میں لکھی گئی ایک عمدہ تحریر ہے۔ پہلی قسط ہی زبردست رہی اور لگتا ہے کافی ریسرچ کے بعد لکھی گئی ہے۔ ماروی میں محبوب کا طرز عمل تبدیل ہو رہا ہے جو ماروی کے لیے مشکل کا سبب بن رہا ہے۔ دوسری طرف مراد مرینہ کی چالبازیوں سے آگاہ ہو چکا ہے۔ کہانی میں کچھ کرنٹ دوڑنے لگ گیا ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام سیلاب لے گیا، لے کر آئے۔ سیلاب کی آمد کی منظر کشی ہولناک تھی۔ پانی جو زندگی کی علامت ہے وہی زندگیوں کو نگل گیا۔ کاشف زبیر کی بدنام مزاح، سسپنس اور ایکشن سے بھرپور تحریر تھی۔ ایمن کے ہاتھ سے جب میری جوانا کا پیکٹ چلتی گاڑی میں گرا وہ منظر نگاری خوب تھی۔ طاہر جاوید مغل کی دو ڈائریاں نے رلا دیا۔ ہم بہت خوش گوار موڈ میں انیس کی صحت، کامیابیوں، شادی اور بچوں کو انجوائے کر رہے تھے کہ اچانک سب کچھ خواب اور تصور بن گیا۔ کہانی کا ایک جملہ کہ 'کینیڈا کا شیروانی صحت یاب ہو سکتا ہے تو میں بھی ہو جاؤں گا' نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ناکافی سہولتوں کی وجہ سے کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہو رہے ہیں لیکن ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ ثمر عباس کی طلاپ، میاں بیوی کے جھگڑوں سے اولاد پر ہونے والے اثرات آشکار کرتی چشم کشا تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن بھی زوروں پر نظر آئی۔ احسان سحر اور شبانہ حسن کا انتخاب بہترین لگا۔ آپ سے گزارش کی تھی کہ اقلیم علیم سے بھی کچھ لکھوائیں۔ کیا اس بارے میں کوئی تجویز زیرِ غور ہے؟ سابقہ شمارے میں ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ایک تحریر شائع ہوئی جس میں فیسٹولا کی مریضہ کے لیے کہا گیا کہ اس کا کوئی مناسب علاج نہیں۔ دل کو چھو لینے والا ایک جملہ جب زاہد نے کہا۔ ان دیہاتوں میں سرحد کے دونوں طرف کیا صرف زلزلوں کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب اس جملے میں چھپے کرب نے افسردہ کیے رکھا۔“

※ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے حاضر ہیں ”حسب معمول اس شمارے کا بھی گیٹ اپ بہت دلکش ہے۔ فہرست کی تزئین کاری بھی بھلی لگی۔ آہا! اس بار تو بڑے بڑے جید اور جگادری تبصرہ نگاروں کے اسمائے گرامی بلیک لسٹ میں نظر آئے، ساتھ ہی اس حقیر فقیر کا بھی نام اس ”کالی فہرست“ میں درج ہے، بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اس دفعہ غیر ملکی کہانیوں میں میری نظر میں بدنام پہلے نمبر پر تھی۔ دوسرے نمبر پر راز اور تیسرے نمبر پر تحفہ تھی۔ مصنف کے تصور میں تحقیق کرنے سے مجرموں کے منصوبے کا دھڑن تختہ ہو گیا ہے۔ فلسطین کے پس منظر میں لکھی ہوئی بھٹی صاحب کی کہانی نے بہت متاثر کیا، یہ نہ صرف کہانی تھی بلکہ یہ ایک دستاویزی حیثیت کی حامل تحریر بھی تھی۔ اگلے حصے میں ابھی بہت کچھ ہونے والا ہے۔ ہنستے ہنسانے کے ٹریک سے اتر کر رونے رلانے والے ٹریک پر آنے والے منظر امام کی کہانی بہت زبردست تھی۔“

※ **سید عقیل احمد**، دبئی اور کنول شاہین خان، سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ”دسمبر کا شمارہ 20 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل بھی بہت اچھا لگا۔ محفل میں اس دفعہ اپنے کزن سید عقیل کا تبصرہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ وہ دبئی میں ہوتے ہیں اور آج میں انہی کی وجہ سے تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ محفل کی صدارت اس دفعہ زویا اعجاز سسٹر کے حصے میں آئی۔ زویا سسٹر واقعی اچھی تبصرہ نگار ہیں۔ قدرت اللہ بھائی کچھ لوگوں کو یہ بیماری ہے کہ اصل نام سے تبصرہ نہیں لکھتے۔ آغا فرید احمد خان کافی دنوں بعد محفل میں نظر آئے۔ عشق ناتمام بہترین کہانی ہے۔ ماروی دھوم مچا رہی ہے مرحوم کی طرح۔ آپ کو منوا گئی ہے۔ عبدالرب بھٹی صاحب نے سودائے جنوں میں صیہونی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ ملک صفدر حیات کی جگادری لڑکیوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں کرتیں۔ طاہر جاوید مغل کی دو ڈائریاں بہت خوب رہی۔ بیسٹ اینڈ بیسٹ اسٹوری ہے۔ عطر شیشہ بھی متاثر کرنے میں کامیابی حاصل کر گئی۔ سیلاب لے گیا میں ہمارے موجودہ دور کی بہترین عکاسی کی گئی۔ تحفہ بھی بہت پسند آئی۔ کترنیں اور محفل شعر و سخن میں سب نے اچھے انتخاب بھیجے ہیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے (خوش آمدید) امید ہے شائع کیا جائے گا۔“

※ **اعجاز احمد راحیل**، ماہی، ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں ”سال رواں کا آخری شمارہ زیرِ نظر ہے۔ یہ وقت بھی کتنی تیزی سے بیت جاتا ہے۔ پچھلے ماہ اپنی اس سندری محفل میں حاضر نہ ہو سکے تو اس بار حاضری لازم تھی۔ سرورق پر محبوبہ دلنواز اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ انشائیہ سلامتی کی راہ مرحوم جون ایلیا کی لازوال تحریروں میں سے ایک عمدہ انتخاب ہے۔ فہرست پر اس دفعہ کافی توجہ دی گئی ہے۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح عمدہ لگا کیونکہ یہ بھی باتیں ہوتی ہیں۔ زویا اعجاز صاحبہ کو صدارت کی مبارک باد۔ تبصرہ کافی نکھرا ہے۔ حیدرآباد سے عمرین ناز کا سندر سا تبصرہ بہت پیارا لگا دیلفان۔ طاہر جاوید مغل صاحب اور ناصر ملک صاحب میرے بہت ہی فیورٹ رائٹر ہیں۔ اس دفعہ سودائے جنوں سے آغاز کیا بلاشبہ عبدالرب بھٹی صاحب نے حق قلم ادا کر دیا۔ اسرائیلیوں کا مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا اور فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے جبر و ستم کو واضح کرتی خون رنگ داستان واقعی قابلِ تعریف ہے۔ محبوب قلم کار درد کے سفیر طاہر جاوید مغل کی دل گداز تحریر دو ڈائریاں خوب رہی۔ ایک ماں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی اور انیس کی دل سوز کتھا دل کو غمگین کر گئی۔ منظر امام صاحب آخری صفحات کا حق ادا کر گئے۔ سیلاب لے گیا، قدرتی آفات اور ان کے گرد گھومتی داستان پُراثر رہی۔ عبید کا کردار بے حد پسند آیا۔ الیاس سیتاپوری کی عشق ناتمام متاثر کن رہی۔ دولت اور عورت بلاشبہ لازم و ملزوم ہیں مگر وجۂ فساد بھی ہوتے ہیں۔ ہارون کا کردار عمدہ لگا۔ ماروی بھی کافی بہترین ہوئی۔ مراد کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے مگر اس کے دل میں ماروی کی محبت کے دیپ جلتے ہیں سو ونیلنٹس محبت کرنے والے مشکلات کا سامنا کرنا جانتے ہیں۔ کاشف زبیر کی اسٹوری بدنام شاندار رہی۔ اپنوں کے حصول کے لیے واقعی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“

※ **سید اکبر شاہ**، مانسہرہ سے محفل کی زینت بنے ہیں ”آئی ایم بیک...... کچھ عرصہ گم رہا۔ وجہ، ایک جملے میں، جو ہزارہا بار سن چکے ہم کہ ”ابھی چند سال کی پڑھائی میں محنت روشن مستقبل کی ضمانت ہے“ یقیناً آپ بھی سمجھے ہوں گے۔ سسپنس کے سرورق پر نظر پڑی تو کچھ بیزاری ہوئی۔ انشائیہ قابلِ غور ہے۔ سنا تھا کہ انسان کا اخلاق اور باطن اچھا ہونا چاہیے، ورنہ اچھی باتیں تو دیواروں پر بھی لکھی ہوتی ہیں۔ گلستان کا رخ کیا۔ مہکتے باغیچے کی اولین پھول خوش رنگ پر نگاہ پڑی تو خوشی اس قدر کہ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ آپی زویا کی شاندار انٹری۔ کہانیوں کی ابتدا ماروی سے کی۔ مراد مشکلات کا

شکار ہے۔ اب تو محبوب کی آزمائش بھی شرطِ اول ہے نواب صاحب۔ مرینہ کے ارادے نیک نہیں۔ دوڈائریاں، بدنام اور عطر شیشہ قابلِ تعریف تحاریر تھیں۔ محفلِ شعروسخن میں قیصر اقبال، بابر عباس اور محمد صفدر معاویہ کے اشعار پسند آئے۔ کترنوں میں رضوان کے انتخاب قابلِ ستائش ہیں۔"

⌘ **اسد عباس،** سرگودھا سے حاضر ہیں "دسمبر کا سسپنس 17 نومبر کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل کی حسینہ شاید میری جدائی میں پریشان تھی۔ خطوط کی محفل میں سب سے پہلے اپنے خط کو تلاش کیا۔ اپنا خط دیکھ کر وہ خوشی ملی جو کسی ملازمت پیشہ کو پہلی تاریخ کو تنخواہ ملنے پر ملتی ہے۔ زویا اعجاز کرسیٔ صدارت پر براجمان ہیں۔ مبارکاں! کہانیوں میں سب سے پہلے ملک صاحب کی جگادری سے انصاف کیا۔ خلافِ توقع یہ کیس ملک صاحب کے لیے بہت آسان ثابت ہوا۔ کاشف زبیر صاحب کی بدنام، بہت سے اتفاقات کا مجموعہ تھی۔ ریمنڈ کی خوش قسمتی کہ وہ ہر آزمائش سے بچ نکلا۔ نرم گوشہ مختصر مگر پُراثر تحریر تھی۔ دوڈائریاں بلاشبہ ایک اچھی کاوش تھی۔ ایک ماں کا دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جس کا جوان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا ہو اور اب اس شمارے کی سب سے بہترین کہانی تحفہ، بلاشبہ کرنل کی پلاننگ فول پروف تھی۔ کرنل کی بدقسمتی کہ عین وقت پر نیم پلیٹ گر گئی اور اس کا منصوبہ فیل ہوگیا۔"

⌘ **قیصر اعوان اینڈ عرفان بجی سیال،** ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سرورق نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی سلامتی کی راہ نے واقعی انسان کو سلامتی کی راہ دکھلائی مگر افسوس ہم سب ہی اپنی ذات کے خول میں قید ہیں۔ انشائیہ کے بعد حاضر ہوئے جگر گوشوں کی محفل میں۔ کرسیٔ صدارت پر بیٹھی زویا اعجاز کو براجمان پایا۔ یہاں مبارکباد قبول فرمائیں۔ مسلسل بلیک لسٹ کی خفت نے دل توڑ دیا اس لیے بس خاموش قاری تک محدود ہو گئے۔ یہاں ہم تہِ دل سے شکرگزار ہیں کہ آپ نے ہم قیدیوں کو دعاؤں میں یاد رکھا۔ نام آپ کی پرائیویسی کی وجہ سے نہیں لکھ رہے مگر امید کرتے ہیں آپ ضرور سمجھ جائیں گی اور آپ کا بتایا ہوا وظیفہ ہم لوگ کر رہے ہیں۔ آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ محمد قاسم آپ کے یقین کو داد دینی پڑے گی۔ محمد یوسف آپ پریشان مت ہوں۔ ہمیں محفل سے کہیں غائب نہیں ہوتیں بس ذرا دیر سویر ہو جاتی ہے۔ سید عقیل بیٹی کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آغا فریدیہ محفل نوک جھونک کے بغیر بھی پھیکی نہیں بس ذرا ادب کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ مغل صاحب کے دیوانوں کی کمی نہیں۔ اشعار میں بختاور بلوچ، صفدر معاویہ کے اشعار پسند آئے۔"

⌘ **محمد قاسم رحمان،** ابرار کالونی ہری پور سے شرکت کر رہے ہیں "ٹائٹل اس مرتبہ کچھ خاص نہ تھا۔ سب سے پہلے اپنے خط کو تلاش کیا جو فوراً مل گیا۔ تھینکس آپ میرے خط شائع کر کے میرا حوصلہ اور بلند کر رہے ہیں۔ کرسیٔ صدارت زویا اعجاز آپی کو ملی۔ تبصرہ بہت زبردست اور جامع تھا۔ وزارت کا عہدہ قدرت اللہ نیازی کو ملا۔ علی رحمان آپ بارہ سال کے بچے ہیں۔ آپ کو رسالے پڑھنے چاہئیں مگر پہلے اسٹڈیز پر دھیان دینا چاہیے۔ میری عمر سولہ سال ہے مگر گھر والوں سے چھپا کر بہت مشکل سے رسالے پڑھتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لوگ ماروی پر بہت تنقید کر رہے ہیں مگر یہ اسٹوری میری فیورٹ ہے۔ اس مرتبہ کی قسط نے بھی بہت متاثر کیا۔ ماروی مراد سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جگادری نام عجیب سا تھا مگر اسٹوری بہت اثر انگیز تھی۔ رائٹر کی بات پر میں بھی متفق ہوں آج کل یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کی پناہ ایک چودہ سال کے بچے کا بھی کسی سے افیئر چل رہا ہے اور ہم اس کو ماڈرن ماحول کا نام دیتے ہیں۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔"

⌘ **طاہرہ گلزار،** پشاور سے چلی آرہی ہیں "کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ وقت اور انسان کسی کا نہیں ہوتا۔ مجال ہے جو کسی نے میری غیر حاضری کو سمجھا۔ میں نے تو سسپنس پڑھنا کبھی نہیں چھوڑا۔ دوستوں میں صرف رضوان تنولی نے میری کمی محسوس کی۔ کوئی یاد کرے یا نہ کرے۔ سسپنس میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ (یہ ہوئی نا اپنایت) پہلے انشائیہ جون ایلیا سلامتی کی راہ پڑھا۔ بہت اثرانگیز اور پُردعا انشائیہ ہے۔ کاش ہم جون ایلیا کے کہنے کے مطابق سلامتی کی راہ پر چلیں۔ مغلِ اعظم بہت جلد ایک لمبا سلسلہ وار کہانی لے آئیں جناب۔ اف طاہر جاوید مغل یہ کیا موذی مرض کینسر کے بارے میں دوڈائریاں تحریر کیں۔ 17 نومبر کی شام مجھے سسپنس ملا اور جب آپ کی تحریر پہ نظر گئی تو سکتے کی حالت میں آگئی۔ اسی موذی مرض نے تو انیس کی طرح میرے شفیق باپ جیسے ماموں کو 12 نومبر کے دن ہم سے علیحدہ کیا۔ آپ کی ساری تحریر میں نے روتے ہوئے پڑھی۔ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ اسپتالوں میں بھی نفسا نفسی ہوتی ہے۔ نواب انکل تو اب ماروی کو کچھ اور ڈگر پہ لے گئے۔ مراد جیسے گاؤں کے سیدھے سادے بندے کو پہلے مجرم بنا دیا اور اب اسے بدکرداری کا ٹیکا بھی لگا دیا اور مرینہ کو تو عورت کم اور طوائف زیادہ دکھایا گیا۔ منظر امام کی تحریر سیلاب لے گیا، ہمارے معاشرے کے دو متضاد رویوں کی عکاسی کرنے والی ایک شاہکار تحریر ہے۔ ویلڈن منظر امام صاحب۔ تصوف کی زبان ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریروں کی تعریف میں کچھ لکھنا کم از کم میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں۔ یہ سمندر کو کوزے میں بند کرتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر عطر شیشہ نے زلزلہ 2005ء کی یاد پھر تازہ کر دی۔ ملک صفدر حیات کا ایک اور کامیاب کیس جگادری جو ایک مرد کی جھوٹی محبت اور ہوس کا ایک تازیانہ مرد اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ کترنیں اور اقوالِ زریں بہت زبردست ہیں۔ اشعار معیاری لگے، امید کرتی ہوں کہ دل سے ویلکم کیا جائے گا۔" (ویلکم بیک)

⌘ **عادل خان،** ضلع صوابی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سسپنس میں ایک طویل عرصے بعد حاضر ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ جس طرح الیاس سیتاپوری مرحوم، اثر نعمانی مرحوم، عبدالقیوم شاد مرحوم، اقبال کاظمی مرحوم کے قلمی شہ پارے وقتاً فوقتاً دوبارہ دیتے رہے اسی طرح حقی صاحب کے قلم پارے بھی دیا کریں تاکہ نئے پڑھنے والوں کو بھی ان کے قلم کی روانی کا پتا چلے۔ الیاس صاحب کے ہنی بال، چنگیز و ہلاکو خان کے بارے میں لکھے گئے سلسلہ وار ناول بھی دوبارہ دیں۔ اس دفعہ تراجم میں کاشف زبیر صاحب کی بدنام اچھی تھی۔ سودائے جنوں، فلسطین اور اسرائیل کے تناظر میں زبردست شروعات بڑا مزہ آیا لیکن ماروی متاثر کرنے میں ناکام۔ آخری صفحات پر منظر امام صاحب آئے جن کا نام ہی معیار کی ضمانت ہے۔"

⌘ **احسان سحر،** ذادے خیلا نوالہ، میانوالی سے چلے آرہے ہیں "کچھ اچھا ہونے والا ہو تو دائیں آنکھ پھڑکتی ہے اور اس کا ثبوت بھی ہمیں مل گیا جب 16 کو سسپنس ہمیں مل گیا۔ جون ایلیا مرحوم کا انشائیہ پڑھا۔ پتا نہیں پہلے انشائیے اور اب کے انشائیوں میں فرق کیوں محسوس ہوتا ہے۔ (شاید زمانے کا فرق ہو) گلستان میں داخل ہوئے۔ زویا اعجاز اچھے انداز میں خوشبو بکھیرتی نظر آئیں مبارک ہو۔ رضوان برادر اس دفعہ آپ کا انداز دھیما رہا۔ عشق ناتمام کا پہلا حصہ کافی خوشگوار اثر چھوڑ گیا۔ ہارون اور منیزہ کا عشق کیا گل کھلاتا ہے...... یہ تو آگے معلوم ہوگا۔ نرم گوشہ خوب صورت تحریر تھی۔ بدنام، بھی متاثر کن رہی۔ ریمنڈ جین سب لوگوں کا مصنوعی کردار آخر حقیقی کردار بن ہی گیا۔ سودائے جنوں، برسوں بعد ایسی شاہکار تحریر پڑھنے کو ملی۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ دوڈائریاں بہت ہی خوب صورت اور دلفریب کہانی رہی۔ ملک صاحب بھی اس دفعہ ہلکے پھلکے اور رنجیدگی سے ہٹ کر کیس لے کر آئے۔ شروع سے اینڈ تک دلچسپی برقرار رہی۔ محبت کی آڑ میں لالچ اور ہوس بھی تمام ہوئی۔ عطر شیشہ میں ڈاکٹر صاحب گزرے زلزلے کی یاد تازہ کرا گئے۔ وہ زلزلہ جس کے آثار ہمیشہ دلوں میں قید رہیں گے۔ پاگل عورت ایک نفسیاتی عورت کی کتھا رہی۔ ماروی میں اس دفعہ کچھ خاص نیاپن پیدا نہ ہوا سوائے جیلسی اور بغاوت کے۔ ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی ہے کہانی۔"

⌘ **زیب حسن،** اچھرہ، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں "آپ کو تو پتا ہے کہ میں سال میں صرف ایک بار سسپنس میں حاضری دیتا ہوں۔ سسپنس کا پورا شمارہ تو نہیں پڑھ سکا لیکن سب سے پہلے اپنے محبوب مصنف محبت کے شہنشاہ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارا۔ آہ...... کیا درد بھری تحریر تھی۔ پتا نہیں طاہر صاحب اتنی جذباتیت سے بھرپور رلا دینے والی تحریریں کیسے تخلیق کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس محبتوں کے سفیر کہلانے والے سے مجھے اک بے نام سی عقیدت ہے۔ میں جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں اک عجب سی لذت آشنائی سے دوچار ہوتا ہوں۔ منظر امام کی تحریر سیلاب لے گیا بہت زبردست تھی۔ سیلاب کی ہولناکیاں اور تباہ کاریوں سے ہر کوئی واقف ہے۔ درحقیقت سیلاب اور زلزلے اللہ کا عذاب ہیں۔ مجھے وہ رات زندگی بھر نہیں بھولے گی جب میں اپنے گاؤں حویلی بہادر شاہ میں تھا اور اچانک رات کے دو بجے شور مچا۔ گلی محلے والے ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے۔ مسجد میں اعلان ہو رہے تھے کہ بند ٹوٹ گیا ہے۔ بہت بڑا پانی کا ریلا آرہا ہے۔ اس وقت کی کیفیات کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بظاہر تسلیاں دے رہے تھے لیکن اندر کی کیفیت سب کی ایک جیسی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ آخرکار ہم سب گاؤں خالی کر کے اپنے اپنے رشتے داروں کے گھر چلے گئے پھر دو دن بعد خبر ملی کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا گاؤں بچ گیا ہے تو ہم واپس آئے۔ کچھ فضل داد جیسے لوگ اللہ کے عذاب کو دیکھتے ہوئے بھی توبہ نہیں کرتے۔ زویا اعجاز کو آخر میں مبارک باد۔ کرسیٔ صدارت ایک مہینے کے لیے آپ کی ہوئی۔ باقی ڈائجسٹ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ پلیز محبت کے شہنشاہ مغلِ اعظم صاحب سے محبت، درد اور جذبات بھری داستان سسپنس کے آخری صفحات پر لکھوائیں۔"

⌘ **نگین مروت،** لکی مروت سے محفل میں شریک ہیں "8 ماہ کے بعد نگین مروت ایک مرتبہ پھر سے حاضرِ خدمت ہے۔ کچھ حالات، دو وفات نے اور زندگی کی مصروفیات نے حاضر ہونے کا وقت نہیں دیا۔ زویا اعجاز کو بہترین تبصرے پر مبارک۔ قدرت لالہ، قاسم لالہ، یوسف لالہ، اسد لالہ، صفدر لالہ کے تبصرے بہترین تھے۔ سید عقیل کو ایک مرتبہ پھر گڑیا کی مبارک۔ آغا لالہ کو ایک بار پھر محفل میں ویلکم۔ شوکت شہریار آپ کہاں غائب ہیں۔ پلیز واپس آئیں۔ کہانیاں سب کی سب اچھی تھیں لیکن نرم گوشہ، سودائے جنوں، ماروی، راز اور آخری اسٹوری سیلاب لے گیا بہترین تھی۔ محفلِ شعروسخن میں بابر عباس، محمد اسلم، قدرت لالہ کے شعر عمدہ انتخاب تھے۔ میری طرف سے آپ سب کو دلی سلام۔"

⌘ **شوکت شہریار،** اوکاڑہ سے 3 ماہ کی طویل غیر حاضری کے بعد پھر سے محفل میں حاضرِ خدمت ہیں "سب سے پہلے تو اپنی پیاری دوست اور سسپنس کی تبصرہ نگار نگین مروت کو شادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے (آمین) ٹائٹل گرل اس مرتبہ کچھ خاص نہ تھی سو محفل میں داخل ہوئے تو زویا اعجاز کو پورے طمطراق کے ساتھ بڑی شان سے کرسیٔ صدارت پر براجمان دیکھا۔ زویا جی آپ کو مبارک ہو۔ آغا فرید بھائی تنقیدی خط لکھنے سے پہلے آپ پوری کہانی تو پڑھ لیتے یار۔ طلحہٰ رحمان مغل صاحب کے دیوانے تو ہم بھی بہت ہیں۔ پر وہ کیا کہتے ہیں کہ میں دل کی دل میں رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے عشق ناتمام پڑھی بہت اچھی لگی لیکن اینڈ میں جاری ہے کا لفظ دیکھ کے اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔ نرم گوشہ میں ایک پولیس آفیسر کی سوچ بہت اچھی لگی اور ڈینی کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔ بدنام کاشف زبیر کی ایک بہت اچھی تحریر تھی۔ آخر میں این، ریمنڈ، جین اور رومیوچ میں ایک خاندان بن گئے۔ سودائے جنوں کی پہلی قسط شاندار لگی۔ لیلیٰ جیسی محبِ وطن بیٹیاں ہوں تو یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔ ان شاء اللہ۔ طاہر جاوید کی دوڈائریاں ایک سبق آموز تحریر تھی۔ کینسر اسپتال صرف امیروں کے لیے بنایا گیا ہے کیونکہ مجھے ذاتی طور پہ بھی اس کا تجربہ ہے۔ ملک صفدر حیات نے اس مرتبہ رحمو کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ عطر شیشہ ہمارے معاشرے کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پاگل عورت میں لگی واقعی پاگل تھی۔ ماروی کی یہ قسط اس مرتبہ شاندار تھی۔ تحفہ میں کرنل کی بدقسمتی ہی اس کو لے ڈوبی۔ پلاننگ بہت اچھی تھی۔ آخری صفحات پر سیلاب لے گیا دل کو متاثر کر گئی۔ قاسم جیسے لوگ واقعی لاکھوں شریف لوگوں سے بہتر ہیں۔ فضل داد جیسے جابر جاگیردار کا انجام اچھا لگا لیکن آخر میں کہانی کا انجام کچھ ادھورا سا لگا کہ ربکھا کو زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کا سہارا تو ضروری تھا۔"

⌘ **سعدیہ بخاری،** اٹک سے تبصرہ کر رہی ہیں "لیجیے جی کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد کسی کا حق ناحق مارنے کے لیے اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ 20 نومبر کو سسپنس کا دیدار ہوا۔ ٹائٹل کو دیکھ کر آنکھوں میں موتیا اتر آیا (خدانخواستہ) کیا ہو گیا ہے ڈاکر انکل کی نظر اور ذوقِ نظر کو۔ محترم جون ایلیا ہمیں سلامتی کی راہ دکھا رہے ہیں۔ اداریے میں آپ نے جن موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس پر اتنا کہنا کافی ہوگا کہ عوام



بچارے تو ان حالات میں بھی صبر کا دامن تھامے پرعزم ہیں۔ پیٹرول سستا ہوا لیکن مہنگائی جوں کی توں ہے۔ اب چلتے ہیں محفل خطوط کی جانب۔ زویا کو صدرِ محفل دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ دوسرے نمبر پہ محمد قدرت اللہ نیازی ہمیشہ کی طرح دھیمے لہجے اور شگفتہ اندازِ گفتگو میں فرسٹ کلاس تبصرہ کرتے نظر آئے۔ کافی سارے نئے لوگ بھی اپنے اختصاریوں کے ساتھ محفل کی رونق بڑھاتے نظر آرہے ہیں۔ ستاروں پر کمند کے بعد اپنی پرانی روش پر چلتے ہوئے آغاز کیا ملک صاحب کی جگادری سے۔ کیس عام فہم سا سیدھا سادہ سا تھا لیکن بہت ہی سبق آموز۔ صابری کی بے وقوفی اور نادانی نے اسے برے حال سے دوچار کیا۔ سودائے جنوں پڑھ کر بے اختیار جزاک اللہ کہا۔ کافی طویل عرصے سے ایسے اہم موضوعات پر مصنفین کے قلم خاموش تھے۔ شکر ہے اب پھر سے کسی نے آغاز تو کیا۔ اجلی رنگت کے مکروہ چہروں نے کچھ ہی عرصہ قبل غزہ میں جس ظلم و بربریت کا مظاہرہ کیا وہ تمام عالم نے دیکھا۔ آخری صفحات پر منظر امام کی سیلاب لے گیا اگرچہ موضوع کے اعتبار سے خاص طور پر واقعات کے لحاظ سے عمومی درجے کی رہی۔ برکھا قدرتی آفت کے ساتھ ساتھ انسانی آفتوں میں بھی گھری رہی۔ عشق ناتمام میں ہارون کو آخرکار اس کی فرماں برداری کا انعام مل گیا۔ مرحوم الیاس سیتاپوری افسانوی انداز اپنا لیتے ہیں جس سے تاریخ افسانہ لگنے لگتی ہے۔ مختصر کہانیوں میں اس بار تمام مترجم تھیں جن میں پہلے نمبر پر رہی بدنام فن، ایکشن اور اجنبی لوگوں کے بیچ اپنائیت کا پروان چڑھنا وہ بھی مغربی معاشرے میں کافی اچھا لگا۔ ریمنڈ کو مجرم ہونے کے باوجود بہت خوب صورت انعام ملا۔ ساتھ میں پوری فیملی بونس میں مل گئی۔ دو ڈائریاں طاہر جاوید مغل کے قلم سے مختصر اور پُراثر تحریر جو کہ حقیقی واقعات لگتے ہیں انھی کی زبانی اس کے حالات نے بہت دل گرفتہ کیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں سے ایک اور اچھی جگ بیتی لائے۔ منظر امام جہاں سیلاب کی تباہ کاریاں بتا رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب زلزلے کی تباہ کاریوں میں سے ایک دکھ بھری داستان سنا رہے تھے۔ پاگل عورت اور راز دونوں کا کوئی سر پیر نہیں تھا جبکہ نرم گوشہ اور تحفہ قابلِ تعریف کہانیاں ثابت ہوئیں۔ محفل شعر و سخن میں کافی اشعار پسند آئے۔ وقاص امین اور ریاض بٹ کا انتخاب زیادہ پسند آیا۔"

❋ **عبدالجبار رومی انصاری**، لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں "گول صراحی جیسی گردن بازو جبیں پہ رکھے ہلکی مسکراہٹ آنکھوں میں کسی کے لیے انتظار کے سائے لیے ہوئے خوب صورت دوشیزہ یوں لگ رہی تھی جیسے ابھی کسی نے ہاتھ سے پینٹ کیا ہو۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی سلامتی کی راہ پر روحانی باتیں تو دل میں گھر کر گئیں۔ ملکی حالات پر ادارے کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ اللہ کرے پاکستان ضرور امن کا گہوارہ بنے۔ قارئین کی بزم میں تھا زویا اعجاز کی صدارت زبردست رہی۔ خوب شاہی تبصرہ کیا۔ ساتھ میں قدرت اللہ نیازی اور محمد یوسف سانول کی باتیں بھی معیاری لگیں۔ کہانی کا آغاز اپنے فیورٹ رائٹر ملک صفدر حیات کی جگادری سے کیا۔ بے چاری صابری نادانی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور ملک صاحب کا نوجوان لڑکے لڑکیوں کو نصیحت کرنا بہت اچھا لگا۔ جب تک تم جیسی بہادر بہنیں اور بیٹیاں ارضِ فلسطین کے لیے سینہ سپر رہیں گی اس سرزمین کو خونِ صیہونیت سے رنگ دیا جائے گا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی فلسطین کے حالات پہ چلتی کہانی بھی زبردست جا رہی ہے۔ منیزہ کو صاحب اولاد ہونے دیا جائے۔ ہارون کے باپ کی اوچھی ترکیب بتانے سے لگ رہا تھا ہارون اس پہ بالکل بھی عمل نہیں کرے گا۔ الیاس سیتاپوری کی کہانی بھی اچھی جا رہی ہے۔ ریمنڈ منشیات ڈیلر ہوتے ہوئے بھی خوب مرچ، سرپرستی اور ہیلپ کرنے کی وجہ سے بچ گیا۔ بدنام، برداشت نہ ہو، بڑی کہانی بھی اچھی رہی۔ منظر امام کی سیلاب لے گیا کچھ عجیب کہانی تھی۔ خوب صورت برکھا مغل داد اور قاسم کے ساتھ ساتھ سیلاب کے تھپیڑوں سے تو بچ گئی لیکن اپنے معصوم شوہر کو کھو بیٹھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تصوف کی زبان میں فرمانِ رسول جس نے اللہ کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا۔ سبحان اللہ اور فقرا تو قناعت پسند ہوتے ہیں۔ تصوف کی باتیں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ زلزلے کی تباہ کاریاں جہاں ہزاروں لوگوں کے لیے زحمت بنی وہیں حمیداں کے لیے رحمت بن گئیں اور عطر شیشہ میں پرسکون زندگی گزارنے لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی نے 2005ء کے زلزلے کی یاد تازہ کر دی۔ ڈائری ایک مگر تحریریں دو۔ انیس تو کینسر سے جانبر نہ ہو سکا مگر اس کی ڈائری اس کی ماں نے مکمل کر دی۔ یوں طاہر جاوید مغل کی دو ڈائریاں بھی مکمل ہوئیں۔ باقی نرم گوشہ، تحفہ، راز، ملاپ اور پاگل عورت بھی اچھا تاثر دے گئیں۔ باقی کردار تو اچھے برے ہوتے ہی ہیں۔ محفل شعر و سخن میں اپنا شعر پہلے نمبر پر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔"

❋ **ہارون بیبرس**، مردان سے چلے آرہے ہیں "سرورق پر کیا تبصرہ کریں سرجی! بس ایویں سا تھا۔ سیدھا دوستوں کی محفل میں پہنچا تو سرِفہرست تختِ شاہی سے جناب زویا اعجاز صاحبہ کو بڑی آن بان سے تختِ شاہی پر جلوے بکھیرتے پایا۔ مبارکباد قبول ہو جی۔ یوسف بھائی! ستاروں پر کمند کا اینڈ تو ہیپی اینڈ تھا، کیسی اداسی یار۔ شکیل کاظمی بھائی کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ کہانیوں کی ابتدا تاریخ کے جھروکوں سے منتخب جناب الیاس سیتاپوری صاحب کی عشق ناتمام سے کی۔ جاندار انداز میں لکھی گئی اس کہانی کے مرکزی کردار ہارون پر پتا نہیں مجھے کیوں بار بار ہنسی آرہی تھی۔ نواب صاحب کی ماروی آج کل جوبن پر ہے۔ مراد اور محبوب پہلے مخلص رقیب تھے لیکن اب کھل کے ایک دوسرے کے خلاف بولنے لگے ہیں۔ ماروی بھی اب کھل کے محبوب کا ساتھ دے رہی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی سودائے جنوں کی طرف بڑھے تو کہانی کے سحر میں ایسے کھوئے کہ ختم کرکے ہی دم لیا۔ ظلم و بربریت، وحشت، سفاک اور غاصب اسرائیلیوں کے مظالم کے خلاف فلسطین کے جانبازوں کے کارناموں کا بہت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز احوال۔ جاندار کردار اور بہت ہی مضبوط پلاٹ...... ادارے سے ایسی ہی کہانی کی امید تھی۔ درد، کسک اور دل گرفتہ کہانیوں کے خالق طاہر جاوید مغل صاحب نے ایک بار پھر اپنی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے رلایا۔ پروفیسر اشفاق عثمانی صاحب ایک دردمند دل رکھنے والے انسان۔ انیس کی بے چارگی اور ان کے والدین کی بے بسی...... بلاشبہ اسٹوری آف دی منتھ۔ ملک صاحب کی جگادری، کم ظرف اور مطلب پرست محبوب کی محبت میں گرفتار معصوم اور بدقسمت صابری کی داستانِ عبرت، کاش اے کاش یہ حسین تتلیاں سمجھ جائیں۔ حالیہ سیلابوں کے پس منظر میں لکھی گئی آخری صفحات کے لیے منظر امام صاحب کی کہانی سیلاب لے گیا نے خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ آخری صفحات پر احمد اقبال صاحب نظر نہیں آرہے۔ ادارے سے درخواست ہے کہ سلسلہ وار کہانی کے لیے ناصر ملک صاحب کو لایا جائے۔ محفل شعر و سخن میں مسز اینڈ مسٹر صفدر معاویہ، سید عقیل بھائی، نیازی بھائی اور جنید احمد ملک کے انتخاب ٹاپ پر رہے۔ مجموعی طور پر جاتے سال کا آخری تحفہ اور آل بیسٹ اینڈ بیسٹ رہا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کی نئی منفرد تبصرہ نگار جناب مسفرہ حسین کا روڈ ایکسیڈنٹ اینڈ



وجہ۔ دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہے۔ (اللہ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے) میری نانی کی طبیعت سخت خراب ہے۔ اس لیے ان کے لیے آپ لوگوں کی مخلص دعاؤں کا طلب گار ہوں۔" (اللہ انھیں جلد صحتِ کاملہ دے)

❋ **رانا حبیب الرحمٰن**، سینٹرل جیل لاہور سے محفل میں شریک ہیں "سرورق کی دوشیزہ کی کلائی میں ہمیشہ کی طرح سات عدد چوڑیاں اور دوشیزہ کسی کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ انکل صاحب اب اس راز سے پردہ اٹھا دیں کہ سرورق کی دوشیزہ کی کلائی میں ہمیشہ 7 چوڑیاں ہی کیوں ہوتی ہیں۔ اب بہانہ نہ بنایئے گا۔ اب دوسرا خوب صورت خط بھیج رہا ہوں امید ہے اس دفعہ ہمارا دل نہ ٹوٹے گا۔ (بھئی بھیجی اگر نہ چھپے خطوط کی گنجائش کیسے نکلے گی) سید عقیل بھائی خط پسند کرنے پر شکریہ۔ دبئی جا کر بھی ہمیں نہ بھول جانا۔ اس دفعہ بہت سے غیر حاضر پرانے دوست نظر آئے تھے۔ ماروی اپنی مقررہ رفتار سے رواں دواں۔ عشقِ ناتمام، جگادری، سودائے جنوں کا پہلا حصہ پسند آیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ کترنوں میں رضوان تنولی ٹھیک جا رہے تھے۔ آخر میں ناز پری اور ماہ تاب گل کے اشعار پسند آئے۔"

❋ **مہرین ناز**، حیدرآباد سے محفل کی زینت بنی ہیں "دسمبر 2014ء...... یعنی بچھڑتے ہوئے سال کا آخری شمارہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جانے کیوں دسمبر میں ہی گزرے ہوئے کچھ یادگار دنوں کی ایک فلم سی ذہن کے پردے پر چل جاتی ہے۔ ملکی سیاسی حالات و واقعات کے اعتبار سے یہ سال بہت اہم رہا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ یہ سال اپنے آغاز سے اختتام تک ہم سب کے لیے خوشیوں کا پیغام لائے۔ (الٰہی آمین) ٹائٹل شاندار رہا۔ حسینہ کے کپڑے اور صورت دونوں بے مثال۔ جون ایلیا صاحب بھی قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کا اہم کام کرتے ہیں، اس بار ہمیں سلامتی کی راہ پر لے کر چل پڑے۔ اداریہ اس بار خوش کن اور تسلی بخش رہا۔ ایڈیٹر صاحب اسٹوریز کا تعارف و تعریف بڑے ہی حسین و دلکش انداز میں کرتی ہیں۔ ویلڈن جی۔ (بہت شکریہ) اب چلتے ہیں اپنی خوش رنگ محفل کی طرف، جہاں زویا اعجاز صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ مبارکباد۔ سید عقیل آپ کا تبصرہ پسند آیا۔ سسپنس ڈائجسٹ واقعی مقبول و مشہور رسالہ ہے جس کو دبئی اور دوسرے ملکوں میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ آفریدی برادر آپ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے بابر عباس بھائی کے تبصرے کا انتظار تھا لیکن اس بار تو بلیک لسٹ اچھے اچھوں کو نگل گئی۔ (کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے) دسمبر 2014ء کے سسپنس کی تمام کہانیاں دلچسپ اور دل کی دھڑکن تیز کرنے والی تھیں۔ دو ڈائریاں میں مغل صاحب ایک بار پھر ہم قارئین کے دل جیت گئے۔ طاہر جاوید مغل صاحب قسمت کے دھنی انسان ہیں، جس موضوع پہ قلم اٹھاتے ہیں بیڑا پار ہوتا ہے۔ الیاس سیتاپوری کی عشق ناتمام، بس ابتدائی صفحات پڑھنے تک محدود رہی۔ ایک عامری کہانی جو آئندہ ماہ بھی چلے گی۔ سیلاب لے گیا، منظر امام صاحب کی بہترین کوشش، قدرتی آفات کی تباہ کاریاں، انھوں نے دل گداز پیرائے میں پیش کیں۔ عبید جیسی اچھی اور حساس سوچ رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے ہماری غریب اور بیچاری عوام کا بھلا ہو جاتا ہے۔ وڈیرا افضل داد اور برکھا کو قاسم کے متضاد کردار۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا پہلا حصہ پڑھا، پسند آیا۔ اسرائیلی ایجنسی موساد کا مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور فلسطینی مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کی عکاسی کرتی ہوئی داستان ہے۔ عابد عسکری کا کردار اچھا لگ رہا ہے۔ لیلیٰ کیا کرتی ہے انجام دیکھنا ہے۔ کمال الدین نواب کی ماروی، تھرپارکر اور انکل کے ساتھ اپنے نمبر بڑھاتی جا رہی ہے۔ مرینہ مراد کو حاصل کرنے کے بعد بھی ماروی کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ جگادری یعنی لوگوں کو دھوکا دینے والے حنیف عرف حنیفو کو ملک صفدر حیات نے موت کے در سے آشنا کروا کے صابری کا بدلہ لے لیا، ایسے گھٹیا لوگ معاشرے کا ناسور ہیں۔ پتا نہیں کب اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کو عقل آئے گی۔ تصوف کی زبان میں ضیا تسنیم بلگرامی نے ہمیں لسان التصوف ابوسعید کے حالاتِ زندگی اور کرامات سے مستفید کیا۔ ممتاز علی اور اشوک کمار کے مراسلے خوب صورت تھے۔ محفل شعر و سخن میں سارے انتخاب لاجواب تھے لیکن بختاور بلوچ، ڈاکٹر ناہید، مسز بابر عباس، انجم کمال، ہادیہ، ماہا اور سعدیہ منظور کے اشعار بہت پسند آئے۔ آخر میں رب جلیل سے دعاگو ہوں کہ وہ سسپنس ڈائجسٹ کے لیے انتھک محنت کرنے والوں، پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ نیا سال 2015ء امن و سلامتی کا سال ثابت ہو۔" (آمین)

❋ **عبدالغفور خان ساغری خٹک**، جہب، اٹک سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "کافی ٹائم کے بعد مصروفیت سے وقت نکال کر خط لکھنے لگا ہوں۔ عرصہ 7 سال سے ہماری ازدواجی زندگی کی ڈور مورخہ 23-10-2014 کو ٹوٹ گئی ہے۔ بہت کوشش کی گھر آباد کرنے کی لیکن نباہ بیوی سے نہیں ہو سکا اور ڈور ٹوٹ گئی ہے۔ (بہت افسوس ہوا آپ کی علیحدگی کا...... اللہ مشکل آسان کرے) دسمبر کا ٹائٹل دل جیتنے میں کامیاب 100 فیصد رہا ہے۔ کہانیوں کی ترتیب اچھی لگی ہے۔ جس طرح سسپنس کا انتظار رہتا ہے۔ کہانیوں میں سیلاب لے گیا بہت اچھی لگی۔ منظر امام نے کافی کچھ باریکی میں لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی عطر شیشہ پڑھی جو کہ کافی دل لگا کر پڑھی۔ خطوط کی محفل میں زویا اعجاز کو صدارت کی کرسی پر فائز دیکھا، مبارک باد۔ ابرار وارث اگر آپ کے دوست عاطف شاہین نے تعلق توڑا تھا تو آپ کو چاہیے کہ آپ جوڑنے میں پہل کرو کیونکہ دوستی میں ناراضگی اچھی نہیں، دوستی کو مضبوط کرو۔ سید عقیل آپ کو بیٹی کی مبارکباد۔ محمد صفدر معاویہ خدا 16 سال کے لڑکے اور ٹرین والے لڑکے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) طاہر صاحب ستاروں پر کمند کافی اچھی تھی لیکن جلدی ختم کر دی ہے آپ نے اور دی اینڈ کافی رلانے والا تھا۔ کترنیں اس دفعہ کافی اچھی تھیں۔ محفل شعر و سخن میں 3 ٹاپ کے اشعار اچھے تھے۔ باقی احسان سحر، زوہیب، اسد عباس، ہادیہ ایمان اور ماہا ایمان کے اشعار کافی اچھے تھے۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

فاخر حسین، لاہور۔ تبسم فاطمہ، ملتان۔ لیاقت، عارف، کراچی۔ حنا عروج، کراچی۔ محمد زریان سلطان، اردو بازار کراچی۔ حسین اختر، لاہور۔ خدیجہ صنم، دادو۔ اطہر معیز، روجھری۔ امتیاز خان، ضلع اٹک۔ طارق مقبول، وہاڑی۔ جبران احمد ملک، گلشنِ اقبال۔ نجیب الرحمان، لاہور۔ کہکشاں فاروقی، سیالکوٹ۔ منور حسین، سیالکوٹ۔ احمد خان، راولپنڈی۔ محمد احسن، کراچی۔

دوسرا حصہ

عشق ناتمام

الیاس سیتاپوری

اگر کتابیں لکھنے کا رجحان طاقتور نہ ہوتا تو آج کوئی تاریخ سے واقف بھی نہ ہوتا... اوراق کتاب کے ہوں اور واقعات ماضی کے... تو پڑھنے والا مستقبل کی سوجھ بوجھ بھی پالیتا ہے... تاریخ صرف بادشاہت کے اصول یا سیاست کی نیرنگی سے ہی واقف نہیں کراتی بلکہ دلوں کے بھید اور خوابوں کی تعبیر بھی بتاتی ہے... اس کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے مگر وہ رشتوں کے گرداب میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ کسی ایک سمت جانے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا... کیونکہ ہر رشتہ اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ اس کے کاندھوں پر اگرچہ ایک اہم عہدے کی ذمے داری تھی لیکن مشکلات کے باوجود وہ کسی رشتے کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ دولت کی ریل پیل نے اپنوں کو دشمن اور دشمنوں کو اپنا تو بنا دیا تھا مگر قسمت کا یہ فیصلہ اسے منظور نہ تھا۔ اسے تو بس اصل چہرے دیکھنے کی تمنا تھی... کیونکہ وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے لخت جگر کو کھو دیتا جو اصل میں اس کا وارث تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

ہارون اور منیزہ خوش وخرم زندگی گزارنے لگے۔

عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع شروع میں منیزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کردی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا، صاف ستھرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتی۔ عامر کسی بات پر روٹھتا تو منیزہ سوجتن کرکے منالیتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔ منیزہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجۂ نزاع تھی۔ وہ مال وزر اور درہم ودینار کو اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات منیزہ کو...... ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ بوڑھا آدمی اس کے گھر کا مالک ومختار بنا بیٹھا رہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرح سے بے دخل کردینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بری طرح اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا کہ اب وہ دادا کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے منیزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال وزر اور درہم ودینار سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اسے خوفزدہ کررہے تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس کرتا رہتا تھا کہ وہ کسی دن بھی حملہ کرسکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور منیزہ کو بھی خبردار کیا کہ اس کے بہنوئی سے چوکنا رہے لیکن منیزہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، شادی تو ہوچکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا۔ ”منیزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔“

منیزہ نے بات ہنسی میں اڑادی۔ ”وہ کیا بدلہ لے گا۔

اب تو وہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔“

کچھ دنوں بعد منیزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس کی بیٹی منیزہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دستِ نگر دیکھ کر افسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹی نے گھر کی ہر چیز اپنے قبضے میں کرلی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور فکرمند ہوگیا کہ منیزہ کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا، ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے منیزہ کے باپ کو خشمگیں نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے منیزہ کے باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کرلیے تھے جو منیزہ کے باپ کے دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں کیا۔ منیزہ کے باپ نے بھی اس کدورت کو محسوس کرلیا۔ اس نے زمانہ سازی سے کام لیا۔ بولا۔ ”شاید یہ شادی پہلے ہوجاتی اگر مجھے یہ معلوم ہوگیا ہوتا کہ تو نے اپنے بیٹے کو منیزہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے کیونکہ مجھ کو ہارون سے کبھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔“

ہارون کے باپ نے برجستہ جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے یہ سوچ کر یہ رشتہ قبول کرلیا کہ ہمیں نوجوانوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہی چاہیے۔“

منیزہ اپنے باپ کے ساتھ برتی جانے والی سرد مہری کو بری طرح محسوس کررہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران منیزہ کے باپ سے کہا۔ ”کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا۔ میری رائے میں آپ بھی یہیں منیزہ کے پاس آجایئے، دل بہلا رہے گا۔“

لیکن منیزہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا۔ ”گھر تو بس اپنا ہی ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہ لو تو میں صاف انکار کردوں گا۔“

منیزہ کے باپ نے اپنے گال پر طمانچہ سا محسوس کیا۔ ہاتھ کا نوالہ منہ تک نہ لے جاسکا، بولا۔ ”اپنا گھر کسے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لیے یہ تعریف گالی بن گئی ہے۔ اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔“

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ”خدا کے فضل سے تو سمجھ دار انسان ہے، بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔“

ہارون باپ کی باتوں پر کٹا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا۔ ”بابا جان! یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟ منیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک سچی بات کہہ دی ہے، یوں بھی مشہور ہے الحق مر (سچائی کڑوی ہوتی ہے۔)“

منیزہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی، بولی۔ ”بابا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جایئے۔ یہ گھر مہمانوں کے لیے تنگ ہے۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا۔ ”مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لیے کہہ۔ منیزہ! میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں لالچی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا جب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کرلیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“ پھر اپنے ہاتھ ایک کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولا۔ ”افسوس کہ بیٹی یہاں آکر بہت شرمندہ ہوا۔ اگر میں انسانی طمع اور خودغرضی کی خباثتوں پر ذرا سا بھی غور کرلیتا تو شاید اس شرمندگی، خجالت اور ذلت سے محفوظ رہتا۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔ ”خوب، یعنی میں خودغرض، طامع اور حریص ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی تجھ سے......“

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہورہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”بابا جان! ویسے یہ ہے بڑی زیادتی کی بات، آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی ہے۔ آپ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیے۔“

باپ بیٹے پر برس پڑا۔ ”تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہوسکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے منیزہ سے شادی کی ہے، اس لیے یہ منیزہ کا گھر ہے۔ منیزہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مہمان بن کر آسکتا ہے۔ اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔“

منیزہ کا باپ تلملا کر چیخا۔ ”جی بھر کے اہانتیں کرلے، جتنا چاہے بولتا رہ لیکن یہ مت بھول، کبھی کے دن

بڑے کبھی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب میں تجھے تیری اہانتوں کا جواب دے سکوں۔“

منیزہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ ”بابا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کدورتیں زندہ رہیں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل وخوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔“

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آرہا تھا۔ بولا۔ ”بابا جان! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ ذرا تحمل سے کام لیجیے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلایئے۔“

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ”مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون...... تو خاموش رہ ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کردوں گا۔“

منیزہ کو رونا آگیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کونے میں چلی گئی، اور وہاں جاکر رونے لگی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند کھجوریں دے دیں، عامر خوش ہوگیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ ”بیٹے عامر! میں کیسا ہوں؟“

عامر نے فوراً جواب دیا۔ ”بہت اچھے، سب سے اچھے۔“

باپ نے سرگوشی میں دوسرا سوال کیا۔ ”اور یہ دوسرا بوڑھا جو منیزہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟“

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ ”برا، آپ سے لڑتا جو ہے۔“

دادا نے پوتے کی پشت تھپتھپائی اور تیسرا سوال کیا۔ ”تیری یہ نئی ماں کیسی ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”اچھی، بہت اچھی۔“

اور وہ رونے لگا، بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔ ہارون کے باپ کو شبہ گزرا کہ شاید منیزہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر منیزہ سے متعلق سوالات پر رونے لگا۔ اس نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میرے بچے عامر! تو مت گھبرا، اگر منیزہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔“

عامر نے برا مان کر جواب دیا۔ ”دادا جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ کہیں میری یہ ماں بھی مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔“

دادا اس جواب پر چونک پڑا۔ اسے اپنے سارے منصوبے درہم برہم ہوتے نظر آئے، بولا۔ ”میرے معصوم ناسمجھ بیٹے! تو ان چالاکیوں اور عیاریوں کو ابھی نہیں محسوس کرسکتا جو منیزہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہوئے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کرسکوں گا۔“

منیزہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ ”منیزہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا سکھا پڑھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

منیزہ نے برا مان کر جواب دیا۔ ”بابا جان! میں آپ کی یہ بات کبھی نہیں مانوں گی۔ میں عامر کو چاہتی ہوں، ازحد، بے حد، بہت زیادہ اور یہ ناممکن ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔“

باپ نے افسوس سے کہا۔ ”میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے۔ تو اس کے ساتھ کچھ بھی کرلے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہوگی تو، تو اس پر پوری طرح اعتبار کرسکے گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی ممتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔“

لیکن باپ کی نصیحتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دیر بعد جب دادا کا ورغلایا ہوا عامر منیزہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں منیزہ کی محبت کا طوفان برپا تھا۔ آج اس وقت اس کو منیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح منیزہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پُرکشش محسوس کررہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھالیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی...... عامر بھی منیزہ کی گود میں پیوست ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شورشوں اور ہنگاموں میں یوں الجھا رہا کہ گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے منیزہ کو مطلع کردیا کرتا۔ دوسری طرف منیزہ کا باپ آذربائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کردی گئی۔ یہیں ہارون کا بہنوئی بھی تھا۔ اس نے منیزہ کے باپ سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا۔ ”تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ منیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری غلط فہمی یا خوش فہمی ہے۔ منیزہ سب سے زیادہ آزردہ اور ناخوش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پہلی بیوی کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے

ذلیل وخوار ہوتی رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے ازراہِ شکایت جواب دیا۔"میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی ناانصافی کی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو منیزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل وخوار نہ ہورہا ہوتا۔"

بہنوئی نے کہا۔"ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیرِ اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رکھی جائے گی۔"

منیزہ کا باپ چونک کر بولا۔"یہ بات تجھ کو کس نے بتائی؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔"مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتائے گا۔ مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہوگئیں۔"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا۔"اچھا ذرا اس کی وضاحت کردے کہ منیزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہورہی ہے کہ میری منیزہ کو لاولد رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوگا؟"

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔"اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور ناگفتنی کھل کر کہہ ڈالوں۔"

منیزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے بہ مشکل دریافت کیا۔"کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتادے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔"جنابِ والا! ہارون اور اس کے گردوپیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ منیزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے عامر کو ہمیشہ منیزہ کی محبت حاصل رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر منیزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوئی کی باتوں پر پورا پورا یقین آگیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جھلسنے لگا، آہستہ سے بولا۔"تو یہ بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنادوں گا اور دیکھوں گا میری منیزہ اولاد سے کس طرح محروم رکھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے؟ اس نے منیزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد حمص پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی حمص پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی جاسکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتا چلا ہے جو منیزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کرلی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ منیزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

منیزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہوگئی۔ منیزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کررہی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہونے لگی تھی کہ عامر کو اس کا دادا بری طرح ورغلاتا رہتا تھا۔ دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل منیزہ کی محبت سے خالی اور محروم رکھے۔ اس نے سو سو طرح سے یہی باور کرادیا کہ منیزہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے، محض بناوٹی ہے۔ وہ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال وزر اور درہم ودینار پر قبضہ کرلے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھایا کہ عقل مند لوگ دولت اور درہم ودینار کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی سبق دیے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سا فرق آگیا۔ اب وہ منیزہ کے طرزِ عمل میں اس کے تصنع، عیاری اور فریب کو تلاش کرتا رہتا اور ننھا سا ذہن ان میں سے کوئی نہ کوئی شے منیزہ میں پالیا کرتا تھا۔

ہارون خراسان میں رہ تو رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ یہاں اس کو اچانک اپنے بہنوئی کا خیال آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی زخمی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کرسکتا ہے چنانچہ اس نے منیزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطورِ خاص یہ ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو منیزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی بات کرے کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہوسکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا ٹکڑا عامر کے لیے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے منیزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ

خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کررہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی محبتیں نچھاور کرتی رہی، اس کو ہارون یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ منیزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے، کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے چڑ کر ہارون کو لکھ دیا۔

"ہارون! میں چند ماہ کے لیے حمص جارہی ہوں کیونکہ وہاں میرا باپ آذربائیجان سے پہنچ رہا ہے۔ میں حمص تنہا جارہی ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

"ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا پن نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظرانداز کردیا۔ مجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہرحال میں حمص جارہی ہوں اور رہ گئی یہ بات کہ تیرے بہنوئی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باتیں نہ کروں تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔

"ہارون! میں بہت اداس ہوں اور یہ اداسی اس طرح دور ہوسکتی ہے کہ یا تو، تو خود چلا آ، یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے ہی کو بیٹا کہہ سکتی ہوں، اسی پر ناز کرسکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کرسکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ ورغلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال وزر اور درہم ودینار کو جبراً تقسیم کراسکے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کرکے رہوں گی۔ آ، جلد آ تاکہ میں تجھ سے ایک بیٹا، کم ازکم ایک بیٹا حاصل کرسکوں۔"

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شبہ گزرا کہ منیزہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی سازش سے کسی نے مطلع ضرور کردیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ کرتی۔ وہ اپنے بہنوئی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ منیزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے بہنوئی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے منیزہ دمشق نہ چھوڑے۔ وہ اسے حمص خود پہنچانا چاہتا تھا اور منیزہ کے ساتھ حمص میں وہ خود بھی رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی اس کی عدم موجودگی میں حمص پہنچے اور منیزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیں۔ اس نے بعجلت منیزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر حمص جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ منیزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کرلیں۔ عامر منیزہ کی لاتعلقی اور بے پروائی سے پریشان ہورہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ منیزہ سے باتیں کرے لیکن منیزہ نے سردمہری سے اس کو خاموش کردیا۔ اس زبردست تبدیلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کرچکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتا نہ تھا کہ منیزہ کہاں جارہی ہے۔ منیزہ نے بستر اور ضروری سامان باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی۔ عامر دور کھڑا یہ حسرت و یاس یہ منظر دیکھ رہا تھا لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پارہا تھا۔ ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بہو سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کرپارہا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد منیزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جاکر پڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی نئی ماں کہاں جارہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جائے گی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے وبا نکلی جارہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور منیزہ کے دروازے پر دہلیز سے لگ کر بیٹھ رہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات منیزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ستارہی تھی، اس کو وہ ننھا منا عامر بری طرح یاد آرہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں بلک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آگئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل کردی تھی۔

عامر دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ ہارون کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں منیزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی۔ منیزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''کون؟''

جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ ''ماں! میں ہوں عامر۔''

منیزہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''عامر! مگر تو یہاں کیا کررہا ہے؟''

عامر نے جواب دیا۔ ''ماں، میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔''

منیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ ''یہاں دہلیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آواز نہیں دی تو دستک دے لیتا۔''

منیزہ اس کو کمرے میں لیے چلی گئی۔ اس نے شمع کی روشنی میں عامر کے چہرے پر خشک آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شوخی سے پوچھا۔ ''کیا تو رو رہا تھا؟''

عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے لگیں بولا۔ ''آپ کہاں جارہی ہیں؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''اپنے باپ کے پاس حمص۔ کیوں؟ تو نے یہ سوال کیوں کیا؟''

عامر نے پوچھا۔ ''کیا آپ تنہا جارہی ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہاں کیونکہ میں حمص سے اکیلی ہی آئی تھی۔''

عامر نے دیکھا منیزہ یہ جواب دیتے ہوئے کپکپا گئی تھی اور اس کی نظریں خلا میں گڑ کر رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ ''میں کس کے پاس رہوں گا؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''اپنے دادا کے پاس کیونکہ میں بہرحال تیرے لیے غیر ہوں۔''

عامر نے خوشامد کی۔ ''آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا، میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔''

منیزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی بات رد نہیں کرسکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا، بولی۔ ''عامر! تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گی۔''

عامر اس سے چمٹ گیا۔ ''میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔''

اسی وقت خوابیدہ حالت میں عامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔''

عامر نے جواب دیا۔ ''دادا جان! آپ جائیے اور آرام کیجیے۔ میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔''

دادا نے انگڑائی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔ ''عامر! تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی غم خوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود۔ ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔''

عامر نے کہا۔ ''آپ سب کا ارشاد سر آنکھوں پر۔''

دادا نے پوچھا۔ ''میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھا دیا ہے، اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوگی کہ تو، تو منیزہ کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ جانے کی ضد کررہا ہے لیکن منیزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! حقیقی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

منیزہ دل مسوس کر رہ گئی، بولی۔ ''بابا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہوجائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں، اس سے کئی آدمی تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ میں عامر کی دشمن ہرگز نہیں، حالانکہ آپ اس معصوم کو یہی باور کرا رہے ہیں۔''

ہارون کے باپ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا۔ ''میں کچھ بھی باور نہیں کرا رہا، عامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و دینار دیکھ کر اس سے شادی کرلی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود حمص اکیلی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے میں یا عامر کس نتیجے پر پہنچیں گے؟ یہی نا کہ تجھ کو عامر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے......''

منیزہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی۔ ''بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کرکے عین روانگی کے وقت اس ندامت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔''

ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ رہا۔ اس نے عامر کو منیزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا۔ ''عامر! ادھر

آ، میرے ساتھ چل۔ میں تجھ کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔" پھر منیزہ کو بطورِ خاص حکم دیا۔ "لڑکی! تو حمص اس طرح جا رہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے حمص جانے کی اجازت تک نہیں لی۔ تو اپنی مرضی سے جا رہی ہے اس لیے تو اس وقت تک حمص میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آ جائے۔"

منیزہ نے رقت سے جواب دیا۔ "آپ تو واپسی کی بات کر بھی رہے ہیں لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں، میں دوبارہ نہیں واپس آؤں گی۔"

عامر کا دادا تلملا کر رہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد منیزہ اس طرح حمص روانہ ہوگئی کہ اس کا ایک پڑوسی دورانِ سفر اس کا سرپرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ منیزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیتِ ایزدی کے مطابق ہے۔ اس لیے منیزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

حمص میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی۔ یہاں اس کے چند رشتے داروں نے خوش آمدید کہا۔ اس کے باپ کی رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے منیزہ کو محبت اور عزت سے اتارا اور اس کی خاطر مدارات میں لگ گئے۔

منیزہ کو رہ رہ کر دمشق، عامر اور ہارون کی یاد ستاتی رہتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر، جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ حمص کی فضا میں چھائے ہوئے بادلوں کو بڑی حسرت سے تکتی رہتی۔ ان کالے کالے اور بھورے یا سرمئی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن منیزہ کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروازے یا چھت سے مویشیوں کے گلے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصباح اس کا باپ بھی آذربائیجان سے آ گیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظریں منیزہ پر جو پڑیں تو وہ مسکرانے لگا اور اشاروں اشاروں میں مافی الضمیر سمجھانے لگا۔ اس نے منیزہ کو پُرشوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال کیا۔ "منیزہ! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھ کو نکال دیا؟"

منیزہ نے ضبطِ غم کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی۔ ہارون کا باپ مجھ کو نکالتا کیوں؟"

بہنوئی نے طنزاً پوچھا۔ "عامر کہاں ہے؟"

منیزہ نے چور کی طرح جواب دیا۔ "دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔"

بہنوئی نے شرارتاً پوچھا۔ "وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا تنہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔"

بہنوئی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا۔ "منیزہ! تو جو چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موذی ہے۔ حرص و طمع کا پیکر، اگر تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے سن لے۔"

منیزہ دم بخود کسی معصوم تماشائی کی طرح تندوئی کی صورت دیکھتی اور باتیں سنتی رہی۔

ہارون کا بہنوئی کہتا رہا۔ "منیزہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! بخدا جب بھی میں تجھ کو دیکھتا ہوں یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ بتقدیر بھی کوئی چیز ہے، تقدیر بھی کیا شے ہے......"

لیکن اسی وقت منیزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس نے ہارون کے بہنوئی سے پوچھا۔ "کہیں تو میری بیٹی کو ورغلا تو نہیں رہا؟" پھر منیزہ سے پوچھا۔ "بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ملول کیوں ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "پدرِ بزرگوار! کوئی ایک سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں۔ میں ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔"

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

ہارون کا بہنوئی بول اٹھا۔ "مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اس گھر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر سرتاپا جنت ہوتا لیکن اب وہ گھر......"

منیزہ رونے لگی، بولی۔ "میں اس بوڑھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی ہے۔"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ "پھر بھی ہوا کیا؟ کچھ تو بتا؟ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی۔"

ہارون کے بہنوئی نے منیزہ کے باپ سے کہا۔ "منیزہ کے اس جواب میں کہ اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی، اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔"

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "اچھا، اب تو واقعی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو حمص ہی میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور یہیں رہے گا۔"

منیزہ نے اشک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا۔ "اور عامر؟ عامر کہاں رہے گا؟"

منیزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا۔" پھر ہارون کے بہنوئی سے کہا۔ "تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں منیزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا، منیزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو بار بار عامر کا نام کیوں لیتی ہے؟ یاد رکھ وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف تیار کر رہا ہے۔ افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ اور روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہو۔"

منیزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنی اولاد کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گرمی سے اس کے سینے اور پورے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔

منیزہ کے باپ نے دبے دبے لہجے اور اشاروں کنایوں میں پوچھا۔ "منیزہ! مجھے تو تیری اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کارفرما نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

منیزہ کوئی جواب دیے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی خلوتوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو پکڑ لیا جہاں ہارون نے چالاکیوں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف مواقع پر خود کو بہ عجلت منیزہ سے الگ کر لیا تھا اور یہی وہ قیمتی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔ پہلے وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن اب وہ ماضی کے اس عمل میں تواتر اور پابندی محسوس کر کے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال کی شکل اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور اولاد حاصل کر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور منیزہ میں اختلافات پیدا کرا دے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ منیزہ سے تخلیے میں چند باتیں کرے۔

منیزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ اس بلاوے کو ٹال دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر بدرجۂ مجبوری اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔ "منیزہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لیے دمشق جا رہا ہوں۔ ہارون کا بہنوئی یہیں رہے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔"

منیزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔ "لیکن میں اس کو ساتھ چلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا مخلص ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عدم موجودگی میں یہیں رہ جائے تو میں اسے منع بھی نہیں کر سکتا۔"

منیزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا رہا۔ "لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہارون اپنے بہنوئی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا تاخیر سے پہنچتا تو، تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی کی بیوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "بابا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجیے۔ گھما پھرا کر کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے اردگرد دیکھ کر مشتعل ہو جائے۔ تو محتاط رہ بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں کہیں موجود ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔"

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے اس نے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن اب مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ کئی ایسے مواقع ملے جب وہ منیزہ کو ورغلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصباح اٹھ کر نماز پڑھتی، اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگاتی پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔ نزلے نے کئی دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو ٹال دیتی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گر گئی۔ بخار بھی ہو گیا۔ رات بھر نیم مدہوشی میں معلوم نہیں کیا بڑبڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی کو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ بہنوئی اس کے سرہانے جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ ”منیزہ! اب کیسی طبیعت ہے؟“

منیزہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔ ”آپ یہاں کب آئے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”منیزہ! میں تیری مجبوریوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو اتنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبوری ظاہر کرتی رہتی ہے۔ اب تجھ کو خول سے باہر آ جانا چاہیے۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے آس پاس کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس سے باہر آ جاؤں۔“

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شوخی سے بولا۔ ”تجھے تو جھوٹ بول کر دھوکا دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔“

منیزہ نے مختصراً کہا۔ ”یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل بشاش اور مطمئن ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! پھر کبھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جانے دو۔“

بہنوئی نے منہ بنا کر کہا۔ ”ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔“

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی۔ ”جو بات کرنی ہو، مختصراً جلدی کر لیں کیونکہ طبیعت باتیں کرنے یا سننے پر راغب نہیں ہو رہی۔“

بہنوئی نے پوچھا۔ ”منیزہ! تو سچ سچ بتا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور مطمئن ہے؟“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی۔“

بہنوئی تلملا گیا بولا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے قریب سے جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے۔ اور اگر ہارون تیرے پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔“

منیزہ نے کہا۔ ”بس یہی بات کہنا تھی یا کچھ اور بھی؟“

بہنوئی سخت مایوس تھا، بولا۔ ”پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب میں جو کچھ کہا وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم کام کی باتیں کروں گا۔“

منیزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو یہ چیز کہلوانے پر مصر ہو تو میں تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب آگے کہیے کچھ۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اگر ہارون اور تیرے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ تم دونوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس لیے میں......“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بہرحال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ جو تھوڑی بہت رنجشیں آ بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ ہی دھل جائیں گی۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور ٹھاٹ کی زندگی گزار رہی ہوتی۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اے بھائی! یہ ٹھاٹ کی زندگی کیا شے ہوتی ہے؟ مجھے کیسے معلوم ہو؟“

بہنوئی نے ہنس کر کہا۔ ”تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے، پھر تجھے خودبخود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔“

منیزہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی۔ ”بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے۔ اگر تم سے شادی کرنا

ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے محبت کرتی ہوں۔“

بہنوئی نے طنز کیا۔ ”محبت کرتی ہے ہارون سے! خوب۔ منیزہ یا تو، تو مجھ کو بےوقوف بنا رہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے۔“

منیزہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی۔ ”میرا سر درد کر رہا ہے۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دیوار سے سر ٹکرا لوں گی۔“

اتنے میں منیزہ کی پھوپی بھی آ گئی۔ اس نے منیزہ کو بستر پر بیٹھے جو دیکھا تو دور ہی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے منیزہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

بیچ میں بہنوئی بول پڑا۔ ”منیزہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے اس کو یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طبیب سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔“

پھوپی نے کہا۔ ”یہ ٹھیک تو کہتا ہے۔ تجھ کو اس کا کہنا مان لینا چاہیے منیزہ! نزلے کا زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا خطرناک بات ہے۔“

منیزہ نے جھنجلا کر کہا۔ ”پھوپی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے چلی جا رہی ہیں۔“

پھوپی نے سختی سے کہا۔ ”تو طبیب کو بلا لا، میں دیکھوں کی یہ علاج کس طرح نہیں کرائے گی۔“

بہنوئی طبیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے بہنوئی کو اتنا خبیث نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آ جائے تو اس کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر دہل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔

کافی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو طبیب تو اس کے ساتھ آیا نہیں، ہاں چند دوائیں البتہ اس کے ہاتھ میں تھیں۔ انہیں منیزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ ”منیزہ! میں نے تیرا حال کہہ کر طبیب سے یہ دوائیں لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟“

منیزہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ ”بھائی! تم نے بلاوجہ زحمت کی، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ پھوپی کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بولا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے جواب چاہتا ہوں، یہ تو تو اچھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ دردِ سر بنا رہے گا۔ رہی یہ بات کہ تو خود صاحبِ اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا کبھی بھی نہ ہونے دے گا اور اگر یہ لغزش ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ بہرحال تیری آغوش تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔“ پھر وہ اور زیادہ بےشرمی پر اتر آیا پوچھا۔ ”منیزہ تیرا بچہ کیوں نہیں ہوا؟“

منیزہ بپھر کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رسید کر دیے، بولی۔ ”بےشرم انسان! تو اسی وقت دور ہو جا میری نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔“

لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”منیزہ! میں غرض مند ہوں اسی لیے یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔“

منیزہ نے بیچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی۔ ”میرا راستہ چھوڑ دے او خبیث انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا، میں نہیں سنوں گی اور ہارون کو تیری باتوں سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا صحیح جواب۔ افسوس کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔“

منیزہ بھاگ کر پھوپی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اب اس کو ایک اور فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا اگر منیزہ نے یہ سب کچھ ہارون کو بتا دیا تو کیا ہوگا؟

اور آخرکار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار ناممکن ہوا تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف منیزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدایا یا تو باپ کو دمشق سے واپس بلوا دے ورنہ ہارون ہی کو واپس بلا لیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبولِ بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آ گیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زاروقطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ”بیٹی منیزہ! کیا ہوا؟ یہ تو رو کیوں رہی ہے؟ خیریت تو ہے؟“

منیزہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”بابا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے۔ اس عمر میں اب میں نے یہ سمجھا ہے کہ بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قبل

از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔"

باپ نے پوچھا۔ "کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "نہیں، ابھی تک تو نہیں۔"

باپ نے شوخی سے منیزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور بزرگوں کو آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ گھبرا، میں آ گیا ہوں۔" پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ "منیزہ! سچ سچ بتا اس نے تجھ کو ستایا تو نہیں؟"

منیزہ رونے لگی۔ "بادا جان! یہ شخص قابلِ اعتبار ہرگز نہیں۔"

باپ نے چونک کر پوچھا۔ "تو رو کیوں رہی ہے؟ اس نے کیا کیا؟ مجھے تو بتا کچھ۔"

منیزہ نے پُرجوش آواز میں کہا۔ "یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا برا حشر کر دیتی۔"

باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے منیزہ کو رلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا جہاں وہ چوروں کی طرح چھپا کھڑا تھا۔ منیزہ کے باپ نے طنزاً پوچھا۔ "تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔"

بہنوئی کی جان میں جان آ گئی، بولا۔ "جنابِ والا! آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟ میں تو بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

منیزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہنے میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ عامر باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور منیزہ کی شکایت کر دی، ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "وہ تنہا حمص چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی۔"

باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوئی۔ ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔"

باپ نے منہ بنا کر کہا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بجانب ہے۔ میں نے بھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر منیزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی مرضی سے حمص چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خودسری محسوس کی۔"

ہارون نے تلملا کر پوچھا۔ "بادا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟ یعنی اس میں اتنی خودسری آ گئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔"

باپ نے پچارا پھیرا۔ "نہیں، بہو سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔"

لیکن اس سے ہارون کا پارا چڑھ چکا تھا۔ وہ منیزہ سے سخت ناراض تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ منیزہ کو سمجھائے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگئی تو کوئی بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

منیزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح منیزہ کو ورغلایا ہو اور منیزہ کا حمص جانا بھی کہیں اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے عامر کو لے کر حمص روانہ ہو گیا۔ منیزہ ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس وقت ہارون کا بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہارون کو سلام کر کے عامر کی طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تو، تو یہاں موجود ہے، گویا میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔"

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر ہارون نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا۔ "بہن مر گئی میرا تیرا رشتہ ختم ہو گیا۔ اس لیے اب بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔"

بہنوئی نے کہا۔ "تو معلوم نہیں کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارون نے سختی سے منع کر دیا۔ "کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا رشتہ ہی کیا، اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔"

بہنوئی شرمندہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہارون نے منیزہ سے پوچھا۔ "منیزہ! تیرا

باپ کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے ناگواری سے کہا۔ "میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ بازار گیا ہوا ہے۔"

ہارون نے بڑی تیکھی نظروں سے منیزہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ منیزہ نے ایک آدھ بار اس کو اس طرح گھورتے دیکھ لیا اور سہم گئی۔ منیزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس سے گھر کی خیریت معلوم کرتی رہی۔ ہارون نے تلخی سے کہا۔ "منیزہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میرے جاتے ہی تو اتنی بدل جائے گی۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟"

ہارون نے کہا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہ یہاں کیوں رہتا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہارون! تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آ کر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔"

ہارون دانت پیستا ہوا بولا۔ "اگر یہ بات تھی تو تجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ میں اپنے بہنوئی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔"

منیزہ [illegible] نرمی اور محبت سے عامر کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ہارون نے کہا۔ "افسوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن تو نے عامر تک کا خیال نہیں رکھا۔ اسے چھوڑ کر اکیلی حمص چلی آئی۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہاں، وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں حمص چلی آئی۔"

ہارون نے منہ بنا کر کہا۔ "میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے چلا ہوں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا پھر میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

اس تلخ ترین اعلان نے منیزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ "فرماں برداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟ کس کی فرماں برداری؟"

ہارون نے کہا۔ "مجھ کو باتوں میں نہ بہلا منیزہ! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے کہیں زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھانا چاہتا تھا۔"

منیزہ کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر بات کو ختم کرنے کے لیے وہ وہ ہارون کے سامنے سے ہٹ گئی، بولی۔ "ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت جی بھر کے باتیں کر لوں گی۔"

ہارون دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ منیزہ اپنی پھوپی کے پاس چلی گئی۔ دوسرے کمرے تک جاتے ہوئے ایک جگہ ہارون کا بہنوئی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ منیزہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "منیزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے اس اجڈ انسان نے تیرا دل بھی دکھا دیا۔"

منیزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ "تو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو ہے۔ ہارون تجھ پر اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے۔"

ہارون کا بہنوئی خاموش ہو گیا۔

سہ پہر کو منیزہ کے باپ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس نے اپنے داماد کو بڑی خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہا مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

منیزہ کے باپ نے کہا۔ "میں تو تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔"

ہارون نے بدمزگی سے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم بہن کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔"

منیزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "ہارون بیٹے! تیرا بہنوئی کتنا ہی برا سہی لیکن یہ میدانِ جنگ کے اس دستے میں تھا جس میں، میں خود شامل تھا۔" پھر ذرا دم لے کر بولا۔ "میں نے یا منیزہ نے تیرے بہنوئی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی قدر و منزلت ہے، اس کا بنیادی سبب وہی ہے جو میں نے بیان کر دیا۔"

ہارون نے کہا۔ "اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بہن کے شوہر کو میرے تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا جائے۔"

منیزہ کے باپ نے افسوس سے کہا۔ ”مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا تعلق، سبب، وجہ؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیے۔“

منیزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا۔ ”افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو منیزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔“

شاید ہارون کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ ذرا نرمی سے بولا۔ ”پدر بزرگوار! میں جب بھی اپنے بہنوئی کی شکل دیکھتا ہوں، مجھے بہنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگتی ہے۔ اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تو بلا کا جذباتی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہ میں تجھ سے......“

لیکن ہارون نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتبار کر۔“ اس کے بعد وہ ہارون کو باہر لے گیا، بولا۔ ”میرے ساتھ چل، ہم دونوں تخلیے میں کچھ باتیں کریں گے۔“

منیزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگور کی بیلوں کے سائبان پھیلے ہوئے تھے اور انجیر اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ منیزہ کا باپ اس کو تاکستان کے سائے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتوں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پسند کیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر حیران ہرگز نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔“

منیزہ کا باپ ہنس دیا۔ ”بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ تاکستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔“

ہارون نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے بہنوئی کا جادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں منیزہ سے قطع تعلق کر لوں اور آپ منیزہ کو میرے بہنوئی کے حوالے کر دیں۔“

منیزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گھبرا کر کہنے لگا۔ ”بخدا ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی تو لاولد کیوں ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو خدا سے کیجیے۔ اولاد دینا یا نہ دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔“

منیزہ کے باپ نے ایک دم جھنجلا کر کہا۔ ”میں خدا سے جو مانگتا ہوں، وہ اس سے تعلق رکھتا ہے لیکن اب جو میں پوچھوں گا، اس کا تعلق تجھ سے اور منیزہ سے ہوگا اور تجھ کو ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔“

ہارون نے کہا۔ ”جو کچھ بھی پوچھنا ہے جلد از جلد پوچھیں، ورنہ شاید اس کا بھی موقع نہ آئے اور میں واپس چلا جاؤں۔“

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ”منیزہ کب تک تیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی؟ وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرتی رہے گی۔ جس دن یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کر لے گی۔“

منیزہ کے باپ نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ ”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ ماں کب بنے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب خدا چاہے گا۔“

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ”اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟“

ہارون ذرا جھجکا کیونکہ اس کا چور پکڑا گیا تھا۔ نرمی سے بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ یہ بات کس نے بتائی آپ کو؟“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عامر نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی گود میں بچہ ضرور ہوتا۔“

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ ”یہ ساری شرارتیں میرے بہنوئی کی طرف سے ہو رہی ہیں اور میں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

منیزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ ”ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیے تھے۔ میں نے اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی

بیٹی کو میں اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے لیے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اب تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے۔ میں زیادہ بے شرمی نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیے۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو منیزہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو منیزہ کو واقعی چاہتا ہے تو، تو اس کو اولاد دے، ورنہ دمشق واپس چلا جا اور عامر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔“

ہارون نے کہا۔ ”یہ فضول سی شرط ہے، میں منیزہ کو لینے آیا ہوں۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”منیزہ تیرے ساتھ جائے گی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گود میں اس کا اپنا بھی بچہ ہوگا۔ تو اس وقت تک حمص ہی میں رہے گا جب تک کہ عامر کے علاوہ ایک اور بچے کا باپ نہیں بن جاتا۔“

ہارون نے کہا۔ ”یہ تو بڑی عجیب شرط ہے۔ میں منیزہ کو جبراً لے جاؤں گا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”اگر جبراً لے جا سکتے ہو تو ضرور لے جاؤ ورنہ یہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔“

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تو آپ اتنی سی بات کے لیے یہاں لائے تھے مجھے؟“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہوا کرے، میں تو اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔“

ہارون نے کہا۔ ”منیزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے۔ میں اس سلسلے میں پہلے منیزہ سے بات کروں گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ”تو منیزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔“

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

منیزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ منیزہ اور ہارون کا بہنوئی دونوں کمرے میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں۔ عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ منیزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا۔ ”اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں کیونکہ میں اپنے شبہات کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔“

منیزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا۔ ”لیکن رسول اللہؐ نے کسی کی جستجو کرنے سے منع کیا ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”لیکن میں کسی کی جستجو کر ہی کب رہا ہوں، میں تو اپنی بیوی کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔“

منیزہ کے باپ نے کہا۔ ”ہارون! اگر تیرا شبہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ منیزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔“

ہارون نے اپنے سسر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خاموش رہیے، ہماری سرگوشی کی آواز کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔“

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن منیزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

اندر آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہارون کا بہنوئی کہہ رہا تھا۔ ”منیزہ! بات بگڑنا نہیں چاہیے۔ میں ہارون کا بہنوئی رہ چکا ہوں اس لیے میں ہارون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک سازش کے زیرِ اثر تجھ کو اولاد سے محروم کر رکھا ہے۔“

منیزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر عامر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے۔“

باہر منیزہ کے باپ کا دھڑکتا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا۔ وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ چور اب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے کان سننا نہیں چاہتے۔ منیزہ کے باپ نے ہارون کو فاتحانہ انداز میں دیکھا، بولا۔ ”سن لیں دونوں کی باتیں، ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پھٹ جائے۔“

ہارون نے کہا۔ ”ذرا توقف سے کام لیجیے۔ ابھی دستک نہ دیجیے گا۔“

لیکن اندر والوں کو ان کی آہٹ مل چکی تھی۔ اندر سے

دروازہ کھل گیا اور دونوں ہارون اور منیزہ کے باپ کو سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

منیزہ نے پوچھا۔ ''یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟''

ہارون نے جواب دیا۔ ''یہی سوال میں تجھ سے کرسکتا ہوں کہ منیزہ یہ تم دونوں چوروں کی طرح اندر بند ہوکر کیسی باتیں کررہے تھے؟''

دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے بہنوئی نے کہا۔ ''ہم دونوں تخلیے میں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تخلیے کی نہیں ہورہی تھیں۔''

منیزہ البتہ شرمندہ تھی، باپ سے بولی۔ ''آپ دونوں اتنی جلدی واپس آگئے؟''

ہارون نے طنزاً کہا۔ ''ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہوگی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار کر واپس آئیں گے۔''

منیزہ کھسیائی ہوئی تھی، بولی۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔''

ہارون نے اپنے بہنوئی اور منیزہ کے باپ سے کہا۔ ''آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ میں منیزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کرلینا چاہتا ہوں۔''

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ''لیکن اس کا خیال رہے کہ میری بیٹی نے تیرے بہنوئی سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو طعنہ دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں، وہ تخلیے میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے۔''

منیزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں کہا۔ ''تو نے یہ اچھی بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلاوجہ شک و شبے میں ڈال دیا۔''

اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو منیزہ نے خوفزدہ ہوکر کہا۔ ''دروازہ بند نہ کرو۔ کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہوسکتیں؟''

ہارون نے منیزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا۔ ''تو مجھ سے خوفزدہ ہے؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو۔''

ہارون نے کہا۔ ''نہیں تو مجھ سے خوفزدہ ہے کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند کرنے میں خوف محسوس کررہی ہے۔''

منیزہ نے موضوع بدل دینا چاہا۔ ''ہارون! تجھے جو باتیں کرنا ہیں وہ کر۔ بے کار باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔''

ہارون نے جواب دیا۔ ''منیزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تنہا رہیں اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہیں گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہِ ہمدردی بس یہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہورہی تھی، اس سے مطلع کردیا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرکے تادیر ان پر قائم نہیں رہنے دیتے۔''

ہارون نے کہا۔ ''اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو دوسرے کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔''

منیزہ نے کہا۔ ''اب کام کی بات کر تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

ہارون نے پوچھا۔ ''کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''سبھی لوگ معترض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی میں اولاد سے محروم کیوں ہوں۔''

ہارون کو چاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ ''پھر تو نے اس کا کیا جواب دیا؟''

منیزہ نے کہا۔ ''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔''

ہارون نے کہا۔ ''لیکن جب تو نے عامر کو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''اپنی اولاد کی بات ہی کچھ اور ہے۔ میں اپنا بچہ چاہتی ہوں، اپنی اولاد۔''

ہارون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''منیزہ! لوگوں کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہیے ورنہ یہ طے ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات میں خوشگواری اسی وقت تک ہے جب تک کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔''

منیزہ نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں بچہ چاہتی ہوں، اپنا بچہ...... جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔''

ہارون نے کہا۔ ''اگر میں انکار کردوں تو؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''تب پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔''

ہارون ایک دم چونک پڑا۔ ''تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''سچائی تلخ ہوتی ہے۔ میں اور

تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور چونکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو دور کردوں گی۔''

ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا۔ ''لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو، تو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔''

''ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی گوارا کرلوں گی۔''

ہارون نے کہا۔ ''منیزہ! تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کے کر کہ اگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو، تو آسانی سے بھگت لے۔''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے ایک ماہ دوں گی۔ اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہیں آئے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''اگر میں تجھ کو مایوس کرکے چلا جاؤں تو؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کروں گی کہ شاید تو اپنا فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے احترام میں عامر کو ایک بھائی یا بہن عطا کردے۔''

ہارون نے پوچھا۔ ''اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟''

منیزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی۔ ''تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گی اور تجھ سے امیدیں ختم کرکے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔''

ہارون نے افسوس سے کہا۔ ''منیزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم دونوں کی روحیں محبت کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ کسی اور کو بھی دے سکتی ہے۔''

منیزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش فہمی میں تھی لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں بھٹکتی چلی گئی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔''

ہارون اپنے مقدمے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب دلائل اور براہین کی جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا۔ اس نے بے دلی سے پوچھا۔

''تو یہ تیرا حتمی اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کرلے گی؟''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کردوں گی۔''

ہارون نے کہا۔ ''لیکن میں بھی تجھے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تجھ کو کسی بچے کی ماں بنا کر عامر کی بدنصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں رہوں جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کرچکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہوجائے، میں کسی دوسرے بچے کا باپ نہیں بنوں گا۔''

منیزہ نے وفورِ جذبات میں آنکھیں بند کرلیں، بولی۔ ''تب پھر تو اسی وقت چلا جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ۔ اگر اس عرصے میں تو ندامت محسوس کرنے لگے اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہوجائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور اگر دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو ازراہِ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد ہوجاؤں اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں۔''

ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ دو سال بعد والے فیصلے کا ابھی اسی وقت اعلان کردے لیکن وہ منیزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب وہ یہ سوچتا کہ اس کی منیزہ کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف اس کا باپ اور بہنوئی دونوں ہی خیالوں میں اس کو منع کررہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے اس کو روک رہے تھے کہ خبردار جو تو نے منیزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا عامر کی بدنصیبی کا آغاز ہوجائے گا۔

تیسری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر کر۔ ممکن ہے اس عرصے میں خود منیزہ کو اپنی بے جا ضد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کرکے دوبارہ رجوع ہوجائے۔

منیزہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون کو متامل دیکھ کر پُرامید ہوگئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان ہارون سے جو کچھ سننا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پاچکا تھا۔ ہارون کی کچھ دیر کی خاموشی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ بے چینی سے بولی۔

''ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے فیصلے سے فوراً

ہی آگاہ کردے۔"

ہارون نے محبت بھری نظروں سے منیزہ کو دیکھا اور مسکرادیا گو کہ اس کی مسکراہٹ میں یاس اور ناکامی کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو منیزہ محسوس نہ کرسکی۔ ہارون نے پُرسکون اور باوقار لہجے میں کہا۔ "منیزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوجانا پڑے تو میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا......"

منیزہ نے اس کی بات کاٹ دی، بے اختیار بولی۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے اور اب میں اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں۔ میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں دو سال کے لیے تجھ سے جدا ہوا جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اس امید میں گزار دے کہ شاید مجھ میں تبدیلی آگئی ہو اور میں اس ہجر کو یوں برداشت کرلوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہوجائے اور میرے پاس چلی آئے۔"

منیزہ نے آنکھیں بند کرلیں اور بستر پر گر گئی، بولی۔ "تب پھر تو یہاں سے اسی وقت چلا جا اور دو سال بعد مجھ سے ملاقات کر لیکن میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا کہ میں اولاد سے کم پر کوئی سمجھوتا کرلوں گی تو یہ تیری بھول ہوگی۔"

ہارون ایک دم کھڑا ہوگیا، بولا۔ "اچھا منیزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں عامر کو اپنے ساتھ لیے جارہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم کرلوں گا۔"

منیزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رختِ سفر باندھ لے گا، بولی۔ "لیکن اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ جب یہ فیصلہ بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں۔"

منیزہ نے ہونٹ بھینچ لیے، بولی۔ "تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔"

ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور منیزہ کے باپ کے انداز سے سمجھ لیا کہ ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پوچھا کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟

اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا۔ "آؤ بیٹے، دمشق چلیں اپنے دادا کے پاس۔"

عامر نے معصومیت سے پوچھا۔ "اور میری نئی ماں...... کیا وہ نہیں چلیں گی؟"

ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبالیا، بولا۔ "ہاں بیٹے! منیزہ نہیں آئے گی۔ وہ یہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی یہیں رہے اور ہماری پھر کبھی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔"

منیزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا۔ "ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "بہرحال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ منیزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہرحال یہ جو کچھ ہوا، اس میں ہاتھ تیرا ہی کارفرما ہے۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اگر یہ شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف اور انتشار میں میرا ہاتھ کام کررہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میری طرف سے منیزہ اور تجھ کو ایک پیشکش ہے۔"

ہارون نے پوچھا۔ "کون سی پیشکش ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "تیرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو عامر کو میرے حوالے کردے۔ میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا۔ اس طرح تو منیزہ کی خواہش بھی پوری کرسکے گا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "اس سے یہ سہارا ملے گا کہ تو عامر کی طرف سے بے نیاز ہوکر منیزہ کو خوش رکھ سکے گا۔"

ہارون کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کردے اور خود منیزہ کے پاس چلا جائے اور ہنس کر یہ خوش خبری سنادے کہ وہ منیزہ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے لیکن پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس وقت منیزہ کمرے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ منیزہ کا باپ اور ہارون کا بہنوئی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو منیزہ بستر پر دوبارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

ہارون دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتادی۔ باپ ساری روداد توجہ سے سنتا رہا، آخر میں پوچھا۔ "پھر اب کیا ہوگا؟ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بابا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

باپ نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا، عامر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

ہارون نے کہا۔ "میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہورہا ہوں۔"

باپ نے کہا۔ "تو نے منیزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر قائم رہوں گا اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کرلے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بابا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں، میں اس فیصلے کو نہیں مانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس وقتی ہنگامی اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔"

باپ نے کہا۔ "تب پھر تو منیزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کرلے۔"

ہارون ہنس دیا۔ "میں اور دوسری شادی کیوں کرلوں؟ اس کا فائدہ؟"

باپ نے جواب دیا۔ "اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت اچھی طرح ہوجائے گی۔"

ہارون نے کہا۔ "اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے گی تو اس وقت میں کیا کروں گا؟"

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ "عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی یا عورت سے تیری اولاد نہ ہو۔"

ہارون نے کہا۔ "افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر کس کے پاس رہے گا؟ اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟" باپ کا دماغ بھی کام نہیں کررہا تھا۔

ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ منیزہ کو طلاق پر آمادہ کرلے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے پاس چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے میں باپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چپے چپے میں گھومتا پھرتا رہا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ سال باہر گزار سکا۔ اس کے بعد وہ سیدھا حمص پہنچا اور منیزہ کے سامنے وہ مال وزر ڈھیر کردیا جو اس نے مختلف جنگوں میں انعام و اکرام اور مالِ غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ منیزہ اس کا انتظار تو کررہی تھی لیکن اتنی... بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون کو ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب منیزہ کے سامنے مال وزر کا ڈھیر لگ گیا تو اس کے باپ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے بیٹی کو حکم دیا۔

"ہارون تھکا ہوا ہوگا اس کے لیے غسل اور آرام کا انتظام کردے۔"

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا۔ "عامر تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا۔"

عامر نے جھجکتے ہوئے نہایت تکلف سے منیزہ کو سلام کیا۔ منیزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "تو ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہوں ماں۔" ہارون نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا۔

"منیزہ، میرا بہنوئی کہاں چلا گیا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اس نے دوسری شادی کرلی۔"

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ "منیزہ! تو نے بہت بڑی خوش خبری سنائی ورنہ میں اس کی طرف سے بہت فکرمند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوئیں ان میں میرے بہنوئی کا بڑا ہاتھ تھا۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

ہارون نے پوچھا۔ "وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "یہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔"

ہارون نے کہا۔ "خوب...... تو اس نے ابھی پیچھا نہیں چھوڑا؟"

منیزہ نے پوچھا۔ "تو دمشق گیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا۔ سیدھا تیرے پاس آیا ہوں۔ اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو

دمشق لے کر چلا جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کرلوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔"

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ "منیزہ کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہوجائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھ کو اب ضد نہیں کرنی چاہیے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "یہ تو بار بار بہنوئی کا ذکر بیچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو نہیں جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"

منیزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹل گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ ہارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو کہیں اندر رکھ دیجیے۔"

منیزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فرطِ جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ "ہارون تو...... کب آیا......؟" اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ "اور عامر تو کیسا ہے؟"

عامر نے بھی بجھی بجھی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "اچھا ہوں۔"

منیزہ اٹھ کر جانے لگی، ہارون نے پوچھا۔ "کہاں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی آتی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔"

ہارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ "تم نے شادی کرلی؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور تجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟"

ہارون نے کہا۔ "یہ اچھا کیا۔"

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ "ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ تلوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔"

ہارون نے کھسیا کر جواب دیا۔ "ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہے میں ضرور مبتلا ہوگیا تھا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو منیزہ کی موجودگی میں شاید نہ کرسکوں۔"

ہارون نے کہا۔ "ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔"

بہنوئی نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ تو منیزہ کی دی ہوئی مدت سے پہلے ہی آگیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بھائی، میں منیزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے ناانصافی بھی نہیں برداشت کرسکتا اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

بہنوئی نے کہا۔ "تو منیزہ کی خواہش پوری کردے کیونکہ میں نے اس دوران ہر طرح ٹٹول کر یہ اندازہ لگالیا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے، اس سے دستبردار نہیں ہوسکتی۔"

ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔ "بھائی، اگر میں منیزہ کی خواہش پوری کردوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظرانداز نہیں کردے گی؟"

بہنوئی نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ "اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے یہ مشورہ کبھی نہ دیتا کہ تو منیزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے اور منیزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہورہی ہے۔ اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں بہلایا جاسکتا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کردے۔ رہ گیا عامر تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے۔ میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں محسوس ہونے دوں گا۔"

ہارون نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ "بھائی، پہلے مجھے غور کرلینے دو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی کی نئی بیوی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے منیزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی رہیں اور ہارون انہیں اڑاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دل جوئی شروع کردی اور اس کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ عامر بھی اپنے پھوپا میں خلوص اور محبت محسوس کررہا تھا۔ اس نے منیزہ کو اپنی طرف سے کھنچا کھنچا محسوس کیا تو پھر منیزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔

منیزہ نے چوتھے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔ "ہارون! میں مستقل بے چینی محسوس کررہی ہوں۔ تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون بہت خوش تھا۔ مسکراتا ہوا منیزہ کے سامنے کھڑا ہوگیا، بولا۔ "میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ تجھ کو اپنے ساتھ لے کر دمشق چلا جاؤں گا اور خراسان واپس جانے کے منصوبے کو ذہن سے نکال دوں گا۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں دمشق اس وقت

تک نہیں جاؤں گی جب تک میں اولاد والی نہ ہوجاؤں۔"

ہارون نے کہا۔ "اگر میں تیری خواہش پوری کردوں تو تو یہ بتا کہ عامر کا کیا بنے گا، وہ کہاں رہے گا؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے بچے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی۔ میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے اور ہمیشہ ہی سمجھتی رہوں گی۔ تجھ کو اس کی طرف سے فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔"

ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ جب میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر تیرے ہی پاس رہے گا اور یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کرلوں گا۔"

یہ خبر منیزہ کے باپ کو بھی مل گئی، اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر و منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ منیزہ کے قہقہے اور شوخیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ منیزہ کا باپ ہارون کی نازبرداریوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا بہنوئی بھی بے حد خوش تھا۔ ہاں، اگر ان سب میں کوئی رنجیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ منیزہ ہارون کو دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے کبھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کی کو محسوس کررہا تھا لیکن خود ہارون اس سے بےخبر تھا۔ ہارون کا بہنوئی بھی عامر کے خلا کو محسوس کررہا تھا۔ وہ کبھی کبھی دبے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ "بیٹے عامر! تیرا باپ تجھ سے چھن گیا لیکن تو ذرا بھی فکر نہ کر میں جو موجود ہوں۔"

عامر کہتا۔ "لیکن پھوپا جان، میری نئی ماں منیزہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ یہ اب اس کو کیا ہوگیا ہے؟"

پھوپا جواب دیتا۔ "ہاں، پہلے وہ تجھی سے پیار کرتی تھی مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کررہی ہے۔ اپنے بچے کے لیے جو ہنوز عدم میں ہے مگر آنے کے لیے بازو ہلا رہا ہے۔"

پھوپا کی سمجھ میں عامر کی باتیں تو آرہی تھیں مگر پھوپا کی باتیں عامر کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھیں۔

☆☆☆

کئی ماہ حمص میں رہنے کے بعد ہارون اور منیزہ نے دمشق جانے کا منصوبہ بنایا۔ اب منیزہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی وہ یہ کہ اس کا باپ منیزہ کو دوبارہ دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔ اس نے کئی راتیں اس فکر اور تشویش میں گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو منیزہ نے ہارون کو مشورہ دیا۔ "ہارون! میں کئی دن سے تجھ کو ملول اور فکرمند محسوس کررہی ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "منیزہ! اب میں تجھ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو امید سے دیکھے گا تو مجھ پر بہت برہم ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس کے جواز میں کیا کہوں گا۔"

منیزہ کا منہ لٹک گیا، بولی۔ "تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

ہارون نے کہا۔ "میرے باپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یہ ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔ سردست تو یہی سوچتا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔"

منیزہ نے برا سا منہ بنایا۔ "مجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا تو نہ ہو۔ مجھ کو اس کی پروا بھی نہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں دمشق میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گی۔"

ہارون نے تسلی دی۔ "بہرحال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھالوں گا اور ایک ڈر یہ بھی ہے کہ میرا باپ کہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو فوراً ہی یہ شبہ گزرے گا کہ اب عامر پر پوری توجہ نہیں دی جارہی ہوگی۔ میں اپنے باپ کے دل سے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو اپنے پاس ہی روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کردے۔ انہی فکروں نے مجھے ہلکان اور پریشان کررکھا ہے۔"

منیزہ نے چٹکی بجائی۔ "اس کا حل ہے میرے پاس۔ اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو حمص میں رکھا جائے۔ تیرا بہنوئی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

ہارون نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو منیزہ کی یہ تجویز بہت اچھی لگی، بولا۔ "لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔"

"کون سی خرابی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر

عامر حمص میں رہا تو اس کے ننھے سے دل پر یہ اثر ہوگا کہ ہم دونوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور یہیں سے اس میں احساسِ محرومی پیدا ہو جائے گا۔“

منیزہ نے کہا۔ ”اتنی گہرائیوں میں مت جا ہارون۔ میرا یہ کہنا مان لے۔ عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس ہی چھوڑ جا۔ میرا خیال ہے تیرا بہنوئی عامر کو اتنا خوش رکھے گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بہرحال اس پر خوب اچھی طرح غور کر کے ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔“

منیزہ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے یہ کب کہا تھا کہ جو بھی کرنا ہے فوراً کر ڈالو۔“

ہارون نے عامر کو لے جانے یا نہ لے جانے پر خاصا غور و فکر سے کام لیا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ عامر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، نقصان ہی نقصان ہے۔ اس نے خاموشی سے منیزہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، بولا۔ ”منیزہ! اب میں تیرے ہی فیصلے پر عمل کروں گا۔ ہم دونوں دمشق چلیں گے۔ عامر یہیں بہنوئی کے پاس ہی رہے گا۔ اس طرح میرے باپ کو ورغلانے پھسلانے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ عامر کو روک نہیں سکے گا۔“

منیزہ کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا، بولی۔ ”میں ہمیشہ تجھے وہی مشورہ دوں گی جس سے تجھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میں تیری شریکِ حیات ہوں، میں ہمیشہ وہی چاہوں گی جو خود اپنے لیے پسند کروں گی۔ اس لیے تجھ کو مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔“

ہارون نے منیزہ کو آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔ ”افسوس کہ میں نے تجھے سمجھنے میں بڑی غلطیاں کی ہیں لیکن اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔“

منیزہ نے ہارون کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو دونوں آنکھیں بند کر لیں، بولی۔ ”ہارون! کوئی انسان بھی غلطی نہ کرے اگر دوسرے ورغلا کر غلطیاں کرنے پر مجبور نہ کریں۔ تو معصوم اور پاکباز انسان ہے جب کہ دوسرے چالاک اور عیار تھے۔ ان چالاکوں نے تجھے ورغلا کر گمراہ کر دیا تھا اس لیے مجھ کو تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لوگوں سے شکایت ہے جو دوسروں کے معاملات میں خوامخواہ دخل دے کر انہیں تباہی اور بربادی کے کنارے پر پہنچا دیتے ہیں۔ افسوس کہ تیرا باپ بھی انہی میں سے ایک ہے۔“

ہارون شرما رہا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور شرما کر آنکھیں بند کر لیں۔

عامر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور منیزہ اسے چھوڑ کر دمشق چلے جائیں گے۔ پھوپا نے بڑی تسلیاں دیں لیکن عامر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہارون بھی عامر کی کمی محسوس کر رہا تھا مگر منیزہ نے تسلی دی اور سمجھایا کہ عامر کو کبھی کبھی تنہا چھوڑ کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا موقع دو۔ ہارون کو غم کے ساتھ ہی یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا باپ.... اس کی اس حرکت پر خوب خوب لعن طعن کرے گا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک اس کی بھوک پیاس اڑی رہی لیکن اس کا پھوپا برابر دل جوئی کرتا رہا۔ عامر بار بار ٹھنڈی سانس بھر کر پوچھتا۔ ”یہ بابا جان مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے؟“

پھوپا نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا۔ ”بیٹے عامر! اب تو میرا بیٹا ہے، اپنے باپ کو زیادہ نہ یاد کر۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا۔ تیرا باپ ایک اور عامر کی فکر میں ہے۔“

ایک اور عامر کی فکر کا مطلب عامر کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس سلسلے میں اس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔ وہ زیادہ تر باتیں اپنے آپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کسی سے سوال کیے بغیر ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا۔

ہارون اور منیزہ کو عامر کے بغیر دیکھ کر ہارون کے باپ کو حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی اور ساتھ ہی ایک لایعنی انجانا خوف بھی محسوس ہوا لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ عامر خیریت سے ہے اور حمص میں اپنے پھوپا کے ساتھ رہ رہا ہے تو ہارون کا باپ سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے ہارون کو مال و زر اور سامان کے بغیر دیکھا تو زیادہ پریشان ہو گیا، پوچھا۔ ”کیا اس بار تو خالی ہاتھ آیا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں باباجان! میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا، کچھ سامان لایا تھا اسے حمص میں چھوڑ آیا۔“

”حمص میں چھوڑ آیا کیا مطلب؟ حمص میں کس کے پاس چھوڑ آیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”حمص میں منیزہ کے گھر کیونکہ میں خراسان سے سیدھا حمص گیا تھا۔“

باپ نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن حمص میں تیرا اپنا گھر تو نہیں ہے۔ یہ کیسی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں میں تجھ میں؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں باباجان، میں نے ڈیڑھ سال تک اپنے مسائل پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں غلطی پر ہوں۔ مجھ کو اپنے مسائل کا حل خود ہی سوچنا







چاہیے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔"
باپ نے بوکھلا کر پوچھا۔ "یعنی...... یعنی کیا مطلب؟"

ہارون نے منیزہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر مسکراہٹ موجود تھی پھر باپ سے کہا۔ "مطلب یہ کہ میں منیزہ کو ناخوش نہیں رکھ سکتا۔ وہ جن کی عمریں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کو صحیح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں منیزہ کو اولاد سے محروم نہیں رکھ سکتا۔"

باپ نے ہارون کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور کسی قدر بے پروائی سے جواب دیا۔ "اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔"

ہارون نے کہا۔ "میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا بلکہ فیصلوں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔"

باپ نے ان دونوں میں دلچسپی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب ہارون اور منیزہ کا بیشتر وقت ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ ان کی محبتیں ایک دم جوان ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی طنابیں کھل گئی تھیں اور انہیں پہلی بار محبت اور آزادی کے نشے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق میں رہے پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ ہارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمے داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں۔ ہارون جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش وخرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تنہا رہ رہا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور چہل پہل سے بھرپور دنوں کو یاد کرتا رہتا جب اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی، عامر، ہارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے، انہی میں منیزہ بھی یاد آ جاتی لیکن منیزہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا۔ منیزہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے سے بدلہ لے لیا۔

ایک سال بعد منیزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے وزن پر قاہر رکھنا چاہتا تھا لیکن منیزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ منیزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔

ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تنہائی دور ہو جائے لیکن عامر کو اس کے پھوپھا نے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

ہارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا لیکن اب اسے موصل کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جزیرہ اور اس کے مضافات میں بھیج دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور حمص کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بیوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور منیزہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا مگر دونوں کسی طرح عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جا سکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں یہی لکھتا رہتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجودگی میں منیزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی اتنا ہی خیال رکھے جتنا وہ ابراہیم کا رکھتی ہوگی۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا، وہی عامر کے لیے بھیجتا لیکن منیزہ اسے بھی رکھ لیتی اور عامر کو اس کی ہوا تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی سوچنے لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے محروم رکھا گیا۔ اس کا یہ اندازِ فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا تھا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ ہارون، ابراہیم کا تنہا ذکر کبھی نہیں کرتا، اس کے ساتھ عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اب حمص میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عامر جب تک حمص میں رہے گا، ہارون اس کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ ہارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور ہارون کے بہنوئی کو ترک سکونت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی منیزہ کے حسد کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ منیزہ، عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور عامر پر نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ منیزہ کو جلا جلا کر ایک قسم کی لذت حاصل کر رہا تھا۔

ایک دن جب وہ حمص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے سے پہلے اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹلی سنبھالے منیزہ کے باپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔ منیزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص کو عزت و احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کروایا۔

"میں ہارون کا بہنوئی ہوں۔ اگر ہارون کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔"

اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوٹلی اس کے حوالے کر دی۔ "یہ ہارون نے بھجوائی ہے، اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی۔ اس کے علاوہ کپڑے بھی ہیں۔"

اس نے پوٹلی لے لی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں منیزہ کو لکھا گیا تھا۔

"صبح کی شفق کی طرح گلنار اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے والی تنویر کی طرح حسین منیزہ! میں عنقریب واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی خارجی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ دو دن پہلے میں ایک خارجی کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ رات کو خارجیوں نے ہم پر شب خون مار دیا۔ ان کے اچانک اور خوف ناک حملے نے ہمیں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ خارجی ہمیں بے دردی سے قتل کرتے رہے۔ ہمارے خیموں کی طنابیں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے چھوٹتے دیکھے۔ زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی۔ جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، خارجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ہنگامۂ دار و گیر میں معلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مردوں کی طرح لیٹ گیا۔ خارجیوں نے مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ عجلت اور جوش میں میرے پاس سے گزرتے رہے لیکن مجھ پر شبہ نہیں کیا۔ ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور کچلتا ہوا نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پروا کیے بغیر مردے کی طرح پڑا رہا۔ میں نے اپنے آس پاس جلتے ہوئے زخمیوں کی لپٹیں محسوس کیں مگر اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے خارجی جا چکے ہیں اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بچتا بچاتا چھپتا چھپاتا موصل پہنچا اور خارجیوں کے خوف ناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔

"منیزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نواز دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے بزورِ قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

"منیزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جری لوگ ہیں جن کے چند افراد سیکڑوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔

"مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند ریشمی ٹکڑے بھیج رہا ہوں ان میں دو نیلے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سلیپر روانہ کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سلیپر کیسی لگی؟

"منیزہ! میں تجھ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو عامر کا خاص خیال رکھ۔ ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ تیرا بیٹا ہے اور اس کے لیے کچھ لکھوں یا نہ لکھوں تو اس کا خیال بہرحال رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے۔ میرے بہنوئی نے اس کی ذمے داریاں قبول کر کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس ... بےنیازی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گود بھر دی۔ اب تو بھی میری خواہش پوری کر اور عامر پر وہی نوازشیں برسا دے جو کبھی دمشق میں برسایا کرتی تھی۔

"میرے خوابوں اور خیالوں کی پراسرار ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق میں میرا باپ بیماری جھیل رہا ہے؟ افسوس کہ اس وقت میں اس کے پاس نہیں لیکن حمص آتے ہی میں تجھے لے کر دمشق چلا جاؤں گا۔ اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے بیمار باپ کی خبر گیری کر سکے تو ضرور کر۔ میں تیرا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔"

ہارون کے بہنوئی نے اس شخص کو رخصت کر دیا پھر خط اور سامان کی پوٹلی منیزہ کو پہنچا دی۔ اس نے منیزہ پر یہ نہیں

ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا خط پڑھ لیا ہے۔ منیزہ خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ بہنوئی نے پوچھا۔

"کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "ہاں، ہارون بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے بچ گیا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "اور کچھ؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اور یہ کہ ہارون کا باپ دمشق میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو عامر کو ساتھ لے کر فوراً دمشق چلا جا کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خواہش ہے۔"

وہ منیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ "اور کچھ؟"

منیزہ نے جل کر جواب دیا۔ "اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ بڑی دیر تک منیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید ریشمی پارچے عامر کے حوالے کردیے جائیں لیکن منیزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عامر بھی یہ خبر سن کر وہیں آکر بیٹھ گیا تھا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے لیکن منیزہ نے اس کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کردیا اور کن انکھیوں تک سے دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اس نے عامر کو جلانے کے لیے ابراہیم کو گود میں اٹھالیا اور اس کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ "ابراہیم! تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بھینچ بھینچ کر تیرے باپ کی طرف سے پیار کروں۔"

بہنوئی نے عامر کی طرف دیکھا جو کھویا کھویا، گم صم یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ بہنوئی نے پوچھا۔

"کیا ہارون نے عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا؟"

منیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور عامر کے پھوپا کو جواب دیا۔ "نہیں، عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عامر کا کیا مقابلہ۔ عامر بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہے۔ چنانچہ میرا شیر خوار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے، عامر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "منیزہ! تیرا اندازِ فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر میں چھوٹے بڑے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہارون عامر سے بھی بڑی محبت کرتا ہے اور اس نے اپنے خط میں عامر کی بابت کچھ نہیں لکھا تو حیرت ہے۔"

منیزہ نے برا مان کر کہا۔ "میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے سے نہیں کہہ پارہی ہوں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دلوں میں کدورت پیدا ہوجائے تو منافقت سے بچنا چاہیے۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو نے اور تیرے باپ نے مجھ کو یہاں روک رکھا ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو غلط سوچ رہا ہے۔ اب تجھ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک عرصے سے شبہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی اس لیے میں نے عامر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عامر میرے ساتھ ہے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "عامر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی۔ تو یہاں سے چلا جا۔"

بہنوئی نے عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اس کو تو اپنے پاس رکھے گی؟ عامر کو تو رکھے گی؟ خوب۔ کیا تجھ کو عامر کا کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں اور میں خود بھی عامر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہوجائے گا۔ ہارون کے آنے کی دیر ہے پھر میں عامر کو جبراً اپنے پاس رکھ لوں گی۔"

بہنوئی نے اکڑ کر کہا۔ "ہاں، صرف اس صورت میں کہ خود عامر بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہوجائے۔"

منیزہ نے تن کر کہا۔ "میں عامر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔"

بہنوئی ہنس دیا، بولا۔ "بے شک، بے شک مجھ کو یقین ہے جو عورت عامر کی سلیپریں غائب کردے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ واقعی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔"

منیزہ دنگ رہ گئی، کٹ سی گئی گرم ہوکر بولی۔ "بداخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اسی لیے سلیپر پارچوں کو دبا کر بیٹھ گئی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو میرے خطوط پڑھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آج اس کا انکشاف ہوگیا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اب فضول باتیں نہ کر جب تیری

چوری پکڑی گئی تو تو اس قسم کی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔"

منیزہ نے عامر سے پوچھا۔ "عامر! سچ سچ بتا تو کس کے پاس رہنا گوارا کرے گا؟ میرے پاس یا اپنے پھوپا کے پاس؟"

عامر نے کسی پس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ "پھوپا کے پاس۔"

منیزہ نے غصے میں جھنجلا کر پوچھا۔ "یعنی میرے پاس نہیں؟"

عامر نے جواب دیا۔ "ہاں، آپ کے پاس نہیں۔"

منیزہ غصے میں کھڑی ہوگئی، بولی۔ "کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی جواب تک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی۔"

عامر نے جواب دیا۔ "آپ نے کبھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا شروع کردیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساسِ محرومی پیدا کردیا ہے۔"

پھوپا کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھائے جارہی تھی اگر عامر نہ ہوتا تو ہارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ منیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ہارون کا بہنوئی اور عامر دونوں اپنے گھر چلے آئے۔

☆☆☆

بہنوئی نے از خود یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ عامر کے ساتھ دمشق چلا جائے گا اور وہاں ہارون کے والد کی تیمارداری میں مشغول ہوجائے گا۔ اس کے اس منصوبے سے ہر شخص لاعلم ہی رہتا لیکن بہنوئی زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے اس نے ہر ایک کو روک کر بتانا شروع کردیا۔ اس نے عامر کو دادا کی بیماری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند دنوں کے لیے دمشق چلا جانا ہے تاکہ تیرے بیمار دادا کی شاندار تیمارداری کی جاسکے۔ اس نے چپکے چپکے عامر کو منیزہ کی وہ ساری باتیں بتادیں جو اس نے ہارون کے خط میں پڑھی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا۔

"عامر! تجھ کو منیزہ اور اس کے پاس موجود مال و زر سے بالکل مایوس ہوجانا چاہیے کیونکہ اس حریص عورت کے پاس سے کچھ نکلوانا بڑا مشکل کام ہے۔"

لیکن عامر اپنے باپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ اس نے پوچھا۔ "پھوپا جان! یہ خارجی کون ہیں؟"

پھوپا نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ یکایک تجھ کو خارجیوں کا کیا خیال آگیا؟"

عامر نے جواب دیا۔ "مجھ کو ان کا یوں خیال آگیا کہ انہوں نے میرے باپ کو مارتے مارتے چھوڑ دیا اور میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی تعریف کی ہے۔"

پھوپا معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اچھل سا پڑا، بولا۔ "بیٹے عامر خارجیوں کی بات بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایمان دار اور بہادر لوگ ہیں۔ اس روئے زمین پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔"

عامر نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا یہ لوگ اچھے ہوتے ہیں؟ آپ تو ان کی تعریفیں کررہے ہیں۔"

پھوپا نے جواب دیا۔ "ہاں، میں ان کی تعریف کررہا ہوں اور اس لیے کررہا ہوں کہ وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ تیرے باپ نے بھی اپنے خط میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔"

عامر نے پوچھا۔ "اگر وہ اتنے ہی اچھے ہیں تو حکومت ان سے جنگ کیوں کرتی ہے؟ میرا باپ ان کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھاتا ہے؟"

پھوپا نے جواب دیا۔ "ان میں کچھ برائیاں بھی ہیں، بس ان برائیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔"

عامر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ "برائیاں کہاں نہیں ہوتیں، کس میں نہیں ہیں پھر جنگ سب سے کیوں نہیں لڑی جاتی؟"

پھوپا نے فاتحانہ شان سے کہا۔ "تو ان باتوں پر مت غور کر دمشق چلنے کی تیاری کر۔ ہم دونوں دمشق چل کر تیرے دادا کی تیمارداری کرتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو منیزہ پہنچ جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر قبضہ جمالے گی۔"

لیکن عامر کو مال و زر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بولا۔ "میں دمشق کے لیے چل تو سکتا ہوں کہ وہاں میرا دادا بیمار ہے، اس کی تیمارداری کرلوں گا لیکن مال و زر کی ہوس لے کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

پھوپا نے کہا۔ "کسی طرح چل تو سہی۔ مال و زر کی ہوس نہ کر مگر اس مال و زر کو غلط شخص کے پاس بھی مت جانے دے۔"

پھوپا نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لیا۔ جب یہ تینوں بالکل تیار ہوگئے تو اس نے منیزہ کو مطلع کردیا، بولا۔ "منیزہ! تو خوش ہوجا۔ تیری مرضی پوری کیے دے رہا ہوں۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "میری مرضی؟ کون سی مرضی پوری کررہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "منیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

کہ اب یہاں نہ رہوں، میں دمشق جا رہا ہوں......"

منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "اور عامر...... یہ عامر کہاں رہے گا؟ کس کے پاس رہے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "افسوس کہ عامر تیرے پاس نہیں رہنا چاہتا، وہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "تم دونوں نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تم لوگ چلو، چند دنوں بعد میں بھی پہنچ رہی ہوں۔"

چنانچہ دو دن بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو منیزہ سے جدائی کا ذرا بھی ملال نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے۔ فضا ابر آلود تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پر کیف ہوائیں جسم میں سرور کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ یہ پریشان حال پردیسی کسی مقصد سے دمشق آئے ہیں۔ یہ تینوں پُر پیچ راستوں کو عبور کرتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔

یہ تینوں اندر داخل ہوئے تو قریب المرگ بوڑھے کے آس پاس چند پڑوسیوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ "تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں اس بوڑھے کا داماد ہوں۔" پھر عامر کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ لڑکا اس بوڑھے کا پوتا ہے۔"

پڑوسی ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ عامر اپنے دادا پر جھک گیا اور بڑی محبت سے کہا۔ "دادا جان! میں عامر آ گیا۔ اب آپ کیسے ہیں؟"

دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا، شاید پہچان نہ سکا۔

عامر نے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی ان کے سینے اور چہرے پر جھک گیا اور بولا۔ "دادا جان! مجھے آپ نے بلایا تھا۔ میں عامر آپ کا پوتا ہوں۔"

دادا نے بمشکل کہا۔ "ہارون...... کیا تو ہارون ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ہارون نہیں، میں ہارون کا بیٹا عامر ہوں۔"

دادا کی جاتی ہوئی سانس واپس آ گئی۔ ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کی طرف دیکھا اور بہنوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو تو ہے ہارون...... تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟"

عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"دادا جان! یہ پھوپا جان ہیں۔ میرا باپ اور آپ کا بیٹا ہارون آنے ہی والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

دادا کو رونا آ گیا۔ "مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر! میرے سینے سے لگ جا تاکہ میں برسوں کے تنہا اور اداس دل کو سکون پہنچا لوں۔ سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، تنہا چھوڑ دیا۔"

عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے بوجھ نے دادا کی سانس میں فتور پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔ عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس کے پاؤں دابنے لگا۔

دادا کو کسی لمحے ہوش آ جاتا لیکن یہ ہوش بھی مدہوشی سے کم نہیں تھا۔ مال و زر کا اس دنیا میں جو مقام ہے بوڑھا شخص مدہوشی میں بھی اس کی قدر و قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔ دادا کی سانسیں کئی بار اکھڑ اکھڑ کر واپس آئیں اور ہر بار یہی شبہ گزرا کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوں گے لیکن بڑے میاں نے تو باتوں تک سے توانائی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کوشش میں مشغول تھے کہ ان کی ناسازیِ طبع کا خاص اثر نہ لیا جائے لیکن وہ عنقریب ادھر ادھر ہو جانے والے تھے۔

☆☆☆

شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر سے بگڑ گئی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

عامر نے کہا۔ "دادا جان! ہوش میں آئیے، پریشان مت ہوئیے۔"

لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔ انہوں نے نہ تو کسی کی باتیں سنیں اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔ عامر اور اس کا پھوپا بوڑھے کے پاس بیٹھے اس کے انجام کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدہوشی میں بار بار ہارون کا نام لے رہا تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا۔

"ہارون! تو نے عامر پر ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے۔"

عامر کے دل پر آرے چل رہے تھے۔ دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورا اور مرحوم بیٹی کو آوازیں دیتے ہوئے ڈوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز دی۔ "دادا جان! ہوش میں آئیے۔"

انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکنے والی نظروں سے عامر کو دیکھ کر پوچھا۔ "تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "دادا جان! میں ہوں عامر آپ کا پوتا۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجیے۔"

لیکن دادا نہیں پہچان سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے نزع کے عالم میں کہا۔ "میرے پاس جو کچھ ہے عامر کا ہے۔ عامر کو بلاؤ تاکہ میں یہ سب اس کے حوالے کر دوں۔"

داماد نے سسر کو آواز دی۔ "جناب! یہ عامر آپ کے پاس ہی موجود ہے۔ پہچانیے تو۔"

لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا کے پائینتی پاؤں پر جھک گیا، انہیں کئی بوسے دیے اور اپنے پھوپا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی کی تیاریاں کرنے لگا لیکن تدفین سے پہلے ہی ہارون اور منیزہ بھی پہنچ گئے۔ ہارون باپ کی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیزہ نے سکھ کا سانس لیا کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ چکا تھا۔

تمام رسوم سے فارغ ہونے کے بعد ہارون نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق میں نہیں رہے گا اور سامان اور مال و زر کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہمیشہ کے لیے حمص چلا جائے گا لیکن بہنوئی نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔

"ہارون! یہ مکان نہیں بکے گا اور گھر میں جو کچھ بھی ہے تیرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق عامر کا ہے۔"

ہارون اپنے بہنوئی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیزہ بھی اس کے پاس ہی کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ہارون نے پوچھا۔ "میرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی عامر کا ہے، اس کا مطلب؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میں نے مرنے سے چند لمحے پہلے خود سنا ہے کہ مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی ہر شے عامر کی ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "جب تک ہم میں ہارون موجود ہے ہارون کے مرحوم باپ کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابراہیم بھی تو مرحوم کا پوتا ہے۔"

لیکن ہارون نے منیزہ کو سمجھایا۔ "منیزہ! تجھ کو نہیں الجھنا چاہیے میں خود بات کر لوں گا۔"

بہنوئی نے ہارون کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ "ہارون! تو اس معاملے میں خاموشی اختیار کر۔ جیسا میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح رہنے دے کیونکہ آئندہ اختلافات کی خلیج وسیع تو ہو جائے گی مگر پٹے گی نہیں، اس لیے عامر کو جو کچھ مل رہا ہے، اس کے پاس ہی رہنے دے۔"

لیکن ہارون نے اس کی بات نہیں مانی۔ "بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ عامر میرا بیٹا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمام چیزیں میرے قبضے میں رہیں گی اور عامر کو ان پر یوں ہی تصرف حاصل رہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔"

بہنوئی نے افسوس ناک لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا تو عامر کو ان چیزوں اور مکان سے محروم کر دے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں مکان بیچ دوں گا اور سارا مال و زر لے کر حمص چلا جاؤں گا۔ عامر اگر تیرے پاس رہا تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔"

بہنوئی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں نفرتیں جمع ہو رہی تھیں۔ ماں کے خلاف، باپ کے خلاف اور دنیا کے خلاف۔

چند دنوں بعد مکان بھی بک گیا اور سارا سامان سمیٹ کر ہارون حمص روانہ ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا پھوپا بھی تھا۔ منیزہ بہت خوش تھی۔ اب اس کی جیت ہی جیت تھی۔ حمص میں داخل ہوتے ہی منیزہ نے ہارون کو سمجھایا۔

"ہارون! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ یہ مختصر سا کنبہ خوش و خرم اور نہال رہے تو تو اپنے بہنوئی کو یہاں سے چلتا کر دے۔"

ہارون نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

منیزہ نے پوچھا۔ "تیری بہن مر چکی ہے۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اب تیرا اس شخص سے رشتہ ہی کہاں رہا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "منیزہ! بات اور حالات کو سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا بہنوئی تھا اور ہمیشہ، جب تک زندہ ہے میرا بہنوئی ہی رہے گا۔ اس نے میرے عامر کو بڑی محبت سے رکھا ہے۔"

منیزہ نے کہا۔ "تو اس کو یہاں سے چلتا کر دے۔ عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی کیونکہ لوگ باتیں بناتے ہیں اور اب میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "لیکن میں بہنوئی سے اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ یہیں میرے پاس ہی رہے گا اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا۔"

منیزہ لاجواب ہو کر خاموش ہو گئی لیکن اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مایوس نہیں ہوئی۔

☆☆☆

ہارون حمص میں کئی بار آیا اور گیا لیکن ابھی تک اس

نے حمص کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تو تفریحات کی سوجھی۔ وہ منیزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے نکلا تو عامر کا خیال آ گیا۔ منیزہ سے کہا۔

’’منیزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟‘‘

لیکن منیزہ نے مخالفت کی، بولی۔ ’’عامر اب بچہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کہاں جائے گا۔ ابراہیم تو بچہ ہے۔ گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔‘‘

ہارون چپ ہو گیا لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آ گیا اور پوچھا۔ ’’تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟‘‘

منیزہ نے جواب دیا۔ ’’میں ہارون کو حمص کی خاص خاص چیزیں دکھانا چاہتی ہوں۔‘‘

بہنوئی نے کہا۔ ’’منیزہ! میں تجھ سے کوئی بات نہیں کروں گا، ہاں ہارون سے البتہ یہ کہنا ہے کہ اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا۔‘‘

عامر بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہارون نے عامر کو دیکھنا چاہا لیکن بہنوئی کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکا، بولا۔ ’’مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، عامر بھی چلے میرے ساتھ۔‘‘

لیکن منیزہ نے غصے سے کہا۔ ’’تب پھر میں رکی جاتی ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم گھوم پھر آؤ، بعد میں، میں چلی جاؤں گی۔‘‘

ہارون کو بھی غصہ آ گیا، بولا۔ ’’یہ کیا بات ہوئی منیزہ؟ کیا تو عامر سے حسد کرتی ہے؟‘‘

منیزہ نے جواب دیا۔ ’’نہیں، میں حسد نہیں کرتی لیکن اگر لوگوں نے چاہا تو حسد بھی کرنے لگوں گی۔‘‘

لیکن بہنوئی نے بگڑ کر کہا۔ ’’ہارون! تو نے منیزہ کو بڑے اختیار دے دیے ہیں۔ میں اس عورت کے منہ پر کہتا ہوں کہ یہ عامر سے جلتی ہے، حسد کرتی ہے۔ میں خدا کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان دونوں کے معاملے میں فریق نہ بن ورنہ پچھتائے گا۔‘‘

ہارون نے منیزہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ’’تو تیرا کیا خیال ہے منیزہ، عامر کو ساتھ کیوں نہ لے لیا جائے؟‘‘

منیزہ نے جواب دیا۔ ’’میں نہیں جاؤں گی۔ تو عامر کو شوق سے لے جا۔‘‘

ہارون نے منیزہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ’’منیزہ! تو بھی ساتھ چل ضد نہ کر، آخر عامر بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔‘‘

منیزہ نے جل کر جواب دیا۔ ’’میں یہ کب کہتی ہوں کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ عامر ہی تیرا بیٹا ہے۔‘‘ ہارون بے بسی محسوس کرنے لگا۔

بہنوئی نے پلٹ کر عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ’’میرے بچے! تو صبر کر انہیں جانے دے۔ تجھے پھر کسی دن گھما پھرا لاؤں گا۔‘‘

ہارون نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ’’ہاں، اس دن میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا تو فکر نہ کر پھر کسی دن سہی۔‘‘ اس کے بعد ہارون، منیزہ اور ابراہیم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

ہارون منیزہ کی گرہ میں تھا۔

بہنوئی عامر کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہو جانے کے بعد بہنوئی نے عامر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ رو رہا تھا۔ پوچھنے پر عامر نے جواب دیا۔ ’’پھوپا جان! اس عورت نے مجھ سے میرے بابا جان کو چھین لیا ہے۔‘‘

پھوپا نے جواب دیا۔ ’’تو فکر نہ کر عامر، میں اس عورت سے تیرے بابا کو چھین لوں گا۔‘‘

منیزہ، ہارون کو خوب خوب گھماتی پھراتی رہی۔ اس نے شہر کے وسط میں یوحنا کے کلیسا کی سیر کروائی۔ اس کا نصف حصہ مسجد تھا اور نصف کلیسا۔ مسجد کے دروازے پر ایک پتلا کھڑا تھا۔ ایک بلند و بالا ستون پر کسی آدمی کی مورتی چوٹی کے سفید پتھر پر بنی ہوئی تھی۔ مورتی کے قدموں میں بچھو کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر منیزہ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’ہارون! اس بت کے قدموں سے مٹی اٹھا کر اس کے جسم پر مل دے کیونکہ اس سے تو ہمیشہ کے لیے بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جائے گا۔‘‘

ہارون نے جواب دیا۔ ’’ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ یہ مورتی نہیں ایک طلسم ہے اور اس کے قدموں میں مٹی ڈالنے والا ہمیشہ بچھو کے زہر سے محفوظ رہتا ہے۔‘‘

ہارون اور منیزہ نے ایک ساتھ مورتی کے قدموں کی خاک اٹھا کر مورتی کے قدموں پر ڈال دی۔ اس کے بعد منیزہ نے ننھے ابراہیم کی مٹھی زبردستی کھول کر اس پر تھوڑی سی خاک رکھ دی اور ہارون نے یہ خاک مورتی کے پاؤں پر ڈال دی۔ اب وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ہارون کو اس موقع پر عامر یاد آ گیا، بولا۔ ’’افسوس کہ عامر ہمارے ساتھ نہیں ورنہ وہ بھی مورتی کے قدموں میں خاک ڈال کر بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جاتا۔‘‘

منیزہ نے تلخی سے کہا۔ ’’ہارون! تو ہر جگہ عامر کا نام مت لیا کر۔ عامر کو اس کا پھوپا بڑے ناز و نعم سے پال رہا

ہے۔ اب اس پر تو نے بھی توجہ دی تو وہ بے جا لاڈ پیار میں بگڑ جائے گا۔‘‘

ابھی منیزہ کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ہارون کا بہنوئی عامر کو لے کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ہارون نے جوشِ مسرت سے کہا۔ ’’واہ تو آ گیا عامر! اس وقت تو میں جو بھی دعا مانگتا پوری ہوتی۔ میں تجھ کو یاد ہی کر رہا تھا۔‘‘

منیزہ کو ہارون کے بہنوئی پر بڑا غصہ آیا، بولی۔ ’’تو بہت شری انسان نظر آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت لے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔‘‘

بہنوئی نے جواب دیا۔ ’’میں کسی اور وقت کیوں لاتا، تم دونوں نے اس کو بہکا دیا تھا لیکن میں اس کا آزردہ اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ کیا تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟‘‘

منیزہ نے جواب دیا۔ ’’نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو ہارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے۔ میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً بھوکا نہیں۔ اس کے پھوپا نے اس کو وہ آرام پہنچایا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکر ہی نہیں رہی۔‘‘

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’ابراہیم کو ذرا بڑا ہو لینے دو، اگر اس کو بھی اپنے قابو میں نہ کیا تو میرا نام نہیں۔‘‘

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی ہوئی مٹی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ہارون نے ازراہِ مذاق کہا۔ ’’بھائی، تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔‘‘

بہنوئی نے جواب دیا۔ ’’ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟‘‘

ہارون نے حیرت سے پوچھا۔ ’’کیا ابھی کچھ اور بھی دیکھنا باقی ہے؟‘‘

بہنوئی نے جواب دیا۔ ’’ہاں، میں اس کو اس لائق کردوں گا کہ یہ تلوار سونت کر تیرے مقابلے میں آ جائے گا۔‘‘

ہارون نے ہنس کر کہا۔ ’’تو گویا تو اس کو گستاخ کردے گا۔‘‘ پھر عامر سے پوچھا۔ ’’کیوں بیٹے! کیا تو تلوار سونت کر میرے مقابلے پر آ سکتا ہے؟‘‘

عامر نے شرما کر جواب دیا۔ ’’نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔‘‘

لیکن منیزہ نے دبی آواز میں کہا۔ ’’نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں ہر بات ممکن ہے۔‘‘

عامر منیزہ کی باتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ بولا کچھ بھی نہیں مگر منیزہ کے خلاف نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

عامر جس ماحول میں جوان ہو رہا تھا، اس کا ہر فرد خود غرض اور چالاک تھا۔ ہاں پھوپا نے محبتیں دی تھیں۔ اس کی بیوی بھی اچھی طرح پیش آتی رہی لیکن وہ ان دونوں کی محبتوں کو بھی شک و شبہے سے دیکھتا تھا کیونکہ جب تک منیزہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا، وہ بھی عامر کو اسی طرح چاہتی تھی لیکن جب ابراہیم پیدا ہو گیا تو منیزہ کی محبت میں کمی آ گئی اور آہستہ آہستہ محبت کی جگہ حسد اور رقابت نے لے لی۔ اب اس کو کسی پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اپنے باپ پر بھی نہیں کیونکہ باپ کے تغافل اور بے نیازی نے اس کو بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ بظاہر ہارون کی محبت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن جب بھی کوئی ایسا موقع آیا جہاں ایک طرف منیزہ ہوتی اور دوسری طرف عامر تو عموماً فیصلہ وہی ہوتا جو منیزہ چاہتی، اس کا باپ منیزہ کی طرف جھک جاتا۔ اس طرح دنیا کے تمام رشتے اپنا اعتبار کھو چکے تھے۔ زمانے کے دستور کے مطابق عامر نے فنِ سپاہ گری بڑی محنت سے حاصل کیا دوسری طرف ابراہیم بھی ہتھیاروں کے استعمال کا فن حاصل کرتا رہا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ ابراہیم اپنے بڑے بھائی عامر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کا حق پسند دل عامر کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر کڑھتا رہتا۔ ہارون اس سے بہت خوش ہوتا اور تنہائی میں ابراہیم کو یہی سمجھاتا رہتا۔ ’’ابراہیم! تیرے بڑے بھائی عامر پر بڑے ظلم ہوئے ہیں لیکن تو اپنے بڑے بھائی کا خاص خیال رکھ اور زندگی بھر اس کا ادب کرتا رہ۔‘‘

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن باپ کی باتوں کو گرہ میں باندھ لیا۔

ہارون اور بہنوئی دونوں ہی اپنی اپنی زندگی کے انحطاطی دور میں داخل ہو چکے تھے۔ ہارون اپنے بہنوئی کا بہت شکر گزار تھا لیکن بہنوئی کا دل صاف نہیں تھا۔ اس کا وہ زخم ابھی تک ہرا تھا کہ عین اس وقت جب وہ دولھا بنا بیٹھا تھا اور منیزہ اس کی دلہن بن جانے والی تھی، ہارون نے بروقت حاضر ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ وہ ہارون سے اکثر ہنسی ہنسی میں کہہ دیا کرتا کہ ’’ہارون! تو نے مجھے جس طرح ذلیل و خوار کیا ہے، میں اسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔‘‘

ہارون ہنس کر کہہ دیا کرتا۔ ’’بھائی جو کچھ ہو گیا، ہو گیا۔

اب اس کا بار بار ذکر ہی کیوں؟ میں معافی چاہتا ہوں۔"

لیکن بہنوئی بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا بہنوئی اس کا اتنا شاکی ہے کہ برسوں پرانی بات کا زخم یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ لگا ہو اور دوسری طرف محبت اور التفات کا یہ عالم کہ عامر کو اپنے بیٹے کی طرح پال ڈالا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ اس کی نظر میں دونوں ہی محترم تھے۔ باپ بھی اور پھوپا بھی چنانچہ جب عامر کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کرے تو دونوں ہی سے مشورہ لینا پڑا۔ پہلے اس نے اپنے باپ ہارون سے مشورہ لیا، پوچھا۔ "باوا جان! اب میں عملی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیجیے کہاں سے اور کس طرح شروع کروں؟"

باپ نے جواب دیا۔ "بیٹے! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ کام کے ساتھ ساتھ مال بھی کمائے تو بہترین موقع ہے میں تجھے فوج میں ملازمت دلا دوں گا۔ آج کل خوارج نے بڑے ہنگامے کر رکھے ہیں۔ اگر تو خوارج سے جہاد کرے گا تو دینوی فائدوں کے ساتھ ہی اخروی ثواب بھی کمائے گا۔"

لیکن عامر اپنے باپ کی رائے سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ وہ خارجیوں کی دین داری اور شجاعت کی بڑی داستانیں سن چکا تھا اور اس کا پھوپا اکثر و بیشتر خارجیوں کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

باپ سے مشورہ لینے کے بعد وہ پھوپا کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی مشورہ لیا، پوچھا۔ "پھوپا جان! میں عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کروں؟ باوا جان کہتے ہیں کہ میں خوارج سے جنگ کر کے دین اور دنیا کے فائدے ایک ساتھ حاصل کروں، آپ کی کیا رائے ہے؟"

پھوپا نے جواب دیا۔ "عامر! مجھے تیرے باپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ خوارج دین دار لوگ ہیں۔ اگر تجھ کو دنیا اور آخرت کی بھلائی واقعی مقصود ہے تو تو خوارج کا ساتھ دے۔ وہ دنیا میں حق قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیاں آخرت کے عوض بیچ دی ہیں۔ چنانچہ اتنی عمر گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خوارج حق پر ہیں اور ہر سچے اور ایمان دار آدمی کو خوارج ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔"

پھوپا کا مشورہ کام کر گیا اور اس نے خوارج سے رابطہ قائم کر لیا۔ عزیزوں رشتے داروں کا مارا ہوا اور زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا عامر جب خوارج میں پہنچا اور ان کی شاندار باتیں سنیں تو وہ انہی کا ہو گیا۔ اس نے اپنی شمولیت کو دوسروں سے چھپائے رکھا لیکن پھوپا کو اس کا علم تھا۔ اس نے عامر کو مبارک باد دی کہ اس نے دین اور دنیا کی بھلائی اور سرخ روئی کی منزل پالی ہے اور اب اس کو گمراہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہارون چاہتا تھا کہ عامر فوج میں داخل ہونے سے پہلے شادی کر لے لیکن منیزہ اس کی مخالف تھی۔ وہ بار بار زور دے کر یہی کہتی کہ عامر خود کمائے اس کے بعد شادی کرے۔ لیکن ہارون کہتا۔ "جب تک میں موجود ہوں اس کی ساری ذمے داریاں میرے سر ہیں۔ اس لیے عامر کمائے یا نہ کمائے، میں اس کی شادی ضرور کروں گا۔"

منیزہ نے جھنجلا کر رائے دی۔ "اگر یہ بات ہے تو ابراہیم بھی جوان ہو چکا ہے، اس کی بھی شادی ہو جانا چاہیے۔"

ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ہاں، اس کی شادی بھی ہو گی لیکن عامر کی شادی کے بعد۔"

دونوں میں اس موضوع پر بڑی دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ آخر ہارون کا بہنوئی بھی اس بحث میں شامل ہو گیا اور اس نے کھلم کھلا عامر کی طرف داری کی لیکن منیزہ کا بوڑھا باپ اپنے نواسے ابراہیم کی طرف تھا۔

ہارون نے اپنے بہنوئی کو سمجھایا۔ "بھائی! تم نے عامر کو پالا پوسا ہے اس لیے یہ ذمے داری بھی میں تمہارے ہی سر ڈالتا ہوں کہ عامر کے لیے اچھی سی دلہن تلاش کرو۔"

دوسری طرف منیزہ نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے کوئی حسین سی لڑکی تلاش کرے۔ دونوں ہی حسین لڑکی کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔

آخر دو ماہ کی جدوجہد کے بعد ہارون کے بہنوئی نے ایک لڑکی تلاش کر لی اور ہارون کو مطلع کیا کہ اگر تجھ کو یہ لڑکی پسند ہو تو میں بات کروں۔

ہارون نے منیزہ سے کہا۔ "منیزہ! میرے بہنوئی نے عامر کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ اس کو دیکھ کر تائید کر دے کہ میں بات آگے بڑھاؤں۔"

منیزہ نے برا سا منہ بنایا اور جواب دیا۔ "ہارون! تو میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کیا کر۔ عامر کی دلہن کو میں کیوں دیکھوں؟ یہ تیرا کام ہے۔"

ہارون نے غصے میں کہا۔ "او شری عورت! تو میرے بیٹے عامر سے اتنا جلتی ہے۔ افسوس کہ میں نے اس پر پہلے کبھی اتنا زیادہ غور نہیں کیا تھا۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "صرف میں ہی نہیں جلتی، عامر بھی مجھ سے جلتا ہے۔ جیسے کو تیسا۔ آخر میں اس کا جواب کس طرح دوں؟"

ہارون نے سختی سے کہا۔ "منیزہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا لیکن اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دلہن کو دیکھ کر دیانت داری سے بتا کہ یہ عامر کے لیے کیسی رہے گی۔"

منیزہ نے بھی بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے تو بھاگ دوڑ کر سکتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟"

ہارون نے ایک بار پھر حکما کہا۔ "منیزہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں اگر تو نے میرا یہ حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

منیزہ کے باپ نے مداخلت کی، منیزہ کو سمجھایا۔ "منیزہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم ماننا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔"

منیزہ بے بس ہو گئی اور بادلِ ناخواستہ ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچ گئی۔

لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور لگتی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کے سائے میں بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں ابرو جیسے تلوار، قد بالا، متناسب جسم پر سپیدہ شہابی رنگ۔ سرتاپا کیف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نشہ ہو جائے۔ باتوں میں سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی کھنک۔ منیزہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر والوں نے ان سب کی بڑی تواضع کی۔

منیزہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ "محترم خاتون! کیا تم نے عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سونپ دینا چاہتی ہو؟"

لڑکی کی ماں نے جواب دیا۔ "نہیں، میں نے لڑکا تو ابھی تک نہیں دیکھا لیکن بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا ہی ہو گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "افسوس کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہا مانو تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو بڑے سکون سے رہے گی۔"

لڑکی والوں نے بھی معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

لڑکی کی ماں نے پوچھا۔ "کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "عامر بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی ضامن بھی نہیں ہو سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور دور رہا ہے۔"

رابعہ کی ماں نے پوچھا۔ "اگر ایسی بات تھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو دیکھنے کیوں آئی تھیں؟"

منیزہ نے جواب دیا۔ "میں لڑکی دیکھنے نہیں، لڑکی کے گھر والوں کو سب کچھ بتانے آگئی تھی۔"

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ اعلان کیا کہ "رابعہ کو ابراہیم کے لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے ہرگز منسوب نہیں کریں گے جو اپنے باپ سے دور پھوپا کے گھر پلا بڑھا ہو۔ وہ یقیناً گستاخ اور سرپھرا لڑکا ہو گا۔"

اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چونکا دیا۔ بہنوئی نے حیرت سے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی، یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بھائی، میں سب کچھ سمجھ گیا۔"

وہ سب نڈھال اور افسردہ جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھوپا منہ سجائے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ منیزہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عامر ہکا بکا معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی زبان سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون، منیزہ سے برہم تھا۔ وہ بھی منیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنا لباس بدل رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی، بولی۔ "ہارون! خیریت تو ہے؟"

ہارون نے پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "منیزہ! یہ کیا ہو گیا؟"

منیزہ نے پوچھا۔ "کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تو کیا جاننا چاہتا ہے؟"

ہارون نے کہا۔ "ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے گئے تھے۔"

منیزہ نے جواب دیا۔ "بے شک لیکن وہ لوگ عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے۔"

ہارون نے افسوس سے کہا۔ "وہ خود عامر کے بجائے ابراہیم کو نہیں پسند کرنے لگے بلکہ تو نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

منیزہ نے ناگن کی طرح مڑ کر جواب دیا۔ "انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عامر کی ضامن بن رہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بچہ میرے پاس نہ رہا ہو، جسے میں نے نہ پالا پوسا ہو اور جو اپنے ماں باپ سے دور پھوپا کے

پاس رہا ہو، میں اس کی ضامن کس طرح بن سکتی ہوں۔''

ہارون نے تلملا کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ ''تو نے غلط بیانی کی ہے۔ عامر ہم سے دور کبھی نہیں رہا۔ اس کا پھوپا بھی ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عامر کی ضامن نہ بن، میں تو ضامن بن سکتا ہوں۔''

منیزہ نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن اب تو میں ابراہیم کی بات کر بھی آئی۔ عامر کی عمر زیادہ ہے جبکہ ابراہیم اس کے لیے بالکل موزوں ہے۔''

ہارون نے سختی سے کہا۔ ''لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ رشتہ عامر ہی سے ہوگا ورنہ ابراہیم سے بھی نہیں۔''

منیزہ نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''ہارون! میں نے کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں کی لیکن جب میں نے ابراہیم کے لیے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گا۔''

ہارون چیخ پڑا۔ ''میں ایک عرصے سے تیری زیادتیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو نے عامر پر جو ظلم کیے، میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان زیادتیوں سے باز آجا۔ ابراہیم اور عامر میں نفرتوں کی خلیج نہ پیدا کر کیونکہ ہم دونوں کے بعد انہیں مل جل کر زندگیاں گزارنی ہیں۔ اگر ان میں نفرتیں پیدا ہو گئیں تو یہ زندگی بھر آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔''

منیزہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، بولی۔ ''ہارون! تو میری عادت سے واقف ہے۔ میں نے ایک بار جو فیصلہ کرلیا، کرلیا۔ میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ پہلے جب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے لوگوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر پورا کیا پھر جب تم نے لوگوں کی سازش کے ذریعے مجھے بے اولاد رکھنا چاہا اور میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل کر کے رہی اور اب میں نے یہ قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہی ہوگی تو یہ شادی ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گی۔''

ہارون نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ گزشتہ تلخیوں کو بھلا دیا جائے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔''

منیزہ نے جواب دیا۔ ''تو اس کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ رابعہ سے ابراہیم کی شادی کردی جائے۔''

ہارون نے خوب اچھی طرح محسوس کرلیا کہ منیزہ کسی طرح بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی تو اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل شروع کیا۔ ابراہیم کو گھر سے دور انگور کی بیلوں کے سائے میں لے گیا اور پوچھا۔ ''ابراہیم! یہ بتا عامر تجھے کیسا لگتا ہے؟''

ابراہیم نے جواب دیا۔ ''بھائی عامر بہت اچھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

ہارون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ''بیٹے! میں تیری ماں کی مخالفت نہیں کر رہا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دانستگی یا نادانستگی میں تیری ماں نے عامر پر ظلم کیے ہیں، زیادتی کی ہے۔''

ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے تاثرات پائے جاتے تھے، بولا۔ ''لیکن وہ میری ماں ہے، میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔''

ہارون نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس شادی سے انکار کردے۔''

ابراہیم نے سر جھکائے ہی جھکائے جواب دیا۔ ''میں نے شادی پر آمادگی ہی کب ظاہر کی تھی، مجھے بھائی عامر سے ہمدردی ہے۔''

ہارون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگالیا۔ ''جزاک اللہ میرے بچے۔ تو کتنا نیک اور صالح ہے۔''

عامر کا پھوپا منیزہ کی حرکت سے اتنا بدظن اور دل برداشتہ تھا کہ منیزہ کے خلاف کسی خطرناک سازش کا منصوبہ تیار کرنے کی فکر میں تھا۔ اس عورت کے خلاف کوئی ایسا شاندار مگر خطرناک منصوبہ بنایا جائے کہ منیزہ کو بس مزہ ہی آجائے۔ اس نے کئی راتیں یوں بے چینی میں گزار دیں کہ منیزہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عامر بھی کچھ کم فکرمند نہیں تھا۔ وہ بھی ... معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر سے کافی کافی دیر تک غائب رہنے لگا اور آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ ہارون اور اس کا بہنوئی دونوں ہی عامر کی ان حرکتوں سے پریشان تھے۔ عامر کے چہرے پر سرکشی کے آثار دیکھ کر دونوں ہی خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایک دن علی الصباح عامر باہر جانے لگا تو اس کے پھوپا نے اس کو روک لیا، پوچھا۔ ''تو کہاں جا رہا ہے؟''

عامر نے جواب دیا۔ ''میں شام تک واپس آجاؤں گا۔''

پھوپا نے کہا۔ ''آج تو کہیں نہ جا کیونکہ میں منیزہ اور تیری چپقلش میں مستقبل کے ہنگامے دیکھ رہا ہوں۔ اس خاموش ماحول کی مثال اس راکھ جیسی ہے جس کے اندر چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل

جانے کو تیار ہوں۔''

عامر نے جواب دیا۔ ''پھوپا جان! میں خود کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔''

پھوپا نے رائے دی۔ ''میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے باپ کو مال و زر کی تقسیم پر آمادہ کرلوں کیونکہ میں نے منیزہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی عدم موجودگی میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کردے گی۔''

عامر نے جواب دیا۔ ''میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا ہوں اس لیے میرے باپ کا مال و زر اس کو مبارک، مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔''

پھوپا بگڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''یعنی اب تو میری بات بھی نہیں مانے گا۔ مال و زر مصیبت نہیں کارآمد ہے۔ میں تجھ کو یوں منفی اندازِ فکر پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔''

لیکن عامر نہیں رکا اور چلا گیا۔ اس کا پھوپا سارا دن ہارون سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی عامر کا حصہ الگ کردے لیکن ہارون اس پر یوں تیار نہیں ہوتا تھا کہ وہ پہلے عامر کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کو الگ کر کے خود اس کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔

لیکن پھوپا نے اصرار کیا۔ ''نہیں، پہلے تقسیم بعد میں شادی اور آخر میں اس کے ساتھ رہائش۔''

کسی طرح منیزہ کو بھی اس بحث و مباحثے کا علم ہو گیا۔ اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا، بولی۔ ''جب تک میں موجود ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ مال و زر نہیں تقسیم ہوگا۔ عامر شادی کرے گا تو وہ ساتھ رہے گا یا الگ، میں اپنے پاس سے اسے کچھ بھی نہ دوں گی کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔''

لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''ماں جس مال و زر کی طمع میں آپ میرا سہارا لے کر بھائی کو ان کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں، میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔''

منیزہ نے ڈانٹ دیا۔ ''تو چپ رہ نادان لڑکے، تیری بہتری کو جتنا بہتر میں سوچ سکتی ہوں کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال و زر کو بڑی کوشش اور محنت سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر میں خاک اڑ رہی ہوتی اور کسی کو بھی حق اور ... حصے کی باتوں کا موقع نہ ملتا۔''

ہارون نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا۔ ''بھائی! تم عامر سے کہہ دو کہ میں اس کا حصہ ابھی سے دے دینا چاہتا ہوں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو گرا دوں گا۔'' پھر منیزہ سے کہا۔ ''اور منیزہ! تو بھی اچھی طرح میری بات ذہن نشین کرلے کہ اگر تو نے اس معاملے میں میری مخالفت کی تو میں پھر بھی وہی کروں گا جس کا میں نے فیصلہ کرلیا ہے اور تیری ضد کے پیشِ نظر یہ بھی ممکن ہے کہ میں تجھ سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کرلوں۔''

منیزہ نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ''ہارون! میں اپنے مال و زر کے حصے بخرے ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ اگر تو اس بہانے سے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کیونکہ یہ میری انا کی بات ہے اور میں اپنی اور اپنے بیٹے ابراہیم کی نظر میں حقیر ہو جانا کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کروں گی۔''

لیکن ہارون اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اپنے بہنوئی سے کہا۔ ''بھائی! عامر کو بلاؤ تاکہ یہ قضیہ ابھی اور اسی وقت چکا دیا جائے۔''

بہنوئی نے جواب دیا۔ ''عامر گھر پر موجود نہیں ہے۔ امید ہے کہ شام تک واپس آجائے گا، تبھی یہ قضیہ بھی چکا دیا جائے گا۔''

منیزہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کا ہاتھ پکڑا اور وہاں

ٹوپٹ

ایک انگریز اور ایک دیہاتی کا نہر کے کنارے آمنا سامنا ہو گیا تو انگریز نے انگریزی میں دیہاتی سے کسی دوست کا ایڈریس پوچھا۔ دیہاتی بولا۔ ''میتوں تیری گل دی سمجھ نئیں او آئی خورے توکی پیا کہنا ایں؟''

انگریز کو بھی دیہاتی کی پنجابی گفتگو کی سمجھ نہیں آئی تو انگریز بولا۔ ''واٹ؟''

دیہاتی بولا۔ ''اچھا...... اچھا میں تیری گل سمجھ گیا واں تو ایس نہر دی وٹ (کنارا) پھڑ تے سدھا لنگھا جا۔ فر اللہ خیر کری۔'' انگریز دیہاتی کی زبان سے نکلے لفظوں سے مزید الجھن میں پڑ گیا اور بولا ''ٹوپٹ۔''

دیہاتی یہ سن کر غصے میں آگیا اور سوچنے لگا۔ ''پاغل (پاگل) جیہا نہ ہووے تے۔'' ایویں ای کن کھادی جاندا اے۔ فوراً بولا۔ ''میں کیوں پٹاں اپنے وڈکیاں نوں...... توپٹ۔''

مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور

سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ”مجھ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ہارون کو ورغلایا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں ہر ایک سے نمٹ لوں گی۔“

ہارون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کردی اور دونوں ہی عامر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

شام ہوگئی مگر عامر نہیں آیا۔ رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر نصف رات ہوگئی۔ پھوپا کم مگر ہارون زیادہ فکرمند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہارون تلملایا تلملایا ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ وہ عامر کی تلاش میں اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ منیزہ بہت خوش تھی کہ ایک کانٹا جو اس کے دل میں مستقلاً چبھ رہا تھا اب دور ہوچکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بہت خوش ہورہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی ہفتے، مہینا، دو مہینے پھر چھ ماہ گزر گئے مگر عامر کا کہیں پتا نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے نڈھال اور پژمردہ کردیا۔ پھوپا بھی پریشان تھا مگر نسبتاً کم۔ اب ہارون غم کو ہوگیا تھا۔ باپ کے غم کو دیکھ کر ابراہیم، عامر کی تلاش میں نکل گیا۔ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ابراہیم کی گمشدگی نے منیزہ کو بھی ہلا ڈالا۔

اب یہ گھر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ منیزہ کا باپ بھی خوف زدہ اور فکرمند رہنے لگا تھا۔ منیزہ کو شبہ تھا کہ اس کا بیٹا ابراہیم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سازش کا بانی مبانی ہارون کا بہنوئی تھا۔ منیزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی کو کچا چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مردہ کردیا۔ اب اس کا کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ منیزہ بھی اکثر و بیشتر روتی ہی رہتی۔ ہارون کا بہنوئی بھی اداس رہنے لگا تھا۔ منیزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور منیزہ گاہے بگاہے آپس میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا۔

”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ تیری خودغرضی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔“

منیزہ کہتی۔ ”ہارون! مجھے موردِ الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔ اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں دفعان ہوجاؤں گی۔“

اور یہ تو تو میں میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہوجاتی۔

ہارون نے اکتا کر بدرجہ مجبوری اپنے سابقہ پیشے سے رجوع کیا اور کوفہ روانہ کیا۔ ان دنوں کوفہ اور بصرہ میں خلافت کی نیابت حجاج بن یوسف کو مل چکی تھی اور وہ خوارج کے خلاف مہمات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کو سپاہیوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے فوج میں داخل کرلیا گیا۔

حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس نے خراسان میں وہاں کے عامل امیہ کا ساتھ چھوڑ کر باغی بکیر کی حمایت کی تھی تو غضب ناک ہوگیا، بولا۔ ”اگر اس بار۔۔۔ بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی مختلف انسان ہوں۔ اگر ان دنوں خراسان میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو تو آج نظر نہ آتا۔ تیری خاک کا بھی پتا نہ ہوتا کیونکہ میں غدار کو معاف نہیں کرتا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی۔ اگر میں غدار ہوتا تو میرا حشر بھی غداروں کے ساتھ ہوچکا ہوتا لیکن میں وفادار انسان ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی گردن تک کٹوا دوں گا۔“

حجاج نے کہا۔ ”تب پھر جیش میں شامل ہوجا جو دشمنانِ خدا سے مصروف پیکار ہے۔ اگر تیری جیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو انعام واکرام سے نواز دوں گا۔“

ہارون نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”امیر! میں لالچی نہیں ہوں۔ اس لیے میں اپنی خدمات کا صلہ انعام واکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ حمص سے چل کر یہاں آیا ہوں، چاہتا ہوں کہ جب میں انعام واکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوفے میں رہنے کی جگہ دے دی جائے۔“

حجاج نے پوچھا۔ ”تجھ کو حمص میں کیا تکلیف ہے جو تو کوفے میں منتقل ہوجانا چاہتا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ اس لیے میں اس گھر میں روحانی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔“

حجاج نے کہا۔ ”تو فکر نہ کر، خوارج کے فتنے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتظام کوفے میں ہی کردوں گا۔“

ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ حمص واپس نہیں جائے گا۔ اس کو منیزہ سے نفرت ہوگئی تھی کیونکہ وہ پورے المیے کا منیزہ ہی کو ذمے دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے اس میں مایوسی اور قنوطیت پیدا کردی تھی۔ اس نے خدا سے لو لگالی تھی اور ہر وقت یہی دعا مانگتا رہتا تھا۔ ”خدایا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب اور

کامران کردے، یا پھر شہادت سے ہمکنار کردے۔“

ہارون کو مشہور خارجی سردار شبیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شبیب نے اموی افواج کو شکستوں پر شکستیں دے کر تہلکہ مچا دیا تھا۔ حجاج ان شکستوں کی وجہ سے فکرمند ہوگیا تھا اور دن رات شبیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔ حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شبیب اپنی فوج کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ حجاج فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔ شبیب فرات کے دوسرے کنارے سنجہ نامی قصبے میں پڑاؤ ڈال کر انتظار کرنے لگا۔ ہارون کا دستہ شبیب کے مقابل حجاج کے حکم کا منتظر ڈٹا ہوا تھا۔

حجاج نے محل کی چھت سے میدانِ جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے اس پار سنجہ میں مسجد کے سامنے شبیب کی فوج کو پڑاؤ ڈالے دیکھا۔ شبیب کے پاس فوج زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب حجاج نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دستے کو فرات کے اس پار اتروا دیا اور سختی سے تاکید کردی کہ وہ شبیب سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈٹا رہے جب تک وہ خود ان کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

محل کی چھت سے اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد حجاج نیچے اترا اور اپنے دو غلاموں کو زرق برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سپاہ کو لے کر فرات کے پار اتر گیا۔ حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج سنجہ کی مسجد تک پہنچنے کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر خارجیوں کی اس مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ شبیب اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

شبیب نے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔ حجاج نے زرق برق لباس پہنے۔۔۔۔ ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا۔ ”اے شخص! اگر تو شبیب کو ہلاک یا زخمی کردے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ آگے بڑھ اور شبیب کو قتل کرکے آجا۔“

غلام نہایت شان اور آن بان سے آگے بڑھا اور شبیب کو للکارا۔ شبیب نے غلام کو حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کردیا۔ غلام اور شبیب میں ذرا دیر مقابلہ ہوا اور چند لمحوں بعد شبیب نے غلام کو قتل کردیا۔ وہ جوش وخروش سے گھوڑا دوڑاتا ہوا حجاج کی فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا۔

”اے مجھ سے نبرد آزما لوگو! اگر یہ حجاج تھا جو زرق برق لباس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اسے قتل کردیا اور تم سب اس کے خوف اور عذاب سے نجات پاچکے ہو۔“

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا۔ ”اب تو جا اور شبیب کے داؤ پیچ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کو ہلاک کردے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہوگیا تو میں تجھے آزاد بھی کردوں گا اور کسی بلند منصب پر فائز بھی کردوں گا۔“

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا۔ شبیب نے ایک دوسرے شاندار شخص کو جھومتے ہوئے آتے جو دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو قتل ہوا بلکہ حجاج یہ ہے جو اب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ پچھلے جوش وخروش سے اس کی طرف بڑھا اور پے در پے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا۔ اس نے بھی بڑی ہوشیاری اور مہارت سے شبیب کا مقابلہ کیا۔ شبیب نے کہا۔

”افسوس کہ میں نے تجھ سے پہلے جس شخص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ تو نہیں کوئی اور ہی تھا۔ لیکن خیر، اب تو مقابلے پر آیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔“

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہ حجاج ہے، بولا۔ ”شبیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی شخص سمجھتا ہے؟ یاد رکھ کہ میں حجاج ہوں اور تیری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی گئی ہے۔“

شبیب نے کہا۔ ”افسوس کہ تو انسان ہوکر خدائی کا دعوے دار ہے۔ ورنہ تو یہ فضول بات کبھی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔“

غلام نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اس میں کیا ہے، ابھی پتا چلا جاتا ہے کس کی موت کس کے ہاتھ لکھی گئی ہے۔“

حجاج ان کی باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”مجھے میری کرسی سمیت آگے بڑھاؤ۔ یہاں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہوجاؤں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہوگی۔“ اس کی کرسی ذرا آگے بڑھا دی گئی۔

حجاج کا غلام طہمان اور شبیب کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر شبیب نے اس کا بھی کام تمام کردیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہوکر جیسے ہی گرا، شبیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کردیا۔“

لیکن شبیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یا امیر المومنین!

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حجاج تو وہ رہا جو کرسی پر حمکنت سے بیٹھا ہے۔"

شبیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا۔ "خیر اگر حجاج ابھی زندہ ہے تو شاید اپنے انجام کو پہنچنے کے لیے اور اللہ نے چاہا تو اس دشمنِ فلاح و خیر سے میں ہی نجات دلاؤں گا۔"

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ "اے اطاعت شعار اور فرماں بردارو! تم ثابت قدم رہو اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے اور فتح کے درمیان کوئی شے حائل نہیں رہے گی۔"

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شبیب نے ان پر بھرپور وار کیا۔ شبیب اپنے چھ سو آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی موجودگی نے اس کی سپاہ کے حوصلے بلند کردیے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیرہ کررہے تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں و نیزے اور تیر انسانوں کو ہلاک اور زخمی کررہے تھے۔ شبیب اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملادی تھی اور وہ خارجیوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی پسپا ہورہے تھے، حجاج کی کرسی سنجر کی مسجد کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو جوش دلایا۔

"اے اللہ کے دوستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا۔ نیچے آجاؤ اور حجاج کی سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔"

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ "امیر! میں اس خارجی سردار کو موت کے گھاٹ اتار کر امر ہوجانا چاہتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "پھر انتظار کس بات کا ہے، آگے بڑھ اور آپ شجاعت سے اس شعلۂ جوار کو سرد کردے۔"

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن وہ جیسے ہی خارجیوں کے قریب پہنچا، خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے گھوڑے کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگ کے کٹ جانے سے منہ کے بل گر گیا۔ ہارون گھوڑے کے سامنے ذرا فاصلے پر اس طرح جاگرا گویا اس کو اٹھا کر پھینک دیا گیا ہو۔ ہارون کے ہاتھ سے تلوار بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساس باقی رہا کہ خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کرسکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پروا کیے بغیر فوراً اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور حکماً کہا۔ "بھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا رہ ورنہ ہلاک کردیا جائے گا۔"

اس شناسا آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کردی اور اس نے بےاختیار اس نوجوان کی طرف دیکھا اور خوشی میں چلایا۔ "ارے، عامر یہ تو ہے...... مگر تو یہاں کہاں؟"

عامر کی تلوار کی نوک اب بھی ہارون کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی جلدی کہا۔ "افسوس کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کرسکتا کیونکہ تو غلطی سے عبدالملک بن مروان کو مسلمانوں کا امیرالمومنین سمجھتا ہے اور میں شبیب کو اپنا امام سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہوگئے اور ہارون پوری طرح ان کے قابو میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! افسوس کہ بدقسمت اسیر میرا باپ ہے اس لیے میں اس کو ہلاک نہیں کرسکتا۔ گرفتار کرکے امیرالمومنین شبیب کے حوالے کردوں گا وہ جو سزا تجویز کریں گے، وہ دے دی جائے گی۔"

لیکن انہی میں سے ایک اور آشنا نوجوان ہارون کے سامنے آکھڑا ہوا۔ یہ ابراہیم، عامر کی سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ "ابراہیم تو بھی، واللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

عامر نے پھر جواب دیا۔ "ہاں، اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی دنیا، آخرت کے لیے فروخت کردی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا احترام بھی نکل گیا۔"

حجاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں گھر گیا ہے، فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔"

شامی سپاہ کا ایک دستہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور آناً فاناً ہارون سمیت کئی خارجیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچ گئے اور خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب پانسا پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی تلوار کی نوک سینے سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کمندیں پھینک پھینک کر انہیں گرفتار کرلیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کو رسیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بےچین ہوگیا۔

شبیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دستے پر یلغار کردی لیکن اتنی دیر میں حجاج شامیوں کو طاقت ور کمک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور اس میں شبیب کا بھائی مصاد قتل کردیا گیا۔ خوارج نے خود کو مجتمع کرکے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توقع میں بدترین لمحوں سے منہ موڑلو۔ شاید آنے والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔"

خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کرسی کو آگے بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ شبیب اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کرسی سے اتر پڑا۔ وہ مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ "اے اطاعت شعارو! اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو ہمیں حاصل ہوئی۔"

پھر وہ بیس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوگیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی ہماری طرف بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی بوچھاڑ سے روک دو۔"

شبیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو مایوس ہوگیا۔ وہ لڑتے بھڑتے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار اتر گیا۔ جب وہ سب دریا پار اتر گئے تو شبیب نے پل تڑوادیا تاکہ اموی سپاہ اس کا تعاقب نہ کرسکے۔

حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دونوں بیٹوں کی محبت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج سخت ظالم اور سفاک انسان ہے، وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے اسیر خوارج کو قیدخانے میں ڈلوادیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر جانے لگا۔ اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقت ور دستہ طلایہ گردی کے لیے چھوڑ دیا اور اس طلایہ گرد دستے کا سردار ہارون کو مقرر کردیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کردیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کرسکتا تھا۔ غضب ناک ہوکر بولا۔ "ہارون! میں حکم عدولی کا سخت مخالف ہوں۔ تجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں ہوجاتا، میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ "میں زبان درازی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تو اسی وقت طلایہ گرد دستے کو لے کر دریا کے کنارے کنارے چکر لگاتا رہ کیونکہ شبیب کا کوئی بھروسا نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

لیکن ہارون نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں کردیا جاتا۔"

حجاج نے کرختگی سے پوچھا۔ "ان سے تیرا تعلق، ان سے تیری دلچسپی کا سبب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار کردوں پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے دلچسپی کیوں ہے؟"

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا بتا مگر مختصراً اجمالاً کیونکہ میں داستان گوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔"

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنادی۔ حجاج بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور درشتی سے کہا۔ "افسوس کہ تو فوج کی سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ نالائق انسان ہے جو اپنے باپ، بہن، بھائی، بیوی اور اولاد کسی پر بھی قابو نہیں رکھ سکا۔ اب میں اپنے آپ پر بھی لعنت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے طلایہ گرد دستے کی سرداری سے معزول کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کردیا اور ہارون سے کہا۔ "اب تو یہاں سے دفعان ہوجا، میں تیرے سائے تک سے بچنا چاہتا ہوں، اپنی فوج سمیت۔"

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کی آنکھوں میں تری محسوس کرلی، بولا۔ "تو عورتوں کی طرح رو کیوں رہا ہے، ان آنسوؤں کا مطلب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظرِ کرم کا خواہاں ہوں۔"

حجاج نے کہا۔ "ہاں، میں ان پر رحم کروں گا۔ ان پر بھی اور تجھ پر بھی۔"

ہارون فرطِ خوشی سے مسکرا اٹھا۔ "امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "کیسا شکریہ؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں نالائق اولادوں سے

تیرا پیچھا چھڑادوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کروادوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہوجائے اور ان نالائقوں سے تیرا ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ جائے۔"

ہارون تلملا کر کھڑا ہوگیا۔" امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں۔ میں یہ نہیں برداشت کرسکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کردی جائیں۔"

حجاج نے سختی سے کہا۔" تو خمس واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں پر صبر کرلے۔"

ہارون نے جواب دیا۔" امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کررہا ہوں۔"

حجاج نے کہا۔" ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لیے رحم کی درخواست قبل از وقت ہے۔"

ہارون نے اپنے مقصد کا زیادہ شدت سے اظہار کیا۔" امیر! میں یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کو معاف کردیں گے۔"

حجاج نے سختی سے جواب دیا۔" کیسی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی۔ دفعان ہوجا یہاں سے ورنہ میں ان دونوں کے ساتھ تجھے بھی بند کردوں گا اور تو بھی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔"

ہارون کا دل بھر آیا۔" امیر! تو مجھے قتل کردے لیکن میرے بیٹوں کو رہا کردے۔"

حجاج نے کہا۔" تو ان بیٹوں کے لیے رحم کی درخواست کررہا ہے جو ہمیشہ سے تیری پریشانیوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ بجا! میں ان دونوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک عفو کا مستحق بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم وہ سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتا کیونکہ اس کی ذلیل اور حاسد ماں کئی آدمیوں کی اذیت اور پریشانی کا باعث بنی رہی ہے۔ اب اس کو پریشان ہونا چاہیے۔ اب اس کو اذیتیں جھیلنا چاہئیں۔"

ہارون تھر تھر کانپنے لگا۔ حجاج اس کو لرزاں و ترساں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ہارون کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر جہاں کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

قیدی خوارج کو حجاج کے روبرو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امرا اور منصب دار حجاج کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رسیوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلاد اور درّہ بردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے در پر دربانوں کی طرح کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ اسیر خوارج کے لیے مقدمے سے پہلے ہی معافی کی یقین دہانی حاصل کرلینا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور چاق وچوبند ہوگئے، ہارون اور دوسرے منصب داروں کو معلوم ہوگیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور عنقریب نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا محل سے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی اپنے مخصوص لباس میں سر جھکا کر چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کے چند رولے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور رولے ایک دوسرے قاضی کے بائیں ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوئے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا چاہا مگر حجاج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دور ہٹادیا۔

حجاج کسی کی پروا کیے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت گار نے اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مؤدب کھڑے رہے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری تمام خارجی اس کے روبرو لائے جائیں۔ یہ کل ستائیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حجاج کے روبرو کھڑا کیا گیا تو حجاج نے پوچھا۔" او بے دین! دشمنِ خدا اور رہزنِ ہدا! بتا تیرا شبیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

خارجی نے جواب دیا۔" وہ امیر المومنین اور امام ہدا ہیں۔"

حجاج نے پوچھا۔" اور امیر المومنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

خارجی نے جواب دیا۔" خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے۔ تو نے امام ہدا کے مقابلے میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔"

حجاج نے بائیں ہاتھ کے رولے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خارجی کے حوالے کردیا اور کہا۔

" اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر پھر میرا جلاد یا کوئی درّہ بردار اس پرزے میں لکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔"

اس کے بعد حجاج کے روبرو دوسرا قیدی پیش کیا گیا۔ حجاج نے اس سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیے جو اس کا پیش رو

دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہوگیا۔ حجاج کے آدمیوں نے ایک بار پھر زدوکوب کرنا شروع کردیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹانا چاہتے تھے لیکن حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو منع کردیا کہ وہ ہارون کو جہاں کھڑا ہے، کھڑا رہنے دیں۔

ہارون نے سرگوشی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔ " بیٹو! خبردار جو تم نے حجاج کی مخالفت کی۔ تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر وہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہوجائے ورنہ حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔"

عامر نے جواب دیا۔" لیکن باواجان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا زنا سے بڑا گناہ ہے۔"

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا۔" ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟"

اس نے جواب دیا۔" ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔"

ہارون نے کہا۔" چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہوجائے۔"

ابراہیم نے جواب دیا۔" باواجان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ وقتی فائدوں کے زیرِ اثر جھوٹ بول دینا آسان اور جائز سمجھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ گردن کو سچ پر قربان کردو۔"

ہارون چیخ مار کر رو دیا۔" او اپنے باپ کی دشمن اولاد! میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بے دین اور گمراہ ہوچکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤں گا۔"

حجاج نے دور ہی سے ڈانٹا۔" او ذلیل اور خانماں برباد ہارون! تو کیا ورغلا رہا ہے۔ ادھر میرے پاس آجا ورنہ میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔"

ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا۔" بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کچھ کہو جو میں نے کہا ہے۔ ویسے تمہاری مرضی۔" پھر آنکھوں سے ابل پڑنے والے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا۔" او ظالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب و روز اپنے پاس رکھ کر خارجی بننے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند نصیحتوں کے ذریعے خارجیت سے منحرف کس طرح کردے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔" آپ درست کہتے ہیں، میں غلطی پر ہوں۔"

حجاج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال کرتا رہا اور آخر میں کسی کو بائیں ہاتھ کا کاغذ تھما دیتا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ عامر کی نوبت آگئی اور اس کو حجاج کے روبرو پیش کردیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال وجواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلیف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتا نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا باتیں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد جب ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا۔

" او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزائے موت نہیں دی لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر اس شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ تھما دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اس کو وہ سزا دے دی کہ وہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔"

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی۔" یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری بار مل لوں؟"

حجاج نے جواب دیا۔" ضرور مل لے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔"

ہارون لرزتا کانپتا ہوا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔" عامر! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔"

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا۔ اس میں بس ایک فقرہ لکھا تھا۔

" فقط پندرہ درّے۔"

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہا۔" ابراہیم! اپنا پرچہ تو دکھانا ذرا۔"

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا۔" قتل۔"

ہارون کا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور پنڈلیاں بری طرح سنسنا رہی تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی۔

"ابراہیم بیٹے! تم گھبرانا مت۔ میں حجاج کے پاس واپس جارہا ہوں۔ میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی بھیک مانگوں گا۔"

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ہارون لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی رقت سے درخواست کی۔ "امیر رحم! میرے بچے ابراہیم پر رحم کر۔ اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے موت مرجائیں گے۔"

حجاج نے درشت آواز میں حکم دیا۔ "ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا۔ پہلے بقیہ کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھمادوں، اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا۔"

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرطِ غم سے دونوں آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ "جا اور جلاد اور درّے والوں سے کہہ دے کہ جن جن کو سزاؤں کے پرچے مل چکے ہیں، ان پر فوراً عمل کیا جائے۔"

قاضی دبے قدموں جلاد اور درّہ برداروں کی طرف چل دیا۔ دوسری طرف، عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عامر نے پوچھا۔ "ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سہما نظر آتا ہے۔ کیا موت سے ڈر گیا؟"

ابراہیم واقعی رو رہا تھا، بولا۔ "بھائی، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری ماں تک جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔"

عامر کو اپنی سوتیلی ماں منیزہ کے ظلم و ستم یاد آئے اور ذرا سی دیر کے لیے منیزہ کے غمگین چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوشی محسوس کی۔ وہ غمگین چہرہ تصور میں قبل از وقت ہی نظر آرہا تھا۔

عامر نے پوچھا۔ "پھر تو کیا چاہتا ہے؟"

ابراہیم نے جواب دیا۔ "بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

عامر، ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا۔ "لے، اسے رکھ لے اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست لے کر حجاج کے پاس جاؤں۔"

ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور درّے بردار بڑی سرعت سے اس کی تعمیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلاد یا درّے بردار کی طرف بڑھا دیتا۔ جلاد فوراً ہی گردن مار دیتا اور درّے بردار درّے لگانے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آگئی اور اس کا پرچہ پڑھ کر اسے درّے بردار کے حوالے کردیا گیا۔ درّوں کی ضربات سے جو چیخیں نکل رہی تھیں، انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو درّوں کی شپاشپ اور زخمیوں کے اِدھر اُدھر گرنے اور بھاگنے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلاد بڑی سفاکی سے گردنیں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے حجاج سے درخواست کی۔ "یا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کیجیے۔"

حجاج نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ "تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کرچکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کروں گا۔"

ہارون بدحواس، افتاں و خیزاں مقتل میں پہنچا۔ اس وقت جلاد اپنی تلوار فضا میں بلند کرچکا تھا اور تلوار کے سائے میں عامر سر جھکائے کھڑا تھا۔ پلک جھپکتے میں تلوار پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کرکے دوسری طرف نکل گئی۔ ہارون چیخ مار کر گر گیا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ ادا کرسکا۔

"اس کو کیوں مارتے ہو، یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔"

ہارون بے ہوش ہوگیا اور ابراہیم پندرہ درّے کھا کر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر کے بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ سسکیاں درّوں کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عظیم بھائی کے عظیم الشان ایثار پر دل کی گہرائیوں سے۔

(ختم شد)

ماخذات
بلادِ فلسطین و شام، جی۔ لی اسٹرنج۔ فتوح البلدان، بلاذری۔ تمدنِ اسلام، جرجی زیدان۔ تاریخِ طبری، طبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابنِ خلدون۔ تاریخِ شام، فلپ کے حتی۔

ممتا چاہے انسان کی ہو یا کسی درندے کی... دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنی اولاد کو کسی صورت چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے ایک عفریت کو جنم دیا اور اس کی تمام مصیبتوں کو جھیلتے ہوئے اسے ہر حال میں زندہ رکھنا چاہتی تھی... لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اس کی دیوانی ممتا اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔

ایک خونی بلا کا احوال جو قدرت کا خوفناک اظہار تھا

عفریت

کاشف زبیر



اکتوبر 1956ء

ننھا جیف دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ ایڈ سخت مضطرب ہے۔ اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کردیے تھے۔ اگرچہ موسم کی وجہ سے کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں مگر اس نے ان کی چٹخنیاں بھی لگا دیں۔ پھر اس نے اپنی رائفل اٹھا کر اسے چیک کیا اور اپنی بیوی مارتھا سے کہا۔ "میں باہر جارہا ہوں۔ تم دروازہ بند کرلو اور میری آواز سنے بغیر دروازہ مت کھولنا۔"

مارتھا نے سر ہلایا۔ وہ خوف زدہ تھی مگر اس نے وہی کیا جو شوہر نے کہا تھا۔ ایڈ کے باہر جاتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ باہر ہلکا سا طوفان آیا ہوا تھا۔

سوکھے پتے اڑ رہے تھے اور ہوا میں کاٹ دار ٹھنڈک تھی۔ چند ہفتے بعد شاید موسم کی پہلی برف باری ہو جاتی۔ بولڈ ماؤنٹین نامی یہ علاقہ نیویڈا کی ریاست میں کیلیفورنیا کی ریاست کے ساتھ صحرا اور پہاڑوں کے ملاپ پر واقع تھا۔ ایک طرف خشک جھاڑیوں اور ریت پر مشتمل صحرا تھا اور دوسری طرف بلند ہوتے پہاڑوں پر گھنے اور اونچے درختوں والے دلدلی جنگل تھے۔ یہاں باقاعدہ آبادی کم تھی لیکن چھوٹے چھوٹے بے شمار فارمز تھے جو پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے۔ بولڈ ماؤنٹین ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ یہاں زمین بنجر اور ناہموار تھی اس لیے کاشت کاری محدود تھی اور کوئی صنعت یا کان کنی بھی نہیں تھی اس لیے علاقے میں غربت زیادہ تھی۔ دلدلی زمین اور بہت گھنے جنگلات کی وجہ سے سیاح نہیں آتے تھے اور نہ ہی کوئی ایسا جانور تھا جس کے شکار کے لیے شکاری یہاں کا رخ کریں۔ باہر سے آنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔

باہر آنے کے بعد ایڈ نے رائفل شانے پر لٹکائی اور سب سے پہلے اپنے پک اپ ٹرک کی چابیاں نکال کر اس کے دروازے لاک کر دیے پھر وہ باہر ریلنگ سے بندھے گھوڑے کے پاس آیا جو بے چین سا تھا۔ اسے کھول کر وہ اندر اصطبل میں لے گیا۔ اسے باندھ کر اس نے اصطبل کا دروازہ باہر سے بند کیا اور پھر احاطے کا کھلا گیٹ بھی بند کر کے اس پر زنجیر لگا دی۔ آخر میں اس نے پورے فارم کا ایک چکر لگایا۔ اپنے مویشی اس نے پہلے ہی بند کر دیے تھے۔ موسم شام سے خراب تھا مگر اس کی احتیاط کے پس پشت صرف موسم کارفرما نہیں تھا۔ یہ کام نمٹا کر وہ اندر آیا اور دروازہ بند کر کے اس پر بلی بھی لگا دی۔ مارتھا جیف کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں سے پوچھا۔

''پاپا اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' مارتھا نے اسے تسلی دی۔ ''تم سو جاؤ۔''

اسی لمحے کسی نے باہر سے زور و شور سے دروازہ بجایا اور چلّایا۔ ''ایڈ! دروازہ کھولو۔''

ایڈ نے اپنی رائفل اٹھالی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر موجود آدمی پھر چلّایا۔ ''ایڈ یہ میں ہوں سام تمہارا دوست...... خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔''

''سام...... یہ سام ہے۔'' مارتھا نے کہا۔

''چپ رہو اور جیف کو دیکھو۔'' ایڈ نے درشت لہجے میں کہا۔ سام مسلسل التجائیں کر رہا تھا۔

''پلیز ایڈ......'' مارتھا نے کہا مگر ایڈ نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر بلند آواز سے کہا۔

''سام! یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔''

''ایڈ پلیز۔'' سام رونے لگا۔ ''میں مرنا نہیں چاہتا۔ وہ میرے پیچھے ہے۔''

''میں تمہاری خاطر اپنے خاندان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔'' ایڈ نے جواب دیا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خود پر بہت جبر کر رہا ہے۔ ''یہاں سے چلے جاؤ۔''

''وہ آگیا۔'' سام نے دہشت زدہ لہجے میں کہا اور پھر اس کی چیخ سنائی دی۔ مارتھا منہ چھپا کر رونے لگی۔ سام کی چیخیں دور جا رہی تھیں۔ ایڈ دروازے سے ماتھا ٹیکے ہوئے تھا۔ شاید وہ بھی رو رہا تھا۔ سام اس کا بچپن کا دوست تھا۔ جیف آہستہ سے بستر سے اترا اور کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو اسے فارم کے آخری حصے میں بڑے چیل کے درخت کے ساتھ وہ نظر آگیا جس نے سام کو گردن سے پکڑ کر بچے کی طرح لٹکا رکھا تھا۔ وہ انسان جیسا ہی تھا مگر اس کا سر بہت بڑا تھا اور شانے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اس کا قد سات فٹ سے اوپر تھا۔ سام اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اچانک اس نے سام کو گھما کر درخت پر دے مارا اور اسی لمحے مارتھا نے عقب سے آکر جیف کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

اکتوبر 1984ء

رک ڈرائیو کر رہا تھا اور میک اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ میک کی شاندار اسپورٹس کار تھی۔ اس سے آگے مارش کی پک اپ پر ان کی دو عدد ٹریل بائیک سوار تھیں۔ پک اپ مارش چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کی گرل فرینڈ فیرو تھی۔ میک کی کار میں پچھلی نشست پر رون اور ایملی بیٹھی آپس میں بات کر رہی تھیں۔ رون، میک کی گرل فرینڈ تھی جبکہ ایملی اور رک کے درمیان کچھ چکر تھا مگر وہ ابھی واضح ہو کر سامنے نہیں آیا تھا۔ رک اور ایملی دونوں شرمیلی فطرت کے تھے۔ رک اور میک کا کارسن سٹی میں گاڑیوں کا شوروم وراثت میں ملا تھا۔ سیٹ اپ اچھا تھا اور انہیں کاروبار میں زیادہ سر کھپانا نہیں پڑتا تھا۔ دونوں بھائی تفریحات اور خاص طور سے بائیک رائیڈنگ کے دیوانے تھے۔ اس وقت بھی وہ بولڈ ماؤنٹین کی طرف جا رہے تھے جہاں ٹریل

بائیک چلانے کے لیے بہت سی شاندار جگہیں تھیں۔ پہاڑوں میں میک اور رک کا ہنٹنگ کیبن بھی تھا۔ کارسن سٹی یہاں سے سو کلو میٹرز دور شمال مشرق میں تھا۔

ہائی وے سے اترنے کے بعد انہیں سڑک ذرا تنگ ملی تھی مگر یہ بُرا راستہ نہیں تھا۔ دوپہر کے قریب وہ بولڈ ماؤنٹین کے پاس پہنچ گئے تھے اور اب انہیں سامان لینا تھا۔ وہ پانچ دن کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ کسی گروسری اسٹور کی تلاش میں تھے۔ اچانک ایملی نے عقب سے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ کچھ پُراسرار سے ہیں۔ وہ باہر سے آنے والوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے۔''

''یہ مرض امریکا میں ہر جگہ ہے۔'' میک نے کہا۔ ''لوگ باہر سے آنے والوں کو خوش آمدید نہیں کہتے۔''

''ان کا طرز زندگی بھی پرانا ہے۔'' ایملی پھر بولی۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔

''میں نے بھی سنا ہے لیکن وہ دورِ جدید کی سہولتیں استعمال کرتے ہیں جیسے ان کے گھروں میں بجلی ہے اور وہ گاڑیاں بھی رکھتے ہیں۔'' رک نے کہا۔ ''ہاں، یہ ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے۔''

''وہ دیکھو بورڈ۔'' میک نے کہا مگر مارش نے اس سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پک اپ اس سڑک پر موڑ دی جس طرف بورڈ اشارہ کر رہا تھا۔ یہ پارسے گروسری کا بورڈ تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں گروسری مل گئی تھی۔ وہ ہفتے بھر کے لیے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے۔ ہنٹنگ کیبن میں کچھ نہیں تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس چھوٹے سے اور لکڑی کے کیبن میں بنے گروسری اسٹور کے سامنے تھے جس میں پھل سبزی سے لے کر ٹارچز اور موم بتیاں تک سب دستیاب تھا۔ وہ نیچے اتر آئے۔ اسٹور کے سامنے سیڑھیوں پر ایک سات آٹھ سال کا بچہ بیٹھا ہوا اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ وہ بال ذرا دور پھینکتا اور کتا بھاگ کر بال لے آتا۔ ان کی گاڑیاں رکیں تو کتا جارحانہ انداز میں ان پر بھونکنے لگا۔ بچہ اسے روک رہا تھا۔ بالآخر وہ کتے کو پکڑ کر واپس لے گیا۔ بچے کی آنکھوں پر دبیز شیشے والی عینک تھی۔ میک نے اسے دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''کیا تم نے کوک کی بوتل کا شیشہ فریم میں لگوایا ہے؟''

''میک! یہ بچہ ہے۔'' رک نے اسے خبردار کیا۔ ''اس سے اس قسم کی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''میں نے کیا کہا ہے؟'' میک کا لہجہ بگڑ گیا۔

''تم نے بہت غلط بات کی ہے۔'' ایملی بولی اور بچے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''ہائے، میں ایملی ہوں۔''

''ہائے، میں باب ہارلے ہوں۔'' بچے نے متانت سے کہا۔ ''یہ میرے ڈیڈ کا اسٹور ہے۔''

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑنگا آدمی باہر آیا۔ اس کا چہرہ اور جسم بتا رہا تھا کہ وہ جفاکشی کی زندگی گزارتا آیا ہے تبھی اس ویرانے میں کامیابی سے یہ اسٹور چلا رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ''باب! یہاں سے دور مت جانا۔''

''یس ڈیڈ۔'' بچے نے جواب دیا۔

میک اور رون اسٹور کی طرف بڑھ گئے۔ رک اور ایملی باب سے بات کر رہے تھے جبکہ مارش اور فیرو آس پاس کا جائزہ لے رہے تھے پھر مارش نے رک سے پوچھا۔ ''تمہارا کیبن یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید آدھے یا پون گھنٹے کا سفر اور ہے مگر یہ گاڑیاں کیبن تک نہیں جا سکتیں انہیں پیچھے ہی چھوڑنا ہوگا۔''

''یہ جگہ بہت خشک ہے۔'' فیرو بولی اور دور پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ ''وہاں ہریالی ہے۔''

اسی اثنا میں ایک پرانا کھٹارا سا لوڈنگ ٹرک ان کی طرف آیا اور اسٹور کے سامنے رک گیا۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی اتر کر سامان کے تھیلے اسٹور میں پہنچانے لگے جبکہ ٹرک کے پیچھے سے کوئی نصف درجن بچے نیچے اتر آئے۔ وہ برآمدے میں رکھے سامان میں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ ایک بچہ ٹرک کی طرف آیا تو ان میں سے سب سے بڑے لڑکے نے اسے پکڑ لیا۔ ''ہے جول...... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

بچے نے چھپانے کی کوشش کی مگر لڑکے کے ساتھ بڑی عمر کی لڑکی نے زبردستی بچے کا ہاتھ آگے کر کے اس میں موجود سیب نکال لیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ''تم نے چوری کی ہے۔''

''اب کدو کے سر والا تمہارے لیے آئے گا۔''

بچے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ جول کے گرد دائرے میں گھومتے ہوئے نظم کے انداز میں گانے لگے۔ ''کدو کے سر والا آئے گا...... تم پر نشان لگائے گا...... پھر تمہارے لیے آئے گا...... تمہارا سر اتار کر لے جائے گا۔''

''چپ کرو۔'' ایملی نے انہیں ڈانٹا کیونکہ بچہ انتہائی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ''یہ سب بکواس ہے۔''

کدو کے سر والا مغرب میں ایک روایتی سا کردار ہے جس کے سر کی جگہ گول بڑا کدو ہوتا ہے جس میں آنکھیں

اور منہ تراشا ہوتا ہے اور اس کے اندر آگ جلتی ہے۔ ہولووین کے موقع پر اس کردار کا ماسک پہن کر لوگ گلیوں میں گھومتے ہیں۔ لڑکے نے آگے آ کر ایملی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''یہ بکواس نہیں ہے۔''

''پیچھے ہٹو۔'' رک نے کہا تو لڑکے نے سیب والا ہاتھ یوں بلند کیا جیسے ایملی یا رک پر دے مارے گا مگر پھر اس نے آگے بڑھ کر سیب باب کے حوالے کر دیا۔ لڑکا، لڑکی اور باقی بچے ٹرک پر سوار ہو گئے اور اندر سے نکلنے والے دونوں افراد ڈرائیونگ کمپارٹ میں جا بیٹھے۔ ٹرک وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ''بچے ڈرا رہے تھے۔''

''نہیں، لڑکا سنجیدہ تھا۔'' ایملی نے تردید کی۔ اتنے میں میک اور رون اندر سے سامان کے تھیلے اٹھائے نکلے اور پک اپ کی پچھلی نشست پر رکھ دیے۔ پھر میک پک اپ پر چڑھ کر اپنی بائیک کھولنے لگا۔ رک اس کی طرف آیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟''

''میں ذرا ان پہاڑیوں کا ایک چکر لگا لوں۔'' میک نے کہا۔ ''تم آ رہے ہو؟''

رک ہچکچایا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔''

جواب میں میک نے بائیک نیچے اتار کر اسٹارٹ کی، ہیلمٹ پہنا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ گروسری کے پاس ہی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گڑھے تھے۔ میک ان سے بائیک کو جمپ کرانے لگا۔ ایملی رک کے پاس آئی۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی ہمیں آگے نہیں جانا ہے؟''

''جانا تو ہے لیکن اگر یہاں کچھ رائیڈنگ کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟'' رک نے کہا اور اپنی بائیک اتارنے لگا۔ پھر اس نے بھی ہیلمٹ پہنا اور میک کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ مارش اور فیرو ایک طرف بیٹھے بیئر کے ٹن سے شغل کر رہے تھے۔ اتنے میں گروسری اسٹور کا مالک اندر سے نکلا اور اس نے باب سے کہا۔

''تم اور پیڈی اندر جاؤ اور جب تک میں نہ آؤں اندر ہی رہنا...... ٹھیک ہے؟''

''یس ڈیڈ۔'' باب نے کہا اور کتے کو آواز دی۔ ''پیڈی! کم آن بوائے۔''

باب اور کتا اندر چلے گئے۔ آدمی نے اسٹور کے ساتھ کھڑا اپنا پرانا پک اپ ٹرک اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مارش، رون، ایملی اور فیرو، بائیک جمپنگ دیکھ رہے تھے۔ اچانک اسٹور کا دروازہ کھلا اور پیڈی بھونکتا ہوا باہر آیا۔ غالباً اسے اپنے سکون میں ٹریل بائیکس کا شور ناگوار گزر رہا تھا اور وہ بھونکتا ہوا ان کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے باب تھا۔ پہلے تو ان چاروں نے باب اور کتے کو دیکھا نہیں کیونکہ اس جگہ کئی فٹ اونچی جھاڑیاں اور گھاس تھی پھر ایملی کی نظر پڑی اور وہ ان کے پیچھے بھاگی۔ وہ چلا چلا کر باب سے رکنے کو کہہ رہی تھی کیونکہ وہ جمپنگ زون میں جا رہا تھا اور یہ بہت خطرناک تھا۔ مگر بائیکس کے انجن کے شور میں باب نے سنا نہیں۔ پیڈی اب ٹیلوں کے درمیان تھا۔ باب اس کے پیچھے بھاگتا ہوا ٹیلوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ایملی کے بعد رون اور فیرو نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ بھی بھاگے آ رہے تھے۔

باب ایک ٹیلے تک پہنچ گیا۔ بائیک اس کے پیچھے تھیں۔ اچانک ٹیلے سے ایک بائیک اچھل کر آئی اور سوار نے باب کو بچانے کی کوشش کی۔ باب بچ گیا مگر بائیک سلپ ہو گئی۔ باب خوف سے اپنی جگہ منجمد ہو گیا تھا پھر دوسری بائیک ٹیلے سے اچھل کر نیچے آئی اور اس کا ٹائر باب کے سینے سے ٹکرایا۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔ دوسری بائیک بھی سلپ ہوئی۔ یہ میک کی بائیک تھی۔ رک اپنا ہیلمٹ اتار کر زمین پر ساکت پڑے باب کی طرف بھاگا۔ رون، ایملی اور فیرو بھی وہاں آ گئے تھے۔ مارش جھک کر باب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ''نبض چل رہی ہے۔ اسے فوری اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔''

''ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔'' میک نے کہا اور بائیک اٹھا کر پک اپ کی طرف چل دیا۔ رک اس کے پیچھے لپکا۔

''کیا مطلب ہے؟ بچے کو مدد کی ضرورت ہے۔''

''اگر ہم یہاں رکے تو مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔'' میک بولا اور بائیک پک اپ پر چڑھا کر اسے باندھنے لگا۔

''تمہارا دماغ درست ہے؟ یہ مر گیا تو تمہارے خلاف کیس بنے گا۔''

''اب بھی میرے خلاف کیس بنے گا اور میرا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔'' میک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اس دوران میں مارش ایمبولینس کے لیے کال کرنے اسٹور کی طرف بھاگا تھا مگر جب اس نے اسٹور میں دیکھا تو اسے کہیں بھی فون نظر نہیں آیا۔ اس نے باہر آ کر اطلاع دی۔ ''یہاں کہیں فون نہیں ہے۔''

''کیبن میں ہے۔'' رک نے کہا۔ ''ہمیں وہاں جانا ہوگا۔''

اس دوران میں میک اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ ''سب آؤ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔''

رک نے ان سب سے کہا۔ ''تم لوگ جاؤ۔'' رون بھاگ کر میک کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے مارش سے کہا۔ ''تم جا کر کیبن سے ایمبولینس کے لیے کال کرو۔''

''ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ایملی بولی۔ ''بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جا کر ایمبولینس کے لیے کال کرو۔''

مارش نے سر ہلایا اور پک اپ کی طرف بھاگا۔ فیرو اس کے ساتھ تھی۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ''تم بھی جاؤ، میں یہاں رکا ہوا ہوں۔''

''میں تمہارے ساتھ رکوں گی۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، تم جاؤ۔''

ایملی رک کے مجبور کرنے پر چلی گئی۔ پک اپ کے جانے کے بعد رک نے بچے کو دیکھا۔ اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ اتار کر اس پر ڈال دی۔ چند منٹ بعد سڑک پر دھول کے ساتھ گروسری کے مالک کا ٹرک نمودار ہوا اور وہ اسٹور کے ایک طرف رک گیا۔ وہ اندر گیا اور باب اور کتے کو نہ پا کر باہر آیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ رک ہاتھ ہلا رہا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور نزدیک آنے پر اسے جیکٹ تلے باب کے سنہری بال دکھائی دیے تو وہ بھاگا اور نزدیک آ کر اس نے جیکٹ اتاری، باب کو دیکھ کر اس کا چہرہ پتھر جیسا سخت ہو گیا۔ اس نے نرمی سے باب کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ رک نے اس کی گر جانے والی عینک اٹھا کر آگے کی تو اس نے لے کر باب کی آنکھوں پر لگا دی۔ وہ اسے سینے سے لگائے آگے بڑھا تو رک نے عقب سے کہا۔

''مسٹر ہارلے! یہ ایک حادثہ تھا۔''

وہ رکا اور اس نے مڑ کر دیکھا تو رک کو اس کی آنکھوں میں شعلے سے دکھائی دیے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میں تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ باب کو لے کر اپنے ٹرک تک آیا اور اسے اس میں لٹا کر روانہ ہو گیا۔ رک اپنی بائیک کی طرف آیا، اسے اسٹارٹ کیا اور اپنے کیبن کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

مارش، فیرو اور ایملی پک اپ پیچھے چھوڑ کر دلدل کے اوپر بنے لکڑی کے چھوٹے سے پل سے ہوتے ہوئے کیبن تک آئے تھے۔ یہ لکڑی کا لیکن بہت نفاست سے بنا ہوا خوب صورت کیبن تھا۔ اس میں بجلی، پانی اور فون کی سہولت تھی۔ کیبن بلندی پر تھا اس لیے یہاں سے آس پاس کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ مارش اندر آتے ہی فون کی طرف لپکا اور اس نے ریسیور اٹھایا لیکن اس سے ٹون نہیں آ رہی تھی۔ تب اس نے دیکھا، میک کے ہاتھ میں فون کا ٹوٹا ہوا تار تھا۔ اس نے کھینچ کر تار توڑ دیا تھا۔ مارش اس کی طرف جھپٹا۔ ''یہ کیا کیا تم نے...... ہمیں ایمبولینس کو کال کرنی ہے۔''

''کوئی کال نہیں کرنی ہے۔'' میک نے سخت لہجے میں کہا تو مارش نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے گھونسا مارا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ مارش نے پلٹ کر ایملی سے کہا۔ ''آؤ، ہمیں کہیں فون تلاش کرنا چاہیے۔''

مگر اسی لمحے میک نے عقب سے اٹھ کر اس کے سر پر پیپر ویٹ سے ضرب لگائی اور وہ فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔ چند منٹ بعد رک اندر آیا تو اس نے دیکھا کہ رون اور ایملی ایک طرف صوفے پر بیٹھی ہیں اور میک کھڑکی سے لگا ہوا تھا۔ رک نے پوچھا۔ ''مارش اور فیرو کہاں ہیں؟''

اسٹور کا دروازہ اندر سے بجنے لگا اور فیرو کے چلانے کی آواز آئی۔ ''رک! اس نے ہمیں بند کر دیا ہے۔''

رک اسٹور کی طرف بڑھا تو میک راستے میں آ گیا۔ رک نے کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہاں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔'' میک نے سخت لہجے میں کہا۔

رک کچھ دیر خاموش رہا۔ ''بچے کو اس کا باپ لے گیا ہے مگر اس نے جاتے ہوئے مجھے دھمکی دی ہے کہ اس کے بچے کو کچھ ہوا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔''

''وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' میک نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اب بات ختم ہو گئی ہے۔''

''تب ان لوگوں کو باہر آنے دو۔'' رک نے التجا کی۔ وہ میک سے دبتا تھا۔ وہ بڑا بھی تھا اور مزاج کا سخت بھی۔ میک نے دروازہ کھولا۔ مارش اور فیرو باہر آئے۔ انہوں نے سب سن لیا تھا۔ میک نے کہا۔

''بات ختم ہو گئی ہے اس لیے ہمیں اپنی پکنک انجوائے کرنی چاہیے۔''

مارش نے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ''یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

ہارلے ٹرک چلا رہا تھا۔ وہ اپنے گھر تک آیا۔ اس کا گھر سادہ سا تھا مگر ان باپ بیٹے کے لیے کافی تھا۔ اس کی بیوی کافی عرصے پہلے بیمار ہو کر مر گئی تھی تب سے وہ باپ کی پرورش کر رہا تھا۔ اس کا دنیا میں بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں

تھا۔ وہ اسے اٹھائے گھر کے اندر آیا اور بستر پر لٹا کر فون کی طرف جانے لگا تھا کہ رک گیا۔ باب جو راستے میں تھوڑا بہت مل رہا تھا، اب بالکل ساکت تھا۔ اس نے باب کی نبض اور پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ انہیں ساکت پا کر وہ غم سے نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور اپنی سسکیاں روکنے لگا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کے آنسو رک گئے تھے۔ مگر اس کے دل میں اب آگ جل رہی تھی۔ اس نے باب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ میرے بچے میں تمہارا انتقام لے کر رہوں گا۔“

کچھ دیر بعد اس نے باب کی لاش ایک چادر میں لپیٹ کر ٹرک میں ڈالی اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ بولڈ ماؤنٹین کی اس پرانی بستی کی طرف تھا جہاں لوگ آج کے دور میں بھی خاصی قدامت پرستی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور ان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب سورج ڈھل چکا تھا، وہ بستی میں داخل ہوا اور اس نے رابرٹ کے مکان کے سامنے ٹرک روکا۔ انجن کی آواز سن کر وہ باہر آیا اور ٹرک کے عقب میں آٹے کے تھیلے دیکھ کر اس نے اپنے پوتے کو آواز دی۔ ”بریڈ! آ کر یہ تھیلے اندر لے جاؤ۔“

بریڈ وہی لڑکا تھا جس نے ایملی اور رک کو کدو کے سر والے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ آ کر ٹرک کے عقب سے تھیلے اتارنے لگا۔ ہارلے نیچے آ گیا۔ اس نے رابرٹ سے کہا۔ ”مجھے اس عورت کا پتا چاہیے۔“

”کس عورت کا؟“ رابرٹ نے پوچھا۔

”جس کا تعلق کدو کے سر والے سے ہے۔“

”ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”وہ ہے اور میں نے اسے خود دیکھا ہے۔“ جیف ہارلے نے یقین سے کہا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے دوست سام کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا اور وہ اس مخلوق کا شکار بن گیا تھا۔ جیف نے اپنی جیب سے رقم کی ایک چھوٹی گڈی نکال کر رابرٹ کی طرف بڑھائی۔ ”مجھے صرف اس کا پتا چاہیے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ رابرٹ نے غصے سے کہا۔ ”تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟“

تب جیف نے باب کی لاش سے کپڑا ہٹایا۔ ”یہ مر چکا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے مارا ہے۔“

رابرٹ نے جھک کر دیکھا اور اس کا چہرہ نرم پڑ گیا مگر اس نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بچے کا افسوس ہے۔ اسے لے جا کر دفن کر دو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

بریڈ رک کر ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا مگر جب رابرٹ نے اسے گھورا تو وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور آٹے کی بوریاں اٹھا کر لے جانے لگا۔ دس منٹ بعد جیف واپس جا رہا تھا کہ ایک تنگ گلی سے گزرتے ہوئے اچانک بریڈ سامنے سے نمودار ہوا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اس کے اشارے پر جیف نے ٹرک روک لیا۔ اس نے کھڑکی سے لٹک کر کہا۔ ”مسٹر ہارلے! میں نے تمہاری اور گرینڈ پا کی بات سنی ہے۔ میں اس عورت کو جانتا ہوں۔ اس کا نام میگاٹ ہے۔“

جیف منتظر تھا کہ وہ مزید کچھ بتائے گا مگر جب وہ خاموش رہا تو جیف نے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے لے کر جیب میں رکھ لی۔ جیف نے اسے کالر سے پکڑ کر کھینچا۔ ”مجھے صرف نام نہیں پتا بھی چاہیے۔“

”میں دکھا سکتا ہوں۔“ بریڈ نے کہا اور اچھل کر ٹرک کے پیچھے سوار ہو گیا۔ اس نے جھک کر جیف سے کہا۔ ”بولڈ ماؤنٹین کے اوپری حصے کی طرف چلو جہاں پرانی دلدل ہے۔“

جیف نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔ پرانی دلدل [illegible] آباد علاقہ تھا اور یہاں کے لوگ بھی وہاں جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہاں اکثر دلدل سے زہریلی گیس خارج ہوتی تھی۔ کئی جان لیوا حادثات کے بعد لوگوں نے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب جیف اس کے اوپری حصے کے پاس پہنچا تو بریڈ نے چھت پر ہاتھ مار کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور ٹرک رکتے ہی وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے جیف سے کہا۔ ”یہاں سے آگے تم خود جاؤ۔ یہ راستہ سیدھا میگاٹ کے گھر تک جاتا ہے۔“

”اوکے تم جا سکتے ہو لیکن وہ نہ ملی تو میں سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔“

”اگر وہ زندہ ہے تو یہیں ہے۔“ بریڈ نے کہا اور پلٹ گیا۔ جیف نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ دلدلی علاقہ تھا جہاں زمین بہت نرم تھی اور راستے سے ہٹنے کی صورت میں ٹرک کے ٹائر زمین میں دھنس سکتے تھے۔ بالآخر ایک جگہ راستہ ختم ہو گیا اور اسے نیچے اترنا پڑا۔ وہ پیدل آگے بڑھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی ہوئی تھی مگر اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ دلدل سے بخارات کے ساتھ گیس اور بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔

عام حالات میں جیف یہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن باب کا انتقام لینے کے لیے اس وقت وہ جہنم جانے کو بھی تیار تھا۔ اسے کچھ دور ایک ٹیلے پر لکڑی کا بنا ہوا جھونپڑا دکھائی دیا جس کی چمنی سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی اور دلدل تھی اور جانے کا واحد راستہ لکڑی کا بنا ہوا خستہ حال پل تھا۔ وہ اس سے ہوتا ہوا جھونپڑے تک آیا اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

جھونپڑے کے اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسے کسی جادوگرنی کے ٹھکانے کا ہو سکتا ہے۔ جگہ جگہ مردہ جانوروں کے ڈھانچے اور حنوط کیے جانور موجود تھے۔ ایک طرف ریک پر زندہ الو بیٹھا تھا جس نے جیف کے اندر آتے ہی بڑی کریہہ سی آواز نکالی۔ اس کے سامنے والے ریک پر چوہے کچھ کھا رہے تھے اور وہ الو کی موجودگی سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ آتش دان کے سامنے سفید بکھرے بالوں والی میگاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

جیف آگے آیا اور اس نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں موجود سونے کے سکے کرسی کے ساتھ رکھی میز پر موجود بلوری گولک میں ڈال دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا ہے۔ یہ اس کا معاوضہ ہے۔“

تب میگاٹ نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا تو جیف کانپ اٹھا۔ اس کے سامنے جھریوں اور رواں سے بھرا ہوا ایک انسانی چہرہ تھا جس کا اس نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ایک آنکھ میں سفید جالا تھا اور دوسری ٹھیک تھی۔ میگاٹ اس علاقے کا ایسا کردار تھی جس کے بارے لوگ بہت کم جانتے تھے اور اس سے بھی کم لوگوں نے اسے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ وہ چڑیل تھی اور کم سے کم ایک صدی سے یہاں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر جیف کو لگا کہ اس کی عمر ایک صدی سے بھی زیادہ تھی۔ کدو کے سر والا اصل میں میگاٹ کا مہرہ تھا، وہی اسے زندہ کرتی تھی اور جن لوگوں کے لیے وہ زندہ ہوتا تھا انہیں ختم کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ ساری کہانیاں تھیں جو اس علاقے میں ایک صدی سے سینہ بہ سینہ چلتی آ رہی تھیں۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کدو کے سر والا میرے بچے کا انتقام لے۔“

عورت کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔ ”سوچ لو، بعد میں پچھتانا مت۔“

”میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں رہا ہے۔“ جیف جذباتی ہو گیا۔ ”میرا بچہ میری کل کائنات تھا اور وہ مر چکا ہے۔“

عورت نے سر ہلایا۔ ”بچے کو یہاں لے آؤ۔“

جیف جا کر باب کی لاش لے آیا۔ عورت نے اسے ایک طرف رکھی کرسی پر ڈالنے کو کہا اور بولی۔ ”اب تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے۔ تم دلدل کے اوپری حصے میں جاؤ گے۔ وہاں ایک بڑے درخت کا کٹا ہوا تنا ہے۔ اس تنے کے اوپری حصے میں ایک لاش دفن ہے، تم وہ نکال کر لاؤ گے۔“

جیف ہچکچایا مگر اتنی دیر میں عورت نے اسے بیلچہ تھما دیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور دلدل کے اوپری حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے کٹا ہوا تنا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑا تھا اور اس کا قطر کم سے کم بھی دس فٹ تھا۔ وہ اس کے کھردرے حصے کو پکڑ کر اوپر آیا۔ کٹا ہوا تنا اوپر سے ہموار نہیں تھا اور اس کے وسط میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ جیف نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ بیلچہ چلانا شروع کیا اور مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے ابھی مشکل سے ایک فٹ مٹی ہٹائی ہوگی کہ بیلچہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے بیلچہ رکھا اور ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگا۔ جلد ایک سکڑا سمٹا ہوا ہاتھ سامنے آیا جس میں لمبی انگلیاں اور ان پر لمبے ناخن تھے۔ جیف مٹی ہٹانے لگا۔ جلد اس کے سامنے ایک عجیب الخلقت انسان کی لاش آ گئی۔ اس کا سر غیر معمولی بڑا اور جسم چھوٹا سا تھا۔ بالکل کسی آٹھ نو سال کے بچے جتنا مگر سر کسی بھی انسانی سر سے کہیں بڑا تھا۔ اس سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ لاش تقریباً ڈھانچا ہو گئی تھی مگر اس کی ساخت واضح تھی۔ جیف نے ابکائیاں روکتے ہوئے اسے باہر نکالا اور اٹھا کر میگاٹ کے جھونپڑے میں لے آیا جو باب کی لاش پر جھکی کچھ کر رہی تھی۔ اس نے جیف سے کہا۔

”اسے میز پر ڈال دو۔“

میز صاف تھی۔ میگاٹ نے اس سے تمام چیزیں اٹھا لی تھیں۔ جیف نے بڑے سر والے کی لاش میز پر ڈال دی۔ میگاٹ مڑی تو اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک پھیلے کناروں والا جام تھا اور اس میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ وہ جیف کے پاس آئی اور مطالبہ کیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

جیف نے ہاتھ آگے کیا تھا کہ اس نے نہایت پھرتی سے اس پر اپنا ناخن مارا۔ جیف کی ہتھیلی پر کٹ نمودار ہوا اور اس سے خون بہنے لگا جو میگاٹ جام میں جمع کرنے لگی۔ اب جام نصف کے قریب بھر گیا تھا۔ وہ گھومی اور اس نے بہت محبت سے جام لاش کے منہ سے لگا دیا اور اس کا سر اٹھاتے ہوئے جام اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ جیسے ہی خون اس

کے منہ میں گیا، اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور اسی لمحے جیف کو لگا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے۔ وہ سر تھام کر پیچھے گیا اور پھر اس نے دھندلاتی آنکھوں سے دیکھا کہ لاش میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ صرف حرکت نہیں بلکہ وہ بڑھ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قدآور عفریت میں بدل گئی۔ جیف اسے بھولا نہیں تھا حالانکہ اسے دیکھے ہوئے اٹھائیس سال گزر چکے تھے۔ پھر وہ چکرا کر نیچے گرا تو اسے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں کب اسے ہوش آیا تو کرسی پر بیٹھی میگاٹ نے کہا۔

"تمہارا کام ہوگیا ہے۔ اپنے بچے کو لے جا کر دفنا دو اور دیکھو، اس کے قاتل کیسے مارے جاتے ہیں۔"

بڑے سر والا غائب تھا۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا۔ جیف نے اٹھ کر باب کی لاش اٹھائی اور بہ مشکل اپنی گاڑی تک آیا۔ اس کا سر اب بھی چکرا رہا تھا۔ اس نے باب کی لاش ٹرک کی نشست پر ڈالی اور روانہ ہوگیا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ رہی تھی کیونکہ پہاڑوں کی طرف سے تیز ہوا چلنی شروع ہوگئی تھی۔ اچانک اس کا سر زور سے چکرایا اور اس نے بریک لگائے۔ گاڑی رکی تو جھٹکے سے اسے ہوش آیا اور تب اس نے دیکھا کہ باب برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اپنا خون آلود سر گھما کر جیف کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ڈیڈی! ہم کیوں رک گئے؟"

وہ چونکا اور پھر اس نے دیکھا تو باب کی لاش بدستور کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بولڈ ماؤنٹین کے قبرستان میں باب کے لیے قبر کھود رہا تھا۔ موسم کو دیکھتے ہوئے اسے اٹھائیس سال پہلے والی رات یاد آگئی، تب بھی موسم ایسا ہی طوفانی ہو رہا تھا۔ باب کی لاش دفناتے ہوئے وہ خود سے سوال کر رہا تھا کہ یہ میں نے کیا کیا؟

☆☆☆

رک غم زدہ تھا۔ اس نے میک سے کہا۔ "تم نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔"

"اپنا منہ بند رکھو۔" میک کا موڈ خراب ہوگیا۔ "یہ حادثہ تھا۔"

"لیکن اس کے بعد تم نے جو کیا وہ حادثہ نہیں تھا۔" مارش بھی بولا۔ "میرا خیال ہے اب اس پکنک کا کوئی جواز نہیں ہے اور ہمیں واپس جانا چاہیے۔"

"کوئی نہیں جائے گا۔" میک نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم کل فیصلہ کریں گے۔"

"تم فیصلہ کرتے رہنا۔" مارش کا لہجہ بھی بدل گیا۔ "پہلے تم نے دھوکے سے مجھ پر قابو پالیا مگر اب تم میرے پاس نہیں آسکتے۔"

مارش باہر جانے لگا تو رک اس کی طرف لپکا۔ "ابھی مت جاؤ، دیکھو موسم خراب ہو رہا ہے۔"

"میرا ٹرک ہر موسم میں سفر کرسکتا ہے۔" مارش نے فخر سے کہا اور باہر نکل آیا۔ فیرو اس کے ساتھ تھی۔ وہ سب بھی باہر آگئے۔ ہوا میں کاٹ تھی اور سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ رک اور ایملی انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میک کے ساتھ رون لاتعلقی سے ایک طرف کھڑی تھی۔ مارش انکار کرتا ہوا برآمدے سے اتر کر نیچے آگیا۔ اس نے کہا۔ "میں نہیں رک سکتا......"

ابھی اس کا جملہ منہ میں تھا کہ چھت سے ایک بڑا سا ہاتھ آیا اور اس نے مارش کا سر پکڑ کر اسے کسی کھلونے کی طرح اوپر کھینچ لیا۔ ایملی، فیرو اور رون کی چیخیں نکل گئیں۔ میک اور رک بھاگے مگر جب انہوں نے ڈھلان والی چھت پر دیکھا تو انہیں ایک سایہ دوسری طرف غائب ہوتا نظر آیا۔ وہ پیچھے کی طرف بھاگے تھے مگر اتنی دیر میں وہ نامعلوم جانور مارش کو کسی بچے کی طرح اچک کر لے جانے والا غائب ہوگیا تھا۔ کم سے کم انہیں لگا یہی تھا کہ وہ کوئی جانور ہے۔ رک نے کہا۔ "یہ کیا تھا...... کوئی ریچھ؟"

"پتا نہیں...... مگر ریچھ یہاں نہیں پایا جاتا۔" میک نے کہا اور اندر کی طرف بھاگا۔ "میں رائفل لینے جارہا ہوں۔ تم تلاش کرو۔"

رک پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ مکان کی طرف سے لڑکیوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اب آسمان پر بجلی چمکنے لگی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو رک نے دیکھا دور ڈھلان پر ایک عجیب الخلقت مخلوق نے مارش کو ٹانگ سے پکڑ کر الٹا لٹکایا ہوا تھا اور وہ بہ ظاہر بے حرکت تھا۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ رک کو کدو کے سر والے کا خیال آیا۔ دوسری بار بجلی چمکی تو وہ غائب تھا۔ اس دوران میں میک اندر سے رائفل لے آیا اور وہ اس طرف بھاگے جہاں رک کو مارش اور وہ چیز نظر آئی تھی۔ رک، میک کو بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا ہے مگر میک نے ماننے سے انکار کردیا۔ "وہ کوئی بڑے سر والا آدمی ہوگا۔ کدو کے سر والا صرف ایک ماورائی کردار ہے۔"

رک اسے یقین دلانے لگا کہ اس نے خود دیکھا تھا۔ انہوں نے آس پاس ہر جگہ دیکھ لیا مگر انہیں مارش یا کدو کے سر والا نظر نہیں آیا تھا۔ رک نے کہا۔ "ہمیں پولیس کو کال

کرنی ہوگی۔"

"پولیس کیا کرلے گی؟" میک بولا۔ "ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔"

اچانک انہیں کیبن کی طرف سے لڑکیوں کے چلانے کی آواز آئی تو وہ پلٹ کر بھاگے اور جب وہ کیبن کے سامنے پہنچے تو انہوں نے مارش کو بری طرح ادھڑا ہوا پڑا پایا۔ فیرو رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "مارش مر گیا ہے۔"

رک نے اس کی نبض دیکھی۔ مارش واقعی مر چکا تھا۔ اس نے جھکے ہوئے انداز میں کہا۔ "اسے اندر لے چلو۔"

میک اور رک مارش کی لاش اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے کہ اچانک فیرو کی چیخ سنائی دی۔ اس کا سر اسی بڑے سے ہاتھ نے پکڑا ہوا تھا جو مارش کو لے گیا تھا اور پھر وہ فیرو کو بھی مارش کی طرح اچک کر چھت پر لے گیا۔ رک اور میک لاش چھوڑ کر بھاگے اور کیبن کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگے کہ فیرو کہاں ہے۔ رون اور ایملی ان کے ساتھ تھیں۔ اچانک ایملی چلائی۔ "وہ دیکھو۔"

کیبن کے ساتھ بنے ایک بہت بلند درخت کے اوپری حصے میں بڑے سر والا فیرو سمیت موجود تھا۔ اس کا چہرہ حیوانی تھا اور وہ بھیانک انداز میں ہنس رہا تھا۔ اچانک اس نے فیرو کو چھوڑ دیا اور وہ ایک طویل چیخ کے ساتھ نیچے موجود پتھر پر آگری اور فوراً مرگئی کیونکہ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف بھاگے۔ لڑکیاں رو رہی تھیں اور وہ دونوں غصے میں تھے۔ میک نے جب رائفل اوپر کی تو بڑے سر والا درخت سے غائب تھا۔ رک کی حالت بری تھی۔ اس نے میک سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یہ وہی بلا ہے۔ ہم سب کو مار دے گی۔"

وہ فیرو کی لاش بھی اٹھا کر اندر لے آئے اور اسے مارش کی لاش کے ساتھ رکھ کر ایک ہی چادر سے ڈھانپ دیا۔ چند منٹ میں وہ اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہوگئے تھے۔ انہوں نے کیبن کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ ان کے پاس ایک رائفل اور ایک پستول تھا۔ پستول رک نے لے لیا۔ میک نے کہا۔ "ہمیں گاڑیوں تک پہنچنا ہوگا۔ ایک بار ہم وہاں پہنچ گئے تو پھر یہاں سے نکل سکیں گے۔"

"تو انتظار کس کا ہے، ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔" رون بولی۔ وہ زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ چاروں محتاط انداز میں باہر آئے۔ اچانک رون نے کہا۔ "میرا پرس اندر ہے۔"

"جلدی سے آؤ۔" رک نے کہا۔ رون اندر چلی گئی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں آجانا چاہیے تھا مگر اس سے اوپر وقت ہو گیا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تو رک اندر گیا۔ لاؤنج میں سناٹا تھا اور وہاں صرف مارش اور فیرو کی لاشیں چادر تلے پڑی تھیں۔ اچانک ایک بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور رون اس سے دھڑام سے آکر باہر گری۔ اس نے رک کو دیکھا اور چلائی۔ "مجھے بچاؤ۔"

تب رک نے اس کے پیچھے اسی بڑے سر والے عفریت کو دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے اندر آیا تھا اور اس نے رون کو دبوچ لیا تھا۔ اس نے جھک کر رون کی ٹانگیں پکڑیں اور اسے کھینچ کر لے گیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میک اور ایملی دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ میک نے سکتے میں کھڑے رک کو جھنجوڑا۔ "کیا ہوا؟"

"وہ...... وہ رون کو لے گیا۔" رک نے بہ مشکل کہا۔ بیڈ روم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایملی نے اندر آتے ہوئے کچن کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا اور اب انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چھت پر کوئی چیز چل رہی ہو۔ پھر عفریت رون سمیت کچن والی طرف سے نیچے کودا۔ اس نے رون کا سر پکڑ رکھا تھا اور اس کا چہرہ کچن کی کھڑکی کے شیشے سے دبا رہا تھا۔ وہ کرب سے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میک چلایا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے؟"

اچانک عفریت نے رون کو پیچھے کیا اور پھر زور سے کھڑکی پر مارا تو وہ کھڑکی توڑتی ہوئی اندر آگری۔ میک کے منہ سے چیخ نکلی، وہ رون کی طرف بھاگا۔ اس نے خون میں ڈوبی رون کو سیدھا کیا مگر وہ مر چکی تھی۔ شیشوں نے اسے بری طرح کاٹ دیا تھا۔ میک دھاڑیں مار کر رونے لگا تو باہر سے عفریت نے حیوانی قہقہہ لگایا۔ ایملی رو رہی تھی اور رک ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ چونکا۔ "ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک اس درندے کو مار نہیں دوں گا۔" میک نے کہا اور رون کی لاش فرش پر ڈال کر اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ رک نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا۔

"وہ درندہ نہیں ہے، وہ کدو کے سر والا ہے۔ ہم یا کوئی انسان اسے مار نہیں سکتا۔"

"صرف وہی انسان اسے مار سکتا ہے جس کا خون اسے زندہ کرتا ہے۔" ایملی بولی۔ "میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہوا ہے۔ رک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلنا چاہیے۔"

"چلو۔" رک نے میک کو پکڑ کر کھینچا اور وہ تینوں کچن سے باہر نکل آئے اور پھر تیزی سے اس جگہ کی طرف بھاگے جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں مگر جب وہ گاڑیوں کے پاس آئے تو ٹھٹک گئے۔ دونوں گاڑیوں کی حالت بری تھی۔ ان کی باڈی پچک گئی تھی اور سارے ٹائر تباہ ہو گئے تھے۔ شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ رک کی بائیک جسے وہ یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کی حالت زیادہ خراب تھی وہ تڑمڑ کر گیند کی صورت میں ہو گئی تھی۔ میک نے پک اپ پر کھڑی اپنی بائیک اتاری اور کک مار کر اسے اسٹارٹ کیا تو وہ اسٹارٹ ہو گئی مگر جب اس نے ایکسلریٹر دیا تو بائیک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ تب انہیں وہی حیوانی ہنسی سنائی دی اور انہوں نے ایک طرف کھڑے عفریت کو دیکھا۔ بائیک کی چین اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایملی ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ عفریت نے ہاتھ میں موجود زنجیر گھما کر میک کو ماری۔ وہ بائیک سے الٹ کر دور جا گرا۔ اسے شدید ضرب آئی تھی مگر وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے رائفل اٹھاتے ہوئے عفریت کا نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میک نے دوبارہ گولی چلائی۔ اس بار بھی عفریت پیچھے گیا۔ مگر پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ایملی کی چیخیں ایک بار پھر تیز ہو گئیں۔

☆☆☆

جیف نے قبر ہموار کی اور بیلچہ ایک طرف پھینک کر سر ہاتھوں سے تھام لیا۔ "یہ میں کیا کر رہا ہوں؟"

جب تک وہ باب کی قبر کھود کر اسے دفن کرتا، اسے رہ رہ کر سر چکرانے کے دورے پڑتے رہے۔ اس وقت اسے لگتا جیسے اس کا تعلق آس پاس کے ماحول سے کٹ گیا ہے۔ چند منٹ میں وہ ٹھیک ہو جاتا۔ اس دورے میں اسے لگتا کہ وہ کچھ کر رہا ہے اور جیسے کسی کو مار رہا ہے لیکن اسے کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک اسے چلانے کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے مرد اور عورتیں چلا رہے ہوں۔ اس کے بعد فائرز کی آواز آنے لگی۔ جیف تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس نے اپنے ٹرک میں موجود شاٹ گن نکالی اور درختوں میں گھس گیا جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں نزدیک آگئی تھیں اور ان میں ایک عورت کی چیخوں کی آواز نمایاں تھی۔

☆☆☆

"اس پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا۔" رک بولا۔ "یہاں سے نکلو۔"

مگر عفریت اس دوران میں ان کے پاس آگیا تھا۔ اس نے میک کا گلا دبوچ لیا۔ پھر وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ فائر کی آواز آئی تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ دور کھڑا جیف شاٹ گن سے عفریت پر فائر کر رہا تھا۔ شاٹ گن کی گولی زیادہ طاقت ور تھی اور عفریت کے پنجے سے میک کا گلا چھوٹ گیا۔ دوسرے فائر پر وہ مزید پیچھے گیا اور تیسرے فائر پر وہ دھڑام سے نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ جیف نے شاٹ گن میں خالی ہونے والے کارتوس کی جگہ نئے کارتوس ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟"

"اس درندے نے ہمارے تین ساتھی مار دیے ہیں۔" رک بولا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ "مسٹر ہارلے! یقین کرو تمہارے بچے کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے کتے کے پیچھے بھاگتا ہوا رائیڈنگ رینج میں آگیا تھا اور ہمیں بالکل پتا نہیں چلا۔"

جیف کا چہرہ ست گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونے کے چند سکے دے کر ایک ایسا عفریت حاصل کر لے گا جو اس کے بچے کے قاتلوں سے اتنا بھیانک انتقام لے رہا تھا۔ میک نے رک کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ "اتنی وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مسٹر ہارلے۔" ایملی بولی۔ "یہ کدو کے سر والا ایک ماورائی کردار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آتا ہے جن پر نشان لگایا جائے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں آیا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" جیف نے آہستہ سے کہا۔ "اب یہ مر چکا ہے۔"

"یہ نہیں مرا ہے۔" ایملی بولی۔ "یہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس کا مشن پورا نہیں ہو جاتا یا اس کا ماسٹر نہیں مر جاتا۔"

جیف چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کیا اس عفریت کا ماسٹر وہ تھا؟ اس نے ایملی سے کہا۔ "لگتا ہے تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ اس کا ماسٹر کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ جس کا خون اسے زندگی بخشتا ہے۔" ایملی بولی۔ اس دوران میں میک عفریت کے پاس چلا گیا تھا۔ رک نے اس سے کہا۔

"آگے مت جاؤ۔"

"میک! واپس آؤ۔" ایملی بولی۔ "یہ مرا نہیں ہے۔"

میک نے رائفل کی نال کا رخ عفریت کے بڑے سے سر کی طرف کر کے گولی چلا دی اور ان کی طرف دیکھا۔ "اب یہ مر چکا ہے۔"

مگر اسی لمحے عفریت نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر گرا اور اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا عفریت نے اٹھتے ہوئے اس سے رائفل چھین لی۔ رک اور ایملی چلا رہے تھے۔ جیف نے دوبارہ شاٹ گن عفریت کی طرف سیدھی کی تھی کہ اسے جھٹکا سا لگا اور ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے ڈولنے لگا۔ عفریت نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے رائفل میک کے سینے کی طرف کی لیکن گولی چلانے کے بجائے اچانک رائفل کی نال بہت قوت سے اس کے سینے میں اتار دی اور پھر اسے نال میں پرو کر اوپر اٹھا لیا۔ رک چلایا اور میک کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ایملی اس سے چمٹ گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر اس سے وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت دم توڑتے میک کو اوپر کیے ہوئے اپنی مخصوص شیطانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ جیف چکرا کر گرا تو عفریت نے میک کو رائفل سمیت ایک طرف پھینک دیا۔

ایملی اور رک ایک طرف بھاگ نکلے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان اندھا دھند دوڑ رہے تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ایملی کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں اور رک بھی بھائی کا سوگ منا رہا تھا مگر وہ رک نہیں سکتے تھے۔ موت ان کے پیچھے تھی اور انہیں ہر صورت عفریت سے دور جانا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ شاٹ گن کی مہلک گولیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔ ایسے میں اس کے سامنے رکنا حماقت اور خودکشی ہی ہوتی۔ اچانک انہیں کچھ دور روشنیاں نظر آئیں۔ ایملی نے کہا۔ "وہ...... اس طرف آبادی ہے۔"

وہ بھاگتے ہوئے اس قصبے تک پہنچے جو ترتیب در ڈھلان پر آباد تھا۔ یہاں مکان قدیم طرز کے تھے اور خاصے خستہ حال تھے۔ گاڑیاں بھی پرانی کھڑی تھیں۔ ایملی نے راستے میں آنے والا پہلا دروازہ بجایا اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ مگر اندر سے کوئی جواب ملنے کے بجائے مکان کی روشنیاں بھی بند ہو گئیں۔ رک اور ایملی دوسرے مکانوں کی طرف بڑھے۔ وہ باری باری دروازے بجا رہے تھے اور اپنے اوپر گزرنے والی روداد سناتے ہوئے پناہ مانگ رہے تھے۔ مگر کسی مکان سے نہ تو کوئی نکلا اور نہ ہی کسی نے جواب دیا۔ وہ رابرٹ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اندر پیچھے کے کمرے میں موجود بریڈ نے اپنی بہن ماریا سے کہا۔ "میں انہیں جانتا ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں ہارلے کے اسٹور پر ملے تھے۔"

"ان کے پیچھے کون ہے؟"
بریڈ نے گہری سانس لی اور بولا۔ "کدو کے سروالا۔"
ماریا بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ بریڈ نے اسے نہیں بتایا کہ اسی نے جیف کی میگاٹ کے ٹھکانے تک راہنمائی کی تھی اور اس کے بدلے رقم لی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا تھا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے گا۔ اس نے اپنا اوور آل اور جوتے پہنے۔ ماریا بے چین ہو گئی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"
"باہر لیکن تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔" اس نے کہا اور چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ گھوم کر مکان کے سامنے والے حصے میں آیا اور ہلکی سی آواز نکال کر رک اور ایملی کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اسے دیکھا تو لپک کر آئے۔ رک نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔
"یہاں کیسے لعنتی لوگ رہتے ہیں جو کسی کی مدد بھی نہیں کر سکتے۔"
"کوئی اس وقت باہر نہیں نکلے گا۔" بریڈ نے کہا۔ "لیکن میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔"
"کوئی کیوں ہماری مدد کے لیے باہر نہیں آ رہا؟"
"کیونکہ وہ سب بڑے سر والے سے ڈرتے ہیں۔" بریڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ "جو اس کے اور اس کے شکار کے درمیان میں آتا ہے، وہ اسے بھی ختم کر دیتا ہے۔ جو اپنے گھر میں رہتا ہے وہ اسے کچھ نہیں کہتا۔ اس لیے کوئی اس وقت باہر نہیں آئے گا۔"
"تب تم کیوں آئے ہو؟"
"شاید میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔" اس نے کہا اور مڑ گیا۔ "میرے ساتھ آؤ۔"
"لیکن کہاں؟"
"تم دیکھ لو گے، وقت کم ہے جلدی آؤ۔"
"اس کے پیچھے چلو۔" ایملی نے کہا تو رک مجبور ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ بریڈ بھاگتے ہوئے آگے جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ قصبے سے نکل کر اوپری جنگل کی طرف آیا۔ وہ دونوں فکرمند ہو گئے۔ رک نے کہا۔
"یہ کہاں لے جا رہا ہے؟ کہیں ہمیں پھنسا نہ دے۔"
اسی لمحے انہیں لکڑی کا بنا ہوا غیر آباد ہو جانے والا چرچ دکھائی دیا۔ اس کی دیواروں اور چھت کی بیشتر لکڑی گر گئی تھی اور چاروں طرف خلا تھے۔ سامنے کا دروازہ سرے سے غائب تھا۔ بریڈ اس کے دروازے پر رکا اور مڑ کر بولا۔ "آؤ جلدی آؤ۔"

وہ اس کے پاس آ کر ہانپتے ہوئے بولے۔
"تمہارے خیال میں یہ محفوظ جگہ ہے؟"
"ہاں، وہ یہاں نہیں آ سکتا۔" بریڈ نے یقین سے کہا اور چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ رک کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ یہ کھنڈر جو انہیں ہوا بارش اور سردی سے نہیں بچا سکتا تھا، وہ اس خون آشام عفریت سے بچائے گا۔ مگر ان کے پاس بریڈ پر اعتماد کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اندر آئے اور ایک سلامت بنچ پر بیٹھ گئے۔ ایملی نے پوچھا۔
"یہ کیا چکر ہے؟ وہ ہمارے پیچھے کیوں ہے؟"
"تم لوگ نشان زدہ ہو۔" بریڈ بولا۔
"نشان زدہ کیا مطلب؟"
"میں نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ میگاٹ جن لوگوں کے لیے بڑے سر والے کو زندہ کرتی ہے، وہ نشان زدہ ہوتے ہیں۔ وہ ان سب کو ختم کر دیتا ہے۔"
"میگاٹ کون ہے؟"
"ایک بوڑھی عورت ہے جس کو سو سال سے اوپر ہو گئے پر زندہ ہے۔" بریڈ نے انکشاف کیا۔ "بڑے سر والا اصل میں اس کا بیٹا ہے۔"
ایملی چونکی۔ "کیا مطلب...... وہ سچ کا انسان ہے؟"
"تھا۔" بریڈ نے کہا۔ "وہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے کی بات ہے۔ میگاٹ کا شوہر یورپ جنگ لڑنے گیا تھا، تب اس کے ہاں بڑے سر والے عجیب الخلقت بچے کی پیدائش ہوئی۔ مقامی لوگوں نے اسے کدو کے سر والا قرار دیا۔ انہوں نے میگاٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ قصبہ چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ بچے کو لے کر دلدل کے علاقے میں چلی گئی مگر اس پر بھی لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تب ایک دن انہوں نے رات کو اس کے جھونپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی۔ اتفاق سے میگاٹ بیمار بچے کی دوا لینے پاس موجود ایک انڈین وچ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ وہ واپس آئی تو جھونپڑا اور اس میں موجود اس کا بیٹا جل چکا تھا۔ میگاٹ نے بچے کو وہیں کہیں دفن کر دیا اور اس کے بعد وہ انڈین ڈاکٹر سے جادوگری سیکھنے لگی۔ جب اس کا شوہر جنگ سے واپس آیا اور اسے پتا چلا کہ اس کے خاندان پر کیا گزری ہے تو وہ پاگل ہو گیا اور اس نے ان لوگوں کو مارنے کی کوشش کی جنہوں نے اس کے گھر پر حملہ کر کے اسے جلا دیا تھا۔ قاتلوں کو مارنے کی کوشش میں میگاٹ کا شوہر اپنی جان سے گیا اور اس کا قاتل وہاں سے بھاگ گیا۔
"پھر ایک طوفانی رات بولڈ ماؤنٹین کے لوگوں نے

بڑے سر والے کو دیکھا۔ وہ چن چن کر ان لوگوں کو مار رہا تھا جنہوں نے میگاٹ کے جھونپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ لگائی تھی۔ اس رات بولڈ ماؤنٹین میں بارہ افراد مارے گئے تھے۔ مگر مقامی لوگوں نے کسی ایک کی بھی پولیس رپورٹ نہیں کرائی اور ان کو خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ پھر برسوں گزر گئے اور کدو کے سر والے کا نام سننے میں نہیں آیا۔ میگاٹ کے شوہر کا قاتل جو یہاں سے بھاگ گیا تھا، وہ برسوں بعد آیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے آنے کے کچھ عرصے بعد لوگوں نے پھر بڑے سر والے کو دیکھا اور اس نے قاتل کو مار دیا۔ البتہ اس کا بیٹا اور بیوی علاقے سے باہر ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ پھر قاتل کا بیٹا سام واپس آیا اور یہاں رہنے لگا مگر جب وہ چالیس سال کا تھا، تب اس نے میگاٹ کو مارنے کی کوشش کی۔ وہ اسے اپنے باپ کا قاتل سمجھتا تھا۔ سام ناکام رہا اور پھر بڑے سر والا آیا اور اس نے سام کو مار دیا۔ اس بات کو اٹھائیس برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔"
"مگر کیوں؟ وہ ہمارا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟ ہم نے کیا کیا ہے؟" رک بولا۔ "اس نے میک، مارش، فیرو اور رون کو مار دیا۔ ہمارے سامنے انہیں لے گیا اور پھر قتل کر دیا۔ اس پر کوئی الزام نہیں آیا۔"
ایملی نے رک کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے میں سمجھتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟"
رک نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اسے بھی اس معصوم بچے کا خیال آیا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن وہ صرف حادثہ تھا۔"
"ہاں لیکن اس شخص کا سوچو جس کی کُل کائنات یہی ایک بچہ تھا۔" ایملی بولی۔ "آخر اسے کیسے پتا چلا کہ ہمارے ساتھ کیا گزر رہی ہے اور وہ مدد کے لیے آ گیا تھا۔"
"اگر یہ اس نے کیا ہے تو وہ مدد کے لیے کیوں آیا؟"
"شاید وہ پچھتا رہا ہے۔" ایملی بولی۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجے اور آسمان روشن ہو گیا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ عفریت چرچ کے سامنے کھڑا ہے۔

☆☆☆

جیف بہ مشکل چل رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم میں کوئی چیز ہے جو رہ رہ کر اسے اندر سے میس کر رہی ہے۔ تکلیف اور سر چکرانے کی وجہ سے اس کے لیے چلنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پک اپ نہیں لی تھی۔ وہ پیدل ہی دلدل کے درمیانی راستوں سے گزر رہا تھا۔ درحقیقت بولڈ ماؤنٹین کا سارا علاقہ پاس پاس ہی ہے، صرف گاڑی سے سفر کے لیے طویل راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ دلدل میں ہر جگہ گاڑی گزرنے کا راستہ نہیں بن سکتا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا اور اگر بجلی رہ رہ کر نہ چمک رہی ہوتی تو اسے راستہ نظر نہ آتا۔ اس کا رخ دلدل کے اوپری حصے کی طرف تھا۔ بالآخر وہ میگاٹ کے جھونپڑے تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر کی طرف گیا۔ اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میگاٹ بدستور اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھے بغیر پوچھا۔
"اب کیوں آئے ہو؟"
"میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔" جیف نے اپنا پیٹ پکڑ کر اینٹھتے ہوئے کہا۔ "اسے روکو۔"
"اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔" میگاٹ نے جواب دیا۔ "جب وہ ایک بار زندہ ہو جائے تو اپنا کام مکمل کرنے تک نہ مرتا ہے، نہ واپس جاتا ہے۔"
"میں کیا کروں؟"
"تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔"
جیف نے شاٹ گن کا رخ میگاٹ کے سر کی طرف کر دیا، اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" اچانک میگاٹ نے کہا۔ "تم مجھے مار سکتے ہو لیکن اسے نہیں روک سکتے۔"
جیف نے گہری سانس لی اور شاٹ گن شانے پر لٹکاتے ہوئے جھونپڑے سے نکل گیا۔ اس کا رخ اب اپنے گھر کی طرف تھا۔ اس بار بھی وہ دلدل کے درمیان موجود شارٹ کٹ راستوں سے گزر رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اپنے گھر کے سامنے تھا۔ کسی زمانے میں یہاں اس کے باپ کا فارم ہوتا تھا مگر پھر دلدل نے زمین خراب کر دی اور اسے فارم ختم کرنا پڑا تھا۔ اس نے ہائی وے پر گروسری اسٹور کھول لیا۔ اس کے بعد جیف یہ اسٹور چلانے لگا تھا مگر اس کے بعد اسے چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید اسے بھی اب چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ باپ کے لیے ہی تو سب کرتا تھا۔ جیف گھر کے بجائے اصطبل کی طرف بڑھا۔ اب اصطبل کی جگہ جیف کی ورکشاپ تھی جہاں وہ مختلف کام کرتا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا اور ایک کونے میں رکھے فائر سلنڈر کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی مدد سے اپنے گھر اور فارم کے آس پاس اگ آنے والی فالتو جھاڑیاں جلا دیتا تھا۔ ڈبل سلنڈر اٹھا کر اس نے چیک کیا۔ آکسیجن والا سلنڈر خالی تھا۔ وہ اس کے نٹ بولٹ کھولنے لگا۔ اس کی جگہ

اسے دوسرا ایلینڈر لگا تا تھا۔ اچانک اس کا سر ڈولنے لگا اور آنکھوں کے آگے ماحول سرخ سا ہو گیا۔

☆☆☆

بوڑھی میگاٹ آنکھیں بند کیے زیر لب کہہ رہی تھی۔

”میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔ تم ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لو گے۔ بس دو شکار اور ہیں۔ اس کے بعد تمہیں پھر کوئی نہیں مار سکے گا اور اس علاقے پر تمہاری حکومت ہو گی۔ یہاں کا ہر شخص تمہارا غلام ہو گا۔“

یہ کہہ کر میگاٹ کچھ پڑھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر عفریت کی راہنمائی کر رہی ہے۔

☆☆☆

ایملی کی چیخ نکل گئی۔ وہ ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔“

رک اس سے متفق تھا۔ اس نے بریڈ سے کہا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ یہ یہاں تک نہیں آ سکے گا مگر یہ آ گیا ہے۔“

”یہ شاید اندر نہ آ سکے۔“ بریڈ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ”میں خود اس کے بارے میں نہیں جانتا، صرف دوسروں سے سنا ہے۔“

عفریت چرچ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں مسلسل بجلی چمکنے سے ماحول نیلگوں روشنی میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ ایملی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اشارہ کیا۔ ”اس کا چہرہ دیکھو، پہلے یہ درندوں جیسا تھا مگر اب اس پر انسانوں جیسے نقوش آ گئے ہیں۔“

رک نے غور کیا تو واقعی اس کا چہرہ اب انسانوں جیسا ہو رہا تھا۔ اسے اس کے نقوش جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ اچانک وہ بولا۔ ”میرے خدا! اس کا چہرہ تو مسٹر بارلے جیسا ہو رہا ہے۔“

”تب یقیناً اسے جیف بارلے کے خون سے زندہ کیا گیا ہے۔“ بریڈ بولا۔ ”وہی اس کا ماسٹر ہے۔“

”یعنی وہ اسے قابو کر رہا ہے۔“

”نہیں، ماسٹر سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی جیف کی وجہ سے ہے۔ جب تک جیف زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہے گا اور جیف مر جائے گا تو وہ بھی مر جائے گا۔“ بریڈ نے کہا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ رک چلایا کیونکہ عفریت آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ ہچکچا رہا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی اس نے چرچ کی حد میں قدم رکھا، وہ تینوں دوسری سمت سے نکل بھاگے۔ رک آگے تھا اور وہ ایملی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ بریڈ ان کے پیچھے تھا۔ وہ اب نیچے کی طرف جا رہے تھے۔ تیز ہوا کی وجہ سے مٹی اڑ رہی تھی اور انہیں آنکھیں کھولے رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ نہ تو رک سکتے تھے اور نہ آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ اس لیے تکلیف برداشت کرتے اور گرتے پڑتے بھاگے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ نیچے آ رہے تھے، دلدلی زمین کم ہوتی جا رہی تھی اور درختوں کے بجائے خشک صحرائی جھاڑیاں زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں اِکا دُکا درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ ایملی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہمیں کسی سڑک تک یا ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں سے ہم پولیس کو کال کر سکیں۔“ رک نے جواب دیا اور مڑ کر دیکھا۔ بریڈ ان سے کچھ دور تھا۔ کیونکہ عفریت نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے انہوں نے رفتار ذرا کم کر لی۔ ورنہ اس سے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ بریڈ ان کے پاس آ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”زور سے بھاگتے رہو۔ [illegible] سے جتنا دور نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔“

”مگر کیسے؟ ہم مسلسل نہیں بھاگ سکتے اور یہاں کوئی گاڑی نہیں ہے۔“

”وہ رہی گاڑی۔“ بریڈ نے دور سڑک پر کھڑے جیف کے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس کی طرف بھاگے۔ ان کا خیال تھا کہ جیف بھی ٹرک میں ہو گا مگر ٹرک خالی تھا۔ وہ تینوں ٹرک کے کیبن میں گھسے۔ اگنیشن میں چابی نہیں تھی۔ انہوں نے تلاشی لی تو ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک اضافی چابی نکل آئی۔ رک نے جلدی سے اسے اگنیشن میں لگایا اور گھما کر انجن اسٹارٹ کیا تھا کہ اس کی طرف کا شیشہ ٹوٹا اور عفریت کا ہاتھ اندر آیا۔ اس نے رک کا سر پکڑا اور اسے کسی کھلونے کی طرح باہر کھینچ لیا۔ ایملی چلانے لگی۔ وہ دوسری طرف سے اترنے لگی مگر بریڈ نے اسے پکڑ لیا۔ ”نہیں، وہ اسے لے گیا ہے۔ تم بھی ماری جاؤ گی۔ ٹرک اسٹارٹ ہے۔ یہاں سے نکلو۔“

ایملی کی حالت بری تھی مگر بریڈ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ انہیں یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ رک کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ

سنبھالی اور گیئر لگا کر ٹرک آگے بڑھا دیا۔ بریڈ مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس نے دیکھا کہ عفریت رک کو سر سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ان کے پیچھے آرہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”جلدی کرو، وہ پیچھے آرہا ہے۔“

یہ راستہ جیف کے فارم کی طرف جارہا تھا اور چند منٹ بعد وہ فارم تک پہنچ گئے۔ بریڈ نے ایملی کو بتایا۔ ”یہ جیف کا فارم ہے۔“

”شاید وہ یہیں ہے۔“ ایملی نے ٹرک روک دیا۔ ”وہی اس عفریت کو زندہ کرنے کا ذمے دار ہے۔ اب جیف کو ہی اسے روکنا ہوگا۔“

وہ دونوں نیچے آئے اور پھر اصطبل کا کھلا دروازہ دیکھ کر آگے بڑھے۔ اندر معمولی سی روشنی تھی اور کہیں کہیں اندھیرا تھا۔ بریڈ نے آواز دی۔ ”مسٹر بارلے...... کیا تم یہاں ہو؟“

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ ایملی آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ جیف ایک کونے میں کھڑا ہوا کچھ کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جیف......“

”تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“ جیف مڑے بغیر بولا۔ وہ اوزار لیے ہوئے سیلنڈر بدل رہا تھا۔ اس کی آواز عجیب سی ہورہی تھی۔

”ہم کہاں جائیں؟ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ایملی بولی۔ ”وہ ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے رک کو بھی پکڑ لیا ہے۔“

جیف اس کی طرف مڑا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”صرف تمہارے افسوس سے کام نہیں چلے گا۔“ ایملی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے اسے زندہ کیا ہے اور اب تم ہی اسے مار سکتے ہو۔“

”میں اسی کی تیاری کررہا ہوں۔“ جیف نے سیلنڈر کا آخری نٹ بھی لگایا اور اس کا نوزل پائپ اٹھا کر اسے تیلی سے آگ دکھائی۔ فوراً ہی سرسراتا ہوا تیز شعلہ نوزل سے نکلنے لگا۔ ”میں اسے جلا کر ختم کردوں گا۔“

”شاید آگ اسے ختم کردے۔“ ایملی بولی۔ ”اس کی اصل موت بھی جلنے سے واقع ہوئی تھی۔“

جیف نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”مجھے بریڈ نے بتایا ہے۔“ ایملی نے کہا اور مڑ کر دیکھا۔ ”وہ میرے ساتھ ہے۔“

مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بریڈ شاید بھاگ نکلا تھا۔ باہر اب بجلی بہت تیزی سے چمکنے لگی تھی۔ جیف نے باہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ آگیا ہے۔“

اس نے سیلنڈر اٹھا کر شانے پر ٹانگا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اسے چکر آنا شروع ہوگئے اور وہ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے میز کا سہارا لے کر اس پر جھک گیا۔

☆☆☆

بریڈ نے عفریت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اصطبل سے نکلا اور اس کے برابر میں موجود اسٹور روم میں گھس گیا۔ عفریت نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ زخمی اور نیم بے ہوش تھا۔ اسٹور کا دروازہ بجا تو عفریت نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اسٹور کی طرف بڑھا۔ بریڈ اندر گھس کر ایک الماری میں چھپ گیا۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کوئی آواز نہ نکلے۔ اسٹور کا دروازہ آواز سے کھلا اور الماری کے دروازے کے رخنوں سے بریڈ نے عفریت کا بڑا سا سر اندر آتے دیکھا۔ اس پر انسانی خدوخال بہت نمایاں ہوگئے تھے اور یہ تقریباً جیف جیسے تھے۔ فرق صرف سکڑی سمٹی سرخ کھال اور سائز کا تھا۔ اس کا سر کسی بھی انسانی سر سے دوگنا بڑا تھا۔ اس کی آنکھیں متحرک یا سانپ جیسی تھیں۔ عفریت اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک باہر سے ایملی کے چلانے کی آواز آئی تو عفریت نے سر گھما کر دیکھا۔ ایملی نے رک کو دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ عفریت غرایا اور اس نے اچانک الماری کا دروازہ کھول کر بریڈ کو باہر کھینچ لیا۔ وہ خوف سے چیخ اٹھا مگر عفریت نے اسے کچھ کہا نہیں، صرف کھینچتا ہوا باہر لایا اور میدان کی طرف پھینک دیا۔

ایملی نیم بے ہوش رک کو اٹھانے کی کوشش کررہی تھی۔ بریڈ اٹھ کر ایک طرف بھاگا مگر عفریت نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ ایملی اور رک کی طرف بڑھا۔ ایملی چلا رہی تھی اور رک سے ہوش میں آنے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت کو نزدیک آتے دیکھ کر ایملی نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا۔ عفریت نے اسے سر سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ ایملی اصطبل کی طرف بھاگی جہاں جیف ابھی تک میز پر جھکا ہوا تھا۔ ایملی نے چلا کر کہا۔ ”خدا کے لیے وہ رک کو مار دے گا۔“

مگر جیف میز پر جھکا ہوا عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایملی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھی۔ ”جیف، تم سن رہے ہو؟“

”ہاں۔“ جیف نے عجیب سی آواز میں کہا اور اچانک گھوما تو ایملی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ جیف کی آنکھیں بالکل عفریت جیسی ہورہی تھیں اور چہرے کے تاثرات حیوانی تھے۔ ”اب بس تم بچی ہو۔“

ایملی باہر کی طرف بھاگی۔ جیف اس کے پیچھے نکل آیا تھا۔ اس نے سیلنڈر اتار رکھا تھا وہ عفریت کی طرف بڑھا مگر وہ عفریت کے لیے نہیں جارہا تھا۔ اس نے نوزل کا شعلہ تیز کیا اور آگے بڑھا تھا کہ اس کا ہاتھ وہاں دستے کے بل زمین میں گڑے کانٹے سے ٹکرایا اور کانٹا اس کی کلائی میں گھس گیا..... یہ گندم اور ریشے الگ کرنے کے کام آتا تھا۔ جیسے ہی کانٹا جیف کی کلائی میں گھسا، عفریت نے دھاڑ ماری اور اپنا ہاتھ دیکھا۔ اسی ہاتھ سے اس نے رک کا سر تھاما ہوا تھا۔ اس سے سر چھوٹا تو رک نیچے گرا اور رینگ کر اس سے دور جانے لگا۔ جیف کو درد کا احساس ہوا تو اس نے اپنی کلائی دیکھی اور پھر اسے آزاد کرانے کے لیے کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ بازو ہلا رہا تھا، عفریت کا بازو بھی ویسے ہی ہل رہا تھا۔ کوشش میں ناکامی کے بعد جیف نے سیلنڈر اتار پھینکا اور پھر دوسرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنا پھنسا ہوا ہاتھ کانٹے سے نکال لیا۔

ایملی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوڑ کر سیلنڈر اٹھا لیا اور شعلے کا رخ عفریت کی جانب کردیا جو اب ایملی کے پاس آرہا تھا۔ شعلے اس سے ٹکرائے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیف ہاتھ تھام کر لڑکھڑاتا ہوا اصطبل کی طرف چلا گیا۔ ایملی پیچھے ہوتے ہوئے عفریت پر شعلے برسا رہی تھی اور یہ آگ اس کا کچھ بگاڑنے سے قاصر تھی۔ اس کی صورت بالکل جیف جیسی ہوگئی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ مارا اور ایملی کے ہاتھ سے پائپ نکل گیا۔ اس نے گردن سے دبوچ کر ایملی کو آگے کیا اور اس کے شانے سے سیلنڈر اتار لیا۔ پھر اس نے پائپ اٹھایا جس سے بدستور شعلہ نکل رہا تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ایملی کو دیکھا تو وہ اس کے عزائم بھانپ کر لرز اٹھی۔

جیف لڑکھڑاتا اور کراہتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اوزاروں والی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا چھوٹا سا ریوالور نکال لیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا اور ریوالور سر سے لگا کر فائر کردیا۔ فائر کی آواز باہر تک آئی اور عفریت جس نے ایملی کا گلا دبوچا ہوا تھا اور شعلہ اس کے چہرے کی طرف لا رہا تھا، اس نے عجیب سی آواز نکالی اور نیچے گر کر ساکت ہوگیا۔ ایملی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور اپنی سانس بحال کرنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ عفریت اچانک کیوں گرا اور اندر سے فائر کس نے کیا تھا۔ گولی عفریت کو نہیں لگی تھی اور لگتی بھی تو بیکار تھی کیونکہ اس پر گولی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں اندر سے جیف لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آیا اور ایملی کے سامنے زمین پر بالکل اسی انداز میں ڈھیر ہوگیا جیسے عفریت گرا ہوا تھا۔ ایملی نے دیکھا اس کا چہرہ بھی ویسا ہی ہورہا تھا۔ اس کی کنپٹی میں گولی کا سوراخ تھا مگر وہ ابھی زندہ تھا۔

اب ایملی کی سمجھ میں آیا کہ عفریت کیوں گرا تھا۔ یہ بات درست ثابت ہورہی تھی کہ وہ اپنے ماسٹر کی موت تک زندہ رہتا تھا اور اب اس کا ماسٹر مرنے والا تھا اس لیے وہ بھی مر رہا تھا۔ ایملی نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ سے ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ جیف کی طرف کردیا۔ وہ ہمت کررہی تھی کہ اس پر گولی چلائے۔ اچانک جیف نے حرکت کی۔ اس نے سر اٹھا کر ایملی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اسے ماردو۔“

جیف کا ہاتھ عفریت کی طرف اٹھا ہوا تھا مگر جب عفریت اچانک اٹھا تو ایملی کی سمجھ میں آیا۔ جیف عفریت سے کہہ رہا تھا کہ اسے ماردے۔ عفریت اس کی طرف بڑھا تھا کہ ایملی نے جیف پر فائر کیا اور پھر جنونی ہو کر اس وقت تک فائر کرتی رہی جب تک ریوالور خالی نہیں ہوگیا۔ اس بار جیف یقینی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ وہ گر کر ساکت ہوگیا اور عفریت بھی اسی کی طرح گر کر ساکت ہوگیا۔ ایملی نے دوڑ کر رک کو اٹھایا۔ وہ زخمی تھا مگر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی۔ بریڈ بھی آگیا۔ ایملی رک کے زخم دیکھ رہی تھی کہ بھک کی آواز کے ساتھ عفریت کی لاش سے شعلے اٹھنے لگے اور چند منٹ بعد شعلے بجھے تو لاش کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ ایملی اور بریڈ نے سہارا دے کر رک کو ٹرک میں سوار کیا اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد درختوں سے میگاٹ نمودار ہوئی۔ اس نے عفریت کی لاش دیکھی اور بولی۔

”مجھے معاف کرنا میرے بچے لیکن میں تمہیں زندہ کرنے سے پہلے نہیں مروں گی۔“

میگاٹ نے عفریت کی سکڑ جانے والی لاش اٹھالی اور کچھ دیر بعد وہ اسے اسی بڑے تنے والے درخت میں دفن کررہی تھی۔

▶●◀

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک "لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کر کے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

دوسرا حصہ



ان کی خوفزدہ نظروں نے دیکھا، ٹرک کی رفتار بجائے کم ہونے کے یکلخت تیز ہوگئی تھی۔ یہ ایک خطرناک سچویشن تھی، جو ان کی توقع کے بالکل خلاف بھی تھی، اس طرح ان کے ساتھی کی جان خطرے میں تو تھی ہی، مگر ان کا یہ خفیہ مشن بھی متاثر ہوسکتا تھا جبکہ حالات کا تقاضا تھا کہ...... اس اہم مشن کو انتہائی رازداری کے ساتھ نمٹایا جائے لیکن یہاں صورتِ حال اس کے برعکس ہوگئی تھی۔ اس اعصاب شکن خطرے کی طرف بڑھتی ہوئی صورتِ حال پر فوری طور پر قابو پانے کے لیے گروپ بی کمانڈوز کو "لیڈ" کرنے والی دلیر مجاہدہ...... لیلیٰ آفندی نے پل کے پل میں ہی ایک جارحانہ فیصلہ کرلیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی...... اور چلائی۔

"سائلنسر پستولوں سے ٹائر کا ایک ٹائر برسٹ کر ڈالو اور ڈرائیونگ کیبن پر ٹوٹ پڑو۔"

ٹرک دھڑدھڑاتا ہوا تیزی کے ساتھ بیچ راستے پر لیٹے ان کے ساتھی کی طرف بڑھ رہا تھا، صورتِ حال کی سفاکی کا احساس اس وقت زیادہ ہوا جب ٹرک دھاڑتا ہوا اس کے عین سر پہ آن پہنچا۔ یہ صرف ایک پل کے لیے ہوا اور دوسرے پل اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ راستے سے کھینچ لیا ہو اور دھاڑتے ہوئے ٹرک کے چوڑے موٹے ٹائر اس کے بالکل سر کے قریب سے گزرتے چلے گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ٹرک جیسے ایک طرف جھک کر زمیں بوس ہوگیا پھر ناہموار کچے راستے پر دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ گرد و غبار کا دیوقامت مرغولہ اٹھا، لیلیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے ٹرک کے ایک ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹرک کے رکتے ہی ان سب نے بیک وقت ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن پر ہلّا بول دیا۔

اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کو رسد سپلائی کرنے والے ٹرک ڈرائیورز بھی عام آدمی نہیں تھے، دونوں تربیت یافتہ فوجی ہی تھے، اول خطرے کو بھانپتے ہی انہوں نے ٹرک کی رفتار آہستہ کرنے کے بجائے مزید بڑھا دی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ساتھی کو گن الرٹ ہونے کا بھی اشارہ کیا تھا، ابھی اس کا دوسرا ساتھی سنبھل ہی پایا تھا کہ ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو راستے پر رینگتے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا۔ اس نے لیلیٰ کو بڑی پھرتی کے ساتھ راستے کے بیچوں بیچ ابھرتے اور پھر لیٹے ہوئے اپنے ساتھی کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دیکھا تو چلا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ "فائر کرو......" برابر کی سیٹ پر بیٹھے اس کے ساتھی نے بھی یہ سب کچھ تقریباً دیکھ لیا تھا اور ابھی اس نے بہ سرعت اپنی گن سیدھی ہی کی تھی کہ ساعت شکن دھماکا ہوا۔ ٹرک کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بدمست ہاتھی کی طرح ڈولنے لگا۔ دونوں فوجی بری طرح بوکھلا گئے مگر جلد ہی اپنے حواسوں پر قابو پالیا اور ٹرک کو الٹنے سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بریک لگا دیے۔ گرد و غبار کا عقب سے طوفانی بگولا نمودار ہوا جس نے چند ثانیوں کے لیے دونوں کو اندھا کردیا۔ اس اثنا میں ڈرائیور فوجی نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال لیا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈرائیور فوجی کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے پہلے اپنے برابر میں بیٹھے اپنے ساتھی کا عبرت ناک انجام ہوتے دیکھا۔ اسے خاموش پستول کی گولی سے کسی نے نشانہ بنایا اس کا بھیجا کھوپڑی سمیت چیخ گیا تھا۔ اس نے پستول سیدھا کیا تو دوسری طرف سے باقر نے اپنے خاموش ریوالور کی گولی سے اس کی گردن پر فائر کردیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

فضا ایک لمحے کو یکدم ساکت ہوتی محسوس ہونے لگی، جیسے کوئی بڑا طوفان گزر گیا ہو...... یہ پانچوں ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔

"صورتِ حال خراب ہوتے ہوتے بچی ہے...... لیکن...... ٹائر برسٹ ہونے کا دھماکا بھی کم نہیں تھا......" لیلیٰ نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ باقر بولا۔

"عزیزم لیلیٰ! یہ عموی دھماکا سمجھا جاسکتا ہے۔ شکر ہے کہ گولی کی آواز نہیں ابھری۔"

"دور تک پھیلے تاریک ویرانے میں معمولی دھماکا بھی...... کسی قریبی اسرائیلی چوکی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔" جمال نے کہا۔

"ہمیں جلدی ہی اپنا کام نمٹانا ہوگا۔ جو ہوا کم سے کم ہی ہوا، مزید تاخیر...... منصوبے کے لیے نقصان دہ ہوگی۔" الجاہد کے قاسم عمر نے بحث کو سمیٹنے کی غرض سے کہا اور پھر سب حرکت میں آگئے، حسبِ توقع ٹرک میں فاضل ٹائر موجود تھا۔ لیلیٰ اور باقر چاروں اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھے، دو ساتھی ٹائر بدلنے میں مصروف ہوگئے جبکہ باقی دو نے اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھالیا۔

یہ سارے کام بہت قلیل وقت میں مشترکہ طور پر نمٹائے گئے۔ اس کے بعد منصوبے کے مطابق جمال اور باقر نے اسرائیلی فوجیوں کی وردی پہن کر ٹرک کا ڈرائیونگ کیبن سنبھال لیا، باقی چار ساتھی ٹرک کے عقبی حصے میں کھانے پینے کے اسباب کی آڑ تلے جا پہنچے۔ ذرا دیر میں ٹرک روانہ ہوگیا۔

یہ لوگ طے شدہ منصوبے "بلینک پوائنٹ" سے روانہ

ہونے کے نصف گھنٹے بعد شمال جنوب کے "ریڈ زون" میں داخل ہوچکے تھے۔ جمال ٹرک ڈرائیو کررہا تھا اور باقر اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ان کے جسموں پر ان دونوں جہنم واصل اسرائیلی فوجیوں کی وردی تھی اور ایک بڑا امتحان ان کے سر پہ تھا۔ اب کسی بھی وقت وہ اس مورچا نما چوکی تک پہنچنے والے تھے، جسے ابونصر نے "پوائنٹ تھرٹی" کا نام دیا تھا۔

پوائنٹ تھرٹی کی بتیاں دور سے چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں اور دونوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے اور اعصاب تن چکے تھے۔ فوجی ٹوپیاں انہوں نے دانستہ پیشانی سے ذرا نیچے جھکا کر آئی ڈی کارڈز ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔ بالآخر جب وہ قریب پہنچے تو انہیں چوکی کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر باہر ہی روک لیا گیا۔ گویا فیصلہ کن گھڑی سر پہ آچکی تھی۔

☆☆☆

سیما سول بندرگاہ کے قریب واقع ہوٹل پورٹ لینڈ کے گیٹ کے قریب جو بھاری گاڑیاں پہنچی تھیں، وہ اسرائیلی پولیس کی تھیں...... خضر کی پریشانی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دونوں عرب مہمانوں نائمہ اور عابد کشمیری کو اب ہوٹل کی انتظامیہ پولیس کسٹڈی میں دینے کا فیصلہ کرچکی تھی اور خضر جانتا تھا کہ ان کے دونوں مہمانوں کا اسرائیلی پولیس کے شکنجے میں جانے کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ اس لیے خضر نے اپنے دونوں ساتھیوں معید اور حارث کی مدد سے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جیسے ہی پولیس نائمہ اور عابد کو لے کر روانہ ہوگی، ان پر راستے ہی میں حملہ کرکے انہیں چھڑا لیا جائے گا۔ وہ اپنے اس منصوبے کی پیشگی رپورٹ اپنے سیکنڈ ان کمانڈ خالد حسین کو دے چکا تھا۔

نائمہ کی طبیعت اب تک کافی سنبھل چکی تھی، پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد وہ خاصی ہراساں رہی پھر عابد کشمیری کو ساتھ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی، مگر عابد خاصا پریشان اور متفکر نظر آرہا تھا۔ کیونکہ یہ معاملہ پولیس کا بن چکا تھا اور انہیں دائرۂ تفتیش میں لانے کے لیے اسرائیلی پولیس کا سامنا کرنا پڑتا...... اور پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے پولیس کی دو گاڑیاں آچکی ہیں تو عابد نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیا۔ ہوٹل کا منیجر رمضان اپنے چہرے پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے عابد سے بولا۔

"آپ دونوں ہمارے معزز مہمان ہیں لیکن سر! آپ کو قانون کے مطابق اس کارروائی سے تو گزرنا پڑے گا۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں یہاں آپ دونوں ہی کی وجہ سے کس قدر ہنگامہ اور خون ریزی ہوچکی ہے۔"

"کیا مطلب...... کیا اس میں ہمارا قصور ہے؟" اس بار نائمہ نے منیجر رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے ترشی سے کہا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ منیجر خود اسرائیلی خفیہ انٹیلی جنس موساد کا ہی جاسوس تھا، ابھی ان کے درمیان یہ بحث ہورہی تھی کہ ایک ٹھگنے قد کا مگر چوڑے اور مضبوط شانے والا شخص چار اسرائیلی پولیس اہلکاروں کے ساتھ وہاں آن پہنچا۔ یہ اسرائیلی پولیس چیف تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کھنڈی ہوئی تھی اور چندی چندی آنکھوں میں مکاری ہلکورے لے رہی تھی۔ جب نائمہ اور عابد نے بھی اس سے بحث میں الجھنا چاہا تو اس نے گمبھیر اور کرخت آواز میں ان سے فقط اتنا کہا۔

"ہم آپ کو مجرم کی حیثیت سے ہتھکڑیاں ڈال کر نہیں لے جارہے ہیں...... ضابطے کی ایک معمولی کارروائی کے بعد آپ کو اسی طرح باعزت طریقے سے یہاں دوبارہ چھوڑ دیا جائے گا۔"

ناچار دونوں کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس دوران جب عابد اور نائمہ پولیس چیف کے ساتھ روانہ ہورہے تھے، منیجر رمضان نے معنی خیز نظروں سے اسرائیلی پولیس چیف کی طرف دیکھا۔ پولیس چیف کے بدہیت ہونٹوں پہ بڑی خبیث مسکراہٹ تھی۔

رمضان پلٹا اور فوراً اپنے کمرے میں آکر ایک خفیہ ٹرانسمیٹر سسٹم پر...... موساد کے کسی ذمے دار اہلکار سے رابطہ کرکے اسے نائمہ اور عابد سے متعلق تازہ ترین رپورٹ دینے لگا۔

اس رپورٹ کے اختتام کے چند منٹوں بعد موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ فوراً حرکت میں آگئے، ان میں دو ایجنٹ وہ بھی شامل تھے جنہوں نے قبرص میں سیما سول کی بندرگاہ میں دو جلاوطن فلسطینی آفیسروں احسن الزہروی اور ابوجواد العزیز کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

منصوبہ یہ تھا کہ یہ پانچوں اسرائیلی ٹاپ ایجنٹ فلسطینی حریت پسندوں کے بھیس بھر کے پولیس کی اس جیپ پر حملہ آور ہوں گے اور نائمہ اور عابد کو ان کی کسٹڈی سے چھڑا کر... فی الفور موساد کے ہیڈکوارٹرز کا رخ کریں گے اور مشہور کردیا جائے گا کہ یہ کارروائی حریت پسند تنظیم پی فرنٹ کے کمانڈوز کی تھی جبکہ اس "ڈرامے" کا پہلے سے ہی مذکورہ اسرائیلی پولیس چیف کو بھی پتا تھا اور محض مکروہ ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے وہ ان کا جعلی مقابلہ بھی کریں گے۔ مقصد یہی تھا کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ نائمہ اور عابد کو ایک سازش کے تحت درحقیقت موساد کی قید میں ڈالا گیا ہے۔ بہرطور دونوں اس کریہہ حقیقت سے بے خبر تھے، سفر اپنے

اندر کئی طوفان بلاخیز چھپائے بہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔ ادھر خضر اپنے دونوں مجاہد ساتھیوں معید اور حارث کے ساتھ ایک کار میں ان دونوں پولیس گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی تعاقب میں لگ گیا۔ ان کے شاید سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ عین ایسا ہی ایک خطرناک منصوبہ موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ بھی...... فلسطینی حریت پسندوں کے بھیس میں بنا چکے تھے چونکہ ان کا منصوبہ طے شدہ تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں گاڑیاں کس وقت اور کہاں سے کس راستے سے گزریں گی، اس لیے اس Fake Action کے لیے وہ پہلے ہی سے گھات لگائے موجود تھے۔

سفر جاری تھا۔ پورٹ روڈ پر گاڑیوں کا رش تھا، تاہم پولیس کی دونوں گاڑیاں تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی دوڑی جارہی تھیں، اور ان کے لیے راستہ صاف اور آسان تھا۔ ان کے تعاقب میں ذرا فاصلے سے پی فرنٹ کے تینوں مجاہدوں کی کار رواں دواں تھی، ایک برج پار کر کے نسبتاً کھلی اور کم رش والی جگہ پر سڑک نوے ڈگری کے قوس نما موڑ پر تھی۔ حارث نے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالا ہوا تھا یکدم روڈ لائن تبدیل کی اور اسی وقت عقبی سیٹ پر براجمان خضر کے کاندھے پر راکٹ لانچر نظر آنے لگا۔ اس کا نشانہ پولیس کی پچھلی گاڑی تھی، نشانہ لیتے ہی اس نے ٹریگر بٹن پش کیا۔ دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا راکٹ فائر ہوا اور سنسناتی ہوئی لہر کے ساتھ پولیس گاڑی کے درمیان جا کے لگا۔ ایک دھماکے سے گاڑی کے پرخچے اڑ گئے، آگے والی گاڑی کی رفتار یکدم تیز ہوئی مگر اس میں سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ اس گاڑی میں پولیس چیف اور نائمہ اور عابد کشمیری موجود تھے، نیز ڈرائیور سمیت چار پولیس اہلکار بھی سوار تھے، دھماکے کی آواز اور سمت کا انہیں فوری اندازہ ہوگیا تھا، پہلے تو یہ لوگ یہی سمجھے کہ شاید ان کے ''اپنوں'' نے یہ دھماکا کیا ہوگا لیکن اپنے ساتھی اہلکاروں کی گاڑی کا حشر دیکھ کر انہیں وہ ''خطرے'' کا احساس ہوا تھا۔ پھر یہ ان کے ''اپنوں'' کا ''حملہ'' کرنے کا اصل مقام بھی نہ تھا۔ جو ظاہر ہے پہلے سے طے شدہ تھا۔ تاہم یہ ان کی غیر معمولی چابک دستی اور بیدار مغزی کا نتیجہ تھا کہ ان کی گھٹی مگر متلاشی نظروں نے جلد ہی اس ہلکے نیلے رنگ کی کار کو دیکھ لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اب ان تین کار سواروں میں سے دو کو گنیں بھی کھڑکی سے باہر سیدھی کرتے دیکھ لیا تھا۔ پھرتی کا مظاہرہ پولیس گاڑی سے پہلے کیا گیا اور ایک ساتھ چار گنیں گرجی تھیں۔ خضر اور اس کے ساتھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ گولیوں کے بیک وقت چار برسٹ ان کی کار پر پڑے۔ حارث کی گردن میں دو گولیاں پیوست ہوئیں وہ موقع پر ہی جام شہادت نوش کر گیا۔ کار کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے لڑھک جانے کے باعث کار نے لہرانا شروع کر دیا۔ خضر کے شانے میں تین گولیاں لگی تھیں جبکہ معید غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے جھک گیا تھا۔ اس وقت کار کا ٹائر بلاسٹ ہوگیا۔ عام ٹریفک رواں تھا۔ کار ڈول رہی تھی، معید چونکہ حارث کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اس لیے اس نے فوراً اسٹیئرنگ پر مقدور بھر گرفت جمانے کی کوشش چاہی مگر کار کا ایک ٹائر برسٹ ہونے کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ سنبھلنے نہیں پارہی تھی، معید کو اپنا مشن ناکام ہوتا محسوس ہوا تو اسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے فوراً اسٹیئرنگ بائیں جانب موڑ دیا۔ نتیجتاً اس کی ڈولتی ہوئی کار ایک دھماکے سے پولیس گاڑی سے ٹکرا گئی، عقب میں کئی گاڑیوں کے ہارن کی پرشور آوازیں ابھرنے لگیں جبکہ دونوں گاڑیاں بیچ سڑک پر پھرکی کی طرح گھومنے لگیں اور سڑک کے کنارے کی سیمنٹ منڈیر توڑتی ہوئی گھاس کے میدان میں جارکیں۔ معید نے اپنی گن سنبھالتے ہی فائرنگ کی جبکہ عقب کی سیٹ میں موجود خضر زخمی حالت میں پڑا تھا وہ ہم خطرے کو سر پہ بھانپتے ہی وہ اپنی گن سنبھالنے لگا۔

پولیس گاڑی میں موجود نائمہ اور عابد کشمیری بری طرح پریشان اور متوحش تھے جبکہ اسرائیلی پولیس نے پھرتی کے ساتھ اتر کر معید کی کار کو فائرنگ کر کے چھلنی بنا ڈالا۔ خضر اور معید موقع پر ہی دم توڑ گئے، تھوڑی دیر بعد یہودی پولیس چیف وائرلیس سیٹ پر ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کر رہا تھا۔

اس کے ذرا دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی، ٹکرانے کے باعث گاڑی کی ایک سائڈ پر خاصا بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا۔ تاہم کار کے مقابلے میں یہ گاڑی بڑی اور مضبوط تھی، اس لیے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا، اندر موجود پریشان حال نائمہ اور عابد پولیس چیف سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن وہ ان کے جوابات آنا کانی سے دے رہا تھا، وہ جلد سے جلد اس مقام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا جدھر ایسا ہی ایک جعلی ڈراما ''پلے'' کیا جانے والا تھا، اندر سے یہ مکار یہودی نژاد پولیس چیف مسرور تھا کہ کار والے ان تینوں حریت پسند مجاہدوں کے ناکام حملے کے باعث ان کے اگلے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر جائے گا۔

جبکہ یہاں تک تو نائمہ اور عابد کو بھی اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ جام شہادت نوش کرنے والے وہ تینوں مجاہد انہی کی وجہ سے اسرائیلی پولیس ٹیم سے ٹکرائے تھے۔ وہ یقیناً انہیں اسرائیلی پولیس کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے، ان سب باتوں کے باوجود عابد کشمیری کو یکلخت ہی کسی گہری سازش کی بو محسوس ہونے لگی، اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی، کچھ ہونے والا تھا۔

مطلوبہ مقام پر گاڑی پہنچتے ہی موساد کے پانچوں ٹاپ ایجنٹ حرکت میں آئے۔ وہ ایک بند وین میں تھے جس کا رنگ سیاہ تھا، ایک دوسری ذیلی سڑک سے اچانک ہی یہ سیاہ فاکس وین نمودار ہوئی اور سڑک کے بیچوں بیچ اس طرح کھڑی ہوگئی کہ آنے والی پولیس گاڑی کا راستہ بلاک ہو چکا تھا۔ پانچوں ایجنٹ جنہوں نے سروں پہ عربی صافہ باندھ رکھا تھا اور ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ فائرنگ کر کے پہلے پولیس گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیے اس کے بعد سب کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ دکھاوے کی خاطر اسرائیلی پولیس اور ان کے چیف نے برائے نام مزاحمت بھی کی تھی مگر پھر انہوں نے نائمہ اور عابد کشمیری کو ان کے حوالے کرنے کا درشت حکم دیا۔

یہ سارا ڈراما دانستہ طور پر شہر کے معروف اور مصروف چوراہے پر انجام دیا گیا تھا اور اس دوران موساد کے ایجنٹوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی تھی، جس سے وہاں اطراف میں خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی، نیز انہوں نے بہ آواز بلند مخصوص قسم کے ملی اور اسلامی نعرے بھی بلند کیے تاکہ ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر دیا جائے۔

اگلے چند منٹوں کے بعد یہ پانچوں ٹاپ ایجنٹ نائمہ اور عابد کو اپنی گاڑی میں ڈالے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نائمہ خوش تھی کہ مجاہدوں کے دوسرے گروپ کو کامیابی ہوئی تھی لیکن عابد کشمیری کا معاملہ اور تھا۔ وہ پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ چکا تھا اور پھر بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوگئی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ ان سے کوئی سوال کرتے، ان کے چہروں پہ ایک مخصوص محلول کا اسپرے کر دیا گیا۔ دونوں بے سدھ ہو کر لڑھک گئے، دونوں کو وین کی عقبی سیٹوں پر لٹا دیا گیا۔

☆☆☆

''المجاہد'' کی لیڈر زبیدہ قیصری کا ''گرینڈ پلان'' کے عمل کا دارومدار اگرچہ گروپ بی کی کامیاب کارروائی پر منحصر تھا لیکن ایک مقررہ وقت تک اس کے بعد زبیدہ نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دینا تھا۔ وہ اپنے پانچ المجاہد کے ساتھیوں اور دو پی ایل ایس او کے محسن اور زبیر کے ساتھ تیونائی کی طرف گامزن ہو چکی تھی۔

تیونائی اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت اور بناوٹ کے باعث پہاڑیوں اور گھنے جنگلات پر مشتمل تھا۔ اس کے وسط میں ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر تھا اور وہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش اور اس کے نائب میجر ایہود شابک کی پرتعیش رہائش گاہیں بھی تھیں۔ ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ایک قلعہ نما عمارت پر مشتمل تھا۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرح یہاں بھی ایک بڑا منظم فائلنگ کیپٹل سسٹم موجود تھا۔ جہاں دنیا بھر کے ممالک کے اہم خفیہ رازوں پر مشتمل کاغذات اہم فائلوں کی صورت میں موجود تھے، جہاں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی اڑانا ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ یہاں کی سیکیورٹی کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس عمارت کو خالص جنگی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ یہاں ہیلی پیڈ، رن وے، طیارے، ایئر وولف نامی جدید تھنڈر میزائل سے لیس ہیلی کاپٹر بھی تھے، پوری بریگیڈ اپنی بٹالین سمیت یہاں تعینات تھی اور چوبیس گھنٹے چوکس رہتی تھی۔

المجاہد کے مٹھی بھر سرفروش جانبازوں کا شب خون مارنا تو بہ ظاہر ایک بڑبولے کا خواب ہی نظر آتا تھا لیکن اپنی سرزمین فلسطین کو ان غاصب یہودیوں کے ناپاک وجود سے خالی کروانے کے آہنی عزم اور سودائے جنوں جیسے بلند حوصلوں کے حامل مجاہدوں نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کو قوت ایمانی اور اللہ واحد کی مدد کے سہارے شکست دینے کا عزم مصمم کر رکھا تھا۔ سو دنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے نیک مقاصد سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

زبیدہ کو ڈیوڈ اسٹار کی قوت کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے گروپ بی کے مشن کو سب سے زیادہ اہم کام سونپا تھا کہ وہ صحرائے نجف میں ڈیمون ایٹمی بجلی گھر (ریسرچ پلانٹ) کو اڑانے کی کامیاب کوشش کر ڈالتے تو یکلخت پورا... یروشلم اور تل ابیب نہ صرف گھٹا ٹوپ تاریکی کی زد میں آجاتے بلکہ گریٹر اسرائیل کے پلان کا اہم ترین جزو کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور لمبے عرصے تک اسرائیل کی کمر ٹوٹ کر رہ جاتی۔ جیسا کہ مذکورہ ایٹمی بجلی گھر کی آڑ میں ایک ان ڈائریکٹ خفیہ معاہدے کے تحت فرانس کی مدد سے اسرائیل یہاں بجلی گھر کی آڑ میں یورینیم افزودگی کا پلانٹ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح وہ ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں طویل عرصے تک خود کفیل ہو جاتا۔ اس کی کامیابی کے بعد اگلا مرحلہ کیمیائی اور جراثیمی ہتھیار بنانے کا تھا۔

تیونائی کی طرف ان کا سفر رات کو شروع ہوا تھا اور یہ دو تیز رفتار گاڑیوں میں ایک مقررہ مقام پر پہنچ کر اتر گئے تھے، دونوں گاڑیاں انہیں ایک گھنے جنگل اور پہاڑیوں کے سرے میں اتار کر واپس پلٹ چکی تھیں ...... یہ گوریلا مشن تھا اور بہت اہم ترین بھی۔ یہ سب ایک دوسرے کو فالو کرتے ہوئے تاریک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے چست کمانڈو ڈریسنگ کر رکھی تھی اور ہتھیاروں کے زیور سجا کر جانیں ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھیں، خود کو سر سے پاؤں تک کیموفلاج کر رکھا تھا۔ اس طرح وہ رات کی سیاہی کا ہی ایک جزو نظر آتے تھے۔ اس گروپ کی کمانڈ زبیدہ ہی کے ہاتھ میں تھی جبکہ گروپ میں اپنا نائب اس نے محسن کو ہی بنایا ہوا تھا اور اسے کچھ صوابدیدی اختیار دے رکھے تھے، یہی سبب تھا کہ پیدل تھوڑا سفر کرنے کے بعد جب یہ لوگ ایک مقام پر رک کر آگے پیش قدمی کی پلاننگ کرنے لگے تو محسن نے زبیدہ کو مشورہ دیا کہ انہیں دو مختلف حصوں میں بٹ کر مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ زبیدہ کو اس کی تجویز اچھی لگی۔ وہ پہلے ہی انہیں ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کے محلِ وقوع سے اچھی طرح آگاہ کر چکی تھی۔ چنانچہ محسن اور زبیر کے ساتھ المجاہد کے دو ساتھی شامل ہو گئے اور دونوں گروپس نے ایک "میٹنگ پوائنٹ" طے کرنے کے بعد اپنی راہ لی۔ ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ان کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ دونوں الگ گروپس میں بٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ ان دونوں گروپس کو ایک مقررہ وقت میں ہیڈ کوارٹر کے قریب پہنچنا تھا اور بجلی کے شٹ ڈاؤن ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ بالآخر یہ دونوں تھوڑی دیر کی کامیاب گوریلا پیش قدمی کے بعد ہیڈ کوارٹر کے قریب ایک مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆

چیکنگ معمول کی تھی۔ ابونصر کی معلومات کے مطابق یہ ڈیمون ریسرچ پلانٹ کی سب سے اہم چوکی پوائنٹ تھرٹی تھی، جو ایک طرح کا اہم مورچا بھی تھی، ظاہر ہے یہاں کی چیکنگ بھی سخت تھی، اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انہیں مطمئن ہو کر آگے جانے دیا جاتا یا پھر کسی مزید تفتیش کے لیے کسی شبے کی بنا پر روکا بھی جا سکتا تھا اور یہ دوسری صورت خطرناک بھی ہو سکتی تھی جبکہ سرائے کے مالک ہمدرد ابونصر نے انہیں اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کا نقشہ سمجھاتے ہوئے تاکید کی تھی، "پوائنٹ تھرٹی" سے بہ خیر و عافیت گزر جانے کے بعد ان کا یہ خطرناک مشن نصف حد تک آسان ہو جاتا جبکہ بھڑ جانے کی صورت میں یہ مشن ناممکن حد تک مشکل بھی ہو سکتا تھا۔

ٹرک رکتے ہی دو گن بردار وردی پوش اسرائیلی دونوں طرف سے ان کی کھڑکیوں کی طرف بڑی مستعدی کے ساتھ بڑھے تھے۔ جمال اور باقر نے اپنے آئی ڈی کارڈز والے ہاتھ کھڑکی سے باہر کر دیے۔ بہ ظاہر دونوں ساکت تھے مگر اندر سے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے گویا کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانے جیسی خطرناک سچویشن کو فیس کرنے کے لیے الرٹ تھے۔

دونوں فوجیوں نے ایک سرد سی نگاہ ان کے نصف ٹوپی سے ڈھکے بشروں پہ اور پھر ان کے آئی ڈی کارڈز پر ڈالی۔ باقر کی کھڑکی کی طرف والے فوجی نے تو کسی حد تک مطمئن ہو کے دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دی تھی مگر جمال کی طرف والے فوجی کو جانے کس بات کا شبہ ہوا تھا کہ اس نے اپنی گن کی نال سے جمال کے چہرے پہ جھکی ہوئی ٹوپی کو ذرا دھیرے دھیرے اوپر کیا۔ جمال کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔ چہرہ قدرے واضح ہوا تو اس فوجی نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ "اس کارڈ میں تمہاری تصویر کیوں بدلی ہوئی ہے؟"

جمال کو اس خدشے اور ایسے سوال کی توقع تھی لہٰذا بلا تامل بولا۔ "سر! نئی تصویر مجھے لگانی چاہیے تھی مگر نہیں لگا سکا تھا۔ سوری! اگلی بار ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"تصویر تو اس کی بھی بدلی ہوئی ہے۔" معاً دوسرے فوجی کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا جس نے باقر کا آئی ڈی کارڈ دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلا دیا تھا لیکن پھر مختصر تکرار پر وہ چونک کر دوبارہ باقر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے نہ صرف آئی ڈی کارڈ کی تصویر چیک کی بلکہ اپنی گن کی نال سے اس کی ٹوپی کو بھی اوپر اٹھا دیا تھا۔

دونوں فوجی یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ان پر گنیں تان لیں اور پھر انہیں مزید چیکنگ کے لیے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ جمال اور باقر کے دل یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگے۔ ہر قسم کی متوقع و غیر متوقع خطرناک سچویشن پر انہیں فوری طور پر کیا قدم اٹھانا تھا، یہ طے شدہ تھا لہٰذا جمال اور باقر نے ان دونوں فوجیوں کی کنپٹیوں پہ بیک وقت خون کے چھینٹے اچھلتے دیکھے اور دونوں ہی تیورا کر گر گئے۔

ٹرک کے عقبی حصے میں موجود ان کے ساتھیوں نے خاموش پستول کے ذریعے دونوں کو جہنم واصل کر ڈالا تھا۔

سامنے چوکی پر جدھر سرچ لائٹ ان کے ٹرک پر پڑ رہی تھی ایک مچان سی تھی، وہاں موجود چار فوجیوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی گنوں کے منہ کھول دیے مگر اس سے پہلے ہی جمال ٹرک کا ایکسلریٹر پوری قوت سے دبا چکا تھا۔ ٹرک دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور مچان سے جا ٹکرایا مگر اس سے پہلے جمال اور باقر بجلی سی پھرتی کے ساتھ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے گر چکے تھے اور سنبھلتے ہی انہوں نے پوزیشنز سنبھال لیں۔ ٹرک مچان کے دو ستونوں سے ٹکرایا اور مچان بری طرح لرز کر رہ گئی، تاریک فضا میں گولیوں کی دل خراش تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری مگر توازن بگڑنے کے باعث اوپر موجود چاروں فوجیوں کا نشانہ خطا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دو فوجی جو شاید بالکل مچان کی دیوار کے کنارے ٹکے کھڑے تھے مچان کے بری طرح لرزنے پر نیچے آ گئے۔ حماد اور باقر کی گنوں نے انہیں بھون ڈالا۔ اوپر موجود دو باقی فوجیوں کو ٹرک کے عقبی حصے میں چھپے ہوئے مجاہدوں نے جہنم واصل کر دیا۔ مچان خاصی مضبوط تھی تاہم ٹرک کے ٹکرانے سے تھوڑا جھک ضرور گئی تھی۔

لیلیٰ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت ٹرک سے اتر آئی تھی۔ تقاضا اب فوری پیش قدمی کا تھا۔ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پوائنٹ تھرٹی کو کراس کر کے یہ اندر داخل ہونے۔ وہاں چند فوجیوں سے ان کا سامنا ہوا مگر ان کی گولیوں نے انہیں بھی بھون کے رکھ دیا۔ یہ لوگ مزید آگے بڑھے۔ ٹھیک اس وقت انہیں نارنجی لکیریں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن ٹکا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل چیخی۔ "خبردار! ان لکیروں کی زد میں مت آنا۔"

پوائنٹ تھرٹی کے خفیہ بنکر میں نصب آٹومیٹک سرچنگ اینڈ الارم سسٹم کا لیزر گائیڈڈ فائرنگ میکنزم آن ہو چکا تھا، بدقسمتی سے لیلیٰ کے دو ساتھی اس کی زد میں آ گئے۔ اگلے ہی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری...... اور مذکورہ دونوں ساتھی کرب ناک چیخوں کے ساتھ زمیں بوس ہو گئے۔ یہ سسٹم اتنا فاسٹ اور خطرناک تھا کہ باقیوں کے لیے ان قاتل نارنجی شعاعوں کی ہلاکت خیزی سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ آگے دور کہیں سائرن بھی چیخنے لگا تھا۔ صورتِ حال بگڑ گئی تھی مگر اب اس بگڑی ہوئی خطرناک صورتِ حال میں انہیں کفن بہ دوش کی حالت میں ہر صورت اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔

یہ لوگ زمین پر لیٹ کر لوٹ کھنیاں کھانے لگے۔ قاتل ریز رکی تھیں نہ خاموش تھیں، مگر جیسے ہی کوئی ان کی زد میں آتا ایک برسٹ فائر ہوتا۔ لیلیٰ کا تیسرا ساتھی بھی اس کی زد میں آ گیا۔ اس کے سینے پر نارنجی لکیر پڑی تو اسے حرکت کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی تھرا دینے والی تھی۔

"بنکر کے اندر ہینڈ گرینڈ پھینکو...... جلدی...... ورنہ چشم زدن میں سب مارے جاؤ گے۔" لیلیٰ پھر چلائی۔ سب سے پہلے اس نے ہی اپنی کمانڈو کٹ سے ایک دستی بم نکال کر بنکر کی طرف اچھالا تھا۔ جمال اور باقر نے بھی چشم زدن میں اس کی تقلید کی مگر جمال نے جیسے ہی دستی بم پھینکنے کے لیے لیٹے لیٹے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ موت کا رقص کرتی تھرکتی قاتل ریز کی رینج میں اس کا وہ ہاتھ آ گیا۔ اسے بم اچھالنے کا بھی موقع نہ ملا۔ ایک قاتل برسٹ فائر ہوا جمال کا ہاتھ کہنی کی طرف سے اڑ گیا اور وہاں سے خون آلود ٹنڈ منڈ بازو کی ہڈی جھانکنے لگی۔ جمال درد کی اذیت سے تڑپ اٹھا، اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر باقر پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ اس نے پے درپے مزید دو تین بم بنکر کی طرف اچھال دیے۔ وہاں کئی دھماکے ہونے لگے۔ سسٹم میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی۔ موت کا رقص کرتی ہوئی قاتل ریز بجھنے لگیں اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو گئیں۔

یہ موقع کسی زخمی ساتھی کو سنبھالنے کا نہیں تھا مگر باقر اپنے ساتھی جمال کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف دوڑا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ جمال جانتا تھا کہ اس وقت کیا صورت حال ہے۔ اپنے ساتھی پر بوجھ بننا مشن کو کھٹائی میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ابھی اس کا دایاں ہاتھ باقی تھا۔ اس نے اس ہاتھ میں گن پکڑ لی۔ بائیں بازو کے درد کو...... دانتوں تلے بھینچ کر پی گیا اور باقر سے بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔ "نہیں دوست! میں ٹھیک ہوں۔ آگے بڑھو۔ مجھے نہیں...... مشن سنبھالو۔"

لیلیٰ نے اپنے بہادر مجاہد کی یہ درد و جوش میں ڈوبی آواز سن لی تھی، حالانکہ وہ مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کی مالک تھی مگر جمال کی بات پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

خطرناک بنکر تباہ ہو چکا تھا۔ پوائنٹ تھرٹی کی چوکی سر ہو چکی تھی مگر گروپ کے تین مجاہد بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے، جبکہ لیلیٰ...... جمال، باقر اپنے ساتھیوں کی قربانی ضائع نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

تینوں آگے بڑھے اور فائرنگ کرتے پلانٹ کے گیٹ تک جا پہنچے۔ وہاں سے بھاری بوٹوں اور وردی پوش

مسلح اسرائیلی فوجی برآمد ہوئے مگر انہوں نے تابڑ توڑ فائرنگ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ ان کے پاس اسلحے کی کمی نہ تھی مگر لیلیٰ وغیرہ کے پاس محدود اسلحہ تھا۔ سات آٹھ فوجیوں پر مشتمل اس دستے نے گویا ان مجاہدوں کی لب بام فتح کو ناکامی کے قریب کر دیا تھا۔ لیلیٰ اور باقر اس صورت حال پر پریشان اور متفکر نظر آنے لگے۔ اسلحے کی کمی کے ساتھ یہ خدشہ بھی تھا کہ کسی بھی وقت یہاں دشمنوں کی مزید کمک پہنچ سکتی تھی۔ جو موقع تھا ابھی تھا مگر لیلیٰ اور باقر کو کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ جمال کی عقابی اور سوچتی ہوئی زیرک نظروں نے اس مشکل پچویشن کے ”ڈیڈ لاک“ کو فوراً بھانپ لیا۔ پل کے پل اس نے غور کیا۔ گیٹ کی بیرونی دیوار کو مورچا بنائے، اسرائیلی دستہ ان کی پیش قدمی کو ”جام“ کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ اس کی دوسری سمت خالی تھی۔ اگر وہ کسی طرح اس سمت دوڑ کر ان پر بے تحاشا فائرنگ کر ڈالتا تو نہ صرف دستے کی طاقت کمزور پڑ جاتی بلکہ ان کے ساتھیوں کو بھی آگے بڑھ کر باقی ماندہ فوجیوں پر حملہ کرنے کا خاطر خواہ اور کامیاب موقع مل سکتا تھا۔ نیز اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس دستی بم بھی ختم ہو چکے تھے، جبکہ اس کے پاس ابھی ایک دستی بم بچا تھا۔ پل کے پل اس نے ایک سرفروشانہ فیصلہ کر لیا اور [illegible] بازو کی کہنی کی مدد سے...... مذکورہ سمت دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا۔ باقر کی نظر اس کی حرکت پر پڑی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا ساتھی دانستہ موت کے دہانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اسے روکنے کے لیے ابھی اپنا منہ کھولنا چاہا تھا کہ اسی وقت اس کی نظر ذرا فاصلے پر زمین پر لیٹی فائرنگ کرتی لیلیٰ کے چہرے پر پڑی۔ اس کا بھی چہرہ مغموم تھا۔ اس نے باقر کو مخصوص اشارہ کر دیا اور باقر نے کرب کی شدت سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

ادھر جمال نے اپنے مطلوبہ مقام پر آنے سے پہلے دستی بم کی سیفٹی پن کھینچی اسے جیب میں رکھا اور بیک وقت تمام اٹھ کھڑا ہوا...... دائیں ہاتھ میں گن سیدھی کی اور ایک سرفروشانہ جوش تلے نعرہ تکبیر بلند کیا پھر جتنی تیز دوڑ سکتا تھا فائرنگ کرتا کھلی جگہ سے دیوار کی اندرونی سمت دوڑ پڑا۔ چونکہ اس طرف سے کسی کے اس طرح مردانہ وار داخل ہونے کا اسرائیلی فوجی دستے کے سان وگمان میں بھی نہ تھا۔ لہٰذا وہ بری طرح بوکھلا گئے۔ بیک وقت ان سب کی گنوں کا رخ جمال کی طرف ہو گیا۔ چند فوجی اس کی گولیوں کی زد میں بھی آئے مگر انہوں نے جمال پر فائر کھول ڈالے۔ جمال تب تک ایک سرفروشانہ حوصلے، قوت ارادی اور ایک مردانہ وار جوش تلے ان کی صفوں میں گھس آیا۔ تب تک اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور پھر اس کی جیب میں اس کا دستی بم ساعت شکن دھماکے سے پھٹا۔ کئی اسرائیلی فوجی کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ لقمۂ اجل بن گئے۔ ادھر لیلیٰ اور باقر کو جیسے ہی پیش قدمی کا موقع ملا وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے دوڑے اور باقی ماندہ اسرائیلی فوجیوں کو جہنم واصل کرتے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں بھی ان کا چند مسلح فوجیوں سے واسطہ پڑا تھا مگر اب یہ دونوں جیالے فتح کے عین قریب پہنچ کر کے موقع دیتے؟ پھر اپنے ساتھی جمال کی دیوانہ وار قربانی اور جرأت نے ان کے حوصلوں کو بھی سوا کر دیا تھا۔ پلانٹ کے مرکز میں پہنچ کر لیلیٰ نے خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم فٹ کرنا شروع کر دیے جو اس نے اپنے ہی پاس رکھے ہوئے تھے، باقر اسے کور کر رہا تھا۔ اسے جو فوجی نظر آتا، وہ اسے اپنی گن سے بھون کر رکھ دیتا۔ اس عرصے میں لیلیٰ نے تیزی کے ساتھ اپنا کام نمٹایا۔ وہ چار عدد خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم پلانٹ کے مختلف حساس مقامات پر فٹ کر چکی تھی اور ان کی بلاسٹنگ ٹائمنگ بھی [illegible] دونوں یہ کام نمٹا کر دوبارہ بیرونی گیٹ کی طرف دوڑے اور باہر نکلے۔ ابھی یہ پلانٹ کی گول گنبد نما عمارت کے وسیع وعریض تاریک احاطے میں تھے کہ انہیں آسمان پر گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ دونوں دھک سے رہ گئے۔ دو اسرائیلی جنگی ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔

☆☆☆

موساد کے میجر بارق شمعون کو اپنے ہیڈ کوارٹر سے جو کال موصول ہوئی تھی اور جسے سن کر وہ سکتے کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا، اس نے اس کی خوشی کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔ اسے اٹیمی بجلی گھر کے خفیہ ریسرچ پلانٹ سے ایمرجنسی کال موصول ہوئی تھی، جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ حریت پسندوں کے ایک ٹولے نے پلانٹ کی اہم چوکی پوائنٹ تھرٹی پر دھاوا بول دیا ہے۔ یہ ابھی ابتدائی اطلاع تھی لہٰذا بارق شمعون نے فوراً اسرائیلی آرمی ہیڈ کوارٹر سے کمک کی درخواست کروائی اور دو جنگی ہیلی کاپٹروں کو روانہ کر دیا گیا۔ وہ سخت پریشان اور جھلایا ہوا تھا۔ جب اس نے یہ خبر اپنے ساتھی ڈپٹی اضحاق شامیر کو سنائی تو ایک لمحے

کے لیے وہ بھی ہکا بکا رہ گیا۔

”ہمیں فوراً جنرل فرناش کو اس کی اطلاع کرنا ہوگی۔ آؤ......“ اضحاق شامیر نے کہا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔ پینل بورڈ کے عقب میں چھپی بیٹھی یہودی کمشنر پیریز ناون کی لاڈلی بیٹی بازغہ باہر نکل آئی۔ اسے بھی احساس تھا کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ بھی نکل کر دوبارہ اس ہال کمرے میں آ گئی جدھر طوفان بدتمیزی پورے جوبن پر تھا، اس نے دیکھا۔ میجر بارق شمعون اور اضحاق شامیر، ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش سے کچھ کہہ رہے تھے، جسے سنتے ہی جنرل فرناش کا چہرہ پہلے تو ایک لمحے کو تاریک ہوا پھر جیسے غیظ وغضب کے مارے لال بھبوکا ہو گیا۔ اسے جھنجلاہٹ میں اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے قریب موجود جام لنڈھاتے کمشنر پیریز کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ کمشنر کا تو جیسے سارا نشہ ہی ہرن ہو گیا۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا اور حیرت اور احساسِ تذلیل کے ملے جلے احساس تلے اپنی آنکھیں پھاڑے جنرل فرناش کا سرخ پڑتا چہرہ تکتا رہا۔

”تم کیا گھاس کاٹ رہے ہو اب تک...... عرب حریت پسند دندناتے ہوئے ہماری سرزمین میں داخل ہو گئے، تم دیکھتے رہے۔ قبرص سے ساڑھے سات سو جلاوطن فلسطینیوں کو بڑے آرام سے ان کی سرزمین میں دوبارہ بسا دیا گیا اور تم تماشائی بنے رہے یہاں تک کہ حریت پسندوں کا ٹولہ صحرائے نجف میں دندناتا ہوا داخل ہو گیا۔ تمہیں خبر تک نہیں۔ کیوں؟ کمشنر ناون......! کیوں جواب دو مجھے......“

کمشنر پیریز ناون سے کوئی جواب ہی نہیں بن پا رہا تھا مگر ذرا دور کھڑی اس کی بیٹی بازغہ اپنے باپ کے ساتھ زیادتی پر چپ نہ رہ سکی، کیونکہ حالاتِ حاضرہ کی اسے بھی اچھی طرح سوجھ بوجھ تھی، فوراً آگے بڑھ کر جنرل فرناش سے تیز لہجے میں بولی۔

”اس میں میرے پپا کا کیا قصور ہے؟ یہ معاملہ تو وزارتِ داخلہ اور انٹیلی جنس کا ہے جسے ہائر اتھارٹیز کی جانب سے خصوصی صوابدیدی اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ کمال ہے آپ لوگوں کی اس قدر پاورفل انٹیلی جنس ہونے کے باوجود یہ مٹھی بھر حریت پسند یہاں تک آن پہنچے اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ یہ تم لوگوں کی نااہلی ہے، میرے پپا کی نہیں، وہ تو صرف شہری انتظامیہ تک محدود ہیں۔“ جنرل فرناش ایک نوجوان لڑکی کے منہ سے ایسے ترکی بہ ترکی الفاظ سن کر مزید بپھر گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ کمشنر پیریز ناون نے جو اپنی لاڈلی بیٹی کو ایک سفاک اور سخت گیر انسان کے نشانے پر دیکھا تو فوراً اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا اور جنرل فرناش سے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

”اسے معاف کر دیں سر!...... یہ ناسمجھ ہے۔“ مگر جنرل فرناش کا آتشِ غیظ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے بپھرے ہوئے تیور بتا رہے تھے۔ وہ کسی بھی وقت دونوں باپ بیٹی کو ہی شوٹ کر ڈالے گا کہ اچانک بلیک آؤٹ ہو گیا۔ بجلی چلی گئی، سارا ہیڈ کوارٹر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دونوں کو ایک ساتھ ہی ہوش آیا تھا۔ ان کے چہرے اور جسم ٹھنڈے یخ پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ نائمہ بے چاری کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی، اس کے کپڑے گیلے ہو کر جسم کے ساتھ چپک گئے تھے اور جسمانی نشیب وفراز ابھرنے لگے تھے، اس کے خوف پر شرمندگی غالب آ رہی تھی، تیز ٹھنڈے پانی کی وجہ سے وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی جبکہ عابد کشمیری کی کیفیات مختلف تھیں ہوش میں آتے ہی اس نے گردوپیش کا جائزہ لینے کے دوران اپنے نیم غنودہ حواسوں کو جگانے کی کوشش کی۔

دونوں ایک قدرے کشادہ کمرے کے کونے میں فرش پر بے سدھ پڑے تھے اور ان کے سامنے تین اجنبی چہرے موجود تھے، جن کے بدہیئت ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ان کے جسموں پر مخصوص وردیاں نظر آ رہی تھیں، جسے دیکھ کر عابد کو پھر تشویش لاحق ہونے لگی تھی، اسے سب یاد آ چکا تھا کہ ان پر دوبارہ حملہ کیا گیا تھا جبکہ دوسرے حملے میں جس آسانی کے ساتھ اسرائیلی پولیس نے انہیں جن نام نہاد فلسطینی حریت پسندوں کے حوالے کر دیا تھا وہ درحقیقت ایک ڈراما تھا۔ وہ اب یقیناً اسرائیلی انٹیلی جنس کی قید میں ڈالے جا چکے تھے، دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے، تاہم اب انہیں رات ہوتی محسوس ہو رہی تھی، کمرے میں بلب روشن تھا۔

”ہاں، مسٹر کشمیری! ہم تم دونوں کو یہاں خوش آمدید کہتے ہیں۔“ تینوں میں سے ایک نے استہزائیہ مسکراہٹ سے عابد کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ وہی موساد کا ٹاپ ایجنٹ شیفل یہود تھا جس نے اپنے ایک کمانڈو ساتھی ڈیوڈ کے ساتھ مل کر قبرص میں دو فلسطینی جلاوطن آفیسروں کو قتل کیا تھا۔ ڈیوڈ بھی وہیں موجود تھا۔ یہ لوگ یروشلم میں موساد کے ایک فائٹر کمانڈو گروپ کے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔

"مجھے حیرت ہوئی اس طرح دھوکے سے اپنے یہاں آنے کی۔" جواباً عابد شکیمری نے شیفل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تمہاری پولیس کے قبضے میں تو ہم آہی چکے تھے...... پھر یہ سارا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اوہ...... خاصے چالاک ہو لیکن تمہاری خرمستی دور کرنے کے لیے مجھے بتانا پڑے گا کہ ہم نے تم پر کس طرح محفوظ طریقے سے ہاتھ ڈالا کہ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مرجائے۔" شیفل بولا۔ پھر اس نے اسے اس ڈرامے کے بارے میں صاف صاف بتادیا۔ اگرچہ عابد کو بھی کافی حد تک اس قصے کا اندازہ ہو ہی گیا تھا، تاہم ان کے منہ سے بھی حقیقت سننا چاہتا تھا۔ کم از کم عابد نے اپنی ذہنی فراست سے اتنا اندازہ ضرور لگالیا تھا کہ یہ لوگ انہیں زندہ چھوڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔

شیفل ایک کٹر یہودی تھا۔ وہ اپنی مکاری، سفاکی اور ظلم کی داستانیں کسی عرب کو بتا کر جانے اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتا تھا۔ اس نے اس بات کا بھی عابد اور نائمہ کے سامنے اعتراف کرلیا کہ سیماسول کی بندرگاہ میں جن دو جلاوطن فلسطینیوں کی ٹارگٹ کلنگ کی تھی ان میں وہ اور اس کا ساتھی ڈیوڈ شامل تھے۔

"ہم سے اب کیا چاہتے ہو تم؟"

بالآخر عابد شکیمری نے دانستہ اپنی آواز اور اپنے لہجے کو شکست خوردہ بناتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس کا دوسرا ساتھی ڈیوڈ آنکھیں نکال کر اس سے بولا۔ "تم دونوں کی موت۔"

"کس جرم میں...... ہمارا تو کسی فلسطینی حریت پسند سے کوئی تعلق نہیں۔" عابد نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا۔ اس کا ذہن اب تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

"جرم......!" شیفل اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ "تمہارا یہ جرم کافی نہیں کہ تم نے ہمارا قبرص آپریشن بری طرح ناکام کر ڈالا۔ ان دونوں جلاوطن فلسطینیوں کی ہمارے ہاتھوں ہلاکت کے باوجود تم نے ان کے اہم مشن کو پورا کرنے کے بعد جو بیڑا اٹھایا، اس پر عمل بھی کر ڈالا اور ساڑھے سات سو ریفیوجیز فلسطینیوں کو اپنی کمپنی کے دو بحری جہازوں میں لاکر دوبارہ انہیں ان کی سرزمین میں آباد کرانے کا سبب بنے۔ یہ ناقابلِ معافی جرم ہے تمہارا۔"

عابد بولا۔ "یہ میرا کاروبار ہے۔ اگر کوئی مجھے زیادہ رقم دینے کا لالچ دیتا تو میں فلسطینی مہاجروں سے بھرے اپنے ان دونوں جہازوں کو خود ہی ڈبو بھی دیتا۔" اس کی بات پر پہلی بار شیفل اور اس کے ساتھی کمانڈو ایجنٹ کے چہروں پر درشتی کی جگہ الجھن سی تیر گئی۔ عابد نے دانستہ خود کو لالچی اور کاروباری ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان یہودی کتوں کے ذہنوں میں یہ بات تشکیک کا شکار ہوجائے کہ اس نیک مقصد میں عابد کا اپنے مظلوم بھائیوں کی ہمدردی اور مدد کا جو ازلی جذبہ کارفرما تھا، وہ آشکار نہ ہوسکے۔

"کیا مطلب؟" اس بار ڈیوڈ نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تو عابد معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"میں ایک عرصے سے اپنی "البحر" جہازراں کمپنی کی آڑ میں خطیر معاوضہ لے کر انسانوں کی اسمگلنگ کا کاروبار کررہا ہوں۔ اب تم لوگوں نے خود کو ظاہر کرہی دیا ہے تو میں کیوں خود کو چھپاؤں؟ یہ میرے کاروباری اصولوں کے منافی ہوگا کیونکہ کاروباری ڈیل تو کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں ممکن ہے۔"

"تو پھر ان ساڑھے سات سو مہاجر فلسطینیوں کو دوبارہ یہاں حیفہ پہنچانے کے لیے تمہیں کس نے ٹاسک دیا تھا؟" شیفل نے برمائی نظروں سے عابد کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کسی حریت پسند تنظیم کا لیڈر تھا۔ کبھی میرے سامنے نہیں آیا۔ صرف فون پر مجھ سے کام کی ڈیلنگ کرتا تھا اور میرا سوئس اکاؤنٹ بھرتا تھا۔" عابد نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ مستحکم اور اعتماد سے پر تھا۔

"لیکن ان فلسطینی آزاد پسند گروپوں کے پاس اتنا سارا روپیہ کبھی نہیں آیا تو وہ تمہیں اتنی خطیر رقم کہاں سے ادا کرتے ہوں گے؟" شیفل نے تشکیک بھرے لہجے میں پوچھا تو عابد ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"تم لوگوں کی عقل شاید صرف آگ و خون کا کھیل کھیلنے میں ہی کام کرتی ہے۔ تم ان خفیہ کاروباری معاملات کو کیا جانو۔ کیا تم لوگوں کی تاریخ میں اتنا بھی نہیں کہ بعض غیر فلسطینی یا آسودہ حال عرب مسلم جذبۂ ہمدردی کے تحت ان لوگوں کی درپردہ مالی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دولت مند عرب خاندان آزادیٔ فلسطین کے دو بڑے گروپوں پی فرنٹ اور المجاہد کی خفیہ مالی مدد کرنے میں مصروف ہے۔"

اس کی بات پر شیفل اور ڈیوڈ نے پرسوچ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عابد دزدیدہ نظروں

سے ان کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ قائم کرتا رہا کہ اس کا اندھیرے میں پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ یہی سبب تھا کہ شیفل یہود نے خبیثانہ مسکراہٹ سے عابد شکیمری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم تم سے یہ کہیں کہ تم اس دولت مند خاندان کی نشاندہی کردو جو خفیہ طور پر ان حریت پسند تنظیموں کو مالی سپورٹ کررہا ہے اور اس کے صلے میں ہم منہ مانگی رقم دیں گے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟"

"میرا جواب یقیناً اثبات میں ہی ہونا چاہیے۔" عابد شکیمری نے یکلخت اپنے چہرے پہ خوشی اور حریصانہ تاثرات سموتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور پھر اچانک جیسے نائمہ پر ایک دورہ سا پڑا وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے ہی ساتھی عابد شکیمری پر جھپٹی اور اپنے لانبے نوکیلے ناخنوں سے اس کے خوبرو چہرے پر چند کھرونچے ڈال دیے۔

"ذلیل...... کتے، لالچی انسان...... غدار مسلم...... تو تمہارا یہ تھا اصل روپ...... تم چند ٹکوں کے لالچ میں...... اپنے مسلم بھائیوں کے خلاف اپنا ضمیر ان یہودی کتوں کے ہاتھوں بیچ دوگے...... میں...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

عابد شکیمری نے نائمہ کے اس اچانک حملے پر کمال بوکھلاہٹ اور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی اور دانستہ کمزور مزاحمت کرتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ خود پر حملہ آور ہونے کے لیے اکسایا اور پھر اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ شیفل اور ڈیوڈ...... نائمہ کو سنبھالنے اور عابد شکیمری کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے غیر ارادی طور پر آگے بڑھے تو...... عابد شکیمری نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ڈیوڈ کے ہولسٹر سے پستول کھینچ لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور ڈیوڈ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ الٹ گیا۔ شیفل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پھرتی سے پستول نکالا مگر عابد کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ جو اس کے چہرے پر پڑی جبکہ اس کے پستول کی دوسری گولی اس کے تیسرے ساتھی کو چاٹ گئی، جو اس پر اسلحہ نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔ شیفل لات کھا کے دیوار سے جا ٹکرایا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ عابد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب کے مارے سرخ ہورہا تھا اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ شیفل کو اپنے رحم و کرم پر دیکھتے ہوئے بار بار اس کے چشم تصور میں وہ دونوں جلاوطن فلسطینی آفیسرز کے چہرے رقصاں ہوگئے جن کو ان سفاک لوگوں نے بے دردی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے شہید کیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے عابد نے شیفل کی پیشانی کی طرف نال کرکے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور شیفل کا سر چیخ گیا۔

"آج میں نے ان دونوں بے گناہ فلسطینی آفیسروں کے خون کا بدلہ لے لیا۔" وہ جوش غیظ سے بڑبڑایا۔ نائمہ جو ہکابکا سی رہ گئی تھی، یکدم اٹھ کر عابد شکیمری کی طرف بڑھی اور اس سے بے اختیار لپٹ گئی پھر اس کے تیز نکیلے ناخنوں نے عابد کے چہرے کو جہاں جہاں سے زخمی کیا تھا وہاں وہاں وہ دیوانہ وار اپنے نرم و نازک لبوں کے مرہم رکھنے لگی۔ عابد شکیمری کے جلتے سلگتے وجود میں جیسے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ پھر وہ سنبھلا۔

"نائمہ! جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ ڈراما کیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا، یہ سب ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیں یہاں موت کے گھاٹ ہی اتارنے آئے تھے، چلو وقت کم ہے۔"

نائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تاہم وہ سنبھلی۔ پھر مردہ اسرائیلی ایجنٹوں کی لاشوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔" عابد اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ جتنی جلدی لاشوں سے ہتھیار اٹھا سکتے تھے، وہ اٹھا لیے۔

"تمہارے نازک ہاتھوں میں قلم کی جگہ ہتھیار؟"

عابد نے محبت کی حلاوت آمیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پرجوش لہجے میں بولی۔ "مجھے ہتھیار چلانے آتے ہیں۔ میں ایک کرائم رپورٹر بھی ہوں اور یہ سب میری تربیت کا حصہ رہا ہے۔"

دفعتاً دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک ابھری۔ عابد نے رائفل سیدھی کرلی تھی، نائمہ کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ سردست یہ لوگ یہی اٹھا سکے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو باریک جھری بنا کر عابد نے دیکھا، سامنے چکنے فرش والے کوریڈور میں وردی پوش چار پانچ مسلح افراد دوڑتے ہوئے اس طرف آتے دکھائی دیے۔ عابد کے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے پل کے پل ایک خطرناک اور جارحانہ فیصلہ کیا۔ اس وقت یہ سب اس کے نشانے پر تھے، اس نے سوچا۔ اگر وہ قریب آگئے تو ان پر قابو پانا مشکل ہوجائے گا اور خطرناک بھی...... چنانچہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دروازے کو تھوڑا مزید کھول دیا اور گن کا رخ ان کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ وہ پانچوں اسرائیلی رقصِ اجل کرتے زمیں بوس ہونے

گئے۔ دفعتاً تیز سائرن بجنے کی آواز ابھری۔ عابد نے ناظمہ کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ پار کر کے وہ دائیں جانب کی راہداری کی طرف دوڑ پڑا...... ایک ساتھ کئی بھاری بوٹوں کی دھمک ابھری۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ اسرائیلی کمانڈوز کے گھیرے میں آنے والے ہوں اور عابد کو اس سفاک حقیقت کا بہ خوبی احساس تھا کہ اگر اس بار وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تو یقینی سنگین موت سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ انہیں اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ فرار کی کوئی راہ سردست سجھائی نہیں دے رہی تھی، تب اچانک ہی سامنے سے انہیں مسلح دشمنوں کا پورا دستہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ انہوں نے فوراً راستہ بدلا اور نسبتاً ایک دوسری چھوٹی راہداری میں آ گئے، جو ان کے بائیں بازو کے رخ پر تھی مگر وہاں پہلے ہی سے تین چار کے قریب مسلح دشمن ان پر گنیں سیدھی کیے اور پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے، اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ان پر دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کی جانے والی تھی۔

☆☆☆

اپنے مطلوبہ مقامات پر پہنچنے کے بعد زبیدہ اور محسن نے ایک دوسرے سے رابطہ کر کے اپنی موجودہ پوزیشنوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ اب انہیں جس موقع کا انتظار تھا وہ بھی وقوع پذیر ہو گیا۔ بجلی اچانک ڈیوڈ اسٹار کی قلعہ نما عمارت تاریکی میں ڈوب گئی، یہی نہیں سارا علاقہ گھٹا ٹوپ تاریکی میں غرق ہو گیا۔ محسن کا دل زور سے دھڑکا۔ گویا...... لیلیٰ والا بی گروپ اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس بات نے اس کے اندر جوش بھر دیا۔

عارضی بجلی دینے والا پاور پلانٹ ان کے نشانے پر تھا جدھر خود کار نظام کے تحت اسٹینڈ بائی جنریٹرز دھیرے دھیرے اسٹارٹ ہونے لگے تھے لیکن محسن اور اس کے ساتھیوں نے منصوبے کے مطابق پہلے ہی اسے اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔ ان کے پاس فقط ایک ہی راکٹ لانچر تھا جو زبیر نے اپنے کاندھے پر لٹکا رکھا تھا پھر محسن کا اشارہ پاتے ہی وہ اس نے فائر کر دیا۔ دم بہ خود فضا میں "سائیں" کی آواز ابھری، عارضی پاور روم کی کنکریٹ اور سیمنٹ سے بنی دیواریں لرز اٹھیں۔ سماعت شکن دھماکے کے ساتھ ہی پاور روم میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر یہ لوگ عمارت کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑے۔ جدھر برائے نام ہی سیکیورٹی کا بندوبست نظر آتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اندر تھوڑی دیر پہلے اسرائیلی افسران صادق الخیری کی شہادت پر جشن منانے میں مصروف تھے نیز کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی یہاں آنے کی جرأت بھی کر سکے گا۔ خدا جب کسی قوم پر زوال لاتا ہے تو سب سے پہلے انہیں غفلت میں ڈال دیتا ہے، ادھر زبیدہ نے بھی اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ ڈیوڈ اسٹار کی عمارت کی طرف حرکت کی، انہوں نے ضرورت کی حد تک ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ دونوں گروپ ایک میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ کر ملے اور گیٹ پر دھاوا بول دیا۔ کچھ دستی بم بھی پھینکے گئی اسرائیلی دشمنوں کی کربہ انگیز چیخیں ابھریں۔ گیٹ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ سب اندر داخل ہو گئے، زبیدہ کے دل و دماغ میں جوش بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے سارے اہم شکار ادھر اکٹھے تھے، یہ شکار نہیں بلکہ ہتھیار تھے۔ ایسے قاتل شیطان جن کی گردنوں پر صادق الخیری اور قیصرا کیلی سمیت جانے کتنے حریت پسند رہنماؤں اور معصوم بے گناہ فلسطینیوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔

اندر داخل ہوتے ہی یہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر دائیں بائیں دو حصوں میں بٹ گئے اور مرکزی دروازے کی طرف دوڑے۔ اپنی ٹارچوں کی محض ضرورتاً ایک "جھپک" مارتے پھر بجھا دیتے اور اندازے سے پیش قدمی کرتے مگر...... محسن کے قریبی ساتھی زبیر سے ایک فاش غلطی ہوئی۔ اسے ایک بار ٹارچ جلانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسے ایک مسلح دستہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس نے فوراً ٹارچ بجھا دی مگر دشمن دستے نے روشنی کا سہارا لے کر اس جانب ایک محتاط انداز سے اپنی گن کا منہ کھول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ابھری اور تاریک گہری سیاہ چادر میں سلگتے قمقمے بجھ گئے، زبیر کو یوں لگا جیسے ان گنت سلگتی ہوئی سلاخیں اس کے وجود میں کسی نے اتار دی ہوں۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی کرب انگیز تھی، ایک دوسرا ساتھی بھی ان گولیوں کی زد میں آ گیا اور زبیر کی طرح اس نے بھی جام شہادت نوش کر لیا۔ محسن کا دل لہو سے بھر گیا۔ اس نے زبیر کو آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ زبیر اور اس کے ساتھی کی چیخوں پر دوبارہ قاتل دستے نے ان پر فائرنگ کی مگر تب تک انہیں بھی اپنی خطرناک پوزیشن کا ادراک ہو چکا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ انہوں نے گر کر اپنی جگہ بدلی اور بنتے ہی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ موجود تھے وہاں گولیوں کی پوری باڑ پڑی۔ اگر انہیں جگہ بدلنے میں چند ثانیوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو محسن سمیت سب چھلنی ہو چکے ہوتے، اندھیرے

کی وجہ سے اب تاریکی کے پردے میں چمکتے شعلوں کے تبادلوں کا اندازہ کرکے موت وزندگی کا یہ ''جوا'' کھیلا جارہا تھا۔ زبیدہ کے گروپ نے اپنا داؤ پھینکا۔ جدھر سے شعلے چمکے تھے اس طرف اس نے فائرنگ داغ دی۔ کئی دشمنوں کی کربہ انگیز چیخیں ابھری تھیں اور اس دوران زبیدہ حلق کے بل شیرنی کی طرح گرجی۔ ''اندر داخل ہونے کی کوشش کرو...... جلدی......''

اس وقت جانے کیوں بار بار اس کی لہورنگ آنکھوں کے سامنے ہزاروں بے گناہ فلسطینی عورتیں، بچوں کی آہیں وسسکیاں گونجنے لگیں اور ان شہدا کے چہرے بھی جن میں صادق الخیری اور قیصرا تحلیلی کے چہرے بھی شامل تھے، صادق الخیری کو جس بیدردی اور بربریت کا ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے مشترکہ تیونس آپریشن میں نشانہ بنایا گیا تھا، زبیدہ آج جلد سے جلد وہ حساب بے باق کرنے کے لیے بے چین تھی۔ ادھر عمارت کے اندر بری طرح کھلبلی مچ گئی تھی، عورتوں اور بچوں نے رونا چلانا شروع کردیا تھا۔ جنرل فرناش، ایہود شابک، اضحاق شامیر، بارق شمعون اور دیگر حکومتی افسران بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئے تھے، مگر اس کے بعد صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً اندھیروں میں گرتے پڑتے وار روم پہنچ کر حریت پسند چھاپا ماروں کے حملے کی اطلاع...... اسرائیلی جی ایچ کیو کو دے دی تھی کسی بھی وقت وہاں سے کمک کی آمد متوقع تھی مگر دھماکوں سے عمارت کے درودیوار لرز رہے تھے۔ اس دوران چارج لائٹیں اور جتنی ایمرجنسی لائٹیں موجود تھیں وہ روشن کرلی گئی تھیں...... بازغہ بھی فکرمند نظر آرہی تھی، یہودی کمشنر پیریز ناون کو اپنی بیٹی کی بھی فکرلاحق ہو رہی تھی۔ جانے کس حکومتی اہلکار نے چلا کے کہا۔

''عورتوں اور بچوں کو ایک کمرے میں لے جاکر محفوظ کردیا جائے فوراً......''

''نہیں۔'' دفعتاً جنرل فرناش کی تحکمانہ اور کرخت آواز گونجی۔ ''یہ عورتیں اور بچے...... ہمارے لیے تحفظ کا باعث بنیں گے۔'' جنرل فرناش کے مکروہ لہجے سے بلا کی عیاری پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت چند اہلکاروں نے اندر آکر بدحواسی میں اعلان کردیا۔ ''حریت پسند چھاپا ماروں کا پلڑا بھاری ہورہا ہے۔ ہمیں فوراً کمک کی ضرورت ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں دراندازہوسکتے ہیں۔''

اطلاع پروہی حکومتی اہلکار پھر چلایا اور جنرل فرناش سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''جنرل فرناش...... کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ فوراً عورتوں اور بچوں کو دوسرے کمرے میں منتقل کرنے کا بندوبست کرو۔ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔''

اس وقت جنرل فرناش کے ایک ہاتھ میں پستول چمکنے لگا۔ جس کی نال کا رخ اس حکومتی افسر کی طرف تھا۔ دوسرے ہی لمحے نال سے ایک دھماکا ہوا اور گولی اس چیختے چلاتے حکومتی اہلکار کی پیشانی میں پیوست ہوکر اس کا بھیجا چاٹ گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔ کئی خواتین اور بچوں کی دبی دبی سسکیاں خارج ہوئیں۔ جنرل فرناش کے سفاکانہ اقدام پر جیسے یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا اور اس خوفناک ماحول میں جنرل آئزک فرناش کی بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔

''یہاں صرف میرا حکم چلے گا۔ جنرل آئزک فرناش کا حکم...... یہودی قوم اور گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں کسی بھی مصلحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ کسی کو کچھ بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم ان فلسطینی حریت پسندوں کی فطرت کو جانتے ہیں یہ لوگ کبھی عورتوں اور بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتے ان کی موجودگی ہمیں تحفظ دے گی۔''

یہودی کمشنر پیریز ناون کی جواں سال نازولی بیٹی بڑے غور سے ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کی بات سن رہی تھی اور اس سفاک اور منافق شخص سے سخت نفرت بھی محسوس کرنے لگی تھی، جو اپنے منہ سے حریت پسندوں کی نیک فطرت کا خود اعتراف کررہا تھا۔ بازغہ کا جی تو چاہا کہ وہ جنرل فرناش سے پوچھے کہ جب فلسطینی حریت پسند عورتوں اور بچوں کا اتنا لحاظ کرتے ہیں تو پھر اسرائیلی بمبار طیاروں نے غزہ، حیفہ اور نابلس کی فلسطینی مسلم آبادیوں میں، حتیٰ کہ اسپتالوں میں وحشیانہ گولہ باری کیوں کی تھی، جس کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے تھے مگر بازغہ باوجود اپنی شدید خواہش کے جنرل آئزک فرناش سے یہ کڑوا سوال نہ کرسکی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس بھیانک انسان کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے اور اس کے باپ پیریز ناون کو بھی گولی مار سکتا تھا۔

لہٰذا بازغہ نے چپ سادھ لی مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے اب جنرل فرناش وغیرہ سے ہی نہیں اپنی مکار، دغاباز اور منافق قوم سے بھی نفرت ہوچلی تھی۔ بازغہ نے نیویارک یونیورسٹی میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے مختلف اقوام اور مذاہب سے متعلق ہسٹریکل بکس کا بھی

مطالعہ کیا تھا، اب تک اسے اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب ایسا محسوس نہیں ہوا تھا جس نے سب سے انسانیت اور انسان سے محبت کا درس دیا تھا۔ ظلم، زیادتی اور نفرتوں کو فساد کی جڑ کہا تھا جبکہ بازغہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی یہودی قوم کو نہتے فلسطینیوں پر ظلم وبربریت کے پہاڑ توڑتا دیکھتی آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ بازغہ کو ایک یہودی ہونے کے ناتے خود اپنے آپ سے بھی شرم آرہی تھی۔

جنرل فرناش کے اس اعلان کی تائید میجر ایہود شابک اور بارق شمعون وغیرہ نے بھی کی تھی۔ جنہیں اختلاف تھا وہ اپنا اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔

فائرنگ کی آواز قریب آتی جارہی تھی، دستی بم بھی پھینکے جارہے تھے، جنرل فرناش اور اس کے ہمنوا چوکنے ہوگئے تھے اور اپنے اردگرد عورتوں اور بچوں کو زبردستی اکٹھا کرلیا گیا تھا۔ اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔

☆☆☆

سوچنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس...... دونوں نے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھکے جھکے انداز میں دوڑتے ہوئے عمارت کے جنوبی حصے کی دیوار کی جانب بڑھ گئے۔ لیلیٰ نے یہاں آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو باقر نے اسے بازو سے تھام لیا اور بولا۔ ''ابھی ہم آگے نہیں بڑھیں گے، دونوں ہیلی کاپٹر ہم پر فائر کھول دیں گے۔''

''تم پاگل ہوگئے ہو؟'' لیلیٰ بولی۔ ''اندر میں ٹائم بم فٹ کرچکی ہوں اور صرف بیس منٹ کا ٹائم فکس کیا ہے میں نے۔ یہ عمارت تباہ ہونے والی ہے۔ ہم بھی......''

''لیلیٰ!...... صبر کرو۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے، تھوڑا انتظار کرو۔'' باقر نے پرجوش لہجے میں کہا۔ لیلیٰ الجھ گئی۔ باقر کی ذہانت سے وہ واقف تھی، اس لیے وہ بھی...... گزرتے وقت کا خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔

دونوں ہیلی کاپٹر پہلے چند منٹوں تک عمارت کے اوپر منڈلاتے رہے اور نیچے سرچ لائٹ پھینکتے رہے۔ اس کے بعد وسیع وعریض احاطے میں اتر گئے۔ ادھر بم پھٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے، جیسے ہی ہیلی کاپٹر نیچے ہوئے، باقر نے لیلیٰ کا بازو پکڑا اور ایک طرف دوڑ لگادی۔ دونوں جتنی تیز دوڑ سکتے تھے، دوڑتے رہے، تیز...... بہت...... تیز اور پھر ان کے عقب میں ذرا دور یکے بعد دیگرے دھماکے ہونے لگے۔ انہیں اپنے پیروں کے نیچے زمین تک لرزتی محسوس ہوئی۔ دونوں اندھا دھند دوڑتے دوڑتے زمین بوس ہوگئے اور ایٹمی بجلی گھر میں آگ بھڑک اٹھی...... اور وہ دھڑا دھڑ شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ آس پاس کا ماحول دور تک سرخ نارنجی سی قرمزی روشنی میں نہا گیا تھا۔ پلانٹ مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا اور اپنے ساتھ ان دونوں اسرائیلی جنگی ہیلی کاپٹروں اور ان کے سواروں کو بھی نگل چکا تھا۔

اس عظیم فتح کی خوشی میں لیلیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ان میں اپنے ساتھیوں اور بالخصوص جمال کی بھی آخری فیصلہ کن لمحات میں دینے والی بے دریغ قربانی کا جذبہ بھی شامل تھا۔

''اٹھو لیلیٰ!...... اللہ نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کردیا ہے۔'' باقر نے ہولے سے کہا اور پھر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کا رخ ابونصر کی سرائے کی طرف تھا۔ ابونصر نے کہا تھا کہ وہ ان کی کامیاب واپسی کا منتظر ہوگا اور موقع ملا تو وہ انہیں لینے کے لیے بھی آئے گا اور وہی ہوا۔ انہوں نے ابھی چند فرلانگ کا سفر طے کیا ہوگا کہ ابونصر ایک اونٹ ریڑھے میں انہیں لینے آن پہنچا تھا۔ اسے باقی ساتھیوں کی موت کا دکھ بھی تھا۔ تاہم خوشی بھی تھی کہ انہوں نے اسرائیل کی کمر توڑ دی تھی۔ ان کا مستقبل کا ایک بڑا خفیہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے سبوتاژ کرڈالا تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا بجلی گھر بھی تباہ کردیا تھا۔ جو اسرائیل کے چند بڑے شہروں کو بجلی سپلائی کرتا تھا۔

یہ لوگ بہ خیروعافیت سرائے پہنچ گئے لیکن ابونصر نے انہیں رکنے نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت یہاں بڑے پیمانے پر تلاشی اور اکھاڑ پچھاڑ کا عمل شروع ہوجائے گا۔ اس لیے اس نے انہیں عرب بدو کا بھیس بھر کے آگے روانہ کردیا۔

ان کا رخ بیت صفانہ کی پہاڑیوں کی طرف تھا، جدھر ''المجاہد'' کا خفیہ ٹھکانا تھا۔ اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے لیلیٰ کو محفوظ اور خفیہ گزرگاہوں کا بہ خوبی علم تھا۔ باقر اور لیلیٰ دونوں ایک اونٹ پر سوار تھے۔ اونٹ سدھایا ہوا تھا جو مسافر کو چھوڑ کر خود ہی واپسی کا رخ کرتا ہے۔ خنک ویران تاریک رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ اوپر تاروں بھرے آسمان پر تھالی سا طباق چاند گردوپیش میں طلسماتی چاندنی نچھاور کررہا تھا۔ دونوں خاموش تھے تاہم دل ہی دل میں زبیدہ اور اپنے ساتھیوں کی مہم کی کامیابی کی دعا مانگ رہے تھے۔ باقر کے دل میں لیلیٰ کے لیے جو جذبات تھے وہ رات کی اس طلسماتی فضا میں اپنا اثر دکھانے لگے۔ باقر بھی ایک جوان مرد تھا۔ اس کے دل میں بھی جذبات تھے، پھر وہ لیلیٰ

سے محبت بھی کرتا تھا۔ بے شک یہ یکطرفہ اور خاموش محبت تھی مگر لیلیٰ بہرحال اس کی پسند تھی۔ لیلیٰ کو ابھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ باقر چپکے چپکے اسے پسند کرتا ہے مگر جانے کیوں ایسے میں اسے کسی کی یاد آنے لگی تھی اور اس کی دلنشین آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ باقر کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی مگر باقر پہلے ہی گاہے بہ گاہے اس کے حسین چہرے کو تکے جارہا تھا۔ اس نے تبھی لیلیٰ کی کشادہ آنکھوں میں چمکتی نمی دیکھ لی تھی اور جب لیلیٰ نے ایک ہلکی سسکی لے کر اپنا رخ ماہ روشن چہرہ دوسری طرف کیا تو باقر تڑپ اٹھا۔ اس نے ہولے سے لیلیٰ کی ٹھوڑی پر اپنا ہاتھ رکھ کے آہستگی سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو وہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ اسے دکھی اور افسردہ دیکھ کر باقر سے نہ رہا گیا اور بے اختیار دل کی عمیق گہرائیوں سے بولا۔

”لیلیٰ...... تم رو کیوں رہی ہو؟“

”بس...... یونہی دل بھر آیا تھا۔“ لیلیٰ نے بہانہ بنانا چاہا مگر باقر کو لیلیٰ کے بیک گراؤنڈ کا علم تھا بولا۔

”لیلیٰ......! ایک مخلص ساتھی کی حیثیت سے میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں...... تم نے واقعی ارضِ فلسطین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پہلے تمہارا بھائی شہید ہوا پھر تمہارا منگیتر اور اب تم خود کو بھی۔ ارضِ وطن کے لیے وقف کرچکی ہو لیکن لیلیٰ!...... میں سمجھتا ہوں انسان کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل بعض فطری جذبات تلے کمزور اور رقیق بھی ہونے لگتا ہے۔ جس کا ثبوت آج میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔“

باقر کی آواز اور لہجے میں جانے ایسا کیا ساز فسوں تھا کہ جس نے لیلیٰ کے جذبات کے تاروں کو چھیڑ ڈالا اور وہ پہلی بار قدرے چونک کر...... سوچتی نظروں سے...... بہ غور باقر کا چہرہ تکنے لگی اور تب ہی اسے باقر کی آنکھوں میں مہر و وفا کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن نظر آیا۔ لیلیٰ کے نسوانی وجدان اور اس کی تلاطم خیزی نے بری طرح جھنجوڑ دیا۔ بے اختیار لیلیٰ کے لبوں سے رمزیہ برآمد ہوں۔

”باقر!...... کیا تم بھی کسی کو پسند کرتے تھے؟“

”ہاں...... ! پسند کرتا تھا نہیں۔ پسند کرتا ہوں۔“ باقر بھی ایک سحر انگیزی کی کیفیات تلے جواباً لیلیٰ کی گہری اور کشادہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کسے؟“ بے اختیار لیلیٰ کے عنابی لبوں سے برآمد ہوا۔ باقر نے محویت کے عالم میں کہا۔

”لیلیٰ! آنکھیں بھی تو ایک آئینہ ہوتی ہیں...... جس میں ایک سچی محبت کا کمال دکھتا ہے۔ سچ بتاؤ اور میری آنکھوں میں غور سے دیکھو...... آئینہ سمجھو۔ بھلا آئینے میں دیکھنے سے کس کی صورت نظر آتی ہے؟“

باقر نے اپنے خفیہ جذبات کی رمزیہ ترجمانی کرتے ہوئے لیلیٰ کے خوابیدہ دل کے تاروں کو جیسے چھیڑا تو لیلیٰ کے حسین چہرے پر پہلے تو حیرت کی رمق ابھری پھر یہ رمق...... ایک ہلکی سی سرخی میں بدل گئی۔

”برا مت منانا لیلیٰ میں نے آج تک تم سے کبھی اپنی یکطرفہ اور خاموش محبت کا اظہار نہیں کیا اور کرتا بھی کیسے؟“ وہ بے اختیار ہوکر بولا۔ ”ہم جس منزل کی راہ کے مسافر ہیں وہاں حب الوطنی اور وطن پر جاں نثاری سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچا جاتا مگر محبت تو محبت ہوتی ہے نا...... لیلیٰ...... اس کے تو ہزار رنگ ہوتے ہیں اور یہ ہر رنگ سودائے عشق ابھارتی ہے۔ چاہے کیسے ہی حالات ہوں ہم کچھ فطری تقاضوں سے چاہیں بھی تو منہ نہیں موڑ سکتے۔“

”محبت کا دوسرا مفہوم قربانی بھی تو ہوتا ہے باقر!“ اس کی بات پر لیلیٰ نے دھیرے سے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔ باقر بولا۔ ”ہاں لیلیٰ! میں تو اپنے وطن کی محبت میں اپنی جان تک کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہوں کہ محبت کا درس ایثار و قربانی بھی ہے۔“

”وقار...... میری نسبت طے ہو چکی تھی۔ ایک عام گھریلو لڑکی کی طرح میں نے بھی اسے اپنا مستقبل کا جیون ساتھی تسلیم کرلیا تھا۔ اس وقت تو مجھے بھی محبت کے مفہوم کا علم نہ تھا کہ یہ ہوتی کیا ہے؟ اسی دوران وہ اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہوگیا۔ میرا بھائی بھی مجاہدوں کے اس گروپ میں تھا جس میں وقار تھا۔ اس کے بعد میری سوچ کا دھارا بدل گیا اور پھر میں نے بھی اپنی زندگی، اپنی سانسیں آزادی وطن کے لیے وقف کر ڈالیں۔ لل...... لیکن...... اب...... کاش۔“ لیلیٰ اٹکنے لگی۔ تاہم اس نے جملہ مکمل کرلیا۔ ”اب شاید تمہاری باتوں سے مجھے بھی محبت کا مفہوم سمجھ آنے لگا ہے۔“ لیلیٰ کی بات نے باقر کے دل کو بے طرح دھڑکا دیا۔ اظہارِ محبت نہ بھی کرو تو انتخاب راہ خود ہی راستے میں پھول بچھا دیتی ہے، جس کی خوشبو پتا دیتی ہے کہ ادھر بھی ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

”لیلیٰ! میں قسم کھاتا ہوں میں ہر قربانی کے لیے تیار رہوں گا۔“

”تو پھر وعدہ کرو۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔ اس محبت کو وطن کی محبت پر کبھی ترجیح نہیں دوں گا۔“ باقر دل کی عمیق گہرائیوں سے بولا اور

پھر دفعتاً اسے اپنے کھردرے مگر مضبوط ہاتھوں میں کسی کے نرم و نازک ہاتھ کا پیار بھرا لمس محسوس ہوا۔ یہ لیلیٰ کا ہاتھ تھا جس سے باقر کا دل ہی نہیں روح تک سرشار ہوگئی۔

☆☆☆

آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی۔ زندگی کی راہ مسدود ہوچکی تھی کہ اچانک ہر سو تاریکی پھیل گئی۔ نائمہ پریشان اور متوحش ہوگئی مگر عابد شیکھری نے اس موقع سے فوری طور پر فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور فوراً نائمہ کو جھکے جھکے انداز میں واپس پلٹنے اور عقب میں اس جگہ مڑنے کی سرگوشی میں تاکید کی، جدھر سے یہ آئے تھے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ دونوں اسرائیلی مسلح دستے اندھیرے میں اندھا دھند فائرنگ کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ اس طرح اپنے آدمیوں کی جانوں کے زیاں کا بھی خدشہ تھا تاہم انہوں نے پیش قدمی کے طور پر دوڑ لگا دی۔ اندھیرے میں دونوں دستے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے، ان کا خیال تھا وہ درمیان میں اپنے شکار کو دبوچ لیں گے مگر بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ تو انہیں جل دے کر راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہوچکے تھے۔

ادھر وہ دونوں تاریکی میں محض اندازوں سے دیواروں کے ساتھ ٹکرا کے فرار کی کوشش میں مصروفِ کار تھے کہ دفعتاً ایک بھی گھرر...... ر...... کی آواز سنائی دی اور لائٹ آن ہوگئی۔ شاید جنریٹر آن کردیے گئے تھے۔ سائرن بھی بج اٹھے تھے۔ عابد، نائمہ دونوں دوڑتے ہوئے ایک زینے کے قریب پہنچے۔ اس عمارت کے محلِ وقوع کے بارے میں انہیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ کون سا راستہ کہاں جاتا تھا؟ اور نکاسی کا راستہ کہاں تھا؟ تاہم ایک محتاط اندازے میں گردوپیش کے جائزے کے دوران عابد کو کچھ اندازہ ہوا تھا کہ وہ گراؤنڈ فلور میں ہی تھے لیکن پھر ایک نیچے جانے والے زینے کو دیکھ کر وہ شش و پنج کا شکار ہوگیا۔ اس دوران نائمہ کا ذہن بھی تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابھی ہمارا باہر نکلنا ناممکن ہی ہوگا۔ یہاں سب ہمارے سلسلے میں ہائی الرٹ ہوچکے ہوں گے جلد بازی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔“

”تمہارا خیال ہے، ہمیں کہیں چھپ جانا چاہیے؟“

”ہاں! ممکن ہے وہ یہ سمجھیں کہ ہم فرار ہوچکے ہیں، معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

”سوچ لو، کہیں یہ عمارت قید خانہ ہی نہ بن جائے ہمارے لیے۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔“ نائمہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی اس کی زندہ دلی عابد کو مسکرانے پر مجبور کرگئی۔

”میرا خیال ہے یہ زینہ کسی بیسمنٹ کی طرف جاتا ہے۔ ادھر ہی چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔“ عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عقب سے بھاری دوڑتے قدموں کی دھمک ابھری۔ دونوں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر زینے اترنے لگے۔ جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے یہاں سناٹا تھا مگر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ یہاں ہر طرح کی چھوٹی بڑی گاڑیاں اور چند ٹرک بھی کھڑے تھے۔

”یہ عمارت کی پارکنگ لگتی ہے۔ آؤ اس کا گیٹ دیکھتے ہیں۔“ عابد نے جوش تلے کہہ کر آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یکدم زینہ بھاری قدموں کی دھمک سے گونج اٹھا۔ دونوں کی خوشی کافور ہوگئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔

”وہ نیچے آرہے ہیں۔“ نائمہ نے مرتعش سرگوشی میں کہا۔ عابد نے تیزی سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اسے یہاں چھپنے کی کوئی معقول جگہ نظر نہیں آرہی تھی پھر وقت بھی کم تھا، مسلح دشمن کسی بھی وقت بیسمنٹ میں آسکتے تھے، ایک لمحے کو تو دونوں کو یوں لگا وہ خود ہی کسی چوہے دان میں آن پھنسے ہوں۔ تب دفعتاً عابد کے ذہن میں ایک خیال جھماکے سے ابھرا۔ وہ خیال ذرا فاصلے پر کھڑی گاڑیوں کی قطار کے درمیان کھڑے ٹرک کو دیکھ کر ابھرا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔

اب بیسمنٹ کا فرش دوڑتے بھاری بوٹوں کے شور سے گونجنے لگا تھا۔ آنے والے دائیں بائیں پھیل رہے تھے۔ ان دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے اور سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ تاہم مطلوبہ ٹرک کے پاس پہنچ کر یہ اس کے اوپر سوار ہونے کے بجائے نیچے سرک گئے۔ عابد ٹرک کے نیچے کا جائزہ لینے لگا اور پھر اسے ایک خلا دکھائی دے گیا۔ نائمہ سے بولا۔ ”جلدی کرو، خود کو اس خلا میں ایڈجسٹ کرو...... ہری اپ۔“

”مم...... مگر...... تت...... تم۔“ وہ ہکلائی۔

”دیر مت کرو...... میں بھی اپنا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“ عابد بولا پھر جیسے نائمہ نے عابد کی مدد سے خود کو ٹرک کے نچلے خلا میں پھنسایا۔ عابد تیزی سے نکلا۔ پاس کی ایک بڑی سی جیپ کے نیچے سرک گیا۔ ٹھیک اسی وقت اسے اس رو میں بھاری بوٹوں کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جیپ کے نیچے خلا تلاش کیا مگر بہت تنگ خلا تھا۔ اس کے اندر خود کو

پھنسانا اسے مشکل نظر آرہا تھا مگر اب مزید چانس لینے کا وقت بھی نہیں رہا تھا، اس کے دائیں بائیں ان گنت بھاری بوٹ نظر آنے لگے تھے اور دشمن گاڑیوں کے نیچے جھک جھک کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے نظر آجانے کی صورت میں وہ اپنے ہتھیاروں کے منہ کھول سکتے تھے۔ عابد ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر جیپ کے نچلے حصے میں نصب ایک آہنی راڈ کو پکڑ کر اوپر کو اٹھ گیا۔ وہ لیٹنے لیٹے پوزیشن میں اوپر کی طرف سپاٹ ہوگیا تھا مگر ٹکے رہنے کی معقول صورت پھر بھی اسے نہیں ملی تھی۔ وہ محض اپنے دونوں بازوؤں اور ٹانگوں کو جیپ کے آہنی پنجر میں اٹکائے اس طرح جھول رہا تھا کہ بالکل سپاٹ ہوگیا تھا۔ اس وقت کئی گردنیں جھک کر جیپ کے نچلے خلا کا جائزہ لینے لگیں، عابد نے بازوؤں اور ٹانگوں کا تھوڑا اور زور لگا کر اپنے وجود کو مزید اوپر کردیا۔ نیچے آہنی جنگلے میں لگے آئل اور گریس سے اس کا اپنا حلیہ بھی بدل گیا تھا مگر اس پوزیشن میں اسے بڑی طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی، اس کا سارا جسم پل بھر میں شل ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیے تھے، اگر وہ نیچے فرش پر گر جاتا تو دیکھ لیا جاتا۔ دشمنوں کی نظروں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہاتھوں پیروں کی قوت سے اپنے وجود کو جیپ کے نچلے مشینری والے حصے میں اسی طرح پھنسائے رکھتا اور وہ ایسا بڑی جانفشانی کے ساتھ کیے ہوئے تھا...... دفعتاً ایک بھاری آواز ابھری۔ لہجہ عبرانی تھا۔

”میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئے...... اوپر ہی ہیں۔ ہمیں اوپر ہی تلاش کرنا چاہیے۔“ اس آواز پر عابد کشمیری نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ اسے مزید خوشی ہوئی جب واپس جاتے قدموں کی آواز ابھری۔ مگر جلد ہی عابد کی خوشی غم ناک سکتے میں بدل گئی۔ نہ جانے نائمہ کے ساتھ کیا ہوا تھا، یا پھر وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکی تھی کہ عابد کو دھپ سے اس کے فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بھی اتنی نہیں تھی کہ جاتے ہوئے دشمنوں کو سنائی دیتی لیکن جانے کیا ہوا تھا کہ جس ٹرک کے نچلے مشینری والے آہنی خلا میں عابد نے اسے اپنی طرح ہاتھوں پیروں کی مدد سے لیٹنے کے انداز میں ٹکایا تھا بدقسمتی سے کوئی آہنی راڈ نکل گئی تھی اور نائمہ سمیت نکل کر وہ آہنی راڈ زور سے پختہ فرش پر بجی تھی۔ جاتے ہوئے دشمنوں کے بھاری قدموں کی آواز کو یکدم بریک لگ گئے۔ عابد کشمیری کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ آہنی راڈ کے گرنے کی آواز پورے بیسمنٹ میں گونجی تھی۔ عابد نے تھوڑا نیچے سرک کر ٹرک کی طرف جھانکا اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔ آئل اور گریس میں لتھڑی ہوئی نائمہ ٹرک کے نیچے فرش پر گری ہوئی تھی اور بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی، وہ بار بار دوبارہ ٹرک کے خلا میں اٹھنے اور اٹکنے کی کوشش کررہی تھی، مگر اب اس کا فائدہ نہ تھا۔ دشمنوں کو شبہ ہوگیا تھا۔ وہ آواز کی سمت اب تیزی کے ساتھ پلٹ رہے تھے، جیتی ہوئی بازی ہار کی طرف مڑگئی تھی۔ ایسی ہار...... جس میں یقینی موت کے سوا زندگی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

☆☆☆

زوردار آواز سے دروازہ کھلتے ہی وہاں موجود عورتوں اور بچوں کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اس بلند چھت والے بڑے سے ہال کمرے کے دوپٹ چوڑے دروازے پر سب سے پہلے زبیدہ اور محسن ہتھیار بدست نمودار ہوئے۔ اس کے بعد ان کے باقی ساتھی جو تعداد میں اب چار تھے۔ جنرل فرناش سمیت بارق شمعون ان چند مجاہدوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو حیرت زدہ بھی رہ گئے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چھاپا مار حریت پسند تعداد میں کئی ہوں گے، جنہوں نے آناً فاناً پوری عمارت پر دھاوا بول کے اس پر اپنا تسلط جمالیا ہوگا مگر ان مٹھی بھر چند مجاہدوں کو دیکھ کر انہیں اس بات کا سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ انہیں بھی ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سرفروش گنتی میں تھوڑے سہی مگر ان کے حوصلے اور آہنی عزم اپنے سے کئی گنا زیادہ نفری رکھنے والے دشمنوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے تھے اور ایسا ہوا تھا مگر فرناش اور شمعون وغیرہ کو تسلی بھی تھی کہ وہاں پہنچنے والی بھاری کمک کے سامنے یہ چند مجاہد زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے۔ ”ہالٹ...... کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔“ زبیدہ نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دہاڑ کر کہا۔

زبیدہ کی عقابی اور برساتی ہوئی نگاہیں جنرل فرناش اور بارق شمعون پر جمی ہوئی تھیں، نیز وہ ان کے دست راست ساتھیوں کو بھی پہچان رہی تھی جبکہ فرناش وغیرہ نے بھی اپنے پستول نکال لیے تھے۔ جنرل فرناش اور شمعون نے اپنے گرد عورتوں اور معصوم بچوں کو اکٹھا کرلیا تھا۔ قریب کھڑی بازغہ کے چہرے پہ نفرت کے تاثرات تھے۔ ”پٹ دی گن ڈاؤن...... ہری اپ......“ محسن نے گرجدار آواز میں فرناش وغیرہ سے کہا جبکہ زبیدہ کے چہرے پر اب جوش کے ساتھ کچھ الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات نمودار ہونے لگے تھے، وہ شاید ان کی بزدلانہ چالاکی اور مکاری کو سمجھ رہی تھی۔

”نو اینڈ نیور...... ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے۔“ جنرل فرناش کی کریہہ آواز ابھری۔ الٹا وہ انہیں دھمکی دیتے ہوئے بولا۔ ”تم سب زندہ نہیں بچ سکو گے۔ بہتر یہی ہے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کردو۔“ اس وقت ہال کمرے میں برسٹ چلنے کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ کئی عورتوں اور بچوں کے منہ سے مارے دہشت کے چیخیں نکل گئیں۔ چھت کا پلستر اکھڑ کر نیچے گرا اور گرد و غبار کا مختصر سا مرغولہ ہال میں رقص کرنے لگا۔ یہ محسن نے برسٹ چلایا تھا۔ نشانہ ہال کی بلند چھت ہی تھا۔

زبیدہ دہاڑ کر فرناش سے بولی۔ ”ہتھیار پھینک دو...... جنرل! ورنہ ہم گولیوں کی بارش کردیں گے۔“ بازغہ بہ غوران مٹھی بھر جیالے جانبازوں کی طرف تکے جارہی تھی۔

جواب میں ایہود شابک نے کہا۔ ”تم لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں صرف تین تک گنوں گا۔ کمرے سے نکل جاؤ۔ ورنہ ہم فائر کھول دیں گے۔“

اب زبیدہ سمیت محسن کے چہرے پر بھی الجھن طاری ہوگئی تھی کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ یہاں عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں یہ مجاہد فائر کھولنے سے قاصر تھے، بے شک یہ یہودی تھے مگر انہیں ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ وہ نہتے معصوم بچوں اور عورتوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔

”ان مردودوں کا نشانہ لے کر فائر کھول دو۔ عزیزی زبیدہ! یہ ہمارے ساتھ مکاری کررہے ہیں۔“ ایک مجاہد نے چلا کر زبیدہ سے کہا تو وہ ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر منع کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں گولیاں چلنے کی صورت میں یہاں موجود بچے اور عورتیں بھی زد میں آجائیں گے اور ہمارا ضمیر اور ایمان گوارا نہیں کرتا کہ...... ہم ان معصوم نہتے بچوں اور عورتوں کو جان لیوا خطرے میں ڈالیں۔“ بازغہ یہ سن کر متحیر ہوگئی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی جوش تلے تمتمانے لگا۔ وہ چلا کر زبیدہ اور محسن کی طرف دیکھ کر عجیب دیوانگی کے عالم میں بولی۔

”یہ جنگ ہے اسے جنگ ہی رہنے دو۔ جذبات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم بھول گئے...... اسرائیلیوں نے تمہارے گھروں پر کیسی وحشیانہ بمباری کی تھی، کتنی عورتیں اور بچے اس میں لقمۂ اجل بنے تھے، اب تم کیوں اپنے دشمنوں پہ یہ رحم کررہے ہو۔ چلاؤ...... گولیاں......“ ایک عجیب جوش سے بازغہ کا دم پھولنے لگا تھا۔

زبیدہ اور محسن قدرے حیرت سے اس خوب صورت کی مگر سنجیدہ صورت یہودی لڑکی کو دیکھنے لگے۔ اس پر جنرل فرناش خارش زدہ کتے کی طرح بلبلا کر کمشنر پیریز سے بولا۔ ”کمشنر پیریز! اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھاؤ، یہ کیا بکواس کررہی ہے...... ورنہ میں اسے گولی ماردوں گا۔“

”میں تین تک گنتی گنوں گا۔ اس کے بعد تم پر فائر کھول دوں گا۔“ اس درمیان میں ایہود شابک نے چیخ کر کہا۔ ”ایک......“

”مجھے آج اپنی یہودی قوم کا اصل اور بھیانک چہرہ دکھائی دے گیا ہے پپا! اور مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔“ بازغہ بھی خاموش رہنے والی کہاں تھی۔ اس کا باپ پریشان ہوگیا۔ وہ بیٹی کو خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگا مگر اس دوران محسن کی عقابی نظروں نے دیکھا۔ جنرل فرناش کے پستول کا رخ قریب کھڑی اس لڑکی (بازغہ) کی طرف ہونے لگا۔ محسن جنرل فرناش پر ابھی گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر اس نے فوراً ایک جرأت مندانہ حرکت ضرور کر ڈالی۔ ادھر جنرل فرناش کے پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ ادھر محسن نے بازغہ پر جست بھری اور اسے رگیدتا ہوا چکنے فرش پر جا پڑا۔ بازغہ پر چلائی ہوئی جنرل فرناش کی گولی محسن کے بائیں بازو میں جا لگی۔ عورتوں بچوں کی چیخیں خارج ہوگئیں...... مگر بازغہ بچ گئی تھی اور محسن خطرے کے دائرۂ کار میں آگیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ جیسے ہی بازغہ کو سنبھال کر کھڑا ہوا۔ اس کے قریب کمشنر پیریز کو دا جس نے پھرتی کے ساتھ اپنا سروس ریوالور نکال لیا تھا اور...... محسن پر تان لیا۔ بازغہ نے جو اپنے باپ کی یہ حرکت دیکھی اور یہ بھی کہ اسے بچانے کی خاطر یہ دلیر مجاہد خود بھی زخمی ہوکر موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا ہے تو وہ یکدم محسن کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہوگئی اور اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ ”پپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ جس نے میری محض انسانیت کی خاطر جان بچائی...... آپ اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔“

”یہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہماری قوم کے دشمن ہیں۔ ہٹ جاؤ آگے سے بیٹی۔“ کمشنر پیریز چیخا۔ تو اس وقت جنرل فرناش نے پیریز سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔

”کمشنر! اڑا دو گولی سے دونوں کو...... شوٹ ہیم......“

صورت حال ایکا ایکی جان لیوا حد تک خطرناک ہوگئی تھی، دفعتاً فائر ہوا اور ہال میں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل فرناش کے نائب میجر ایہود شابک کی کریہہ انگیز چیخ ابھری۔ زبیدہ کی چلائی ہوئی گولی اس کی گردن میں پیوست ہوگئی تھی اور غالباً شہ رگ متاثر ہونے کے باعث

خون کا فوارہ اس کی گردن سے اُمڈ پڑا۔ گولی زبیدہ نے... ایہود شابک ...... پر تاک کر فائر کی تھی۔

ایہود شابک درحقیقت محسن کو خاموشی سے اپنے پستول کی گولی کا نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ زبیدہ کی عقابی نگاہوں نے اس کی مکارانہ اور سفاکانہ حرکت کو بروقت تاڑ لیا تھا مگر پھر تو جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ ایہود شابک کی موت نے فرناش اور شمعون وغیرہ کو بلبلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے عورتوں بچوں کی پروا کیے بغیر زبیدہ اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کردی۔ اندھادھند فائرنگ میں زبیدہ کا ایک ساتھی شہید ہوگیا۔ زبیدہ نے چلّا کر اپنے ساتھیوں کو واپس پلٹنے کا حکم دیا اور وہ خود بھی پلٹی۔ محسن بھی بازغہ کو چھوڑ کر دوڑا۔ اس کے بازو سے ہنوز خون جاری تھا مگر اسے اس کی کب پروا تھی۔ یہ لوگ .... کمرے سے باہر ایک راہداری میں کھڑے ہوگئے۔

"ان کی کمک کسی بھی وقت پہنچنے والی ہے۔ تاخیر مشکل کا سبب بنے گی بلکہ ہم بھی مارے جائیں گے..... ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ اس کے بازو والے زخم پر کسی ساتھی نے رومال باندھ دیا تھا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ یہ مخصوص قسم کی گڑگڑاہٹ تھی۔

"ہیلی کاپٹر....." دفعتاً زبیدہ کے ایک ساتھی کے منہ سے برآمد ہوا۔ "لگتا ہے ان کی کمک آگئی ہے۔"

ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے ہوگئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔

"زبیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ کسی کمرے سے جنرل فرناش اور بارق شمعون کو ہٹ کرنے کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں کمک کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"مگر....." زبیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی بازغہ کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازغہ محسن کے قریب آکے بولی۔

"تم لوگ.... سخت خطرے میں ہو۔ باہر کمک پہنچ چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جنرل فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"

"ان بزدلوں نے عورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی ہے۔" محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے [illegible] کس کمرے میں گئے ہیں۔" بازغہ نے انکشاف کیا۔ اس کا سرخ و سپید حسین چہرہ جوش سے لرز رہا تھا پھر واپس پلٹی۔ محسن اور اس کا ساتھی عبید اس کے عقب میں چل پڑے۔ بازغہ انہیں مختلف راہداریوں سے گزارتی ہوئی ایک ایسے کمرے کے سامنے والی راہداری میں لے آئی جو وار روم کہلاتا تھا۔

"اس کمرے کے اندر وہ دونوں شیطان موجود ہیں۔" بازغہ نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ٹھیک اسی وقت بھاری قدموں کی آواز ابھری...... اور ساتھ ہی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے کوریڈور گونج اٹھا۔ اس میں محسن کے ساتھی عبید کی چیخ بھی شامل تھی۔ محسن نے عقب میں گھوم کر دیوار کی آڑ لیتے ہی اپنی گن کا رخ سیدھا کرکے لبلبی دبا دی۔ ایک گرجتا ہوا برسٹ فائر ہوا اور کئی وردی پوش اسرائیلی فوجی کریہہ چیخیں مار کر زمیں بوس ہوگئے۔ محسن ان کی نفری کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا اور یہ بھی کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں ٹک سکتا۔ آگے بڑھا اور بازغہ سے بولا۔ "تم چلی جاؤ۔ ورنہ میرے ساتھ تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"میں نے اپنے لوگوں اور اپنے باپ کا روپ دیکھ لیا ہے۔ اب میرا کوئی نہیں میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔" بازغہ بولی۔ "اس کمرے کا دروازہ توڑ ڈالو۔ جلدی کرو۔"

محسن نے ایسا ہی کیا۔ مذکورہ دروازے پر اس نے اپنی نال کا رخ کرکے برسٹ فائر کردیا۔ دروازے کا لاک اڑ گیا۔ محسن نے اسے لات دے ماری۔ پھر بازغہ سے بولا۔

"تم کسی طرح عورتوں اور بچوں کو عمارت سے نکال دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" بازغہ یہ سن کر پلٹ گئی۔

محسن اندر داخل ہوا۔ سامنے اسے مختلف چینل کے پاس..... جنرل فرناش اور بارق شمعون نظر آگئے جو برسٹ چلنے کی آواز پر بری طرح چونک کر اٹھے تھے پھر یکدم اِدھر اُدھر چھپنے لگے۔ محسن نے ان پر اندھادھند فائرنگ کردی۔ کئی چینل اور اسکرین تڑخ گئے۔ جنرل فرناش جانے کس دروازے سے غائب ہوچکا تھا جبکہ بارق شمعون اس کے نرغے میں آگیا۔ "خبردار......! کتے..... ہلنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔"

بارق شمعون نے شکست خوردہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کردیے۔ ٹھیک اسی وقت کئی مسلح وردی پوش اندر در آئے۔

☆☆☆

زبیدہ نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جدھر کا رخ کیا تھا وہاں اس کی زد میں اضحاق شامیر آگیا جو ہال کمرے کے ایک بغلی دروازے سے عمارت کے کھلے اندرونی گوشے کی طرف بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"رک جا...... یہودی کتے......! ورنہ گولیوں سے بھون ڈالوں گی۔" زبیدہ کی گرجتی آواز پر اضحاق شامیر لرز اٹھا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا مگر اسے فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ زبیدہ نے اپنی گن کی لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اضحاق شامیر کو چھلنی کرکے رکھ دیا۔ وہ چیختا ہوا فرش پر گرا۔ زبیدہ نے اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو یکایک عقب میں کئی دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ زبیدہ بری طرح ٹھٹکی۔ اسے جنرل فرناش اور بارق شمعون کی تلاش تھی...... وہ جانتی تھی کہ [illegible] دونوں اسرائیل بلکہ یہودیوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتے تھے مگر پہنچنے والی کمک نے ان کے منصوبے کو مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں مبتلا تھی کہ اچانک [illegible] سے بالٹ ہالٹ کی آوازیں ابھریں اور اس کے ساتھ ہی اندھادھند گولیاں چلیں۔

زبیدہ اور اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً حرکت کی۔ [illegible] مشکل [illegible] پھر جس سمت بازغہ نے انہیں پیش قدمی کرنے کی نشاندہی کی تھی، وہ اس طرف ہی دوڑ پڑے۔

☆☆☆

[illegible] تک وہ بیت صفانہ کی پہاڑیوں میں پہنچ چکے تھے۔ [illegible] مقام پر اتر کر انہوں نے اونٹ کو واپس روانہ کردیا۔ دونوں اب نسبتاً محفوظ گزرگاہ سے پیدل جانے لگے۔ یہوں سے "المجاہد" کا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ وہ بھی [illegible] تھوڑا سستاتے رہے بالآخر المجاہد کے ٹھکانے پر [illegible] تھکے ہارے پہنچ گئے جہاں ان کا پرجوش انداز [illegible] کے ساتھیوں نے استقبال کیا تھا اور انہیں مشن [illegible] کی مبارکباد بھی دی گئی۔ ٹھکانے پر انہیں اونٹ [illegible] کردیا گیا اور روٹی کے ساتھ کھجور کھانے کو دی۔ [illegible] زبیدہ کے نائب عارف حبیب سے ان کی بات [illegible] مسرت سے بولا۔ "ہمیں اس مہم میں [illegible] کا دکھ بھی ہے، مگر خوشی بھی ہوئی کہ ان کی [illegible]"

[illegible] کہ عزیزی زبیدہ اور ہمارے دوسرے [illegible] کا تیونائی آپریشن کامیاب ہوجائے تو غاصب صہیونیوں کی لمبے عرصے تک کمر ٹوٹ جائے گی۔" لیلیٰ نے کہا تو عارف حبیب کے ایک ساتھی نے کہا۔

"انشاء اللہ وہ بھی ضرور کامیاب ہوں گے۔ ویسے تم لوگوں نے اسرائیل کے ایٹمی بجلی گھر کو تباہ کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس سے اسرائیلی خفیہ ایٹمی پروگرام کو کافی دھچکا لگا۔ لیکن جانے کیوں میرا دل بے چین ہورہا ہے۔" باقر نے گوکو سے لہجے میں کہا۔ "کاش ہم بھی عزیزی زبیدہ اور اپنے دوسرے گروپ اے کی مدد کو جاسکتے۔"

"اطمینان رکھو دوست! اور اللہ سے ان کی کامیابی کی دعا کرو۔" عارف حبیب نے کہا۔ اچانک باہر دور کہیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ وہ سب چونک پڑے اور ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ انہیں جیٹ... طیاروں کی خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اگلے ہی لمحے یکے بعد دیگرے کئی سماعت شکن اور لرزا دینے والے دھماکوں کی آوازیں ابھریں...... جس گھپا میں یہ لوگ موجود تھے، وہ بھی انہیں لرزتی محسوس ہوئی، ایک بم شاید ان کی گھپا کے کہیں قریب گرا تھا۔

"دشمنوں نے حملہ کردیا...... ہوشیار......" باہر سے کسی ساتھی نے خبردار کیا اور یہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیلیٰ [illegible] بجلی گھر کی تباہی کا ردعمل ہو۔ بہرطور وہ سب اسلحہ سنبھال کے باہر دوڑے۔ عارف آگے تھا وہ جیسے ہی گھپا سے باہر نکلا اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔ وہ وہیں دم توڑ گیا۔ لیلیٰ اور باقر کا دل دکھ اور جوش انتقام سے بھر گیا۔ ان کی اسلحہ کٹوں میں جس قدر ایمونیشن سما سکتا تھا وہ انہوں نے بھر لیا اور باقیوں نے عارف... کا انجام دیکھتے ہوئے گھپا سے نکلنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا بلکہ گھپا کے شگاف دہانے کے سرے پہ کھڑے ہوکر پوزیشنز سنبھال لیں۔ بیت صفانہ کی پہاڑیاں اس وقت گولہ باری اور دھماکوں سے لرز رہی تھیں۔ آسمان پر کئی اسرائیلی جنگی طیارے گردش کرتے نظر آتے تھے اور پہاڑیوں میں چھپے فلسطینی مجاہد اینٹی ایئر کرافٹ اور راکٹ لانچرز سے انہیں گرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسرائیلی طیاروں میں مشین گنیں بھی فٹ تھیں، ان کا بھی ایک ساتھی راکٹ لانچر کاندھے پہ لے کر نمودار ہوا۔ باقر اور لیلیٰ نے بڑی مستعدی کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لیا اور انہیں احساس ہوگیا کہ اسرائیل کی طرف سے یہ ان پر فضائی حملہ کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اسرائیل کے اس بزدلانہ جنگی انداز سے واقف تھے۔ یہ ان کی اولین حکمت عملی ہوتی تھی۔ وہ پہلے فضائی

حملہ کرکے دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے تھے اس کے بعد دوسرے مرحلے میں وہ اپنے کمانڈوز روانہ کرتے تھے۔

باقر نے راکٹ لانچر سنبھال لیا اور لیلیٰ کے ساتھ باہر آگیا۔ اس وقت انہوں نے ایک اسرائیلی طیارے کی دم سے گاڑھا دھواں نکلتے دیکھا اور نعرۂ تکبیر بلند کردیا۔ مجاہدین دشمن کا ایک طیارہ مار گرانے میں کامیاب ہوگئے تھے جو آگے جاکر سنگلاخ پہاڑیوں کے دامن میں گرکر دھماکے سے تباہ ہوگیا تھا۔

لیلیٰ اور باقر جس وقت ایک سنگلاخ درّے سے گزر رہے تھے، اچانک اس کے سامنے والی ایک نسبتاً بلند پہاڑی چوٹی سے ایک اسرائیلی طیارہ بہت نیچی پرواز کرتا ہوا کسی دیوزاد آہنی پرندے کی طرح نمودار ہوا جو مسلسل گولیاں برسا رہا تھا۔ باقر نے پہلے ہی سے اپنے کاندھوں پہ راکٹ لانچر اٹھا رکھا تھا مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ راکٹ فائر کرنے کے لیے اپنی مخصوص پوزیشن سنبھالتا۔ تاہم اس نے ایک چٹانی دیوار کے سہارے خود کو ٹکایا اور تاک کر نیچی پرواز کرتے اسرائیلی طیارے پر راکٹ فائر کردیا۔ یہ سنہری موقع تھا جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ راکٹ فائر ہوا اور سنسناتا ہوا تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف لپکا۔ ادھر لیلیٰ نے بھی اپنی گن سے طیارے پر گولیاں برسانا شروع کردی تھیں۔ طیارے کے پائلٹ کو اس طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے ایک مارٹر گولہ داغ دیا مگر اس کے اگلے ہی لمحے اس کے طیارے کو زبردست جھٹکا لگا۔ باقر کا فائر کیا ہوا راکٹ طیارے کے پچھلے حصے سے جا ٹکرایا تھا۔ اسرائیلی پائلٹ نے فوراً ایئر اسٹک کو اوپر کیا مگر طیارے کا عقبی حصہ تباہ ہونے کے باعث طیارہ خاطر خواہ بلندی کو نہ چھو سکا اور سامنے کی ایک بلند پہاڑی چوٹی سے ٹکرا کر تباہ ہوگیا۔ اس کا پھینکا ہوا مارٹر لیلیٰ اور باقر سے تقریباً بیس تیس گز دور گرا تھا۔ ایک لرزہ خیز دھماکا ہوا اور لیلیٰ نے مارٹر گرتے ہی خود کو بڑی پھرتی کے ساتھ ایک چٹانی آڑ کے پیچھے کرلیا مگر بدقسمتی سے باقر کو چھپنے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم دھماکا ہوتے ہی اس نے خود کو فوراً سنگلاخ اور ناہموار زمین پر گرا لیا تھا۔ گولہ گرتے ہی کان پھاڑ دھماکا ہوا اور کئی تباہ کن نکیلے چٹانی سنگ ریزوں کے ساتھ گرد و پیش میں پھیلے، ان کے مہلک پھیلاؤ کی زد میں باقر بھی آگیا۔ اس کا چہرہ زخمی ہوگیا اور بایاں کاندھا ایک بارودی شیل لگنے سے بری طرح متاثر ہوگیا۔ مارے اذیت کے باقر کے حلق سے کرب ناک چیخ ابھری تھی، جس نے کچھ فاصلے پر چٹانی آڑ میں اوندھی پڑی لیلیٰ کو بری طرح دہلا کر رکھ دیا۔ وہ شدتِ کرب سے تقریباً چیختی ہوئی پتھریلی زمین پر خون میں تربتر لڑکھڑا کر باقر کی طرف دوڑی اور اسے سنبھالا دیا۔

گولیوں دھماکوں کی آوازیں بہ دستور گونج رہی تھیں، تاہم گولہ باری میں کچھ کمی آتی محسوس ہوئی، شاید مجاہدین دشمنوں کے کچھ طیارے مار گرانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔

ادھر باقر کی حالت دیکھ کر لیلیٰ کا دل بری طرح دکھ رہا تھا۔ ”باقر...... باقر!...... تت...... تم...... زخمی ہو......“ لیلیٰ کی آواز شدتِ غم سے لرزنے لگی۔ باقر نے کچھ گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کے بعد کراہتی ہوئی آواز میں بہ مشکل کہا۔

”مم...... میں ٹھیک ہوں۔ تت...... تم...... تم ایک کام کرو۔ کسی طرح میرے زخمی کاندھے پر میری قمیص پھاڑ کر پٹی باندھ دو۔“

”لل...... لیکن......“

”دیر...... مت کرو لیلیٰ......! ہمیں آخری سانسوں تک دشمنوں سے لڑنا ہے۔“ باقر نے جوش سے ہانپتے ہوئے کہا اور لیلیٰ نے اپنی آنکھوں سے آنسو خشک کرلیے، بالکل اسی طرح جیسے اس نے اپنے بھائی اور منگیتر کی شہادت کے بعد خشک کرڈالے تھے۔

حریت پسند مجاہدوں کی جنگی کٹ میں مقدور بھر مرہم پٹی کا سامان بھی ہوتا تھا۔ اس وقت لیلیٰ کے پاس وہی ایک کٹ تھی، اس نے جلدی جلدی پہلے باقر کے زخموں کا معائنہ کیا پھر اس کی قمیص کاندھے کی طرف سے پھاڑ ڈالی۔ کٹ سے مرہم نکال کر زخم پہ اس کا پیسٹ لگائی پھر پٹی باندھ دی۔ خون کا رساؤ کچھ کم ہوگیا تھا۔ باقی زخموں پہ بھی اس نے اینٹی سیپٹک لوشن لگا کے مرہم رکھ دیا۔ مگر وہ ناکافی تھا جیسے تیسے کرکے باقر کو سنبھالا دے کر چٹانی دیوار کے سہارے اٹھا کے بٹھا دیا۔ باقر نے دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں پھر ایک طرف پڑے راکٹ لانچر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ رائفل اس نے دائیں کاندھے سے جھلا دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لیلیٰ نے فوراً سہارا دیا۔ باقر کے تھوڑے قدم ڈگمگائے پھر وہ اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے دشمن سے ایک بار پھر نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔

اسرائیلی طیارے اب بھی آسمان پر گردش کررہے تھے اور مجاہدین کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ باقر کو اسرائیلی طیارے مار گرانے کی زیادہ فکر تھی، مگر محض راکٹ لانچر سے وہ ان طیاروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا جبکہ طیارے زیادہ تر اس علاقے میں گولہ باری کررہے تھے جہاں حریت پسند...... اگرچہ اینٹی ایئر کرافٹ گنوں سے ان کا زور توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر لگتا تھا آج کے اینٹی بجلی گھر کی تباہی نے اسرائیلیوں کو بری طرح تلملا دیا تھا۔ وہ اپنی اس بربادی پر زخم خوردہ تھے اور مجاہدوں کے ممکنہ خفیہ ٹھکانوں پر بلا بول دیا تھا۔

راکٹ لانچر اب لیلیٰ نے سنبھال رکھا تھا۔ دو راکٹ ابھی اس کی جنگی کٹ میں موجود تھے، باقر بھی حتی المقدور کوشش کررہا تھا کہ وہ لیلیٰ کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں پہ چلے۔ اس نے رائفل اب اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس دوران چند مسلح مجاہد ان سے آن ملے۔ ایک نے انہیں پہچان کر کہا۔ ”اس طرف سے پیچھے نکلنے کی کوشش کرو...... دشمن بھاری تعداد میں پیدل اس طرف آرہے ہیں۔“

”ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمیں دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔“ لیلیٰ نے پرجوش لہجے میں کہا تو باقر نے بھی اسی انداز میں تائید کی۔ بولا۔

”دشمن چاہے کتنی ہی تعداد میں ہوں ہم ان کے آگے ڈٹ جائیں گے۔“

وہ باقر کی حالت دیکھ کر حیران پریشان ہوئے مگر پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ اس جگہ چٹانوں پہ پوزیشنیں سنبھال لیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ انہیں سامنے تقریباً پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر اسرائیلی مسلح دستہ دکھائی دے گیا، جو چست وردیوں میں ملبوس تھے، انہیں دیکھتے ہی مجاہدوں نے اپنی رائفلیں چلا دیں۔ دوسرے ہی لمحے میں گرد و پیش کی چٹانیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھیں۔ چند اسرائیلی دشمن گولیوں کی زد میں آئے، دفعتاً باقر کی عقابی نظروں نے دیکھا دشمن دستے کے چند مسلح فوجی ان کی طرف بیک وقت کئی دستی بم اچھالنے کی تیاری کررہے تھے، باقر نے لیلیٰ سے تقریباً چلا کر کہا۔

”لیلیٰ! ان پر راکٹ فائر کرو۔ جلدی......“ باقر جانتا تھا اگر بیک وقت اتنے سارے دستی بم ان کی طرف اچھالے گئے تو...... کچھ بھی نہیں بچے گا۔ لیلیٰ نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے راکٹ داغ دیا۔ سماعت شکن دھماکے کے ساتھ ہی کئی اسرائیلی دشمن جہنم واصل ہوگئے۔

دلچسپ معلومات

☆ دنیا کا سب سے پہلا بینک اٹلی میں قائم کیا گیا۔

☆ انسانی جسم میں دانت وہ ہڈی ہے جس پر گوشت نہیں ہوتا۔

☆ اگر سانپ کا سر کاٹ دیا جائے تو بھی وہ آدھا گھنٹے ڈسنے کے قابل رہتا ہے۔

☆ قرطی نامی پرندہ ایک بار بھی پر ہلائے بغیر سارا دن اڑ سکتا ہے۔

☆ قطب شمالی کے آسمان سے سال کے 182 دن سورج مکمل غائب رہتا ہے۔

☆ مچھر گورے رنگ اور پیلے بالوں والے شخص کو کاٹنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

☆ ہاتھی 5 ٹن وزن رکھنے کے باوجود 40 کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑتا ہے۔

☆ اگر دنیا کی ساری مرغیاں شمار کی جائیں تو ہر شخص کے حصے میں صرف دو مرغیاں آئیں گی۔

☆ سورج کی روشنی زمین تک 8 منٹ میں پہنچتی ہے۔

مرسلہ۔ عاطف شاہین اٹھارہ ہزاروی

ٹھیک اسی وقت ایک طیارے نے اس سمت بم گرایا۔ مجاہدوں نے ادھر ادھر گر کر حملے سے بچنے کی کوشش کی۔ بم گرا اور زوردار دھماکے سے اردگرد کی پہاڑیاں لرز اٹھیں، یہ نپام ”بگ کلسٹر“ بم تھا، جس کے گرتے ہی دھماکے کے ساتھ کئی بھڑکتے ہوئے شعلے اچھل کر دائیں بائیں خاصی دور تک گرے اور ہر شعلہ بم کی طرح دوبارہ بلاسٹ ہوا اور حریت پسندوں کو چاٹ لیا۔ ان کی چیخیں کرب ناک تھیں۔

”ایک اور راکٹ فائر کرو۔“ باقر چیخا۔ اسے اپنے ساتھی حریت پسندوں کی موت پر طیش آگیا۔ لیلیٰ نے بھی یکے بعد دیگرے دو راکٹ چلا دیے۔ ”اس طرف بڑھو......“ باقر ایک طرف اشارہ کرکے بولا۔ لیلیٰ نے خالی لانچر ایک طرف پھینک کر رائفل سنبھال لی۔ باقر مذکورہ سمت کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی چند قدم ہی دونوں نے طے کیے ہوں گے کہ بری طرح ٹھٹک گئے۔ مجاہدین کے ایک مورچے پر انہیں

دشمنوں کا قبضہ ملا۔ یہاں اینٹی کرافٹ گن نصب تھی، جسے دشمنوں نے تباہ کر ڈالا تھا۔ یہاں کچھ دشمنوں اور مجاہدوں کی ادھر ادھر لاشیں بھی پڑی دکھائی دی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت باقر نے دیکھا نیپام بم پھینکنے والا وہ مہلک طیارہ دوبارہ ایک طویل گول چکر کاٹ کر اس سمت آرہا تھا اور اس بار اس کی پرواز قدرے نیچی تھی۔ اس نے لیلیٰ کو قریب ہی ایک نسبتاً بلند ٹیکری پر چڑھنے کا کہا اور بتایا کہ اس طیارے کو تباہ کرنا ضروری ہے...... پھر دونوں مذکورہ ٹیکری پر چڑھنے لگے، طیارہ خوفناک انداز میں گڑگڑاتا ہوا عفریت نما آہنی پرندے کی طرح اس طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ دونوں اپنی سی جان توڑ کوشش کے ساتھ ٹیکری پر پہنچ گئے...... اس کی سنگلاخ ڈھلان پر پشت کے بل لیٹ گئے اور اپنی طاقتور گنیں اوپر کرلیں۔ طیارہ ان کے قریب آیا اور انہوں نے ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ طیارے کے نچلے حصے میں ایک تواتر کے ساتھ پیوست ہوتی چلی گئی اور طیارہ ان کے اوپر سے گزر گیا مگر انہوں نے جیسے ہی سر گھما کے دیکھا تو مسرت سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ طیارے کی دم سے دھوئیں کا سیاہ بادل امڈ رہا تھا اور وہ توازن کھو رہا تھا...... پھر دور کہیں چوٹیوں میں غائب ہو گیا، ٹھیک اسی وقت ایک تباہ کن دھماکے کی آواز ابھری۔ طیارہ گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ دونوں سنبھل کر اٹھے مگر قریب مورچے میں قابض دشمنوں نے انہیں تاڑ لیا اور وہ سب بیک وقت حرکت میں آگئے۔

اس وقت لیلیٰ اور باقر خطرناک پوزیشن میں تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ دائیں جانب لڑھکنی لگائی، اسرائیلی دستے نے ایک راکٹ فائر کیا جو اس جگہ پر گرا جدھر تھوڑی دیر پہلے لیلیٰ اور باقر موجود تھے، دونوں نے سردست ان سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ ترک کیا اور ایک سنگلاخ آڑ کے قریب آکر ٹک گئے۔

ابھی وہاں ٹکے انہیں تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اچانک اردگرد کی پہاڑیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھیں۔ لیلیٰ اور باقر نے پرمسرت جوش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ مجاہدین کی بھی شاید نئی کمک اس طرف پہنچ چکی ہے۔

☆☆☆

دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آرہی تھیں اور ناعمہ کی زندگی اس وقت شدید خطرے سے دوچار تھی، اس کے لیے عابد شکیھری کا فوری حرکت میں آنا ضروری تھا۔ جیتی ہوئی بازی یکدم الٹ گئی تھی اور اس بار میں یقینی موت کی سرگوشیاں بھی شامل تھیں۔ عابد نے خود کو گاڑی کے خلا سے نیچے فرش پر گرا لیا اور اپنے پہلو سے بندھی گن سنبھالی اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لڑھکنی لگا کے لیٹے لیٹے ناعمہ کے قریب جا پہنچا پھر تیزی سے اس کے کان میں کچھ کہا اور ناعمہ نے بھی اپنی گن پہلو سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر دونوں نے اسی طرح فرش پر لیٹے لیٹے اپنی پشت ملا دیں۔ انہیں دشمنوں کے بھاری جوتے...... اس ٹرک کے قریب آکر رکتے ہوئے نظر آئے پھر جیسے ہی دشمنوں نے جھک کر نیچے جھانکا۔ دونوں نے فائر کھول دیے۔ دشمن ٹرک کے دائیں بائیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے، گولیوں نے ان کے سروں کو چھلنی کر کے رکھ دیا۔ وہ فرش بوس ہو گئے۔ دونوں ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ بیسمنٹ میں برسٹ فائر ہوا اور گولیوں کی بوچھاڑ ٹرک کے کیبن پر پڑی۔ ایک زوردار چھناکے سے اس کی ونڈ اسکرین اڑ گئی۔ کچھ دشمن دوسری سمت انہیں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے مگر اس طرف گولیاں چلنے اور اپنے ساتھیوں کی کربناک انگیز چیخیں سن کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ دونوں جھکے جھکے انداز میں گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک طرف کو دوڑے۔ عابد کو احساس تھا کہ صورت حال خطرناک حد تک مخدوش ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کی یہاں موجودگی کا علم ہوتے ہی سب ادھر کا ہی رخ کریں گے اور ان سے لڑنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

اچانک ایک ڈبل کیبن ٹرک کے قریب سے گزرتے ہوئے عابد شکیھری ٹھٹک کر رکا۔ اسے اس کے کیبن میں ایک بڑے گچھے کی صورت میں چابی لگی نظر آگئی۔ اس نے بجلی کی سرعت کے ساتھ ٹرک کا دروازہ کھولا اور ناعمہ کو پہلے سوار کرایا۔ ٹھیک اسی وقت ایک برسٹ فائر ہوا وہ نیچے جھک گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ ناعمہ کے فوراً بعد خود بھی سوار ہونے کی جلد بازی نہیں کی تھی، ورنہ...... چلائے ہوئے اندھے برسٹ کی زد میں آجاتا۔ سنبھلتے ہی مذکورہ سمت کی طرف پلٹا اور جو نظر آیا اس پر جوابی برسٹ فائر کر دیا۔ ایک چیخ اسے بھی سنائی دی تھی، دشمن کا ہدف توڑنے کے فوراً ہی بعد لپک کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔ یہ پک اپ ٹرک تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے اگنیشن سوئچ میں لگی چابی گھما دی...... بیسمنٹ میں گاڑی کے انجن کی گھرگھراتی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے ٹائروں کی تیز خراش آواز کا شور ابھرا۔ پک اپ ٹرک ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔ عابد شکیھری کی عقابی نظریں ایک محتاط انداز سے

کے ساتھ نکاسی کے راستے کی متلاشی تھیں جو جلد ہی اسے نظر بھی آگیا مگر اس سمت اس نے چار پانچ دشمنوں کو ہتھیار... بدست نمودار ہوتے بھی دیکھا۔ عابد کے بیدار مغز میں ایک خیال چمکا۔ اسے معلوم تھا وہ جب تک انہیں اپنے ٹرک تلے روندنے کے لیے ان کے قریب پہنچے گا وہ ان پر بیک وقت اپنی گنوں کا منہ کھول دیں گے۔ اس کی عقابی نظروں نے اس گاڑی کو بھانپ لیا جو ان کے بالکل قریب پارک تھی۔ عابد نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ دشمن ٹولے نے بہ سرعت اپنی گنیں سیدھی کرلیں۔ عابد کے ٹرک نے ایک گاڑی کو سائڈ ٹھوکر ماری اور مطلوبہ گاڑی کے قریب پہنچتے ہی اس نے ٹرک کو "گرفتنگ" کے انداز میں گول گھما دیا۔ ٹرک کا عقبی حصہ پوری قوت سے مطلوبہ گاڑی سے ٹکرایا اور وہ گاڑی ایک دھچکے سے لرزی اور دشمن دستے سے جا ٹکرائی، ان کی چیخیں گونج اٹھیں۔ ٹرک سیدھا کرتے ہی عابد نے ایکسلریٹر...... پر پاؤں رکھ دیا۔ طاقت ور انجن والے ٹرک نے دھاڑ ماری اور سلوپی ڈھلان پر تیزی کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے پارکنگ کے آہنی دروازے کا شٹر تھا ٹرک اس سے ٹکرایا اور توڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر عابد نے کچھ نہیں دیکھا اور احاطے کا بھی گیٹ توڑتا ہوا باہر سڑک پر آگیا۔

ٹرک طوفانی رفتار سے دوڑنے لگا۔ عابد جانتا تھا کہ جلد ہی بیسیوں گاڑیاں اس کے تعاقب میں لپکیں گی۔ اس لیے اس نے دانستہ شہر کے وسط کا رخ کیا اور ایک جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی ہتھیار سمیت چھوڑ کر ناعمہ کو لے کر اتر گیا۔ وہ ایک معروف بازار میں آگئے اور ایک گارمنٹس کی بڑی سی شاپ کا رخ کیا۔ یہاں دونوں نے اپنی ڈریسنگ وغیرہ تبدیل کی اور وہاں سے نکل کر ایک سیلون پارلر میں گھس گئے۔ وہاں دونوں نے اپنے چہروں کی مخصوص لیپا پوتی کروائی اور دو عدد وگیں بھی خریدلیں، ناعمہ نے اپنے سیاہ بالوں پر "جنجر گولڈ" وگ چڑھائی تھی۔ دونوں اب...... یورپین لوور کپل کی صورت میں نظر آنے لگے تھے۔ ان چند اہم کاموں کو فوری نمٹانے کے بعد عابد شکیھری نے ایک قریبی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے اپنے ایک ہم وطن کمپنی بزنس ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ جس کا نام طلحہٰ تھا۔ وہ یہاں قریب ہی نورانی بلڈنگ اپارٹمنٹ کے ایک لگژری کشادہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے انہیں وہیں رکنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں انہیں لینے بھی آگیا۔ اگلے نصف گھنٹے بعد دونوں طلحہٰ کے فلیٹ میں تھے اور انہوں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ طلحہٰ ایک چالیس پینتالیس سالہ سانولی رنگت

تین عنایات

اللہ نے اپنے بندوں پر تین عنایات کی ہیں۔

(1) گندم، اناج میں کیڑے پیدا کر کے۔ ورنہ انسان اسے سونے چاندی کی طرح ذخیرہ کرلیتا اور لوگ بھوکے مرجاتے۔

(2) موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کردی۔ ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔

(3) مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر دیا ورنہ ان کی زندگی کبھی خوشگوار نہ ہوتی، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

کا آدمی تھا اور اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ وہاں کئی سالوں سے مقیم تھا۔ عابد نے ناعمہ سے اس کا تعارف کروایا پھر اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ ان دونوں کے یہاں جدہ سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرے۔ اس نے ان کے کھانے پینے کا بھی اچھا بندوبست کر دیا تھا۔

طے یہی پایا کہ...... طلحہٰ ان کے حلیے تبدیل کر کے...... کمپنی کے کسی بحری جہاز میں انہیں عام مسافروں کی طرح یہاں سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"میرا خیال ہے اس میں خطرہ ہے۔" ناعمہ نے اعتراض کیا۔ "بندرگاہ پر ہماری تلاش کے سلسلے میں بہت سخت پہرا ہوگا۔ بالخصوص "البحر" کے جہازوں کی خصوصی چیکنگ کی جائے گی۔" عابد کے ذہن میں پہلے سے یہ بات تھی وہ خاموش رہا جبکہ طلحہٰ نے احساس دلایا کہ اب مزید...... اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

"مجھے نہیں لگتا کہ...... میری تازہ ترین مہم جوئی کے بعد اسرائیلی کوسٹ میری کمپنی کے جہازوں کو اب یہاں لنگر انداز ہونے کا پرمٹ جاری کرے گی۔ تاہم یہ بعد کا مسئلہ ہے۔" عابد پرسوچ لہجے میں بولا۔ "ہمیں کسی اور کمپنی کے بحری جہاز میں سفر کرنا ہوگا۔"

"خطرہ اس میں بھی ہے...... اور اگر چیکنگ ہوئی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں ایک اور تجویز تو آئی ہے۔" طلحہٰ نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا تو عابد اور ناعمہ مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ طلحہٰ

ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''دونوں اگر ساتھ رہو گے تو شبے کی پہلی نظر تم دونوں پر ہی پڑے گی، تم دونوں کو الگ الگ نکلنا ہوگا۔'' اس کی بات پر عابد پھر متفکر سا ہو گیا اور ایک نظر نائمہ کے پیلے پڑتے چہرے پر ڈال کر طلحہٰ سے بولا۔

''اگر تمہیں یہ طریقہ نسبتاً زیادہ محفوظ لگ رہا ہے تو پہلے تم نائمہ کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔''

''ہرگز نہیں، میں تمہارے بغیر حیفہ سے نہیں نکلوں گی۔'' نائمہ نے فوراً انکار کیا۔ عابد اس کی وجہ جانتا تھا اور شاید طلحہٰ کو بھی کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ عابد نے طلحہٰ کی طرف دیکھا۔

''تم کوئی ایسا بندوبست نہیں کر سکتے کہ بے شک میں اور نائمہ الگ الگ سفر کریں مگر حیفہ سے نکلیں ایک ساتھ......؟'' اس کی بات سن کر طلحہٰ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر...... آج رات تم دونوں آرام کرو۔ اگلے دن میں تم دونوں کو یہاں سے نکالنے کا کوئی نہ کوئی محفوظ انتظام کرتا ہوں۔'' عابد اور نائمہ نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔

اس دوران وہ ٹی وی پر چلنے والی نشریات بھی دیکھ رہے تھے، جہاں چونکا دینے والی چیختی چنگھاڑتی خبریں نشر ہو رہی تھیں، جس کے مطابق تل ابیب یروشلم بجلی گھر تباہ ہونے کے باعث تاریکی میں ڈوب گئے تھے، نیز الجاہد اور پی ایل ایس او کے بہادر مجاہدوں نے اسرائیلی انٹیلی جنس اور آرمی کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے جبکہ سرکاری ٹی وی میں اسرائیل اپنی اس ہزیمت کو چھپانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور بجلی گھر کی تباہی کے بجائے غلط رپورٹنگ دے رہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، ہاں البتہ بجلی میں کوئی فنی خرابی پیدا ہونے کے سبب ایسا ہوا بہت جلد یہ خرابی دور کر لی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ......

عابد ... نائمہ اور طلحہٰ ...''الجاہد'' اور فلسطینی لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مجاہدوں کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔

اگلے دن دونوں دن چڑھے تک سوتے رہے۔ جاگنے پر طلحہٰ کی بیوی ام خالدہ نے بتایا کہ طلحہٰ صبح سویرے ہی اپنے دفتر جا چکا تھا۔ نیز سختی سے تاکید بھی کی تھی، یہ دونوں اس کے آنے کا انتظار کریں اور فلیٹ سے باہر بالکل نہ نکلیں۔

بہر طور غسل وغیرہ کر کے یہ دونوں تازہ دم ہو گئے، پھر ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔ طلحہٰ اور ام خالدہ کے دونوں بچے بہت پیارے تھے۔ اس دوران عابد چائے کا مگ تھامے کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آ گیا اور ذرا پردہ سرکا کر یونہی باہر کا جائزہ لینے لگا۔ فلیٹ روڈ فیسنگ تھا، ساری ٹریفک نظر آ رہی تھی، سڑکوں کے کنارے واقع بازار...... میں زندگی کی مصروفیات پوری شدومد سے جاری تھیں۔ آسمان صاف تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا شور رچا ہوا تھا۔ اچانک عابد کے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے مخصوص ساخت کی دو بھاری گاڑیاں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ دونوں کا رخ اسی بلڈنگ کے مین باؤنڈری گیٹ کی طرف تھا۔ وہ ان گاڑیوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہی گاڑیاں تھیں جو اسے اسرائیلی انٹیلی جنس کے کمانڈ سینٹر میں نظر آئی تھیں، وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھتا رہا۔ گاڑیاں رکیں اور اس کے اندر سے مخصوص وردیوں میں مسلح افراد برآمد ہوئے، اب تو عابد کا ماتھا ٹھنکا۔ اسی اثنا میں نائمہ بھی اٹھ کر اس سمت آ رہی تھی کہ عابد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ ٹھٹکی۔ عابد نے فوراً کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور نائمہ کو ساری صورت حال بتائی تو وہ بھی متوحش سی نظر آنے لگی۔ عابد نے ام خالدہ سے پوچھا۔

''کیا طلحہٰ سے اس وقت ٹیلی فونک رابطہ ہو سکتا ہے؟''

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''آفس کے نمبر پر ہی اس سے بات کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ وہاں ہوں، لیکن بات کیا ہے...... برادرم عزیزی؟'' اس نے آخر میں الجھی ہوئی نگاہوں سے عابد شمشیری کی طرف دیکھا۔ عابد نے اسے بھی بتایا تو وہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ تاہم بولی۔ ''آپ لوگ ادھر ہی ٹھہرو، میں خود جا کر باہر معلومات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے عبا پر بڑا سا اسکارف باندھا اور فلیٹ سے نکل گئی۔ عابد اور نائمہ متفکر سے کھڑے رہ گئے اور بے چینی سے ام خالدہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ عابد جلد از جلد طلحہٰ سے فون پر رابطہ کر کے اسے اس تازہ ترین مخدوش صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ تاہم انہیں کچھ اطمینان تھا کہ ان کے اصل حلیے بدلے ہوئے تھے کیونکہ کل رات ہی طلحہٰ ان کے لیے ہلکا پھلکا ریڈی میڈ میک اپ کا سامان لے آیا تھا مگر ... کاغذی شناخت وہ اپنی پھر بھی چھپانے سے قاصر ہوتے، اس کے لیے بھی طلحہٰ نے انہیں کسی حد تک تسلی دی تھی کہ وہ کسی ایجنٹ سے بات کر کے ان کے موجودہ حلیے کے مطابق تصاویر اتار کے کاغذات میں ہیر پھیر کرانے کی کوشش کرے گا۔

ام خالدہ تھوڑی دیر بعد لوٹ آئی۔ اس کے صبیح چہرے پہ تفکر کے آثار تھے، دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے ''اور کیا ہوا؟'' کی تفسیر پیش کرنے لگے۔

''تم دونوں پر یہاں کسی کو کوئی شبہ تو نہیں ہوا ہے مگر اسرائیلی خفیہ ایجنسی اور پولیس تم دونوں ہی کی تلاش میں خفیہ سرچ آپریشن کر رہی ہے۔ یہ معمول کی چیکنگ ہے جو تقریباً ہر رہائشی بلڈنگ میں کی جا رہی ہے۔'' ام خالدہ نے بتایا۔ عابد اور نائمہ کے چہروں پہ تشویش کے آثار پھیل گئے۔ جان گئے تھے کہ ان کے فلیٹ کی بھی باری آ سکتی تھی۔ تاہم عابد نے ام خالدہ سے کہا کہ اس کی کسی طرح اپنے شوہر طلحہٰ سے بات کرا دیں۔ ام خالدہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور قریب دھرے ایک خوب صورت سے دیدہ زیب فینسی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی ...... نائمہ نے عابد سے ایک خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''فون ذرا دھیان سے کرنا۔ ممکن ہے کالیں خفیہ طور پر چیک کی جا رہی ہوں۔''

''ہاں ......'' عابد نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ام خالدہ نے بتایا کہ اس کے شوہر طلحہٰ سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں مصروف تھا اور اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ بے چارہ یقیناً ان کے کام کے سلسلے میں دوڑ دھوپ میں مصروف تھا۔

''میرا خیال ہے یہاں کی صورت حال پر ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' عابد نے خود کلامیہ انداز میں یہ کہتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اسی پر ام خالدہ بولی۔

''میرا خیال ہے آپ دونوں کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... کیونکہ آپ دونوں اپنے اصل حلیے میں نہیں ہیں۔'' اس کی بات پر نائمہ بولی۔

''ہمشیرہ عزیزی! بات صرف حلیے بدلنے کی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ شناختی کاغذات ہم سے مانگ سکتے ہیں پھر ہم دونوں مرد عورت کے جوڑے پر تو انہیں سب سے پہلے شبہ ہوگا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھی لے جا سکتے ہیں۔'' نائمہ پریشان ہو رہی تھی، کیونکہ اس کی وجہ واضح تھی، بڑی مشکل سے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر تو یہ لوگ ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، اس پر کسی گہری سوچ میں مستغرق عابد شمشیری نے کہا۔

برائے وسعت رزق

(1) ''خواجہ احمد دیزلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (مجربات دیزلی) میں تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص نیا لباس پہننے سے پہلے پاک پانی پر دس مرتبہ سورۃ قدر اور سورۃ اخلاص پڑھ کر لباس پر چھڑک دے تو جب تک لباس کا تار اس کے بدن پر رہے گا اسے مالی تنگی نہیں ہوگی۔''

(2) گھٹنوں سے ٹچ ٹچ کی آواز آنا۔ ''جن لوگوں کے گھٹنوں میں سے ٹچ ٹچ کی آوازیں آتی ہوں ان میں وٹامن ڈی 3 کی کمی ہو جاتی ہے، وٹامن ڈی 3 کی کمی دور کرنے سے گھٹنے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

(3) حضور ﷺ کا پیالہ جھاؤ کی لکڑی کا تھا۔

جھاؤ جسے عربی میں طرخا، فارسی میں گز، پنجابی اور سرائیکی میں لائی، مہرا اور انگریزی میں ٹمریسک ٹری (Tamarisk Tree) کہتے ہیں۔

ڈاکٹر کرنل چوپڑا نے ٹمریسک ٹری کے پیالے کے مندرجہ ذیل فوائد بتائے ہیں۔

اس پیالے میں پانی پینے سے جگر کے امراض (Liver diseases) خاص طور پر ورم جگر (Liver inflamation) استسقاء (Oedema) ختم ہو جاتا ہے اس سے گردوں کی ورم (Kidney Inflamation) ختم ہو جاتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے حتیٰ کہ اس پیالے میں پانی پینے سے خون میں صفراوی کیفیت کم ہو کر خون میں چربیلے مواد کولیسٹرول (Cholesterol) اور کیسی تھین کم ہو جاتی ہے پتہ (Gall bladder) میں پتھری بننے والا مواد پیشاب کے ذریعے نکل جاتا ہے۔

مرسلہ: روشنی رشید، دھمیال کیمپ، راولپنڈی

"میرا خیال ہے ہمیں ان لوگوں کے ہتھے سرے سے چڑھنا نہیں چاہیے۔ جانے اب تک انہوں نے کتنے مشکوک لوگوں کو گرفتار بھی کرلیا ہوگا۔"

عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ان کے فلیٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ ان کے چہرے فق ہوگئے۔ "دروازہ کھولو...... جلدی...... ورنہ توڑ دیا جائے گا۔ پولیس۔" باہر ایک کرخت اور بھاری آواز ابھری تھی۔

☆☆☆

محسن اب اکیلا تھا مگر اندر حوصلوں کی یلغار سی جاری تھی۔ اس کا بازو زخمی بھی تھا مگر اسے اپنے درد کی پروا کب تھی۔ دو آنے والے مسلح اسرائیلی فوجیوں پر اس نے برسٹ چلایا۔ ان کی پیش قدمی کو روکتے ہی وہ مختلف پینل بورڈ کی آڑ لیتا ہوا راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بارق شمعون پر جھپٹا اور چشم زدن میں اسے گن پوائنٹ پر لے لیا۔ فوجیوں نے موساد کے اہم افسر کو محسن کی گن پوائنٹ پر دیکھا تو اپنی گنیں اس پر تان لیں مگر وہ محسن پر فائر کرنے سے قاصر ہی رہے کیونکہ اس نے بارق شمعون کو اپنی ڈھال بنائے رکھا تھا۔

"خبردار...... اگر کسی نے گولی چلائی۔ میری گن اس کے ناپاک وجود کے پرخچے اڑا دے گی۔ اپنی گنیں فرش پر گرا دو۔ جلدی......" محسن خونی خوار انداز میں غرایا۔

بارق شمعون کا مکروہ چہرہ موت کے خوف سے تاریک پڑتا جارہا تھا جبکہ اسرائیلی دستہ شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ محسن نے بارق شمعون کی پشت پر اپنی گن کی نال چبھوتے ہوئے اس بار اس کے ذریعے ہدایت دلوائی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جیسے یہ کہہ رہا ہے ویسے ہی کرو...... ورنہ یہ مار ڈالے گا جان سے......"

فوجیوں نے اپنی گنیں فرش پر ڈال دیں اور اس وقت محسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے بارق شمعون سمیت فرار کے لیے دروازے کی طرف رخ کیا۔ وہ زخمی تھا...... مگر یہ جوش و جذبہ تھا جس نے اسے پامردی کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے رکھا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں نے طوعاً و کرہاً اس کی پیروی کی تھی۔ دوسرا حکم محسن نے انہیں دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرنے کا دیا۔ بارق شمعون کی مکار آنکھیں تیزی سے گردش کررہی تھیں۔ وہ زخمی محسن کی "کنڈیشن" کو نوٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ اس کی طرف سے مزاحمت کے جواب میں اپنے اندر کتنی طاقت رکھتا تھا۔ بارق شمعون خود بھی ماضی میں ایک ٹاپ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ جسے قابلیت اور "سینیارٹی" کے بل بوتے پر... موساد کا اسسٹنٹ ڈپٹی اور اب اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا...... اس کی تیز بھانپتی ہوئی مکار نگاہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کا زخمی حریف اب...... اپنی پہلے جیسی تیزی یعنی "لائن آف فاسٹ ایکشن" کھو چکا ہے اور موقع ملتے ہی کسی بھی وقت اسے برسٹ چلا کے ختم کردینے کے درپے ہے...... بارق شمعون نے اسی لیے فوجیوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ بلا چون و چرا محسن کا حکم مانتے رہیں...... جس کے باعث محسن کے انداز و اطوار میں وہ تیزی نہ رہی اور یہی کمزوری بارق شمعون کے اندر کے ٹاپ ایجنٹ نے فوراً بھانپ لی تھی، وہ اب اس سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھا کہ ایک موقع پر جب محسن نے دروازے سے اس سمیت باہر قدم رکھا اور محسن کی آنکھوں میں غیظ کا شعلہ چمکا۔ وہ بارق شمعون کو جہنم واصل کرکے آگے کی راہ لینا چاہتا تھا کہ دفعتاً دروازے کی غیر معمولی چوڑی چوکھٹ پار کرتے وقت بارق شمعون نے دانستہ اس طرح جھٹکا کھایا جیسے چوکھٹ پار کرتے وقت اس کا پاؤں رپٹا ہو، اس طرح وہ اپنی غیر ارادی حرکت کو ظاہر کرنے کی غرض سے دانستہ تھوڑا جھک بھی گیا اور پل کے پل جیسے ہی وہ گن پوائنٹ سے آؤٹ ہوا اس کی دائیں ٹانگ تیزی سے حرکت میں آئی جس کی ضرب محسن کی زخمی ران پر لگی، محسن اس کی چالاکی نہ سمجھ پایا۔ زخم کی ٹیس نے اسے ایک لمحے کے لیے لرزا دیا اور اس دوسرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بارق نے اسے اپنے بھاری بھرکم کاندھے کی زوردار ٹھوکر بھی رسید کرڈالی۔ محسن جب تک اس پر اپنی گن سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، وہ خود لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ بارق شمعون نے اس دوران ایک اور خطرناک حرکت کی... محسن کے لڑکھڑانے کے باعث اس کے ہاتھ سے چھوٹتی گن پر بھی گرفت جمانی چاہی تھی مگر گرتے ہوئے محسن کی خوش قسمتی یہ رہی تھی کہ وہ راہداری کی دیوار سے ٹکرا کر گرا تو گن بھی چھوٹ کر اس کے پاس ہی گری، اپنے زخموں کی تاب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان اعصاب شکن لمحات میں بھی محسن نے جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گن پر جھپٹا مارا۔ ادھر بارق شمعون شکاری کو "شکار" بنتے دیکھنے کی حسرت لیے اپنی جان بچانے پر ہی...... موقوف ہونا پڑا اور فوراً حلق کے بل چیختا ہوا کمرے کے اندر دوڑ گیا۔

"ہتھیار سنبھالو۔ شکار سامنے ہے۔" فوجی جیسے چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آگئے۔ محسن کو خطرناک

کا احساس ہوا اور اس نے سنبھلتے سنبھلتے اندر برسٹ فائر کردیا پھر ایک ہاتھ سے گن سنبھالتا ہوا کوریڈور کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گن اب بیکار ہو چکی تھی، اس کا خالی بوجھ اسے گراں گزرنے لگا۔ وہ اس نے پھینک دی۔

وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا بازغہ سے سامنا ہوگیا۔ اس کی محسن پر نگاہ پڑی اور اسے تنہا اور زخمی پاکر بازغہ کی آنکھوں میں تشویش و تفکر کی لہریں سمٹ آئیں، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر محسن کو سنبھالا، محسن پر بھی اب نیم غشی سی طاری ہونے لگی تھی، بازغہ کے نرم سہارے سے اسے کچھ طمانیت محسوس ہوئی تھی جبکہ بازغہ اسے لیے...... ایک کمرے کا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"تم کسی طرح ایک عدد ہتھیار کا بندوبست کرسکتی ہو؟" محسن نے ہانپتی ہوئی آواز میں بازغہ سے کہا تو بازغہ بولی۔

"تم شدید زخمی ہو۔ تت...... تمہارا بازو اور ٹانگ بری طرح گھائل ہیں۔ اپنی جان کی فکر کرو...... پلیز...... تمہیں ہتھیار کی نہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے...... آؤ میرے ساتھ......" محسن کی حالت غیر ہونے لگی تھی، تاہم اس نے نیم باز سی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ بازغہ سے لیے ایک اندرونی دروازے سے دوسری طرف ایک ایسی جگہ لے آئی...... جدھر ایک دیوار میں سرنگ سے مشابہ محرابی دہانہ دکھائی دیا۔ یہ زمین دوز جگہ معلوم ہوتی تھی، یا پھر اس کا اندرونی گوشہ کسی طویل بیسمنٹ سے جڑتا تھا کیونکہ یہ کمرا ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا مگر یہاں اسے بہت سی موٹر ٹرالیاں موجود نظر آئیں اور ایک بڑی سرنگ کے اندر غائب ہورہی تھی۔ بازغہ نے ٹرالی سنبھالی اور محسن کو سنبھال کے اس پر سوار کرا دیا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور ٹرالی کے چھوٹے سے پینل پر لگے چند بٹنوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے ٹرالی حرکت میں آچکی تھی۔

"ہم کدھر جارہے ہیں؟" محسن نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی الجھن آمیز حیرت کا شائبہ تھا۔ بازغہ جواباً بولی۔

"اپنے گھر...... میں اس ٹرالی کے ذریعے اپنے پاپا کے ساتھ یہاں آئی تھی۔"

ان کی ٹرالی نیم تاریک سرنگ میں آگے کی طرف اپنے سفر پر گامزن تھی، سرنگ کی گول چھت پر کہیں کہیں بلب روشن تھے...... محسن ہونٹ بھینچے چند ثانیے پرسوچ اور خاموش نظروں سے بازغہ کا چہرہ تکتا رہا پھر عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "ویسے تم ہو کون؟ اور اپنے لوگوں کے خلاف ہماری مدد کیوں کررہی ہو؟ اس طرح تو تمہارے اپنے ہی تمہارے دشمن بن جائیں گے؟"

"میں نے بتایا تو تھا۔ میں کمشنر پیریز ناون کی بیٹی بازغہ ہوں اور مجھے اب اپنے لوگوں سے سخت نفرت ہوگئی ہے۔" وہ بولی۔ "جبکہ مجھے تم لوگ مظلوم اور حق پر نظر آتے ہو لیکن میری قوم کے لوگوں نے مظلوم اور نہتے فلسطینیوں پر طرح طرح کے جو انسانیت سوز مظالم ڈھا رکھے ہیں۔ وہ میری تو کیا کسی کی بھی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن افسوس تو مجھے اس بات کا بھی بہت ہے کہ میرا اپنا باپ جو تل ابیب کا کمشنر ہے...... پیریز ناون وہ بھی اس گھناؤنے عمل میں پیش پیش رہتا ہے۔"

محسن کو اس نرم و نازک سی خوب صورت لڑکی کی باتوں میں سچائی کی بو محسوس ہوئی، وہ اس سے متاثر ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی رو میں آگے بولے جارہی تھی۔

"پھر تم نے بھی میری جان بچانے کے لیے اس سفاک اور ننگ انسانیت آدمی جنرل آئزک فرناش کی چلائی ہوئی گولی سے بھی بچایا اور زخمی ہوگئے۔ ایسا تم نے کیوں کیا؟ اسی لیے نا کہ میں نے تمہاری اپنے باپ اور فرناش کے سامنے حمایت کی تھی، وہ ظالم تو اپنی ہی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنانا چاہتے تھے۔ میں تم حریت پسند مجاہدوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔"

محسن ہولے سے مسکرا کے رہ گیا۔ بازغہ کی آنکھیں نمناک ہونے لگی تھیں۔ معاً بازغہ نے دیکھا محسن کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اس کے زخموں سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ وہ محسن کے خوبرو چہرے پر اترنے والی زردی مائل رنگت کو دیکھ کر تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ محسن شاید... بے ہوش ہوگیا تھا۔

☆☆☆

زبیدہ کا ایک مزید ساتھی کام آچکا تھا۔ اب اس کے ساتھ صرف دو ساتھی رہ بچے تھے۔ ایک فرہاد اور دوسرا عامر...... دشمنوں کی نئی کمک کی آمد اور اپنی کمزور پڑتی نفری طاقت کو مدنگاہ رکھتے ہوئے زبیدہ... اور اس کے دونوں ساتھی سردست دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھے، تاہم ایک اہم دشمن یعنی موساد کے اضحاق شامیر کو جہنم واصل کرنے کے بعد...... زبیدہ دیگر اہم اسرائیلی افسران کی متلاشی تھی، اسے جنرل آئزک فرناش اور بارق شمعون کی

تلاش تھی۔ اسے حالات کا اندازہ بھی ہو رہا تھا جو تیزی کے ساتھ مخالف سمت کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے، اگرچہ اس کے گرینڈ پلان کا ایک حصہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا مگر اس کے پلان کا دوسرا حصہ نسبتاً زیادہ اہم تھا جو گروپ بی کے کامیاب ایکشن پلان اور کارروائی کے بعد فوری عمل کرنے کا متقاضی تھا، جو بدقسمتی سے نہ ہو پایا اور اب زبیدہ کے پلان کا یہ دوسرا اور نسبتاً اہم مشن ناکامی کے دوراہے پر تھا بلکہ اب تو انہیں خود اپنی جان کے لالے پڑنے لگے تھے مگر جان جوکھم میں ڈال کر اندھا دھند کارروائی کرنے کی زبیدہ بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھی، جب تک کہ اصل ہدف حاصل نہیں ہو جاتا۔

نئی اسرائیلی کمک پہنچتے ہی زبیدہ اور اس کے دونوں ساتھی پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر...... زبیدہ کو محسن کی بھی فکر تھی۔ نجانے وہ کہاں اور کن حالات کا شکار تھا؟ فرہاد اور عامر اس کے ہمراہ تھے نئی کمک کی آمد کے ساتھ ہی ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے کونے کونے میں ملک الموت بن کے پھیل چکے تھے، ناچار زبیدہ کو اپنا یہ اہم مشن ادھورا چھوڑ کے فرار ہونے کی حکمتِ عملی پر مجبور ہونا پڑا، جو سر دست مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے دفاقی پوزیشن اختیار کرتے ہوئے خاموشی سے ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مقام پر ان تینوں کو اسرائیلی دستے نے گھیر لیا...... یہ عمارت کا عقبی اور آخری گوشہ تھا...... دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تو ناچار فرہاد نے زبیدہ سے کہا۔

”عزیزی زبیدہ!...... آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں، میں اور عامر دشمنوں کو کور کیے ہوئے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر نہیں لوٹ سکتی۔ نکلیں گے تو ساتھ ہی۔“ زبیدہ نے حتمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا تو عامر کو بھی بولنا پڑا۔

”فرہاد ٹھیک کہہ رہا ہے عزیزی زبیدہ......! آپ ہمارے لیے نہیں پوری فلسطینی قوم کے لیے اہم ہیں۔ آپ کا بچ نکلنا ہم سے زیادہ ضروری ہے...... خدا کے لیے اپنی قوم اپنے آدرش کی خاطر...... مان لیں ہماری بات۔ یہ یہودی کتے آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے ہم اہم نہیں آپ ہیں۔“ زبیدہ نے اندرونی کرب سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لیے۔

”سوچنے کا وقت نہیں...... عزیزی!...... آپ پوری فلسطینی قوم کی ہی نہیں امتِ مسلمہ کی بھی امانت ہیں۔ ابھی ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ فرہاد نے بھی مرتعش سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو زندہ رہنا ہے ابھی...... ہم سب کے لیے...... صادق الخیری اور قیصر انلیلی جیسے جاں باز مجاہد کا زخم بھی ابھی ہمارے سینوں میں تازہ ہے۔ ہم آپ جیسی عظیم مجاہدہ کے مزید کسی ایسے زخم کے ہرگز متحمل نہیں ہو سکتے...... جو خدانخواستہ ہماری کمر توڑ ڈالیں۔“

زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ ایک مجبور سی نگاہ اپنے دونوں ساتھی مجاہدوں پر ڈالی اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد اور عامر اسرائیلی فوجیوں کے سامنے اس وقت تک ڈٹے رہے، جب تک ان کے ہتھیار ساتھ دیتے رہے اور زبیدہ ان کی پہنچ سے دور نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں نے بالآخر جام شہادت نوش کر لیا۔ اس امید فردا کے ساتھ کہ بہت جلد ان کی دلیر لیڈر زبیدہ تازہ دم ہو کر اسرائیلی غاصبوں کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دے گی۔

☆☆☆

کئی گھنٹے بیت چکے۔ ارض فلسطین کے لہو لہو افق سے پو پھٹنے لگی تھی مگر ابھی اس صبح کی سپیدی سحر میں مظلوموں اور نہتے بے گناہوں کے فریادی لہو کی سرخی شامل تھی جو ابھی اصل سپیدۂ سحر کی منتظر تھی، [illegible] ہونے کی آس باقی تھی۔ ابھی گل لالہ کا دامن دل و جاں اپنے ہی لہو سے خوں رنگ تھا۔ ابھی مٹھی بھر سرفروشانِ وطن کے اسلام کے سودائے جنوں خیزی کی رفوگری جاری تھی تو دوسری جانب انسان نما شیطانی ٹولوں کی چال گری بھی عروج پر تھی۔ حق و باطل کی جنگ کے میدانِ کارزار میں اگر ایک طرف رقص ابلیس نظر آتا ہے تو دوسری طرف آبروئے وطن اور اسلام کی سربلندی کی خاطر جام شہادت نوش کرنے والے پرچم اسلام کے نام پر رقص زنجیر پہن کر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ غلط ہے ان کی سوچ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ صرف فلسطین کی جنگ ہے۔ ہرگز نہیں...... یہ تو پورے عالم اسلام کی جنگ ہے۔

جنرل آئزک فرناش کی حالت اس وقت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی بال نوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہی حال بارق شمعون کا بھی تھا۔ دونوں اپنے اہم ساتھیوں، ایہود شابک اور اسحاق شامیر سے محروم ہو چکے تھے مگر اس سے زیادہ ان کی خارش زدہ حالت ہونے کی وجہ حریت پسندوں کا اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر پر کامیاب حملہ تھا۔ جس کے باعث ان کی اس قدر سبکی اور رسوائی ہوئی کہ

ان کے دیرینہ خواب ”عظیم تر اسرائیل“ کو عالمی سطح پر سخت ذلت و ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہی نہیں ایٹمی بجلی گھر کی آڑ میں ان کا یورینیم افزودگی کا پلانٹ بھی تباہ ہو گیا تھا پھر تیونائی میں ڈیوڈ اسٹار کی عمارت پر چھاپا مار مجاہدوں کا حملہ بھی کم نہ تھا۔ جس میں اگرچہ فلسطینی مجاہد کے دوسرے گروپ کو خاطر خواہ کامیابی تو نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حملہ بھی پوری یہودی قوم اور اسرائیل کی اونچی ناک کو کاٹنے کے ہی مترادف تھا۔ چونکہ یہودیت کا خمیر ہی مکاری اور دغابازی سے اٹھا تھا اس لیے انہوں نے حتی الوسع کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر پر فلسطینی چھاپا ماروں کے حملے کو راز میں رہنے دیا مگر ڈیمون حملہ اور ایٹمی بجلی گھر کی تباہی کے واقعے کو چھپانے سے قاصر رہے تھے کیونکہ اس کی تباہی سے پورا یروشلم اور تل ابیب اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اسے بھی فنی خرابی کا نام دے کر اپنے تئیں چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی مگر وہ اس زخم کا اندھا انتقام لینا چاہتے تھے۔ فلسطینی اور عرب بستیوں کے مظلوم اور نہتے معصوم لوگوں پر گولہ باری اس طرح کی بزدلانہ کارروائی یہودیت کا بنیادی شیوا تھا۔ اس پر فی الفور عمل پیرا ہونے کے لیے اسرائیلی اتھارٹی نے فوراً چار بڑوں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ کال [illegible]۔ ان چار بڑوں میں ایک ڈیوڈ اسٹار کا سربراہ جنرل آئزک فرناش تھا۔ دوسرا موساد کا ڈپٹی چیف بارق شمعون، تیسرا یہودی انٹیلی جنس یونٹ ”ہگانہ“ کا ڈائریکٹر آئزر مین ہیری اور چوتھا انٹروگیشن سینٹر کا چیف انچارج شمیر گویان تھا۔ جبکہ ہگانہ کے ڈائریکٹر آئزر مین کو ”شن بیتھ“ نامی اسرائیلی کاؤنٹر انٹیلی جنس کی بھی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں جو ”الیا بیتھ (aliyah beth) کا بانی بھی تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ موساد اور ڈیوڈ اسٹار درحقیقت ”ہگانہ“ اور ”شن بیتھ“ کا بانی ایک پولینڈ نژاد یہودی آئزر ہیری تھا جو صرف بیس سال کی عمر میں 1901ء میں پہلی مرتبہ فلسطین آیا تھا، وہ اس یہودی تحریک کا خفیہ جاں نثار تھا جو بڑی خاموشی سے ایک سازش کے تحت دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین پہنچ کر آباد ہونے کا مشورہ دیا کرتی اور پھر اس کا بندوبست بھی کرتی تھی۔

آئزر ہیری نے جدہ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک راج مستری کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی اس نے اپنی کنسٹرکشن کمپنی قائم کر لی لیکن چند سالوں میں اس کا دیوالیہ نکل گیا تو وہ واپس پولینڈ آ گیا۔ پھر یکایک اس کی زندگی میں انقلاب آیا اور 1938ء میں جب وہ دوبارہ اسرائیل آیا تو وہ یہودیوں کی خفیہ فوج کا جاں نثار سپاہی تھا۔ 1948ء میں آئزر ہیری لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا اور ”ہگانہ“ (یہودی انٹیلی جنس یونٹ) کی باقاعدہ داغ بیل ڈال کر اس کا بانی اور چیف بن گیا۔ مکاری میں یکتائے روزگار ہونے کے سبب وہ خفیہ امور کا چیمپئن سمجھا جاتا اور اس کا شمار ہگانہ آرمی کے معزز افسران میں ہوتا تھا۔

جب اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی جنگ کا آغاز ہو گیا تو اسرائیل کی بقا کی ذمے داری بھی ایک طرح سے آئزر کے کاندھوں پر آن پڑی۔ اس پر ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ہگانہ، چیف ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن دبلے پتلے اور لمبے قد کے آئزر ہیری نے جیسے حالات سے شکست کھانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے چند دنوں میں ہی اپنے ایجنٹوں کا جال دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ جرمن نازی کیمپوں سے نکالے گئے یہودیوں کو بھی اسرائیل اور فلسطین میں لا کر بسانا اس ملعون شخص کا کام تھا۔ اب ہگانہ کا ڈائریکٹر آئزر ہیری اپنے پڑدادا کا ہم نام ہی نہیں بلکہ اس جیسی ناپاک اور مکروہ خصلت کا مالک بھی تھا۔ اس نے آگے چل کر ہگانہ کی دو ذیلی شاخیں نکالیں، جن میں ایک الیا بیتھ Aliya Beth اور شن بیتھ Shun Beth تھیں جو موجودہ اسرائیل کی جدید کاؤنٹر انٹیلی جنس ایجنسی کا کام کرتی تھی۔ ان میں شن بیتھ وہ تھی جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور ڈگری یافتہ درس گاہوں میں اسکالر کی بنیاد پر آئے ہوئے ان مسلم طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی جن کا تعلق مسلم ممالک سے تھا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہ ان ہونہار مسلم طالب علموں کے درخشاں مستقبل کے آگے روڑے اٹکانے اور انہیں مختلف جھوٹے الزامات میں پھنسا کر ایسے جدید تعلیمی اداروں سے رسوا کر کے بے دخل کرنے کا مشن انہیں سونپا گیا تھا۔ بالخصوص امریکا کی اعلیٰ اور جدید درسگاہوں میں ایسے مسلم ہونہار اسکالرز طالب علموں کو بے دخل کرنے کے مشن پر یہ ملعون کٹر مسلم کش یہودی باقاعدہ خود بھی اسرائیلی سفیر کی حیثیت سے کچھ عرصہ امریکا میں مقیم رہا جس نے امریکا میں موجود مسلم طالب علموں کے خلاف جعلی ثبوت اکٹھے کر کے امریکی حکام کو گمراہ کیا لیکن آئزر مین کا اصل ٹارگٹ پاکستان اور پاکستانی طلبا ہوتے تھے، ان کا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگانا اور انہیں برباد کرنے میں وہ اپنی طرف سے کوئی بھی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ امریکا کے بعد اسرائیل کا دوسرا ہمنوا برطانیہ تھا۔ آئزر مین کی شن بیتھ

وہاں بھی اس کاز پر مصروفِ کار تھی۔ مشن بیتھ بالخصوص امریکا اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں مختلف اسلامی ممالک سے اسکالرشپ "برانزاسٹڈی" کے لیے آئے ہوئے مسلمان طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور ان کے مستقبل کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہر اوچھا ہتھکنڈا استعمال کرتی تھی جعلی الزامات کے ساتھ ساتھ وہ حسین یہودی عورتوں کو بھی استعمال کرتے تھے، جو انہیں بے راہ روی میں مبتلا کر کے اپنے مقصد سے ہٹانے کا باعث ہی نہیں بنتے بلکہ اپنے ملک اور قوم کی بھی بدنامی کا سبب بنتے۔

آئزرمین کے لیے بھی یہ ایک بڑا زخم تھا جو P L S O اور المجاہد نے اسے تیونانی اور نجف آپریشن کی صورت میں دیا تھا۔ بین اسی طرح جیسے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی سات سنگال فورس نے اپراسالٹ ون اور ٹو کے ذریعے تیونس آپریشن کے دوران غضب خدا کے فلسطینی مجاہد رہنما خلیل الوزیر اور پی فرنٹ کے صادق الخیری کو شہید کر کے فلسطینیوں کو زخم دیا تھا۔

اس ہنگامی میٹنگ میں اسرائیلی حکومت کی پارلیمانی کمیٹی بھی موجود تھی اور ان سب کے چہرے بری طرح تپے ہوئے تھے، ہگانہ آرمی کے آئزرمین بیری جونیئر کو اسرائیلی قوم کے ہیروئی "موروثی" حیثیت حاصل تھی اور اس کا حکومتی عمل داری میں بھی موساد اور ڈیوڈ اسٹار سے زیادہ دخل تھا۔

آئزرمین بیری جونیئر ایک لمبا تڑنگا اور کالی رنگت کا گول چہرے والا کٹر یہودی تھا۔ سر بالکل گنجا، ناک قدرے پچکی ہوئی تھی جبکہ چندی چندی آنکھوں میں بلا کی مکاری ایک خباثت لیے ہوئے تھی۔

اسٹین لیس اسٹیل راڈز کی سپاٹ میز کرسیوں پر یہ سارے اکابرین بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے ناپاک اذہان میں خون مسلم بہانے کے لیے بے چینی پھیلی ہوئی تھی، آج یہ صفت فرعون وابلیس انتقام کے نشے میں اندھے ہو کر بیت المقدس قبلہ اول اور ارضِ فلسطین کے خلاف مذموم اور بھیانک فیصلہ کرنے والے تھے۔

میٹنگ کی ابتدا پہلے تو دھواں دھار انداز میں ہوئی اور وہاں موجود سب ہی گویا پہلے سے اس بات پر متفق ہوئے بیٹھے تھے کہ المجاہد اور PLSO کی ان چھاپا مار کارروائیوں کا بدلہ یہ لوگ فلسطین کے معصوم اور نہتے عوام سے لیں گے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ صرف مارا ماری میں پورا انتقام نہ ہوگا۔ انتقام کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح کرنا ضروری تھا، یہ ان کا دہرا انتقام لینے کا پرانا مذموم طریقہ کار تھا مگر ساتھ ہی آئزرمین بیری جونیئر نے ایک نیا ایجنڈا بھی پیش کر دیا۔ جسے اسرائیلی کابینہ کے ارکان نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد آئزرمین نے اپنی بدہیئت آواز میں میٹنگ کے شرکا سے مخاطب ہو کے کہنا شروع کیا۔

" حریت پسندوں کی ایسی کارروائیاں ہمارے گریٹر اسرائیل پلان کو ہمیشہ سے ہی سبوتاژ کرتی آئی ہیں لیکن ہمیں اس کا منہ توڑ جواب بھی دیتے رہنا ہوگا ہر مصلحت سے بالاتر ہو کر ہمیں اس پالیسی پر عمل کرنا ہوگا جو فلسطینیوں کو بری طرح کچلنے اور عرب بستیوں اور علاقوں پر ہمارے قدم مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوں۔" سب نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

آئزرمین کے اس نئے ایجنڈے کے مطابق اردن کی سرحد سے متصل مسلمانوں کے تاریخی و ثقافتی علاقے "وادی اردن" (اغوار) کو صیہونی ریاست میں ضم کرنا تھا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد اسرائیل مشرقی بیت المقدس اور وادی گولان کی طرز پر اس علاقے میں بھی اپنے قوانین لاگو کرے گا۔ اس مقدس وادی میں امت مسلمہ کے امین حضرت عبیدہ بن جراحؓ اور جلیل القدر صحابی معاذ بن جبلؓ سمیت متعدد صحابہ کرامؓ اور کثیر تعداد میں تابعین کی آخری آرام گاہیں ہیں۔ یہ مقام کئی تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے پوری امت مسلمہ کے لیے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناپاک اور متنازعہ مسودۂ قانون کو وہاں موجود اسرائیلی حکمران جماعت "لیکوڈ" اور اس کی اتحادی "جیوش ہوم" کے وزرا کی پہلے ہی سے حمایت اور تائید حاصل تھی، جس کے مطابق مقبوضہ وادی اردن کو مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس کی طرح اپنے انتظامی کنٹرول میں لانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ کابینہ کمیٹی میں لیکوڈ اور جیوش ہوم کے آٹھ وزرا نے اس متنازعہ قانون کی حمایت کر ڈالی۔ ان وزرا میں رکن پارلیمنٹ میری ریگیو بھی تھا جو اس سے قبل وادی اردن میں یہودی بستیوں کی تعمیرات سے متعلق قانون سازی پر عمل درآمد کی بھی نگرانی کر چکا تھا۔ اس متنازعہ مسودۂ قانون کی منظوری اور میٹنگ کے اختتام کے بعد اسرائیل کا شرمناک اور انسانیت سوز شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔

چیختے چنگھاڑتے دیوقامت اسرائیلی جنگی طیاروں نے فلسطینی اور عرب بستیوں پر وحشیانہ گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ غزہ کو کھنڈر بنا دیا۔ نہتے معصوم اور بے گناہ فلسطینیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، صیہونی

چنگیزیت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں بے گناہ معصوم شہریوں کا بڑی سفاکی سے گویا قتل عام کیا گیا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف انسانی لاشیں، چیتھڑوں کی صورت نظر آنے لگیں۔ کہیں معصوم..... شیرخوار بچوں کے اجزے بجزے اعضا بکھرے نظر آتے تو کہیں صرف پر گوشت کے لوتھڑے۔ اسرائیل کی اس ننگی جارحیت سے زمین و آسمان تھرا اٹھے مگر کرب ناک المیہ تو یہ تھا کہ اس ظلم اور سفاکانہ بربریت کے انسانیت سوز شیطانی کھیل کی عالمی سطح پر رپورٹنگ اور ٹی وی کوریج بھی کی گئی مگر باوصف اس کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور عالمی امن کے داعی امریکا کے سر پہ جوں تک نہ رینگی۔ اس کے بعد سب "ماٹھا" پڑ گیا۔ حکومتی سطح پر احتجاج ریکارڈ کروایا گیا تو ڈرتے ڈرتے...... یوں جیسے کسی چودھری کی بیٹھک میں کوئی غریب مزارعہ ڈرتے ڈرتے اپنی عرضی پیش کر رہا ہو...... عرب کنٹریز کے طعام خانوں میں لٹھے کے لمبے لمبے دسترخوان...... بھانت بھانت کے من و سلویٰ کھانوں سے بھرتے رہے لیکن کسی نے خاطر خواہ طریقے اور ذرائع سے اسرائیل کی ریشہ دوانیوں کے آگے سینہ سپر ہونے کی کوشش نہ کی۔ اقتدار کے بھوکے گدھ، مردہ خوری کے ہی منتظر رہے مگر کسی نے امریکا کے لے پالک اسرائیل کی چیرہ دستیوں کو اس طرح نہ چیلنج کیا، جو حالات کے متقاضی تھا۔

ادھر فلسطینی مظلوموں کی اجڑی بچھڑی بے گور و کفن لاشیں...... بہ ظاہر مردہ آنکھوں سے آسمان کو تکتی رہیں اور خالق کائنات سے ہی انصاف مانگتی رہیں۔

ابھی فلسطین اپنے ہی خون میں نہایا تڑپ رہا تھا کہ صیہونیوں نے ان کی غیرت وحمیت پر ایک اور چرکا لگایا۔ آئزرمین بیری کے اگلے مکروہ پلان کے مطابق یہودیوں نے مسلمانوں کے قبلہ اول مسجد اقصیٰ میں گھس کر اپنی مذہبی رسومات ادا کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد بھی بے حرمتی کرنے والوں میں اکثریت اسرائیلی فوجیوں اور متشدد یہودی آبادکاروں کی تھی جو پہلے بھی مختلف رسومات کی ادائیگی کے بہانے سے مسجد میں گھس کر بے حرمتی کے مرتکب ہوئے۔ ان میں اسرائیل کے انٹیلی جنس اہلکار بھی شامل تھے۔ جو بڑی تعداد میں مسجد کے اندر مسلمانوں کی سرگرمیاں مانیٹر کرنے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے یہودی منصوبے کی تکمیل کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔

آج بھی مسجد کے اندر دراندازی کے دوران یہودیوں نے کئی ایسی کارروائیاں کر ڈالیں جن سے اسلامی

دوست کی خاطر

ملنگی بہت ظالم ڈاکو تھا اس کے خوف کے پیش نظر لوگ کہتے تھے۔ دنے راج فرنگی داتے راتی راج ملنگی دا۔ عدالت سے سزا کے طور پر جس دن اس کو اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی جانی تھی۔ تو صبح سویرے جیل سپرنٹنڈنٹ اس کے پاس پہنچا اور کہا۔ "ملنگی کٹھن منزل آگئی ہے اپنے آپ کو اس سفر کے لیے تیار کر لو۔" ملنگی نے جواب میں یہ کہا کہ ملنگی موت کو در دسر یا معمولی خراش سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے گرفتاری کا سبب پوچھا تو ملنگی نے گرفتاری کا سبب بتایا کہ ہمارا ساتھی جواب بھی اگلی کوٹھڑی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے گرفتاری سے پہلے جنگل میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھے تھے ہمارا یہ ساتھی اس وقت بھی قرآن مجید کی تلاوت میں معروف تھا اچانک ہمارے جاسوس نے پولیس آنے کی اطلاع دی ہم بھاگنے کو تیار ہو گئے اگر ہم اس وقت بھاگ کھڑے ہوتے تو کبھی گرفتار نہ ہو سکتے لیکن ہمارے ساتھی نے کہا "میں جب تک قرآن مجید کا یہ پارہ ختم نہ کر لوں تلاوت نہیں چھوڑ سکتا۔" ایک طرف اس ساتھی کے ساتھ موت اور دوسری طرف زندگی کے لیے فرار۔ ان دو صورتوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے دوست کے ساتھ مرنا گوارہ کر لیا کہ جو شخص قرآن دوستی کے مقابلے میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا ایسے دوست پر اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہیے۔

مرسلہ: محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور مظفر گڑھ

شناخت بری طرح متاثر ہوئی۔ بالخصوص مسجد کے صحنوں کو یہودی مقام قرار دینے کے لیے یہاں وقفے وقفے سے یہودی رسومات اور تقریبات کا انعقاد کیا جاتا رہا نیز...... مسجد اقصیٰ اور اس کے گرد پھیلے ہوئے بابرکت شہر القدس کو بھی یہودی رنگ میں رنگنے کا سلسلہ خفیہ اور اعلانیہ جاری رہا۔ الجاہد اور PLSO کی تازہ کارروائیوں کے انتقامی جواب میں اسرائیل کے بزدلانہ عمل سے بے شک چند اسلامی ممالک کی طرف سے لعن طعن کی گئی اور احتجاج بھی کیے گئے مگر اسرائیل اپنے قسائی مزاج سے باز آنے والا کب تھا۔ اب تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی عرب بستی پر نہتے مظلوم مسلمان عوام پر اسرائیلی بمبار طیارے گولہ باری کرتے۔ واقعی اس بربریت اور سفاکانہ کھیل کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہودی مسلمانوں کی نسل کشی پر اتر آئے ہوں... مگر یہ شیطانی کھیل جاری تھا۔

☆☆☆

ریجنٹ (Regent) پارک کی مسجد میں جمعۃ المبارک کی نماز سے پہلے خطبہ دیا جا رہا تھا اور پیش امام بڑی دردناک آواز میں اسرائیل کے فلسطین پر کیے جانے والے بھیانک اور انسانیت سوز ظلم کے ساتھ عالم اسلام کی بے حسی کے بارے میں بھی ذکر فرما رہے تھے، ان کے وعظ کا لب لباب وہی تھا جو خواب غفلت کی نیند میں سوئے ہوؤں کو جگانے کے لیے مقصود ہوتا ہے۔ جو فلسطین کی جنگ کو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ یہ ہماری جنگ نہیں۔ اس موضوع پر لندن کے قانون اور مصلحت کوشی کے سبب انہوں نے زیادہ تقریر کرنا مناسب نہ سمجھا مگر حق کی آواز کو تو قیصر و کسریٰ کے دربار میں بھی نہیں دبایا جا سکتا تھا تو یہ تو پھر لندن تھا۔ یہاں بھی مسلم کمیونٹی کی جانب سے اسرائیل کی فلسطین پر وحشیانہ اور ظالم گولہ باری پر احتجاج کیا گیا تھا۔

لندن کی ریجنٹ پارک کی اس مسجد میں جمعۃ المبارک کی باجماعت نماز میں ایک پاکستانی مسلم گھرانے کے دو فیملی ممبرز بھی نماز کی ادائیگی کے لیے موجود تھے، یہ دو بھائی تھے، ظہیر احمد اور ڈاکٹر کمال احمد...... یہ دونوں سگے بھائی تھے، ظہیر احمد بڑا بھائی تھا اور وہ دس برسوں سے لندن کے شہر "لیڈز" (Leeds) میں مقیم تھا... ایک چھوٹے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا مالک تھا۔ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اچھے وقتوں میں جب برٹش ویزا پالیسی نرم تھی، وہ یہاں اپنی قسمت چمکانے آیا تھا، پھر ادھر ہی اس نے ایک پہلے سے آباد مسلم گھرانے کی لڑکی پروین سے شادی کر لی۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، باپ ٹیکسی چلاتا تھا۔ پہلے پہل ظہیر احمد، پروین سے شادی کے بعد ان کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا جو کرائے کا تھا، ایک حادثے میں پروین کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ تب تک ظہیر احمد خود بھی اپنی محنت کے بل بوتے پر یہاں اپنے قدم جما چکا تھا اور پھر اپنے ساس سسر کا فلیٹ جو کرائے کا تھا، چھوڑ کر ویسٹ کارنر کے علاقے میں ایک دو کمروں کا چھوٹا مکان Mortgaye پر لے لیا اور ایک فاسٹ فوڈ ٹائپ کی دکان کی بنیاد بھی وہ پہلے ڈال چکا تھا جو اب ایک چھوٹے سے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بدل گئی تھی۔

ڈاکٹر کمال اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کل پانچ بہن بھائی تھے، تین بھائی دو بہنیں ظہیر احمد سب سے بڑا تھا۔ پھر جمال احمد کے بعد کمال احمد تھا۔ دونوں بہنیں چھوٹی تھیں۔ ان کا تعلق پاکستان کے شہر بہاولپور سے تھا جس کے نواحی گاؤں میں ان کا باپ کسی چودھری کا منشی تھا۔ سوائے کمال احمد کے کسی کو بھی پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ ظہیر احمد شروع میں دبئی گیا۔ ایک پاکستانی کنسٹرکشن کمپنی کو لیبر کی ضرورت تھی۔ ظہیر احمد زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر جسمانی محنت مشقت کرنے کا دھنی تھا۔ وہ کسی طرح ایک مزدور کی حیثیت سے مذکورہ کنسٹرکشن کمپنی میں بھرتی کر لیا گیا اور دبئی جا کے مزدوری کرنے لگا۔ فطرتاً وہ خود غرض تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں ماں باپ کی کوئی پروا نہ تھی۔ دبئی میں چند سال رہنے کے بعد اسے گویا باہر کی دنیا کا چسکا پڑ گیا پھر خود بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا کچھ ایسے لوگوں میں ہو گیا کہ اس نے اپنا مستقبل لندن جا کر بنانے کا فیصلہ کیا۔

لندن میں شادی کرنے اور کچھ پاؤں جمانے کے بعد اسے کہیں جا کر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال آیا تو وہ بھی واجبی سا۔ کبھی تھوڑے پیسے بھیج دیے، کبھی نہیں۔ بوڑھے ماں باپ نے ہی اپنی باقی کی اولاد کو اپنی استطاعت بھر پالا پوسا۔ منجھلا بھائی جمال آوارہ دوستوں اور نشے میں پڑ چکا تھا اور ایک دن زیادہ نشے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ بہنوں کو وہیں کسی نہ کسی طرح بیاہ دیا گیا۔ ماں باپ فوت ہو گئے۔ منشی فیض محمد کو اپنے جس بیٹے پر سب سے زیادہ فخر تھا...... وہ چھوٹا بیٹا کمال احمد ہی تھا۔ صحیح معنوں میں آخر وقت تک وہی اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنا رہا اور بنتا کیوں نا...... منشی فیض محمد نے اپنے خون پسینے کی ایک ایک پائی اپنے اس چھوٹے ہونہار اور فرماں بردار بیٹے پر جو لگائی تھی کیونکہ کمال کو شروع ہی سے پڑھنے

لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے باپ نے بھی اس کی پوری مدد کی تھی اور اسے ڈاکٹر بنایا تھا مگر کمال احمد صرف ایم بی بی ایس کر کے مطمئن نہ تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ اس کے باپ نے یہاں تک ہی اسے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دیا تھا وہ کیا کم تھا... تاہم ڈاکٹر کمال نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اسکالرشپ کا ایک امتحان پاس کر کے وہ لندن لیڈز یونیورسٹی آ گیا۔ تب تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ماں باپ فوت ہو گئے، دونوں بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں اور ڈاکٹر کمال اپنی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب سجائے، لندن آ گیا۔

وہ مائیکرو بیالوجسٹ تھا اور پاکستانی حکومت نے پانچ سال کا ایک "بانڈ" بھر کے اسے اسکالرشپ پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے لیے سرکاری سطح پر لندن لیڈز یونیورسٹی بھیجا تھا۔

ڈاکٹر کمال یونیورسٹی کے کیمپس میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اپنے بڑے بھائی ظہیر احمد سے ناراضگی کے باوجود اس سے اس کا ملنا جلنا بھی تھا۔ بڑے بھائی نے بھی واجبی سا ہی تعلق رکھا تھا تاہم جمعے کی نماز پر دونوں ملتے تھے۔ ڈاکٹری جیسے خشک شعبے سے وابستگی ہونے کے باوجود ڈاکٹر کمال ایک دل بھی رکھتا تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع اور سادہ منش شخص تھا۔ صحت اچھی تھی دراز قد تھا، رنگ گورا اور چہرے پر شفاف عدسوں کی نفیس عینک لگایا کرتا تھا۔ عمر پچیس، تیس کے درمیان تھی۔ اسے ہسٹری سے بھی دلچسپی تھی۔ اپنی ذات میں وہ مرنجاں مرنج آدمی تھا۔ مگر دنیائے ادب کی کتب بینی بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سادہ فطرت ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے سچے اور کھرے موقف پر ڈٹا رہتا۔ جب کسی سے مدلل گفتگو کرتا تو اس کے اندر سے جوش کا ایک طوفان اٹھتا تھا۔ وہ جب اپنے ساتھی طلبا کے درمیان کسی اہم اور حساس موضوع پر بحث شروع کرتا تو اس کا جوش اور ولولہ دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ جاتے، جو اسے "خاموش سمندر" سمجھتے تھے، انہیں اس کے اندر ایک ولولہ انگیز مدبر اور شعلہ بیاں مقرر ہی نہیں بلکہ ایک پرجوش جنگجو انسان بھی نظر آتا تھا......

جینی کرسٹی ایک برطانوی حسینہ جو اس کی کلاس فیلو تھی۔ وہ اس سے زیادہ متاثر تھی، وہ ایک سنہری بالوں والی حسینہ تھی۔ مقامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے شیرف جان نسویٹر کی بیٹی تھی اس کا بھائی بھی تھا، ریان نسویٹر...... وہ اس سے ایک سال بڑا تھا۔ وہ ایک لاابالی اور آوارہ منش آدمی تھا۔ ڈاکٹر کمال

یوں تو اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا اور وہ بہت پہلے سے ہی اپنی اس حسین کلاس فیلو جینی کی نیلی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بھانپ چکا تھا مگر وہ لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ ایک حد سے زیادہ اس نے جینی کو آگے بڑھنے نہیں دیا تھا۔

اسرائیل کے فلسطین پر ڈھائے جانے والے ستم پر ڈاکٹر کمال کا دل بھی اپنے مسلم فلسطینی بھائیوں کے لیے تڑپتا تھا۔ جینی سے اکثر اس کا اس سلگتے موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اس کے فیلوز میں جینی ہی وہ فرد واحد تھی جو اس کے اس موقف کو جائز سمجھتی تھی اور اسرائیلیوں کے فلسطین پر اس ظلم و ستم کو برا اور انسانیت کی تذلیل سمجھتی تھی۔

آج بعد نماز جمعہ مسلم کمیونٹی نے ہائیڈ پارک پر جا کے فلسطین پر ہونے والے اسرائیل کے انسانیت سوز ظلم کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ ان میں ڈاکٹر کمال کے ساتھ جینی بھی شامل تھی اور کچھ انسانی حقوق کے علم بردار برٹش گوروں کی تنظیموں کے افراد بھی ان کے ساتھ احتجاج میں ہم آواز تھے جبکہ ڈاکٹر کمال کا اپنا بھائی ظہیر احمد جمعے کی نماز کے بعد خاموشی سے کھسک گیا تھا۔ ان لوگوں نے بلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے، جن میں جلی حروف میں اسرائیل کی غزہ اور دیگر عرب بستیوں کے نہتے لوگوں اور زیادہ آبادی والے علاقوں پر وحشیانہ گولہ باری کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ پرامن طریقے سے یہ احتجاج ریکارڈ کرانے کے بعد سب نے اپنا اپنا راستہ لیا اور ڈاکٹر کمال بھی...... جینی کے ہمراہ اس کی کار میں یونیورسٹی کیمپس کی طرف روانہ ہو گیا۔

"تمہارا شکریہ جینی!" کار ڈرائیو کرتی ہوئی جینی کے سرخ و سپید چہرے کی طرف ایک نظر تکتے ہوئے ڈاکٹر کمال نے ہولے سے کہا۔

"شکریہ...... کس بات کا؟" جینی نے ایک لمحے کو کار کی ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے، ذرا گردن موڑ کے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

"تم نے ایک غیر مذہب ہونے کے باوجود ہمارا ساتھ دیا۔" ڈاکٹر کمال نے کہا۔ اس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی۔

"بس! تمہاری تان مذہب پر آ کر ٹوٹ جاتی ہے۔" جینی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس پر کمال کو چونکنا پڑا۔ جانے کیوں ایک لمحے کو کمال کو جینی کے لہجے میں چبھتا ہوا طنز محسوس ہوا تھا۔ مختصراً بولا۔

"تم نے شاید غلط سمجھ لیا۔"

''میں نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے کمال!'' جینی نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے ترنت کہا۔

تمام تر ذہنی اور کسی حد تک نظریاتی ہم آہنگی کے باوصف ان دونوں کے درمیان بھی بحث چھڑ جایا کرتی تھی، مگر باوجود اس کے دونوں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھ لیتے تو اچھے دوستوں کی طرح متفق بھی ہو جاتے۔

''تم لوگ یہی سب سے بڑی غلطی کرتے ہو کہ ہر کسی کو سب سے پہلے مذہب اور پھر بعد میں فرقے کی عینک سے دیکھتے ہو۔ کیا ہمارا ایک دوسرے سے محض انسانیت کا ناتا نہیں ہو سکتا؟ میں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کر رکھا ہے اور جس قدر میں نے مذہب اسلام میں کشادگی، روشن خیالی اور وسیع النظری دیکھی ہے وہ مجھے آج تک کسی اور مذہب میں نہیں نظر آسکی۔ تمہارے پیغمبر اسلام نے بھی انسانیت کے درس کے ساتھ ہی ایک خدا اور ایک کتاب (قرآن مجید) کی تبلیغ کی۔ خود انؐ کی اپنی زندگی انسانیت کی اعلیٰ معراج کا نمونہ نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ تو مجھے بھی یاد آتا ہے تمہارے پیغمبر کا کہ کوئی کافر عورت ہر روز انؐ کے اوپر کچرا پھینکا کرتی تھی، ایک روز ایسا نہ ہوا تو تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ اس کافر عورت کے گھر تشریف لے گئے، کافر عورت کو حیرت ہوئی۔ آپؐ نے اس عورت سے فرمایا۔ ''آج تم نے مجھ پر کچرا نہیں پھینکا تو میں سمجھا کہیں تمہاری طبیعت نہ خراب ہو۔ تمہاری خیریت پوچھنے آگیا ہوں۔'' اس کافر عورت پر اس حسن سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی۔ غرضیکہ تمہارے پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ آپؐ کے حسن اخلاق اور آپؐ کے کامل انسانی نمونے کو تو غیر مذاہب کے لوگوں نے بھی کشادہ دلی سے تسلیم کیا ہے۔ آپؐ کی ذات پاک تو خود ایک اللہ، اسلام اور آخری کتاب کا تبلیغی پرچار کرنے والی ذات تھی مگر...... میں معذرت چاہوں گی ڈاکٹر کمال کہ میں آپ کی بات تو نہیں کرتی لیکن تم میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو مذہبی انتہا پسندی کی طرف گامزن ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ایک دوسرے کو فرقوں کی بنیاد پر جان سے مار ڈالتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے۔'' جینی نے اپنی بات ختم کی تب تک یونیورسٹی کیمپس کے گیٹ کے قریب ان کی کار پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو ایک عجیب سی چپ لگ گئی تھی، اس سے پہلے وہ یہی سمجھتا تھا کہ جینیفر یعنی جینی محض اس کی دوستانہ حمایت میں اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اسے جینی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی مذہب اسلام کے بارے میں خاصا مطالعہ رکھتی ہے اور ایسے ہی متاثر نہیں ہوئی۔

''ایسا سب سازش کے تحت ہوا۔ مسلمانوں کو مسلمان سے لڑانے کے لیے۔'' ڈاکٹر کمال نے کہا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی آواز پھنسی پھنسی سی محسوس ہوئی۔

''دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے غالب......''

دفعتاً ہی جینی کے لبوں سے غالب کی شاعری کا یہ مصرع ادا ہوا جس نے ڈاکٹر کمال کو صحیح معنوں میں ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

''مسٹر کمال!...... بے شک ہر فساد کے پیچھے ایک بڑی سازش ہی کارفرما ہوتی ہوگی مگر سازش کی ہانڈی بھی بھڑکتی ہوئی آگ کے چولہے پر ہی پکتی ہے۔ تم لوگوں کے پاس بہترین ضابطۂ حیات ہے ایک اللہ، ایک رسولؐ اور ایک کتاب...... پھر اس سے آگے تم کیوں آپس میں بحث و مباحثوں میں پڑتے ہو......؟'' جینی نے کہا اور کیمپس کی پارکنگ میں کار روک کر نیچے اتر آئی۔ ڈاکٹر کمال بھی اتر آیا۔ جانے کیوں اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو جینی کی نگاہوں میں چھوٹا محسوس کرنے لگا ہے۔

اسے جینی کی علمی معلومات اور پر مغز مطالعے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جینی بھی اس کی طرح اپنے خشک شعبے سے ہٹ کر کچھ ایسی اضافی نالج بھی رکھتی تھی، جس سے انسانی دماغ اور دل کشادگی اور وسیع النظری محسوس کرتا ہے اور روح کی تسکین کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، پی ایچ ڈی کے طالب علم جن کے مطالعے میں دنیا جہاں کی معلومات اور غیر نصابی اسٹڈی کا موجود ہونا کچھ ایسی اچنبھے کی بات نہیں ہوتی۔

پھر جب دونوں ہاسٹل بلاک کے قریب پہنچ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے سے پہلے ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے تو ڈاکٹر کمال نے مسکرا کر کہا۔ ''جینی! آج مجھے صحیح معنوں میں تمہاری دوستی پر فخر اور خوشی ہے لیکن میرے کہنے کا مقصد اب بھی وہی ہے کہ تم نے انسانیت کے ناتے ہی سے ہمارے مسلم فلسطینی بھائیوں کے حق میں ہمارے ساتھ مل کر آواز بلند کی۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے مگر تم نے کیا۔''

جینی کے نرم گلابی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور وہ ''اٹس او کے'' کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

جینیفر سنو یز...... مقامی ہونے کے باوجود ہاسٹل میں ہی رہنا زیادہ پسند کرتی تھی، اس کے مطابق گھر کے مقابلے

میں یونیورسٹی کیمپس میں پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم پر اچھی توجہ دی جاسکتی تھی۔

کچھ دن گزرے تھے کہ یونیورسٹی کی آرٹ اینڈ ہسٹری کی فیکلٹی میں ایک اسکالر کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ایک برطانوی نژاد لمبا تڑنگا کالا یہودی ڈی کارلو تھا۔ انتہائی متعصب ذہنیت کا مالک ڈی کارلو ایک شرپسند یہودی تھا۔ اس نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے مسلمان طلبا کا جینا حرام کر دیا۔ آئے روز وہ یونیورسٹی، سینٹرل کینٹین، ہاسٹل غرضیکہ جہاں اور جدھر اسے موقع ملتا وہ مسلمان طلبا کو تضحیک کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے کچھ ہم خیال گوروں کا بھی ٹولہ بنا رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کمال کا ہم عمر ہی تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ فرنٹو کارلو...... برٹش پارلیمنٹ کا رکن اور اقلیتی امور کا وزیر بھی رہ چکا تھا اور برطانیہ کی مقتدرہ شخصیت میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے اثر و رسوخ کا حامل تھا۔

متعصب ڈی کارلو...... سے امن پسند مسلم طلبا کنی کترانے کی کوشش کرتے، وہ جانتے تھے کہ اس کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ وہ اس کی ہرزہ سرائی کی شکایت کرنے کی ہمت کرتے تھے، ڈی کارلو دانستہ جدھر مسلم طلبا کی ٹولی کو دیکھتا اپنے ٹولے کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور مسلمان اور اسلام کے خلاف خرافات بکنا شروع کر دیتا۔

ایک دن اس کی مڈبھیڑ ڈاکٹر کمال سے ہو گئی۔ دونوں ہم عمر اور یکساں قد و قامت کے تھے...... ڈاکٹر کمال کے بارے میں ڈی کارلو نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا اور بڑی شدومد کے ساتھ اسے اس کی تلاش تھی مگر چونکہ ڈاکٹر کمال فاضل اوقات میں ادھر ادھر بیٹھنے کے بجائے سیدھا لائبریری کا رخ کرتا اور اضافی وقت وہیں گزارتا تھا۔ جینی بھی کبھی کبھار اس کے ہمراہ ہوتی، تو چائے وغیرہ کی غرض سے...... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے سینٹرل کینٹین میں آجاتے۔ ڈی کارلو کے ایک ساتھی نے اسے ٹہوکا دے کر...... سامنے اشارہ کرتے ہوئے قدرے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا...... ڈاکٹر کمال جن کے ساتھ بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھا، درمیان میں دو میزوں کا فاصلہ تھا۔ ڈی کارلو نے سنسناتی نظروں سے گردن ذرا گھما کر ڈاکٹر کمال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پہ نفرت انگیز تاثرات امڈ آئے۔ چندی چندی آنکھوں میں شر پھوٹنے لگا۔ وہ یکدم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دانت بھینچتا ہوا سیدھا ڈاکٹر کمال اور جینی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جینی اسے پہچانتی تھی کمال نے بھی اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔

''کیا تم ہی وہ بڑبولے اور تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کمال ہو جو آئے روز ہائیڈ پارک پہ جا کر اسرائیلیوں کے خلاف کیچڑ اچھالتے ہو؟...... یہ خیال کیے بغیر کہ جس ملک (برطانیہ) نے اپنی اعلیٰ تعلیمی درس گاہ میں تم جیسے پھٹیچر پاکستانی کو ایڈمیشن دیا اور لندن جیسے جدید شہر میں تمہیں رہنے کا موقع دیا جس کے تم لوگ صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہو۔ وہاں آکر...... تم اس طرح کا انتشار پھیلاتے ہو اور امن کی فضا کو خراب کرتے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

متعصب اور لمبے تڑنگے کالے یہودی کی آواز کسی افریقی بیل کی طرح سینٹرل کینٹین میں گونج رہی تھی اور وہاں موجود بھانت بھانت کے ممالک سے آئے ہوئے طلبا یکدم خاموشی سے ان کی طرف تکنے میں محو ہو گئے۔ ان میں مسلم بھی تھے اور مقامی گورے بھی...... مکار یہودی کارلو نے ان گوروں کو بھی خوش کرنے اور اکسانے کے لیے...... برطانیہ (لندن) کی بھی تعریف کر ڈالی تھی۔ کئی ایک کے چہروں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے شرارت آمیز شوق بھی مترشح تھا۔ جینی پریشان نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال نے بہ ظاہر بڑے تحمل سے یہ سب سنا پھر اپنی شفاف عدسے کی عینک درست کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی بھی یہی سوچ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ شاید کمال اس کے منہ لگے بغیر وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

ڈی کارلو اور اس کے ساتھی ٹولے کا ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال بھی دیگر مسلم طلبا کی طرح ڈی کارلو کی ہرزہ سرائی کا جواب دیے بغیر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ یہ ان بے چارے امن پسند اور ذہین اسکالرز مسلم طلبا کی مجبوری تھی کہ وہ اس طرح کے شر اور گفتگو سے بچنے ہی کی کوشش کرتے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے کینٹین کے ہال میں سرگوشیوں کی سرسراہٹیں بلند ہونے لگیں اور پھر اس وقت سب کو یکدم سانپ سونگھ گیا جب انہوں نے ہال میں ڈاکٹر کمال کی پرجوش آواز گونجتی سنی۔

''تم مجھے تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کہہ کر یہاں کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر کمال نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے ڈی کارلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ہلکے گرے کلر کے کوٹ پینٹ میں ملبوس تھا جبکہ ڈی کارلو نے ٹائٹ پتلون پر صرف شرٹ چڑھا رکھی تھی اور کہیں سے بھی مہذب طالب علم نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آگے بولا۔ ''تمہاری اس ہرزہ سرائی

کا جواب میرے پاس بالکل سادہ سا ہے کہ دوسرے پر اس طرح کی تمہاری لغو الزام تراشی درحقیقت تمہارے خود کے متعصب ہونے پر دلیل کرتی ہے اور ہاں تمہارے اس طرح کے اشتعال انگیز کرتوتوں سے کون واقف نہیں ہے کہ تم خود اس معزز اور مہذب تعلیمی ادارے کا امن پامال کرنے کی نیت سے آئے روز امن پسند مسلم طلبا کو تضحیک کا نشانہ بناتے رہتے ہو...... مگر وہ اس ادارے کے تعلیمی تقدس کو پامال نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی تمہارے جیسے کے ساتھ منہ لگتے ہیں، اب رہی بات ایک بڑبولے کی...... جو ہائیڈ پارک میں...... اسرائیلیوں کے خلاف کیچڑ اچھالتا ہے تو اس بڑبولے کے منہ سے تم بھی سن لو...... یہ کیچڑ...... بلکہ کالک...... اسرائیل نے خود اپنے منہ پر ملی ہے۔ خود کو دنیا کی عظیم قوم ثابت کرنے کے جنون نے تم غاصب یہودیوں نے اپنے ہی کرتوتوں سے خود کو دنیا کی نظروں میں ملعون اور پست ذہنیت قوم ثابت کردیا ہے۔ فلسطین کے نہتے، بے گناہ اور مظلوم انسانوں پر اس طرح کی ننگی جارحیت کہاں کا انصاف ہے۔ آبادیوں والے علاقوں میں بمبار طیاروں سے وحشیانہ گولہ باری کرنا کدھر کا دستور ہے؟ مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنا کہاں کا شیوا ہے؟ رہی بات لندن میں آکر ہم پاکستانی مسلمان طلبا کا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا...... تو...... یہ صرف برٹش حکومت کی خارجہ پالیسی ہی نہیں ہے...... دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی سب کچھ ہے...... اس طرح یہ ممالک...... درحقیقت اپنا ایک خلا پُر کرتے ہیں، بہترین دماغوں کا خلا...... اعلیٰ تعلیم یافتہ اور Skill Persons اور ذہین لوگوں کا خلا...... کیونکہ ان افراد کی شرح ترقی یافتہ ممالک میں وہ نہیں ہے جو اب ہونی چاہیے۔ لہٰذا ایسے ترقی یافتہ ممالک ان تیسری دنیا کے ملکوں سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے ہوئے ان لوگوں کو بڑی بڑی آفرز دے کر ہائر کرلیتے ہیں۔ انہیں قابل بنا کر واپس اپنے وطن جانے سے روک لیتے ہیں اور ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے...... مذکورہ ممالک میں اس خلا کی وجہ بڑی ٹھوس ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں ہر عام اور چھوٹے سے چھوٹے شہری کو ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ بیروزگاری الاؤنس سے لے کر کسی کو معمولی کھانسی بھی ہوجائے تو ایمبولینس اسے لینے رات کے دو بجے بھی گھر آجاتی ہے۔ ان کا معمولی سے معمولی دردِ سر بھی حکومت نے اپنے ذمے لیا ہوتا ہے جبکہ تیسری دنیا کے لوگوں کو یہ سب آسائشیں حاصل نہیں یہ سب کچھ ان بے چاروں کو خود اپنے بل بوتے پر کرنا پڑتا ہے اور یہی بات انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے پر مہمیز کرتی ہے۔ تو بھلا ایک ترقی یافتہ ملک کے نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اسے ویسے ہی گھر بیٹھے ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ اب رہی بات تمہاری ہائیڈ پارک سے متعلق تو ایک معمولی آدمی کو بھی اپنا جائز موقف پیش کرنے کی یہاں قانونی اجازت ہے اور ہم نے بھی اس قانون کی پاسداری میں ہائیڈ پارک میں پرامن احتجاج کیا...... مگر تم...... مسلم دشمنی کے تعصب میں اندھے ہوکر یہاں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہو...... یہ سب جانتے ہیں۔''

ڈاکٹر کمال نے اپنی بات ختم کی۔ ہاتھ میں پکڑی عینک دوبارہ اپنے چہرے پہ چڑھائی اور دھواں دھواں مسخ چہرے والے ڈی کارلو کو دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ اس وقت ہال میں ڈاکٹر کمال کی اس منہ توڑ جوابی تقریر پہ میزیں بجنا شروع ہوگئیں اور ''وشیم...... وشیم......'' کی آوازیں بھی گونجنے لگیں۔ ڈی کارلو کا سیاہ رو چہرہ احساسِ تذلیل سے مسخ ہوکر رہ گیا۔ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا جبکہ ڈاکٹر کمال میز سے اپنی چند کتابیں سمیٹ کر پروقار چال کے ساتھ سینٹرل کینٹین سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جیتے رہیے ...

اس منہ توڑ جواب کے بعد ڈی کارلو کی طرف سے دوبارہ مسلم طالب علم کے ساتھ بدتمیزی یا ہرزہ سرائی دیکھنے میں نہیں آئی، پوری یونیورسٹی نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ تک بھی ''مذاکرے'' کی بھنک پہنچ گئی تھی، ایک طرح سے وہ بھی خوش تھے کہ ڈی کارلو جیسے ''کالے بیل'' کو نکیل ڈال دی گئی تھی کیونکہ وہ خود تو ڈی کارلو کے باپ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کرسکتے تھے، اور یہ سب بے چارے چند مسلم طلبا کے ساتھ ہی ہو رہا تھا، بھلا نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ لہٰذا انتظامیہ بھی چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھی۔

تاہم مسلم طلبا بالخصوص جینی کا خیال تھا کہ اس طرح کی کراری جوابی کارروائی سے ڈاکٹر کمال نے...... اس متعصب یہودی ڈی کارلو کو اپنا دشمن بنالیا ہے مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی چنداں پروانہ تھی۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا اور لندن بھی قیصر و کسریٰ کے دربار سے کیا کم تھا۔

☆☆☆

اس کرخت آواز پر دونوں کے چہرے فق ہوگئے۔ ام خالدہ بھی بے چاری ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ عابد کا

ذہن اس مشکل اور جان لیوا صورتِ حال پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب اس نے ام خالدہ کو آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کا کہہ دیا اور خود لپک کر دوسرے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اس کے چھجے پر جا ٹکا۔ کھڑکیاں کشادہ تھیں اور منڈیروں پر بھی پاؤں ٹکا کر کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ کھڑکی انہوں نے باہر سے بند کردی۔ وقت گویا ان پر بھاری سل کی طرح مسلط ہوگیا تھا جو گزرے نہیں گزر رہا تھا۔ اندر جانے کیا ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عابد شکیمری اور نائمہ ساتھ ساتھ جڑے اونچے رہائشی اپارٹمنٹس کی عمارت کی بارھویں منزل پر تھے۔ جان پر بنی ہوئی تھی، یہ حصہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا اور دور ساحلِ سمندر کا منظر تھا۔ کافی دیر بعد کھڑکی کھلی کسی ممکنہ اور متوقع خطرے کے پیش نظر دونوں کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے، پھر وہاں ام خالدہ کا چہرہ طلوع ہوتے دیکھ کر دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ام خالدہ انہیں وہاں ٹکا دیکھ کر ایک لمحے کو تو متحیر سی ہوگئی، پھر بولی۔ ''اندر آجاؤ...... وہ چلے گئے ہیں۔''

دونوں آہستہ آہستہ کھسک کر کھڑکی کے قریب آئے، پہلے عابد نے نائمہ کو کھڑکی کے اندر داخل کیا پھر خود نہایت احتیاط کے ساتھ اندر در آیا۔

''انہیں کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوا؟'' اندر کمرے میں آکر عابد نے سوالیہ نگاہوں سے ام خالدہ کی طرف دیکھا۔ ''دروازہ دیر سے کھولنے پر وہ اسرائیلی کتے برہم ضرور ہوئے تھے۔'' وہ جواباً بولی۔ ''مگر میں نے بہانہ کر دیا کہ میں باتھ روم میں تھی اور بچوں کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔''

''ہوں......'' عابد نے پُرسوچ ہنکاری بھری۔

''میرا خیال ہے، خطرہ ٹل گیا۔'' نائمہ نے کہا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' ام خالدہ بولی۔ ''تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ باہر نکل کر جائزہ لے کر آؤں گی۔'' پھر تھوڑی دیر بعد خالدہ دوبارہ عبایا پہن کر باہر نکل گئی۔

نائمہ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار منجمد تھے، جسے محسوس کرتے ہوئے عابد نے تشفی آمیز لہجے میں اس سے کہا۔ ''پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ سے دعا کرو۔ ہم ان شاء اللہ بخیر و عافیت جدہ سے نکل جائیں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' نائمہ نے زیرِ لب کہا۔

خالدہ نے آکر انہیں مژدہ جانفزا سنایا کہ اسرائیلی فوجی جاچکے ہیں۔ دونوں نے بے اختیار طمانیت کی سانس لی۔ اس کے دو گھنٹے بعد طلحہٰ بھی آگیا۔ اس نے بھی ایک خوش



خبری انہیں سنائی کہ اس نے انہیں قبرص روانہ کرنے کا ایک خفیہ بندوبست کرلیا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج رات ایک بجے کارگوشپ سائپرس (قبرص) کی طرف روانہ ہوگا اور دونوں کو الگ الگ اس کے عملے کے طور پر اس میں سوار کرانا پڑے گا۔ جہاز کا کپتان عرب لبنانی تھا نام اس کا موسیٰ زہروی تھا۔ طلحہٰ نے اسے پہلے ہی عابد شکیمری اور نائمہ کی پچویشن سے متعلق آگاہی دے دی تھی۔ مسافر بردار جہاز سے زیادہ کارگوشپ میں عملے کے لوگوں کے بھیس میں ان دونوں کا جدہ کی بندرگاہ سے روانہ ہونا زیادہ مناسب اور محفوظ تھا۔

عابد کا اس روز بہت جی چاہا کہ وہ ایک بار اپنے ماں باپ اور بہن سے فون پر بات کرکے انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کردے۔ مگر طلحہٰ نے ایسا کرنے سے منع کردیا تھا۔ اس میں خطرہ تھا۔ اسرائیلی انٹیلی جنس ان کی کال ٹریس بھی کرسکتی تھی اور راہِ فرار کا سارا منصوبہ فیل بھی ہوسکتا تھا۔ بہرطور طلحہٰ نے اور کچھ ٹی وی پر چلنے والی نیوز سے یہ بھی پتا چلا کہ اس وقت اسرائیلی انٹیلی جنس اور خفیہ پولیس وغیرہ حریت پسندوں کی تازہ کارروائیوں کے باعث اسرائیلی مشنری اس میں بری طرح الجھی ہوگی۔ تیونس آپریشن اور پی فرنٹ کے صادق الخیری کی اسرائیلی انٹیلی جنس کے خونی دستے کے ہاتھوں شہادت کے بعد ''المجاہد'' اور PLSO نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور ان مٹھی بھر بہادر فلسطینی کفن بہ دوش مجاہدوں نے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کو گھنگی کا ناچ نچا رکھا تھا۔

بہرحال طلحہٰ کا منصوبہ بے داغ تھا۔ ایک بار پھر ان لوگوں نے منصوبے کی جزئیات پر غور کیا اور بالآخر طے یہ پایا کہ عابد تو ایک ٹیکسی کے ذریعے سب سے پہلے مذکورہ جہاز راں کمپنی کے آفس پہنچنے کی کوشش کرے گا اور وہاں سے عملے کو بندرگاہ پہنچانے والی کوسٹر میں...... وہاں پہنچے گا جبکہ نائمہ کو طلحہٰ ایک ٹیکسی کے ذریعے عین اس وقت کمپنی کے دفتر

پہنچائے گا جس وقت کوسٹر مذکورہ کارگو شپ کے عملے کو لے کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو رہی ہوگی۔

رات ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان عابد شنگھری ایک شیئرڈ ٹیکسی میں سوار ہو کے کمپنی کے دفتر روانہ ہو گیا۔ طلحہٰ نے اپنی آج کی دوڑ میں عابد اور نائمہ کی بھیس بدلی ہوئی تصویروں کے ایمپلائی کارڈز بھی تیار کروا لیے تھے...... عابد خلاصیوں (ملاح) کے شعبے سے متعلق تھا جبکہ نائمہ ''ڈائننگ کار'' کے شعبے میں تھی۔

مقررہ وقت میں یہ دونوں عملے کی کوسٹر میں الگ الگ سیٹوں پہ سوار ہو کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بندرگاہ پہنچنے کے بعد.... متعلقہ کمپنی کے آفس روم میں جا کر ان دونوں نے دیگر متعلقہ عملے کے لوگوں کی طرح Muster roll پر اپنے اپنے سائن کیے۔ مخصوص وردیاں چڑھائیں اور کسٹم چیکنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ عابد کی عقابی نظریں تیزی سے گردوپیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ساتھ ہی گاہے بہ گاہے وہ نائمہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ طلحہٰ نے سختی سے اس بات کی تاکید دونوں کو کر رکھی تھی کہ ان کے بشروں سے گھبراہٹ یا ڈر و خوف کا شائبہ تک نہیں جھلکنا چاہیے... ورنہ وہ چیکنگ کرنے والوں کی نظروں میں نہیں تو اسرائیلی انٹیلی جنس کے کسی گماگ ایجنٹ کی نظروں میں کھٹک جائیں گے اور انکوائری ہو جائے گی۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ بہ ظاہر عام لوگوں کی طرح چیکنگ کے مرحلے سے بہ خیروعافیت گزر چکنے کے بعد بھی ان کے شپ میں سوار ہونے تک ان پر خفیہ نظریں رکھیں گے لہٰذا شپ روانہ ہونے تک کسی قسم کی جلد بازی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت تو عابد شنگھری کو بھی معلوم تھی کہ عام حالات میں مسافر بردار شپ کے مقابلے میں کارگو شپ کے عملے کی اتنی سخت چیکنگ نہیں ہوتی مگر اب حالات اور تھے، بندرگاہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس بار کارگو شپ کی بھی سختی سے چیکنگ ہو رہی تھی مگر اس وقت عابد کے اور.... طلحہٰ کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ جن پر اسرائیلی کسٹم یا انٹیلی جنس کو ذرا بھی شبہ ہو رہا تھا وہ ان کے چہروں پر اسونیا اسپرے بھی کر کے جانچ رہے تھے کہ کسی نے اپنا اصل چہرہ ریڈی میڈ میک اپ کے پیچھے چھپا رکھا ہو تو وہ ظاہر ہو جائے۔

اس وقت چیکنگ کے دوران یہی ہو رہا تھا تاہم عابد کو طلحہٰ کی ایک عقل مندی پر اطمینان بھی تھا کہ اس پر یا نائمہ پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا کیونکہ عملے کا ریکارڈ فوٹو سمیت دو گھنٹے پہلے کسٹم کاؤنٹر پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

بہرطور عابد یہاں اتنی سخت چیکنگ دیکھ کر یہ بھی سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی سیکرٹ سروسز کی نظروں میں کس قدر ''اہمیت'' اختیار کر گیا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ وہ نہ صرف ساڑھے سات سو غریب الدیار اور جلاوطن فلسطینیوں کو ان کے وطن میں واپس پہنچانے کا سبب بنا تھا بلکہ اس نے آئندہ بھی اس نیک مقصد کو اپنا مشن بنانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ اسی طرح گا ہے... بگاہے دیگر جلاوطن اور بے گھر فلسطینیوں کو ان کے وطن ضرور واپس لائے گا۔

بہرطور وہ نازک مرحلہ آن پہنچا۔ انہیں قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ نائمہ کا نمبر عابد کے بعد تھا۔ عابد نے اسے آخر میں تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ یعنی نائمہ چیکنگ کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے لیکن بدقسمتی سے عابد دھر لیا جائے تو نائمہ خاموش رہے گی اور قبرص روانہ ہو جائے گی اس پر نائمہ نے مجبوری نگاہوں کے ساتھ عابد کی طرف دیکھتے ہوئے بلا تامل کہا تھا۔

''اور اگر میں پکڑی جاؤں تو پھر...... تم خاموشی سے شپ میں سوار ہو کر سائپرس روانہ ہو جاتا۔''

نائمہ کی اس بات پر عابد بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ تاہم جواباً بولا تھا۔ ''نائمہ!...... یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔''

''تو پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا عابد کہ میں تمہیں خطرے میں چھوڑ کر خود......''

''پلیز! نائمہ...... سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر محبت بھری رسانیت سے بولا۔ ''تمہاری بات اور ہے...... اب بحث کا وقت نہیں رہا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں، دیٹس اٹ......''

چیکنگ ہوتی رہی...... عابد کا نمبر لگا سائنفر مشین میں اس کا مختصر بیگ چیک کیا گیا اور پھر اسے آگے جانے کی اجازت مل گئی، آگے انکلوژر تھا۔ باقی عملہ وہاں سے گزرنے لگا۔ نائمہ کی باری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ عابد اسے دیکھنے کے لیے دروازے کے ایک طرف سائڈ میں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے باقی ماندہ عملے کی چیکنگ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ سو قسم کے اندیشناک وسوسے سر اٹھا رہے تھے، بالآخر عابد کی دھڑکتی نظروں نے نائمہ کو چیکنگ کاؤنٹر پر آتے دیکھا۔

(جاری ہے)

جدا انتظام

طاہر جاوید مغل

دل کا سارا نظام اللہ نے جانے کیوں پردے میں رکھا ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا احساسات کا معاملہ... اس کا دل بھی بہت اچھا تھا لیکن سرخ آنکھوں میں ایک دکھ کا احساس جھلکتا تھا۔ یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کتنی پردوں میں چھپا ہوا... دل میں درد کی لہریں اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پہرے... عجب تماشا ہے زندگی بھی...

گم شدہ محبت کے ملال میں مبتلا

ایک حسینہ کا ماجرا



میں شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی، اس کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ حساس تھی، ذرا سردی یا گرمی لگی اور بیماری نے آن دبوچا۔ نزلہ زکام اور بخار جیسی وبائی تکلیفیں بھی مجھے بڑی جلدی آ پکڑ لیتی تھیں۔ ایسے دنوں میں اکثر امی چند دن کے لیے مجھے اسکول سے چھٹی کرا لیتی تھیں۔

میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی زیادہ تھی۔ سارے کہتے تھے کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ پیاری ہوں۔ شاید اس وجہ

سے سب مجھ پر توجہ اور دھیان بھی دیتے تھے جس کی وجہ سے میں اکثر بیمار ہو جاتی تھی۔ ادھر کسی کو چھینک آئی ادھر میں نے بھی چھینکنا شروع کر دیا۔ موسمی بخار کے دن آئے تو سب سے پہلے میرے منہ میں تھرمامیٹر آیا۔ آشوب چشم شروع ہوا تو سب سے پہلے میری آنکھوں میں لالی اتری۔ بڑی چاچی میرے لیے پنجابی کا ایک محاورہ استعمال کرتی تھیں...... جس کے معنی کچھ یوں تھے...... جس گڑ کی بہت ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً ڈھیلا اور خراب ہی ملتا ہے۔

میرے ابو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ میرے دو چچا بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لاہور کی ایک جانب کشادہ رہائشی آبادی میں یہ دو منزلہ مکان تھا۔ یہ تیس چالیس سال پہلے ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ دادا تو اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، دادی حیات تھیں اور ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑے چچا کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے ماشاءاللہ تین بچے تھے۔ چھوٹے چچا جو بڑے چچا سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے، حال ہی میں شادی شدہ ہوئے تھے۔ چھوٹی چچی کا نام سارہ تھا۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر رہی تھیں۔ کافی اسمارٹ اور دلکش تھیں۔ مجھے ان کے لمبے گھنے بال سب سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی۔

چھوٹی چچی سارہ بڑے اچھے طور اطوار کی مالک تھیں۔ ہر ایک کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رکھتی تھیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا لیکن چھوٹی چچی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے اسے ''چھوٹا'' کہا ہے لیکن میرے لیے شاید یہ چھوٹا نہیں تھا۔ چھوٹی چچی کو اکثر الرجی رہتی تھی۔ ناک سرخ رہتی، کبھی کبھی آنکھوں سے پانی بھی نکلتا اور وہ ہاتھ میں رومال یا ٹشو پیپر پکڑے نظر آتیں۔ سردی شروع ہوئی تو انہیں کئی دفعہ چھینکیں مارتے بھی دیکھا۔

امی، ابو اور خاص طور سے امی کو وہم کی حد تک میری صحت کی فکر لاحق رہتی تھی۔ امی نے ایک دن بڑی خاموشی سے مجھے کہہ دیا کہ میں چچی سارہ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ ایسے معاملوں میں، میں خود بھی بہت حساس ہو چکی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چچی سارہ سے قدرے دور رہنے لگی۔ خاص طور سے جن دنوں ان کی ناک سرخ نظر آتی یا آنکھیں سوجی سوجی ہوتیں...... یا وہ ویسے ہی پژمردہ دکھائی دے رہی ہوتیں۔ چچی سارہ دادا کے ایک دوست کی پوتی تھیں۔ یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ چچی سارہ کی الرجی کو بھی اسلام آباد کے موسم سے ہی نتھی کیا جاتا تھا۔ وہاں ہوا میں غالباً کسی طرح کا ''پولن'' تھا جو شہر کے اکثر مکینوں کو اس مصیبت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔

جو کچھ بھی تھا لیکن چچی سارہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کسی وقت میں اسکول سے ملنے والا ہوم ورک لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے ہوم ورک کراتیں کہ میں حیران رہ جاتی۔ پھر ان کی دلچسپ باتیں، ان کا پیار بھرا انداز اور ان کے گز بھر لمبے ریشمی بال جو حرکت کرتے ہوئے بار بار ان کے دودھیا چہرے پر آجاتے تھے اور جنہیں وہ اپنی خوب صورت انگلیوں سے پیچھے ہٹاتی تھیں لیکن اس قسم کے موقعے کم ہی آتے تھے۔ خاص طور سے جب امی گھر میں موجود ہوتیں، میں اس طرح کا رسک ہرگز نہیں لیتی تھی۔ امی اور چچی سارہ کے درمیان دیورانی، جیٹھانی کا رشتہ تھا اور اس رشتے میں اکثر شکایتیں اور تلخیاں پیدا ہوتی رہی تھیں۔ تاہم اس معاملے میں بھی چچی سارہ کا جھکاؤ اکثر مفاہمت اور صلح کی طرف ہی ہوتا تھا۔ چچا، چچی کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک ہی تھے۔ دونوں مہینے میں ایک بار لاہور سے اسلام آباد جاتے اور واپسی پر ہم سب بچوں کے لیے ہماری پسندیدہ چپلیں، کھلونے اور کپڑے وغیرہ لاتے۔ مجھے یقین ہے میرے اور چچی کے درمیان خوب جمتی اگر ہمارے درمیان یہ الرجی والا معاملہ نہ آجاتا۔

اب اتنے برسوں کے بعد میں سوچتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ برائے نام مسائل کو بڑے بڑے وسوسوں اور واہموں کا روپ دے دیتے ہیں۔ چچی سارہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو گریز پیدا ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ میں ان سے بچی بچی رہنے لگی۔ دلی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھتی اور نہ ہی ان کے کمرے میں جاتی۔ بچپن کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک دن چچی سارہ نم آنکھوں اور سرخی مائل ناک کے ساتھ کمرے سے نکلیں اور چھت پر چلی گئیں۔ بڑے چچا نے بڑی چچی نبیلہ سے کہا۔ ''لگتا ہے، سارہ کو پھر الرجی کا اٹیک ہوا ہے۔''

بڑی چچی نبیلہ نے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔ ''کوئی الرجی ورجی نہیں ہے، بس ڈرامے کرتی ہے...... کچن سے دور رہنا کس کو اچھا نہیں لگتا۔''

اس بارے میں بڑے چچا اور بڑی چچی میں کچھ اور

باتیں بھی ہوئی ہوں گی لیکن میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ بس چچی نبیلہ کا ایک اڑتا اڑتا سا طنزیہ جملہ میری سماعت سے ضرور ٹکرایا۔ ''یہ الرجی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔''

یقیناً یہ جملہ چچی سارہ کے لیے ہی تھا، میں کئی دن تک الجھن میں مبتلا رہی، پھر یہ بات خود بخود ذہن سے نکل گئی۔

ایک دن چچی سارہ اچھے موڈ میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ بھی نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتویں کلاس کے پیپرز تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چچی چھت پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ میں اپنی میتھ کی بک لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے دو چار سوالوں کے حل میں مدد لی پھر انگلش گرامر کے دو تین سوال ان سے پوچھے۔ چچی محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ مجھے پڑھاتی رہیں پھر ایک دم کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔ ''نادو! کیا بات ہے۔ تم دور دور رہتی ہو مجھ سے۔ پچھلے ہفتے میرے سر میں اتنا درد رہا، تم نے حال تک نہیں پوچھا؟''

میں کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی لیکن پھر پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے چچی کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چچی جی بتاؤں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

''وعدہ...... بالکل نہیں مانوں گی۔'' انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ کو پتا ہی ہے، مجھے بڑی جلدی نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ امی میرے لیے ہر وقت ڈری ہوئی رہتی ہیں۔ آپ کو اکثر الرجی رہتی ہے۔ اس لیے میں ذرا دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یقین کریں امی کے بعد پورے گھر میں مجھے سب سے زیادہ آپ اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھی رہوں، آپ سے باتیں کرتی رہوں۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور میرے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔ ''تو پھر بیٹھی رہا کرو، باتیں کرتی رہا کرو۔ تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ میری الرجی تمہیں نہیں لگے گی۔ بیماری کے جراثیموں سے پیار کے جراثیم زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے جراثیموں کو مار دیتے ہیں۔''

میں مسکرا دی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ شفقت سے میرا ماتھا چوما اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے الرجی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

اسی دوران میں امی اوپر آگئی تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ چھوٹی چچی نے مجھے گلے سے لگا رکھا ہے۔ ان کے

کترنیں

☆ روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے لیکن اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔

☆ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔

☆ دل کو توڑنے کے لیے ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔

☆ محبت میں گزارنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا دوست کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا بہت دیر بعد سیکھتے ہیں۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔

☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو در گزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ برا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی تپش کو بھی روک لیتا ہے۔

☆ خالی پیٹ، خالی جیب اور جھوٹا دوست انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو بڑے سے بڑا استاد بھی نہیں سکھا سکتا۔

☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریزوی
اورنگی ٹاؤن، کراچی

چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ بکھر گیا۔ پہلے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ ”دو چار دن ہو گئے ہیں نا ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے۔ اب پھر بیمار ہو کر بیٹھ جانا۔ اوپر سے امتحان سر پر ہیں۔ فیل بھی ہو جاؤ گی انشاءاللہ۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی نیچے اتر گئیں۔ چچی کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی امی اور چچی کی لڑائی کے خیال سے سہم گئی اور جلدی سے کتابیں سمیٹ کر نیچے اتر آئی۔

اس واقعے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا مزید کم ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابو اور دونوں چچاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ایک ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چچا نے لاہور ہی میں ایک علیحدہ گھر لے لیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی یا پھر فیملی کے کسی فنکشن میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی مجھ پر پڑھائی کا بوجھ بتدریج بڑھ گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان قریب آتے جا رہے تھے اور ابو دن رات مجھے محنت کرا رہے تھے۔ ابو نہ ہوتے تو بڑے بھائی جان مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور میں رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی۔ گھر والے مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنوں اور اگر بن جاؤں تو پھر الرجی و دمہ وغیرہ کی فیلڈ میں اسپیشلائزیشن کروں لیکن انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ بس تین چار نمبروں کے فرق سے مجھے پری میڈیکل میں داخلہ نہ مل سکا۔ دوسرا آپشن بی بی اے کا تھا۔ مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں اسکالرشپ پر داخلہ مل گیا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اسٹڈی شروع کر دی۔ میرا ہر نتیجہ بہترین رہا۔ کلاس میں اول پوزیشن جیسے میرے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی کالج میں میرا ایک فرسٹ کزن یاسر بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ ”بی بی اے“ کے ففتھ سمسٹر میں تھا۔ ہم دونوں خالہ زاد تھے۔ میں نوعمری ہی میں یاسر سے وابستگی محسوس کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کے بعد یاسر سے زیادہ ملنا جلنا ہوا تو یہ وابستگی، انسیت اور پھر لگاؤ میں بدلنا شروع ہو گئی۔ یاسر پیار سے مجھے ”ٹچ می ناٹ“ چھیڑتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ”تم چھوئی موئی کا پھول ہو۔ یہ پھول تازگی چھیننے والی ہر چیز کا اثر فوراً قبول کر لیتا ہے۔“

میں مسکرا کر کہتی۔ ”تو تم تازگی چھیننے والی چیز نہ بننا۔“

”دل پر کسی کا بس تو نہیں ہوتا۔ کیا پتا، جو وعدہ میں آج کروں، کل اس پر قائم نہ رہ سکوں۔“

ایسی باتیں ہم ہنسی مذاق میں کیا کرتے تھے۔ میں اب اتنی نازک مزاج بھی نہیں رہی تھی جتنی بچپن میں تھی۔ نزلہ زکام بھی اب کافی وقفے کے بعد اثر انداز ہوتا تھا بلکہ اس حوالے سے میں تقریباً نارمل ہی ہو چکی تھی۔ عمومی صحت بھی اب پہلے سے کافی اچھی رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم دونوں کا تعلق ”محبت“ میں بدل گیا۔ امی کی اجازت سے میں کبھی کبھار یاسر کی بائیک پر بھی کالج سے واپس آ جاتی۔ یاسر کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت خیال رکھنے والا اور ہمدرد انسان تھا۔ امی، میری اور اس کی انسیت سے آگاہ ہو چکی تھیں اور شاید ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار بھی تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یاسر پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ یاسر کے والد فوت ہو چکے تھے اور یہ لوگ ابھی تک اندرونِ شہر سات آٹھ مرلے کے گھر میں رہتے تھے۔ یاسر سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی ابھی شادیاں ہونا باقی تھیں۔ یاسر اور اس کے گھر والوں کی گزر بسر تین دکانوں کے کرایے وغیرہ سے ہو رہی تھی۔ میرے ابو اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھے لیکن اتنی لچک انہوں نے اپنے اندر ضرور رکھی تھی کہ اگر یاسر کو اچھی جاب مل گئی اور اس نے اپنی مالی حالت بہتر کر لی تو وہ اس بارے میں غور کریں گے۔

انہی دنوں کی بات ہے ایک روز میں کالج سے گھر لوٹی تو مجھے ایک روح فرسا خبر ملی۔ یہ خبر ایک ایسی محبوب ہستی کے بارے میں تھی جس کو میں نے کچھ عرصے سے تقریباً فراموش کر رکھا تھا۔ مجھے گھر والوں کی زبانی پتا چلا کہ چچی سارہ اپنے گھر کے پاس ہی ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہو گئی ہیں اور انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اس اسپتال میں پہنچے۔ وہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں تھیں۔ ان کے سر پر اور ریڑھ کی ہڈی میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ امید سے بھی تھیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ گھر کی قریبی مارکیٹ سے سبزی لینے کے لیے پیدل ہی نکلی تھیں۔ ایک بغلی سڑک سے آنے والی تیز رفتار اسکول وین نے انہیں ٹکر ماری اور وہ دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئیں۔

وہ بڑی دلخراش شام تھی۔ سورج کے ساتھ ہی چچی سارہ کی زندگی کا سورج بھی ڈوب گیا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے زندہ نہیں نکل پائیں۔ دو معصوم بچوں اور غمزدہ خاوند کو چھوڑ کر وہ قبرستان کی گہری تاریکیوں میں جا لیٹیں۔

ان کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سے کتنا پیار کرتی تھی۔ میں کئی دن سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ میرے اندر جیسے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوستی بھی تھی کہ ایک عرصے تک ایک بے نام خوف کی وجہ سے میں کیوں ان سے دور دور رہی۔ پھر کبھی کبھی ایک بھولا بسرا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا۔ یہ فقرہ ایک مرتبہ بڑی چچی نبیلہ نے ایک زہریلی سرگوشی کی صورت میں بڑے چچا سے کہا تھا۔ وہ بولی تھیں۔ ”اسے الرجی ورجی نہیں ہے۔ بس ڈرامے کرتی ہے۔“ پھر شاید بڑی چچی نے یہ بھی کہا تھا۔ ”الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے اسے.....“

الرجی سے زیادہ خطرناک؟ کیا چچی سارہ کسی اور خطرناک بیماری میں بھی مبتلا تھیں؟ کوئی ایسی تکلیف جسے ان کے میکے والوں نے چھپایا تھا اور پھر وہ بھی چھپاتی رہی تھیں۔ وہ کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہ سوال میرے لیے ایک پہیلی بن کر رہ گیا تھا۔

چچی سارہ کی موت کے غم نے کم و بیش تین ماہ تک مجھے گھیرے رکھا۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بڑے بڑے سنگین صدمے دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ گردشِ روز و شب...... ہمہ وقت رستے زخموں کو خشک کرنے لگتی ہے۔ میں بھی پڑھائی کی مصروفیت میں اس قدر گم ہوئی کہ باقی سب کچھ بھول گئی۔ ایف ایس سی میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پھر بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یاسر کے ساتھ بھی تعلقات معمول پر تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور جب نہیں ملتے تھے، تب بھی ایک دوسرے کے خیالوں میں گم رہتے تھے۔ سردیوں کی طویل راتیں، گرمیوں کی حسین شامیں، ساون کی خوب صورت جھڑیاں اور بہار کی چمکیلی خوشبودار صبحیں، ہماری محبت کی گواہ تھیں مگر پانچواں موسم غم کا بھی تو ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ یہ موسم خزاں میں ہی آئے۔ یہ موسم کسی بھی موسم میں انسان کو دبوچ سکتا ہے۔ مجھے اور یاسر کو اس موسم نے سردیوں کی نہایت خنک شاموں میں دبوچا۔ یاسر کی والدہ پر فالج کا حملہ ہوا اور ان کا ایک بازو اور ٹانگ بے کار ہو گئی۔ انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا اور علاج پر اندھا دھند روپیا خرچ ہونے لگا۔ یاسر کا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر بھی بیچ میں ہی رہ گیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر ان لوگوں کو اپنی ایک دکان اونے پونے بیچنا پڑی۔ یاسر کی بڑی بہن کی شادی کی تیاری تھی، وہ تیاری بھی درمیان میں ہی اٹک گئی۔ لڑکے والوں کو تاریخ دی جا چکی تھی۔ یاسر نے جیسے تیسے بہن کی ڈولی تو رخصت کر دی لیکن اس کے لیے اسے اپنی دوسری دکان بھی فروخت کرنا

پڑی۔ والدہ کی بیماری نے مسلسل اخراجات کا راستہ کھول رکھا تھا۔ آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک روز گھر میں میرے ابو اور امی کے درمیان تندوتیز باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کی بازگشت میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ مجھے پتا چلا کہ ابو نے امی کو سختی سے کہہ دیا ہے کہ یاسر ہمارے گھر میں زیادہ آمدورفت نہ رکھے۔

میں آنسوؤں کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ حالات مسلسل ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جا رہے تھے۔ انہی دنوں پتا چلا کہ یاسر نے فی الحال اپنی پڑھائی کو مؤخر کر دیا ہے اور اپنی آخری دکان کو اپنے استعمال میں لے آیا ہے۔ اس نے وہاں کمپیوٹر ہارڈ ویئر کی فروخت کا کام کر لیا تھا۔ انہی دنوں میرے ابو اور یاسر کے ایک تایا کے درمیان لین دین کے تنازعے پر تلخ ترش باتیں بھی ہو گئیں۔ اس واقعے کے بعد میرے اور یاسر کے رشتے کی امید تقریباً ختم ہو گئی۔ ابو میرے ہونے والے شوہر کو کسی اچھے سرکاری یا نیم سرکاری عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ یاسر اور اس کے گھر والوں سے خوش نہیں تھے۔

قریباً ایک سال تک یہی دھوپ چھاؤں والی صورت حال چلتی رہی...... پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ جونہی میرا بی اے مکمل ہوا، ابو امی نے میری منگنی غیروں میں کر دی۔ لڑکے کا نام توفیق عمر تھا۔ اچھی ملازمت تنخواہ و مراعات تھیں۔ ترقی کے امکانات بھی روشن تھے۔ ان تمام تر ”روشن امکانات“ کے باوجود میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سینے میں ہر وقت جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرتا رہتا تھا لیکن یہ آبشار دل میں سلگتے ہوئے انگاروں کو ٹھنڈا نہیں کرتا تھا، مزید بھڑکاتا تھا۔ انہونیوں کی امید انسان کے دل میں ہمیشہ رہتی ہے۔ میں بھی اپنے دل میں یہ امید پالتی تھی کہ پانچ چھ ماہ ابھی باقی ہیں۔ ان پانچ چھ ماہ میں ہی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا اور میں اپنی محبت کے اس دردناک انجام سے بچ جاؤں گی...... لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ جذبوں کی موت اور سمجھوتوں میں لپٹی ہوئی ایک نئی زندگی کی شروعات...... توفیق سے میری شادی ہو گئی اور میں دلہن بن کر لاہور سے ملتان چلی گئی۔

زخم اتنی جلدی نہیں بھرتے۔ اس کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے نئے گھر میں اس وقت کا انتظار کرنے لگی۔ میری تین نندیں تھیں، ایک دیور بھی تھا۔ میں خود کو سارا دن ان لوگوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔ توفیق آتے تو زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتی...... اور خود کو توفیق کی گرم جوشی میں گم کرنے کی کوشش کرتی۔ ان کی باہنوں کی حرارت میں اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی لیکن جتنی شدت سے بھول جانا چاہتی، اتنی ہی شدت سے وہ یاد بھی آ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں۔ شادی سے چند روز پہلے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے خداحافظ کہہ دیا تھا لیکن خداحافظ کہہ دینے اور الوداع کر دینے سے تو کوئی دور نہیں چلا جاتا۔ جیسے شہر بستے بستے، بستے ہیں، اسی طرح یادوں کے نگر بھی خالی ہوتے ہوتے خالی ہوتے ہیں۔

برسات کی ایک اداس شام میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اچانک توفیق کی کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں بھونچکی رہ گئی۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی دفتر سے واپس آ گئے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ دو تین دفعہ مجھے روتے ہوئے پکڑ چکے تھے۔ میں نے امی ابو کی یاد کا بہانہ بنایا تھا اور انہوں نے مجھے سختی کے ساتھ، رونے دھونے سے منع کیا تھا۔ آج پھر یہی صورت حال بن رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہیں آیا۔ قریب ہی ایک باسکٹ میں پیاز پڑے تھے۔ چھری بھی تھی۔ میں نے باسکٹ اپنی طرف کھسکائی اور جلدی جلدی پیاز کاٹنے میں مصروف ہو گئی۔ یہ تدبیر کارگر رہی۔ کچھ دیر بعد جب توفیق کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں میرے رونے کا بالکل علم نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہی بولے۔ ”بھئی! پیاز کاٹتے وقت اسے پانی میں بھگوتے جائیں تو جلن کم ہو جاتی ہے۔“

کتنی مشکل صورت حال کا یہ کتنا آسان حل نکلا تھا۔ مجھے کہیں پڑھا ہوا ایک دل گداز مضمون یاد آ گیا۔ مضمون کا عنوان تھا لڑکیاں پیاز کیوں کاٹتی ہیں۔ بہرحال میں نے آنسوؤں اور پیاز کے اس معنی خیز تعلق کو اپنے پلے سے باندھ لیا۔

اگلے تین ماہ میں کم از کم دو دفعہ ایسا ہوا کہ اس پیاز کی وجہ سے ہی میں توفیق کے سامنے اپنے ”اشک بار“ دکھ کو چھپانے میں کامیاب رہی۔ عام طور پر میں توفیق کے آنے سے کافی پہلے ہی اپنے آپ کو سنبھال لیتی تھی اور اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں مجھے پہلی دفعہ ”رونے دھونے“ کا اصل مفہوم بھی سمجھ میں آیا تھا۔ رونے کے ساتھ دھونا شاید اسی لیے لازم و ملزوم ٹھہرتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کو کچھ قرار آتا جا رہا تھا...... یادیں تو اپنی جگہ موجود تھیں لیکن شاید اب بتدریج وہ گہرائی میں جا رہی تھیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور آگے بڑھنے کے لیے تلخ یادوں کا گہرائی میں جانا ضروری ہوتا ہے۔ شاید اسی طرح قدرت حیات کے سرچشموں کے لیے نئے راستے پیدا کرتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق یاسر نے بھی اب خود کو آہستہ آہستہ سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ ایک روز ایک بار پھر میں بری طرح پھنس گئی۔ اس روز لاہور سے بڑے بھائی جان کا فون آیا تھا۔ ان کی زبانی پتا چلا تھا کہ یاسر کی شادی ہو گئی ہے۔ اپنی معاشی مجبوریوں کے سبب وہ خاندان کے ہی ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے شادی پر رضامند ہو گیا تھا۔ لڑکی شکل و صورت کے لحاظ سے ہرگز اس کی ہم پلہ نہیں تھی۔ عمر میں بھی شاید ایک آدھ سال اس سے بڑی ہی تھی۔ اس رشتے کی بات چیت اور تیاری کئی دنوں سے ہو رہی تھی۔ آخر کل سب کچھ انجام پا گیا تھا۔

اس دن میں ایک بار پھر دیر تک روتی رہی اور اس دن ایک بار پھر غیر متوقع طور پر توفیق گھر آ گئے تھے۔ کسی اسٹرائیک کی وجہ سے وہ آفس جا ہی نہیں سکے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس حالت میں ان کے سامنے گئی تو بہت بری طرح ڈانٹ کھاؤں گی بلکہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ خدانخواستہ...... وہ کسی شک میں مبتلا ہو جاتے۔ میں اپنی ورم زدہ آنکھوں کے ساتھ تیزی سے کچن کی طرف بھاگی۔ پیاز اور چھری...... یہ دو چیزیں...... یہ دو غیر اہم چیزیں اس صورت حال میں میرا واحد سہارا تھیں۔ کچن میں پہنچ کر میں چکرا کر رہ گئی۔ یہ ایک سنگین اتفاق تھا کہ مجھے کہیں پیاز نظر نہیں آئی۔ میں نے دیوانوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے، ملازمہ کو آوازیں دیں۔ اسی دوران میں توفیق کامن روم میں آ چکے تھے۔ ”نادو...... نادو۔“ انہوں نے مجھے پکارا۔

میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ میں جیسے، ایک چور تھی اور رنگے ہاتھوں پکڑی جانے والی تھی۔

وہ اب کچن کی طرف ہی آ رہے تھے۔ میں نے ٹشو پیپر پکڑا اور افراتفری میں اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ وہ اندر آ گئے، مجھے غور سے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے نادیہ؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پپ...... پتا نہیں...... الرجی...... شش شاید...... الرجی ہو گئی ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”اوہ۔ ایک تو تم لڑکیوں کو نخرے دکھانے کا شوق ہوتا ہے۔ رات کو کہا بھی تھا کہ سویٹر پہن کر نکلو۔“ انہوں نے کہا اور کمرے کی طرف چلے گئے۔

میرے کانوں میں اپنے ہی الفاظ گونج رہے تھے اور دل و دماغ میں زلزلہ پیدا کر رہے تھے...... الرجی...... شاید الرجی ہو گئی ہے۔

ان چار پانچ الفاظ نے میرے سامنے سے جیسے ایک دبیز پردہ اٹھا دیا۔ مجھے اچانک ہی اپنے ایک دیرینہ سوال کا جواب مل گیا تھا۔

چچی سارہ کو بھی تو الرجی تھی۔ گھر میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں الرجی نہیں ہے۔ بڑی چچی نبیلہ کا وہ فقرہ ابھی تک میری سماعت میں محفوظ تھا۔ ”اسے الرجی ورجی کچھ نہیں، بس ڈرامے کرتی ہے۔“ اور انہوں نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ اسے الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے۔

اب مجھے اس خطرناک بیماری کی سمجھ اچھی طرح آ رہی تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ آپ ہر دفعہ اپنے آنسو...... پیاز کے پیچھے چھپا سکیں یا پھر آنکھوں میں دھواں یا تنکا وغیرہ پڑنے کا بہانہ کر سکیں۔ آپ کو اپنے آنسوؤں کی پردہ داری کا ”مستقل انتظام“ چاہیے ہوتا ہے...... اور کبھی کبھی کسی کے ذہن رسا میں اس طرح کا ”انتظام“ بھی آ جاتا ہے۔ چچی سارہ کے ذہن میں بھی ایسا ہی جدا انتظام آیا تھا۔

اب سب کچھ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اگلے روز دوپہر کے وقت جب توفیق دفتر گئے ہوئے تھے اور باقی گھر والے بھی اپنی اپنی مصروفیات میں گم تھے، میں کمرا بند کر کے دیر تک بیٹھی رہی۔ چچی سارہ کی ایک تصویر میرے سامنے تھی۔ وہ کسی شاعر کی خوب صورت غزل لگتی تھیں۔ پتا نہیں کون شاعر تھا؟ لیکن غزل تو میرے سامنے تھی۔ لمبے بال کندھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ خوب صورت آنکھوں میں کسی خاموش محبت کی جوت تھی...... آہ عورت کی مجبوریاں۔

میں نے محویت کے عالم میں تصویر کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوا اور نمناک لہجے میں کہا۔ ”چچی...... آج میں جان گئی ہوں۔ آپ کو الرجی نہیں تھی...... آپ کو محبت تھی۔ کوئی نہ کوئی یاسر آپ کی زندگی میں بھی آیا تھا۔ کسی کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آپ نے بھی سنہری سپنے دیکھے تھے۔ میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے چچی۔ بند ہونٹوں کے ساتھ صبر کا دامن تھامے رکھنا اور اپنے اندرونی کرب کو چہرے پر نہ آنے دینا مجھے آپ سے ہی تعلیم ہوا ہے۔ میں بھی آپ ہی کے نقش قدم پر چلوں گی۔ اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے ماضی کے سایوں سے حتی الامکان دور رکھوں گی۔ اگر کبھی کبھار دل پر غم کے بادل چھائے بھی تو مجھے رونا نہیں آئے گا...... بس الرجی ہو گی۔“



کہنہ مشق

مرزا امجد بیگ

"م" سے مثبت اور "م" سے منفی... عجب منطق ہے انسان کی ہمیشہ ملال میں مبتلا رہتا ہے اور مانتا نہیں کہ اس نے کچھ غلط بھی کردیا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے عقل مندی کا مظاہرہ کچھ مندی عقل سے کر ڈالا... مثبت رویّہ چھوڑا اور منافقت کا رستہ اختیار کیا پھر نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جو نکلا...لیکن بیگ صاحب کی تدبیروں نے بالآخر مجرم کو گھیرے میں لے ہی لیا۔

جلوں سے جلوں سے اقرارِ جرم کی انوکھی داستان

موسم سرما کی ایک خنک اور اداس شام میں اپنے آفس میں بیٹھا حسبِ معمول کلائنٹس کو ڈیل کررہا تھا کہ ایک پریشان حال عورت اپنا دکھڑا رونے میرے پاس آگئی۔ میں نے سلمٰی نامی اس عورت کو اپنے چیمبر میں بلالیا۔

اس روز میرے آفس میں کلائنٹس کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ایک جاتا تو دوسرا آجاتا تھا۔ وزیٹنگ لابی میں بھی وہ رونق نہیں تھی جو وہاں کا خاصہ تھی۔ نصف درجن سے زیادہ افراد ہمہ وقت اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ اس مندی میں کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ ویسے بھی بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ کلائنٹس کی عدم موجودگی کے باعث اچھی خاصی بوریت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جبھی سلمٰی کو انتظار کی کوفت نہیں اٹھانا پڑی تھی اور فوراً سے پیشتر وہ میرے چیمبر میں پہنچ گئی تھی۔

سلمٰی کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ متناسب بدن کی مالک ایک عام سی شکل وصورت والی عورت تھی۔ اپنے حلیے اور پہناوے سے وہ غریب نظر آتی تھی۔ میرا یہ اندازہ بعدازاں درست ثابت ہوا۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکی تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں......" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔

"وہ تو آپ کی حالت ہی سے نظر آرہا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "آپ اپنی پریشانی کی وضاحت کریں تاکہ میں یہ اندازہ لگاسکوں کہ میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"وحیدہ کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔

"یہ وحیدہ کون ہے؟" میں نے کاغذ قلم سنبھالتے

ہوئے سوال کیا۔ ”اور پولیس نے وحیدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”وحیدہ میری اکلوتی بیٹی کا نام ہے وکیل صاحب۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”پولیس نے اسے بیگ صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔“

”بیگ صاحب کون ہیں...... میرا مطلب ہے، کون تھے؟“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہاری بیٹی وحیدہ سے ان کا کیا تعلق تھا......؟“

”جناب! ہم تو غریب اور مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ ”میں اور میری بیٹی وحیدہ بفرزون کے عقبی حصے میں واقع گوٹھ نما ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں کام کرکے ہم اپنی روزی کماتے ہیں۔ وحیدہ، بیگ صاحب کے گھر میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کا کام کرتی ہے۔“ لحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ”اشتیاق بیگ صاحب کا بنگلا نارتھ ناظم آباد میں واقع ہے......“

”ٹھیک ہے......“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”قتل کی واردات کب پیش آئی ہے؟“

”کل دن میں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

آج جنوری کی اکیس تاریخ تھی گویا یہ گزشتہ روز یعنی بیس جنوری کا واقعہ تھا۔ اس کا ایک واضح مطلب یہ بھی تھا کہ آج صبح پولیس نے ملزمہ کو عدالت میں پیش کرکے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیا ہوگا۔ جب یہی سوال میں نے سلمٰی سے کیا تو اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔ میں نے پوچھا۔

”آپ کی بیٹی وحیدہ کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟“

”کل دن میں تقریباً دو بجے جناب۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم دونوں اپنے گھر میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں کہ پولیس ہمارے دروازے پر پہنچ گئی...... پھر وہ لوگ وحیدہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے......“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

واقعات کی تفصیل میں سلمٰی نے بتایا کہ وہ خود تین گھروں میں اور اس کی بیٹی وحیدہ دو گھروں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ وہ دونوں روزانہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی تھیں اور دوپہر ایک ڈیڑھ بجے تک ان کی واپسی ہوتی تھی۔ بنگلوں والے پیسے اچھے دیتے تھے لہٰذا وہ انہی پانچ بنگلوں تک محدود تھیں اور آدھے دن کی سخت محنت کے بعد باقی کا آدھا دن آرام کرتی تھیں۔ مزاجاً دونوں ماں بیٹیاں سادہ اور قناعت پسند تھیں اس لیے زیادہ کے لالچ میں نہیں آتی تھیں۔ سلمٰی ایک بیوہ عورت تھی۔

وحیدہ کے پاس دو بنگلوں کا کام تھا اور یہ دونوں بنگلے نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں واقع تھے۔ پہلے وہ نو بجے سے گیارہ بجے تک مقتول اشتیاق بیگ کے گھر کا کام نمٹاتی تھی۔ اس کے بعد گیارہ سے ایک بجے دوپہر تک فیاض شیخ کے بنگلے کا کام کرتی تھی۔ یہ دونوں بنگلے قریب قریب تھے وقوعہ کے روز بھی وہ مقتول کے گھر کا کام ختم کرکے بنگلے پر گئی تھی اور پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول اپنے گھر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں سلمٰی بھی گھر پہنچ گئی۔ پھر وہ دن کے کھانے میں مصروف تھیں کہ پولیس نے وہاں آکر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک سلمٰی سے مختلف زاویوں سے سوال کرتا رہا۔ میں نے سلمٰی کے بیان کے مختلف اہم پوائنٹس نوٹ کرنے کے بعد تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے سلمٰی صاحبہ! آپ کل اسی وقت میرے پاس آجائیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ وحیدہ کی رہائی کے سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔“

”کل آؤں......!“ وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ ”آپ آج کچھ نہیں کریں گے......؟“

وہ قانونی اور عدالتی معاملات سے بالکل ناواقف نظر آتی تھی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”سلمٰی جی! ابھی اس لیے کچھ نہیں ہوسکتا کہ آپ کی بیٹی عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے لیے کم ازکم سات روز کا ریمانڈ تو ضرور لیا ہوگا۔ جب وہ لوگ چالان کے ساتھ وحیدہ کو حوالۂ عدالت کریں گے تو اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔ اس دوران میں، میں وحیدہ سے ملاقات کرکے اس واقعے کے حوالے سے معلومات حاصل کرلیتا ہوں......“ لحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لے کر سلمٰی سے پوچھا۔ ”وحیدہ کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟“

اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتادیا۔

میں نے اس کی پریشانی کے پیشِ نظر تسلی اور دلاسے دیے۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر بولی۔ ”کیا میری بچی سات دن تک پولیس والوں کے قبضے ہی میں رہے گی......؟“

”ہاں...... یہ قانونی مجبوری ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جب پولیس کسی ملزم کو عدالت میں پیش کرکے اس کا ریمانڈ حاصل کرلیتی ہے تو پھر وہ تفتیش کی تکمیل تک اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے کی مجاز ہوتی ہے۔“

وہ اپنی بیٹی کے لیے بے حد فکرمند تھی، متذبذب انداز میں مستفسر ہوئی۔ ”وکیل صاحب! میری وحیدہ رہا تو ہوجائے گی نا......؟“

”انشاء اللہ!“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ بے گناہ ہے تو پھر اس کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔“

”یہ تو مجھے پکا یقین ہے کہ وحیدہ نے قتل نہیں کیا۔“ وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ”میری بیٹی کو خوامخواہ اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”عدالت سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی لگائی جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوجاتا ہے۔ میں آج ہی کسی وقت تھانے جاکر وحیدہ سے ملاقات کرلوں گا۔“

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔

اسی رات آفس سے اٹھنے کے بعد میں متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ تھانے میں عدالتی ریمانڈ پر آئے ہوئے بندے سے ملاقات کرنا آسان کام نہیں ہوتا تاہم اس کام کو سہل بنانے کے مجھے ہزاروں گر آتے تھے۔ اس روز وحیدہ سے ملاقات میں مجھے پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔

جب میں حوالات پہنچا تو وحیدہ چپ چاپ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی، مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ بدکنے والے انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ ”وحیدہ! کیسی ہو؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے الجھن آمیز تذبذب دکھائی دیا جیسے خاموش نگاہ سے پوچھ رہی ہو...... میں کون ہوں، اس کا حال احوال کیوں پوچھ رہا ہوں۔

”وحیدہ!“ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ میں ایک وکیل ہوں اور تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے آیا ہوں۔ تمہاری ماں نے میری خدمات حاصل کی ہیں اس لیے......“ میں نے رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا پھر ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ”میں تم سے جو بھی پوچھوں اس کا بالکل سچا اور کھرا جواب دینا۔“

”جی اچھا......!“ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔

وحیدہ کی عمر پچیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور درمیانے قد کاٹھ کی مالک ایک قبول صورت عورت تھی۔ موجودہ حالات نے اس بے چاری، دکھوں کی ماری کو فکرمند کر رکھا تھا۔ میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ ”پولیس والوں نے اقبالِ جرم کروانے کے لیے تمہارے ساتھ زورزبردستی تو نہیں کی......؟“

”کوشش تو ان کی یہی ہے کہ میں بیگ صاحب کو قتل کرنے کا اقرار کرلوں۔“ وہ سادگی سے بولی پھر چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے......؟“

میں اس کے سوال کی تہ میں پہنچ گیا اور زیرِلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے اور میرا مقتول اشتیاق بیگ کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں......“

اس کی آنکھوں اور چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں دھیمے انداز میں وحیدہ سے وقوعہ کے روز پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اسے جہاں تک معلوم تھا وہ مجھے بتادیا۔ میں نے اس سے مقتول اشتیاق بیگ کی فیملی اور دیگر معاملات کے بارے میں بھی سوالات کیے اور اس نے مجھے تسلی بخش جوابات دیے۔ آدھے گھنٹے کی ایک تحقیقاتی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وحیدہ کا اس قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس بے چاری کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں گھسیٹ لیا گیا تھا۔

میں نے اس ملاقات کے اختتام پر وکالت نامے، درخواستِ ضمانت اور دیگر اہم کاغذات پر وحیدہ کے انگوٹھے لگوائے کیونکہ وہ چٹی اَن پڑھ تھی لہٰذا دستخط وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر اس بات کا یقین دلایا کہ میں اپنی کوششوں سے اسے باعزت رہا کروا لوں گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں میں نے اسے پولیس کی تفتیشی مہربانیوں سے بچنے کے لیے چند پتے کی باتیں بھی بتائیں پھر وہاں سے واپس آگیا۔

اگلے روز وحیدہ کی ماں سلمٰی حسبِ وعدہ مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی بیٹی کا کیس لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس نے میری فیس پوچھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔

اس کے چہرے اور آنکھوں میں تذبذب نمودار ہوا، ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”وکیل صاحب! آپ کی فیس بہت زیادہ نہیں ہے......؟“

”بعض لوگوں کو میری فیس بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بہت سے وکیلوں کی تو مجھ سے دگنی تگنی فیسیں ہیں......“

”مجھے دوسرے وکیلوں کا تو پتا نہیں جناب!“ وہ سادگی سے بولی۔ ”میں تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

”آپ یا تو اپنی فیس میں کچھ رعایت کر دیں اور یا......!“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متذبذب انداز میں مجھے تکنے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔ ”اور یا......کیا؟“

”یا یہ کہ......!“ وہ ضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”آدھی فیس ابھی لے لیں، آدھی وحیدہ کی رہائی کے بعد۔“

”میں اس قسم کے معاملات نہیں کیا کرتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”البتہ، فیس میں رعایت والی بات قابلِ عمل ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب! یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“ وہ احسان بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو بھی زیادہ سے زیادہ کم کر سکتے ہیں، وہ کر دیں۔“

میں سال میں ایک آدھ چیریٹی کیس بھی پکڑ لیا کرتا تھا جس میں، میں ایک پیسا بھی نہیں کماتا تھا۔ اس عمل سے میں اپنے پیشے کا صدقہ نکالتا رہتا تھا لیکن یہ سال کا آغاز تھا لہٰذا میں سال کے پہلے ہی مہینے میں اس قسم کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا اور سلمٰی کو بالکل مایوس کر دینا بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا چنانچہ میں نے درمیانی راہ کا انتخاب اور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے کے استعمال سے مجھے کوئی نقصان نہیں تھا البتہ سلمٰی کو اس سے حسبِ منشا فائدہ ضرور پہنچ سکتا تھا۔

”آپ کی خاطر میں اپنی فیس میں پچاس فیصد کمی کر سکتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر میں فیس ایڈوانس ہی میں لوں گا۔ ادھار کی کوئی گنجائش نہیں۔“

وہ قدرے الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ”وکیل صاحب! یہ فیصد، وصد کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ سیدھی سیدھی رعایتی فیس بتائیں......؟“

”پچاس فیصد کا مطلب ہے، آدھی!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو اپنی جو فیس بتائی ہے اس کو آدھا کر سکتا ہوں۔ بس، اس سے زیادہ رعایت ممکن نہیں۔“

”جناب......!“ وہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”آدھی فیس کا مطلب تو اتنی رقم ہے جو میں آپ کو ایڈوانس ادا کر سکتی ہوں۔ جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، آدھی فیس آپ ابھی لے لیں......ہیں نا؟“

”جی ہاں، اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔“ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو جگمگا اٹھے۔ اس نے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

”دعا“ بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ اس کی خرید و فروخت ممکن نہیں۔ اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لیے نہ تو کرایہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر مختلف ٹکٹ چسپاں کرنے کی صورت پیش آتی ہے۔ یہ ایک ”خیر“ کا جذبہ ہے جو ایک انسان، دوسرے انسان کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ دوسروں کی دعائیں لیتے رہنا چاہیے۔ پتا نہیں، کب کس کی دعا آپ کو لگ جائے۔ دعاؤں کی قبولیت کا اختیار جس ذات پاک کے پاس ہے وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور بے شک! وہ ہر شے پر قادر ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو ملزمہ وحیدہ اور مقتول اشتیاق بیگ کے بارے میں مختصراً بتاتا چلوں جس سے کیس کے پس منظر پر بھی روشنی پڑے گی اور آگے چل کر اس کیس کی سماعت کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار بھی نہیں ہوگا۔ ایک بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے یہاں بیان کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بعض باتیں آپ سے چھپا بھی لی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب سنسنی خیز مقامات پر کیا جائے گا تاکہ آپ کی تفریح کے لطف کو دوبالا کیا جا سکے۔

☆☆☆

جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے، ملزمہ وحیدہ اور اس کی ماں سلمٰی کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقے سے تھا۔ وہ لوگوں

کے گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کر کے اپنا گزارہ کرتی تھیں۔ وحیدہ کے باپ عبدالشکور کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایک فیکٹری میں مزدوری...کرتا تھا۔ ان ماں بیٹی کی رہائش بفرزون کے عقبی علاقے میں واقع ایک گوٹھ نما بستی میں تھی۔

سلمٰی کے پاس تین گھروں کا کام تھا جبکہ ملزمہ وحیدہ صرف دو گھروں میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کیا کرتی تھی جن میں ایک گھر تو مقتول اشتیاق بیگ کا تھا اور دوسرا فیاض شیخ کا۔ پہلے وہ مقتول کے گھر کا کام نمٹاتی تھی۔ اس کے بعد فیاض شیخ کے بنگلے کا رخ کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز بھی اس نے اپنا معمول جاری رکھتے ہوئے یہی کیا تھا لیکن جب وہ کام نمٹانے کے بعد اپنے گھر پہنچی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس نے اسے اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

مقتول کی فیملی نہایت ہی مختصر تھی۔ یعنی صرف دو افراد مقتول اشتیاق بیگ اور اس کی بیوی نرگس۔ یہ لوگ ناظم آباد میں واقع دو سو گز کے ایک بنگلے میں رہتے تھے۔ مقتول ایک صنعت کار تھا۔ شہر کے انڈسٹریل ایریا میں اس کی لیدر جیکٹس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جہاں سے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مال جاتا تھا۔ اس کا بزنس بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا کہ اچانک دل نے اس کے ساتھ دھوکا کر دیا۔ ایک رات اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ بیٹھا ہو کر رہ گیا۔ دل کے دورے سے اس کی جان تو بچ گئی تھی مگر ڈاکٹر نے کم از کم چھ ماہ تک بیڈ ریسٹ بتا دیا تھا اور ابھی اس ”بیڈ ریسٹ“ کے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے کسی شقی القلب شخص نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ بے چارہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔

نرگس، مقتول کی دوسری بیوی تھی۔ مقتول کی پہلی بیوی رخسانہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی بیوی......سے مقتول کی ایک اولاد عادل نامی ایک بیٹا تھا جو اپنے ماموں کے پاس رہتا تھا۔ مقتول کی دوسری شادی نے باپ بیٹے کے درمیان خاصی شدید اور سنگین اختلافی فضا قائم کر دی تھی لہٰذا وہ باپ کو چھوڑ کر اپنے ماموں کے گھر میں جا بسا تھا۔ ویسے بھی مقتول کا ساری زندگی اپنی سسرال یعنی عادل کی ننھیال کے ساتھ جھگڑا رہا تھا اور رخسانہ کے انتقال کے بعد تو یہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ عادل کا رجحان شروع ہی سے اپنی ننھیال کی جانب تھا لہٰذا مقتول کی دوسری شادی کے بعد گھر میں کچھ اس قسم کے تنازعات اٹھے کہ عادل اپنا سامان سمیٹ کر ماموں عثمان کے گھر میں آ گیا۔

جب تک وہ مقتول کے گھر میں تھا (مقتول کی دوسری شادی کے بعد) اس کا صبح شام کسی نہ کسی بات پر، اپنی سوتیلی ماں نرگس کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ان اختلافات کے سلسلے میں مقتول اس کے بجائے اپنی بیوی نرگس کا ساتھ دیتا ہے تو اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ رنجش بڑھتی گئی اور بالآخر سال بھر پہلے وہ اپنے ماموں کے پاس آ گیا تھا۔ اس کا ماموں عثمان ٹیکسٹائل انڈسٹری میں انجینئر تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ عثمان کی اپنے بہنوئی مقتول اشتیاق بیگ سے کبھی نہیں بنی تھی۔

مقتول کا بنگلا دو بیڈ روم، ایک ٹی وی لاؤنج، ایک ڈرائنگ روم اور سرسبز لان پر مشتمل تھا۔ یہ ایک ہوادار اور سکون بخش رہائش گاہ تھی۔ ملزمہ وحیدہ روزانہ نو بجے صبح کام کے لیے وہاں پہنچتی اور گیارہ بجے تک وہاں رہتی تھی۔ اس دوران میں مقتول کی بیوی نرگس بھی گھر میں موجود ہوتی تھی۔ اگر اسے کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو وہ انہی اوقات میں نکلا کرتی تھی اور وحیدہ کا کام ختم ہونے سے پہلے واپس آ جایا کرتی تھی کیونکہ اسے اپنے بیمار شوہر مقتول اشتیاق بیگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔

ملزمہ وحیدہ کے مطابق وقوعہ کے روز وہ حسبِ معمول کام کرنے مقتول کے بنگلے پر پہنچی تھی۔ لگ بھگ ساڑھے نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون سیٹ ٹی وی لاؤنج میں ایک اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ نرگس نے فون اٹینڈ کیا اور پھر ملزمہ کے پاس کچن میں چلی آئی۔ وحیدہ اس وقت کچن میں برتن دھو رہی تھی۔

”سنو وحیدہ!“ اس نے ملزمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ تم بیگ صاحب کا خیال رکھنا۔“

”ٹھیک ہے باجی۔“ ملزمہ نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کب تک واپس آ جائیں گی؟“

”تمہاری چھٹی کے ٹائم سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”تمہارے صاحب کی ایک دوا لانا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی گولی لکھی ہے جو بہت کم اسٹورز پر ملتی ہے۔ ابھی ایک میڈیکل اسٹور والے ہی کا فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ابھی وہ ٹیبلیٹس موجود ہیں۔ میں نے سوچا، ابھی لے آؤں۔ کیا پتا، پھر ملیں نہ ملیں۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے صاحب نے ناشتا کرلیا ہے اور میں نے انہیں صبح والی دوا بھی کھلا دی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہے ہیں۔ ان کی دواؤں میں ایک سکون کی گولی بھی ہے۔ وہ تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہیں گے۔ مجھے یقین ہے، میری واپسی تک وہ یونہی بے خبر سوتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے باجی! آپ بے فکر ہوکر جائیں۔" وحیدہ نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "اگر صاحب جی جاگ بھی گئے تو میں سنبھال لوں گی۔"

اس کے بعد نرگس بنگلے سے روانہ ہوگئی تھی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ نرگس، وحیدہ کو گھر میں چھوڑ کر باہر نکلی ہو۔ اکثر و بیشتر وہ ایسا کرتی رہتی تھی لہٰذا وقوعہ کے روز وحیدہ نے نرگس کے باہر جانے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور حسبِ معمول اپنے کام میں جتی رہی۔

وحیدہ کا خیال تھا کہ اس کی باجی نرگس دس بجے تک واپس آجائے گی لیکن جب وقت دس سے آگے بڑھنے لگا اور نرگس کی شکل نظر نہ آئی تو وحیدہ کو تشویش ہونے لگی۔ جوں جوں اس کی چھٹی کا وقت قریب آرہا تھا، اس کی فکرمندی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس نے دو تین بار مقتول کے بیڈروم میں بھی جھانک کر دیکھ لیا۔ مقتول اشتیاق بیگ گہری نیند سو رہا تھا۔

دس کے بعد، سوا دس اور پھر ساڑھے دس بج گئے۔

وحیدہ سوچنے لگی، پتا نہیں باجی کہاں رہ گئی ہیں؟ کون سے میڈیکل اسٹور سے وہ صاحب کی دوا لینے چلی گئی ہیں......؟

وحیدہ مقتول کے گھر کا کام ختم کرنے کے بعد فیاض شیخ کے بنگلے پر جاتی تھی جہاں اسے گیارہ سے ایک بجے تک کام کرنا ہوتا تھا۔ فیاض شیخ کا بنگلا، مقتول کے بنگلے سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اگر اسے وہاں پہنچنے میں کبھی دیر ہوجاتی تو ... شیخ صاحب کی بیوی بہت شور مچاتی تھی۔ وہ ایسی غصہ ور عورت تھی کہ شیخ صاحب بھی عالمِ طیش میں اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وحیدہ، امینہ کے غصے کا سوچ سوچ کر پریشان ہورہی تھی اور دل ہی دل میں یہ دعا بھی کررہی تھی کہ گیارہ سے پہلے پہلے نرگس واپس لوٹ آئے تاکہ اسے امینہ کے غیظ و غضب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مسز امینہ شیخ بڑی دھانسو قسم کی عورت تھی۔

کم و بیش پونے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی تو وحیدہ نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف اس کی باجی نرگس تھی۔

"ہاں وحیدہ!" اس نے پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے نا......؟"

"جی، سب ٹھیک ہے۔" اس نے جلدی سے بتایا۔

"میں نے سارا کام ختم کرلیا ہے اور صاحب جی ابھی تک سو رہے ہیں۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے پوچھ لیا۔ "باجی! آپ کب تک آئیں گی؟"

"بس، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچنے ہی والی ہوں۔" نرگس نے جواب دیا۔ "اور اگر مجھے ایک دو منٹ اوپر نیچے ہوجائیں تو تم چلی جانا......"

"بیگ صاحب کو اکیلے چھوڑ کر......؟" وحیدہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔" نرگس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور تمہارے صاحب تو ویسے بھی آرام سے سو رہے ہیں۔ تم مین گیٹ کو بھیڑ کر اپنے وقت پر چلی جانا۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہوں۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ جب تمہیں دوسرے گھر پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے تو شیخ صاحب کی بیوی تم پر چیخنا چلانا ہے......"

وحیدہ نے نرگس کو مسز شیخ کے غصے کے بہت سے قصے سنا رکھے تھے۔ نرگس نے جب اس کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی تو وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

"جی باجی...... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں گیارہ بجے تک آپ کے آنے کا انتظار کروں گی۔ اس کے بعد باہر کا گیٹ بند کرکے شیخ صاحب کے گھر چلی جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے......!" یہ کہتے ہوئے نرگس نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کردیا۔

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ اس نے احتیاطاً گیارہ پانچ تک نرگس کی واپسی کا انتظار کیا تھا اور پھر باجی کی حسبِ ہدایت بنگلے کے بیرونی گیٹ کو بند کرکے دوسرے بنگلے پر کام کرنے چلی گئی تھی۔ گیٹ کو اس نے باہر سے کنڈی لگادی تھی تاکہ ہوا وغیرہ کے دباؤ کی وجہ سے وہ خود بخود کھل نہ جائے۔

وحیدہ نے وقوعہ کے روز حسبِ معمول شیخ صاحب کے گھر کا کام نمٹایا پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔ اس کی ماں سلمٰی اس سے پہلے گھر پہنچ چکی تھی اور کھانا وغیرہ تیار کررہی تھی۔ وہ دونوں جب دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھیں تو ایک سب انسپکٹر دو کانسٹیبل کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گیا پھر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

وحیدہ نے جب مقتول کے گھر کو چھوڑا تو اشتیاق بیگ زندہ سلامت، گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وحیدہ کو جو کچھ بھی معلوم تھا

اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے بتادیا تھا۔ باقی کی معلومات مجھے خود حاصل کرنا تھیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے اپنے تمام گھوڑے میدان میں ڈال دیے تھے اور مجھے اپنی محنت سے اور خدا کے گھر سے قوی امید تھی کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کردیا۔ میں نے جب تھانے جاکر حوالات میں بند وحیدہ سے ملاقات کی تھی تو اسے بعض ایسے گر بھی بتائے تھے جن کا بروقت استعمال کرکے وہ خود کو پولیس کی معروف تفتیشی "مہربانیوں" سے محفوظ رکھ سکتی تھی اور اس نے عین میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ خاصی عقل مند ثابت ہوئی تھی۔

عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں نے وحیدہ کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور ملزمہ کی درخواست ضمانت دائر کردی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جج اپنی کرسی پر آکر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی مؤکلہ کے حق میں بولنا شروع کیا۔ "جنابِ عالی! ملزمہ وحیدہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی ہے۔ کسی گہری سازش کے تحت اس بے چاری مؤکلہ کی اس واردات کے ساتھ نتھی کیا جارہا ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میری مؤکلہ کی درخواست ضمانت کو منظور کرتے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر کیے جائیں......"

"یور آنر......!" وکیلِ استغاثہ نے ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "ملزمہ ایسی معصوم، بے گناہ اور بے چاری بھی نہیں جیسا میرے فاضل دوست بیان کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔"

"سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے......" میں نے وکیلِ استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسی کے الفاظ دہرائے پھر گزرے لہجے میں پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کس سنگین جرم کی بات کررہے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "آپ کو نہیں پتا، کون سا سنگین جرم......"

"چند لمحات کے لیے فرض کرلیں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں......" میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ بتادیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں ایسی کوئی مہربانی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" وہ رکھائی سے بولا۔ "اور دوسری بات یہ کہ عدالتی معاملات میں "فرض کرنے" سے کام نہیں چلتا۔ جب آپ کو یہی نہیں پتا کہ عدالت میں کس کیس کی سماعت ہورہی ہے تو پھر آپ اپنی مؤکلہ کی وکالت کیسے کریں گے؟"

"آپ میرا کام مجھ پر چھوڑ دیں میرے محترم!" میں سلگانے والے انداز میں کہا۔ "صرف اتنا بتادیں کہ میری مؤکلہ نے کون سے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔"

میرے سوالات نے ابتدا ہی میں وکیلِ استغاثہ کو ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برہمی سے بولا۔ "میں "اشتیاق بیگ مرڈر کیس" کا ذکر کررہا ہوں جس کی اس وقت عدالت میں کارروائی ہورہی ہے۔"

"اوہ......!" میں نے چونکنے کی اداکاری کی پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "تو آپ کا خیال ہے، اشتیاق بیگ کو میری مؤکلہ وحیدہ نے قتل کیا ہے؟"

"تو اور کیا......!" وہ بے ساختہ بولا۔ "اسی لیے تو وہ عدالت میں حاضر ہے۔"

"عدالت میں تو آپ اور میں بھی حاضر ہیں میرے فاضل دوست۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے بھی اشتیاق بیگ کے قتل میں حصہ لیا ہے؟"

"آپ خواہ مخواہ بات کو الجھانے کی کوشش کررہے ہیں!" وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

"بالکل نہیں......!" میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو الجھے ہوئے معاملے کو سیدھا کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

"میرے تعاون کی ضرورت ہے...... کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"آپ نے میری مؤکلہ کے حوالے سے کہا ہے کہ...... اس لڑکی نے جو سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔" میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ "اور ابھی آپ نے اضافہ کیا ہے کہ اسی لیے وہ اشتیاق بیگ کے قاتل کی حیثیت سے اس وقت عدالت میں حاضر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری مؤکلہ کے جرم کے بارے میں بہت پُریقین ہیں؟"

"جی ہاں......" وہ خاصی کراری آواز میں بولا۔ "میں پُریقین ہوں۔"

اس نے میرے بچھائے ہوئے جال میں پہلا قدم

رکھ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کے یقین سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے میری مؤکل کو خود اپنی آنکھوں سے یہ جرم کرتے ہوئے دیکھا ہے......؟''

''ن......نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیسی بات ہے میرے فاضل دوست؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں وہی تو جاننا چاہتا ہوں۔''

''مم...... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ...... میں نے ملزمہ وحیدہ کو یہ قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا اس واقعے کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔''

''کوئی اور عینی شاہد ہے اس واردات کا؟''

''کوئی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

''تو پھر......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو میری مؤکل کے بارے میں زبان کو زحمت دیتے وقت محتاط الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت میں، اس پر عائد جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اس کی حیثیت ایک ملزمہ ایسی ہے لہٰذا یہ کہہ دینا کہ...... وہ ایک مجرم ہے، اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے...... سراسر زیادتی والی بات ہوگی۔''

میری وضاحت نے وکیلِ استغاثہ کو قدرے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ وہ کھسیاہٹ آمیز انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میری مؤکل گھروں میں کام کرنے والی ایک بے چاری لڑکی ہے۔ میں آگے چل کر ثابت کر دوں گا کہ قتل کی اس واردات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں لہٰذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی ضمانت کو منظور کیا جائے۔''

وکیلِ استغاثہ ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ''جناب عالی! واقعاتی شہادتیں سراسر ملزمہ کے خلاف جاتی ہیں۔ خاص طور پر آلۂ قتل پر ملزمہ کے جو فنگر پرنٹس ملے ہیں، انہیں کسی بھی قیمت پر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''

مزید پندرہ بیس منٹ تک وحیدہ کی ضمانت کے حق میں اور ضمانت کے خلاف دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر عدالت نے میری مؤکل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے وحیدہ کو جیوڈیشل ریمانڈ... پر جیل بھیج دیا۔

جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا گیا ہے کہ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ مجھے عدالت کے اس فیصلے پر کوئی اچنبھا ہوا تھا اور نہ ہی مایوسی۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنے حصے کا کام نہایت ہی خوبی سے کر دیا تھا۔ کیس کی باقاعدہ سماعت پر مجھے اپنے جوہر دکھانا تھے۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پولیس کے چالان، یعنی استغاثہ کے بارے میں مختصراً بتاتا چلوں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت بیس جنوری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلۂ قتل ایک تیز دھار گوشت کاٹنے والی چھری تھی جس کی مدد سے مقتول کی شہ رگ کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ خطرناک چھری سے مقتول کی گردن پر اتنا بڑا کٹ لگایا گیا تھا کہ اس کے زندہ بچنے کے امکانات صفر کے برابر ہوکر رہ گئے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی میڈیکل ایگزامن کی رپورٹ بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ بہ وقتِ قتل مقتول کسی خواب آور دوا کے زیرِ اثر تھا اور حالتِ بے ہوشی یا حالتِ نیند میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ مقتول کے معدے میں نشہ آور دوا کے اثرات موجود تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ یہ وہی دوا ہو جو نرگس نے ناشتے کے بعد اپنے شوہر مقتول اشتیاق بیگ کو کھلائی تھی۔

استغاثہ نے میری مؤکل کے خلاف خاصا مضبوط کیس تیار کیا تھا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے علاوہ بھی اس پر مزید دو الزامات ڈالے گئے تھے۔ نمبر ایک دس ہزار نقدی نمبر دو لگ بھگ چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری۔ یہ دونوں چیزیں مقتول کی بیوی نرگس کی الماری سے غائب ہوئی تھیں۔ نرگس کا دعویٰ تھا کہ جب وہ وقوعہ کے روز گھر سے نکلی تو یہ نقدی اور جیولری اس کی الماری میں موجود تھیں لیکن جب دن میں وہ واپس آئی تو اس کی الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور یہ دونوں اشیا اپنی جگہ موجود نہیں تھیں۔ اس نے اپنی الماری کا کونا کونا چھان مارا مگر اسے کہیں بھی نقدی یا زیورات دکھائی نہ دیے۔ الماری کے کھلے ہوئے پٹ دیکھ کر اسے جس گڑبڑ کا احساس ہوا تھا، وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

قصہ مختصر، میری مؤکل وحیدہ کو نقدی و طلائی زیورات چرانے اور اپنے صاحب اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرکے حوالۂ عدالت کر دیا گیا تھا۔





☆☆☆

اس پیشی پر کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہوا تو عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے کارروائی شروع کرتے ہوئے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزمہ نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار بتائی جا چکی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں دیے گئے ملزم کے بیان یعنی اقبالِ جرم کو عدالت میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ پولیس والوں کے تفتیشی ہتھکنڈوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض اوقات ملزم اقرارِ جرم کرلیتا ہے اور عدالت میں جا کر اس سے منحرف ہوجاتا ہے۔ یہ نکتہ چونکہ عدالت کے علم میں بھی ہوتا ہے اسی لیے وہ پولیس کی تحویل میں ملزم کے کسی بھی بیان کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔

اس کے بعد ملزمہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ ملزمہ وحیدہ نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے کل پانچ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیانات میں کوئی خاص بات ہوگی۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی۔ ”جناب عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے فوراً مجھے اجازت دے دی۔ ”پرمیشن گرانٹیڈ......“

تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ کی سی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ موجودہ کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) کا نام صفدر علی تھا۔ رینک کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔ صفدر علی پستہ قامت اور بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے گال پھولے ہوئے تھے، آنکھوں سے شرارت ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی جاگتا تھا کہ وہ بڑے سائز کا کوئی شریر بچہ ہے۔

جج کے حکم پر آئی او صفدر علی وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ میں جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آئی او صاحب...... آپ خاصے صاف ستھرے نظر آرہے ہیں۔“

وہ میرے ریمارکس پر چونک کر مجھے تکنے لگا پھر قدرے ناگوار لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا وکیل صاحب؟“

”مطلب یہ کہ......“ میں نے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا یونیفارم خاصا اجلا نظر آرہا ہے، آپ کا شیو بنا ہوا ہے، بال بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے ہیں اور جوتے بھی چمک رہے ہیں۔ آپ خاصے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی تعریف اور وہ بھی ایک وکیلِ مخالف کی زبان سے سن کر خوش ہوگیا تاہم اپنی خوشی کو دباتے ہوئے اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ نے بجا فرمایا کہ میں ایک خوش ذوق پولیس آفیسر ہوں لیکن ان باتوں کا زیرِ نظر کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں آئی او صاحب!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”بس، میں نے ایسے ہی ذکر کردیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ عموماً صبح و شام جن پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے انہیں اپنے حلیے یا یونیفارم سے کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ کم از کم تھانہ انچارج کے رینک سے نیچے تو اس بات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں جاتا کہ انسان کا لباس اور [illegible] پیشہ ورانہ صلاحیتوں [illegible] نہایت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔“

”بس جناب......“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔“

”کیا خوب صورت بات کی ہے آپ نے......“ میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا، خاموش نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”صفدر صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی......؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ”واقعے سے میری مراد ”اشتیاق بیگ مرڈر کیس“ ہے......!“

”آپ وضاحت نہ بھی کرتے تو میں سمجھ گیا تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس واقعے کی اطلاع مقتول کی بیوی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس نے بیس جنوری کی دوپہر تھانے فون کرکے دی تھی۔“

”دوپہر...... کتنے بجے؟“ میں نے سوال کیا۔

”پولیس کے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع دوپہر بارہ بج کر پینتالیس منٹ پر دی گئی تھی یعنی پونے ایک بجے۔“

”اور آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ایک...... سوا ایک بجے کے درمیان۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری معلومات کے مطابق ملزمہ وحیدہ کو لگ بھگ دو بجے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! میری معلومات غلط تو نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ ملزمہ کی گرفتاری کا وقت وہی ہے جو آپ نے بتایا ہے۔“

”ملزمہ کی گرفتاری یقیناً مقتول کی بیوہ نرگس کی نشاندہی پر کی گئی ہوگی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”نرگس صاحبہ نے میری پوچھ گچھ کے نتیجے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ ملزمہ کو گھر میں چھوڑ کر کسی ضروری کام سے باہر گئی تھی۔ واپسی میں اسے دیر ہوگئی۔ جب وہ گھر آئی تو ملازمہ وحیدہ یعنی ملزمہ گھر میں موجود نہیں تھی اور نرگس کے شوہر کو بڑی...... بے دردی سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور دوسرے کمرے کی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔ مذکورہ الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات بھی غائب تھے۔ نرگس کو شک تھا کہ یہ کارنامہ ملزمہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہوسکتا لہٰذا ہم نے نرگس کے ایما پر ملزمہ کو اس کے گھر سے گرفتار کرکے شاملِ تفتیش کرلیا۔“

”بہت خوب!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی کارکردگی واقعی لاجواب تھی۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ میں اس کی تعریف میں سنجیدہ ہوں یا مذاق کررہا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے بتایا ہے کہ جب نرگس واپس آئی تو ملزمہ وحیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کیا ملزمہ کو اس وقت گھر میں موجود ہونا چاہیے تھا؟“

”جی ہاں......“ وہ اصراری انداز میں بولا۔ ”مقتول کی بیوی نرگس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر دل کا مریض تھا اور اس نے ملزمہ کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہیں آجاتی، وہ گھر میں موجود رہے۔“

”مقتول کی بیوہ نرگس نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز دس پینتالیس پر اپنے گھر فون کرکے ملزمہ سے کیا کہا تھا؟“ میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

”جی ہاں...... سب بتایا تھا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”نرگس نے ٹھیک پونے گیارہ بجے اپنے گھر فون کیا تھا۔ فون ملزمہ نے اٹینڈ کیا تھا۔ نرگس نے ملزمہ کو تاکید کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، ملزمہ گھر سے نہیں جائے گی چاہے اسے دوسرے گھر سے کام کی چھٹی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”لیکن ملزمہ کا بیان اس کے برعکس ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پونے گیارہ بجے جب مقتول کی بیوہ نرگس نے ملزمہ کو فون کیا تو ملزمہ نے پوچھا تھا، باجی! آپ کب تک واپس آئیں گی۔ مجھے گیارہ بجے شیخ صاحب کے گھر کام کرنے جانا ہے؟ اس پر نرگس نے جواب دیا تھا، میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔ تم میری واپسی کا انتظار نہیں کرنا اور گیارہ بجے بیرونی گیٹ بند کرکے شیخ صاحب کے گھر چلی جانا ورنہ تمہارے دیر سے جانے پر شیخ کی بدمزاج بیوی تم پر خوامخواہ چیخے چلّائے گی۔ ان دونوں بیانات میں اتنا زیادہ تضاد ہے کہ......“ میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”کہ...... دونوں میں سے کوئی ایک بیان ہی درست ہوسکتا ہے۔“

”ملزمہ وحیدہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔“ آئی او جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہی فتویٰ میں اس کیس کی مدعی اور مقتول کی بیوہ نرگس کے لیے بھی جاری کرسکتا ہوں۔“

”آپ کا فتویٰ درست نہیں مانا جائے گا وکیل صاحب!“ انکوائری آفیسر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کیونکہ مقتول دل کا مریض تھا۔ نرگس اس کی طرف سے ایسا غیر محتاط اقدام اٹھا ہی نہیں سکتی۔ وہ ملزمہ کو اس وقت تک گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی جب تک وہ خود مقتول کے پاس واپس نہ آجاتی۔ یہ تو ایک سامنے کی حقیقت ہے جو معمولی سی عقل رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔“

آئی او نے آخری جملے میں مجھ پر چوٹ کی تھی۔ میں نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور معتدل انداز میں پوچھا۔ ”آپ کی معلومات کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول کی بیوہ نرگس کتنے بجے گھر واپس آئی تھی؟“

”ساڑھے بارہ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بارہ پینتالیس پر اس نے تھانے فون کرکے،

اپنے شوہر کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔“

میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی گھر پہنچنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد......؟“

”جی ہاں......!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس صاحبہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ ان کی جگہ اگر کوئی اور خاتون ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ سب سے پہلے اردگرد کے لوگوں کو اکٹھا کرتی۔ پولیس کو اطلاع دینے کا خیال تو بہت بعد میں آتا......“

میری مؤکلہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نرگس کی اجازت پر ہی گیارہ بج کر پانچ منٹ پر بنگلے سے نکلی تھی کیونکہ نرگس بنگلے کے قریب ہی کہیں موجود تھی لیکن آئی او سے ہونے والے سوال وجواب سے جو صورت حال سامنے آرہی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا، نرگس کے ذہن میں کچھ اور ہی پک رہا تھا۔ جب وہ گواہی دینے وٹنس باکس میں پہنچتی تو میں اسے اپنے انداز میں گھس سکتا تھا۔ فی الحال تو آئی او سے نمٹنا تھا جو استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہونے کے ساتھ ہی استغاثہ کا وارث بھی تھا۔ میں نے مختصری جرح کے لیے اسے جج سے مانگا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سوال وجواب کا یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی دراز ہوتا چلا جارہا تھا لیکن چونکہ میری کرید کے نتیجے میں نئے نئے انکشافات ہورہے تھے لہٰذا جج بڑی توجہ اور دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسی دوران میں وقفے وقفے سے اس کا قلم بھی حرکت میں آجاتا تھا اور وہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگتا تھا۔

”یہ تو جناب...... اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔“ انکوائری آفیسر نے میرے اعتراض کے جواب میں کہا۔ ”بعض لوگ کسی مصیبت کا سن کر ہی ہاتھ پاؤں ڈال دیتے ہیں اور بعض پر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو وہ کسی چٹان کے مانند ایستادہ رہتے ہیں۔“

”پھر تو مقتول کی بیوہ کو ”آئرن لیڈی“ کی شیلڈ ملنا چاہیے۔“ میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ایسے فولادی اعصاب کی مالک ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔“

اس نے میرے طنز کا جواب طنز ہی سے دیا۔ ”اگر آپ کا کوئی بورڈ اس قسم کے انعامات کا انعقاد کرتا ہے تو آپ بہ خوشی مسز بیگ کو یہ شیلڈ پیش کرسکتے ہیں۔“

میں نے زیرلب مسکرانے پر اکتفا کیا اور سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انکوائری آفیسر سے پوچھا۔

”صفدر صاحب! وقوعہ کے روز جب آپ دوپہر ایک اور سوا ایک کے درمیان جائے واردات پر پہنچے تو وہاں مقتول کی بیوہ نرگس کے علاوہ اور کون موجود تھا؟“

”مقتول کی فیکٹری کا منیجر فرید غوری بھی جائے وقوعہ پر موجود تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا فرید غوری کو بھی مقتول کی بیوہ نے فون کرکے وہاں بلایا تھا؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

”آپ نے اس سلسلے میں مقتول کی بیوہ نرگس سے پوچھا نہیں تھا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ایک انکوائری آفیسر کی حیثیت سے آپ کو فرید غوری کی جائے وقوعہ پر موجودگی کا سبب پتا ہونا چاہیے تھا؟“

”میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”آپ نرگس سے خود پوچھ لیجیے گا......“

”میں مقتول کی بیوہ سے ضرور یہ سوال کروں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیونکہ میں اس معاملے کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔“

”جیسی آپ کی مرضی!“ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”آئی او صاحب! جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا؟“

”مقتول بیگ اپنے کمرے میں بیڈ پر مردہ پڑا تھا۔“ اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ خون کے بہاؤ نے اس کا لباس اور بیڈ کا ایک بڑا حصہ سرخ کردیا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ کسی خواب آور دوا کے زیراثر تھا۔ اس کے معدے کے کیمیاوی تجزیے سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ مقتول کی بیوہ نے ناشتے کے وقت اسے جو سکون بخش دوا کھلائی تھی یہ اس کے اثرات ہوں۔ ان اثرات کی روشنی میں دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ......“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جب کسی نشہ آور شے کے زیراثر کسی شخص کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو مرنے والے کو زیادہ تڑپنے پھڑکنے کا موقع نہیں ملتا۔ آپ نے

مقتول کی لاش کو دیکھ کر کیا اندازہ قائم کیا تھا؟“

”جیسا آپ فرما رہے ہیں، میں نے بالکل ویسا ہی دیکھا تھا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مقتول کی لاش اور بستر کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ موت کے منہ میں جاتے وقت مقتول نے زیادہ اچھل کود نہیں مچائی ہوگی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، آپ نے جائے وقوعہ سے بڑی آسانی کے ساتھ آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا تھا؟“ میں نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں......“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”آلۂ قتل کی تلاش میں مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔ وہ خطرناک گوشت کاٹنے والی چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی پڑی مل گئی تھی۔“

”آپ نے آلۂ قتل پر سے فنگر پرنٹس بھی اٹھائے تھے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ پرنٹس ملزمہ کے فنگر پرنٹس سے میچ بھی کرگئے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ بہ آواز بلند بولا۔ ”جبھی تو یہ بات اور بھی یقینی ہوگئی کہ ملزمہ ہی نے دراصل مقتول کی جان لی تھی۔ اگر وہ اس معاملے میں ملوث نہ ہوتی تو آلۂ قتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں پائے جاتے۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔“ بات ختم کرکے وہ معنی خیز انداز میں مجھے تکنے لگا۔

”ایک نہیں، اس کیس میں تو بہت سی باتیں غور طلب ہیں آئی او صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”جن پر ہم باری باری غور بھی کریں گے لیکن آلۂ قتل پر ملزمہ کے فنگر پرنٹس کی موجودگی ہرگز یہ ثابت نہیں کرتی کہ اسی نے مقتول اشتیاق بیگ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

”جی کیا مطلب؟“ وہ چونک کر مجھے تکنے لگا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میری مؤکلہ کے مطابق وہ خطرناک چھری جو اس کیس میں آلۂ قتل کی حیثیت کی حامل ہے اس کا تعلق مقتول کے کچن سے ہے۔ ملزمہ اکثر و بیشتر اسے استعمال کرتی تھی لہٰذا اس چھری کے دستے پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات کا پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس چھری کے حوالے سے ملزمہ نے مجھے ایک نہایت ہی اہم بات بھی بتائی ہے......“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں آئی او کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”کون سی اہم بات؟“

میں نے آئی او کی حیرت کو نظرانداز کرتے ہوئے جج کی جانب دیکھا۔ اس کی دلچسپی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور آئی او کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میری مؤکلہ اور اس کیس کی ملزمہ کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ سے چند روز قبل وہ چھری کچن سے غائب ہوگئی تھی۔ جب اس نے مذکورہ چھری کے بارے میں اپنی باجی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس سے استفسار کیا تو اس نے چھری کے حوالے سے اپنی لاعلمی ظاہر کردی تھی۔“

”مجھے آلۂ قتل کے ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”نہ ہی مجھے یہ ہسٹری جاننے سے کوئی دلچسپی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آلۂ قتل پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور وہ اپنی مالکن کی حکم عدولی کرکے اس کے گھر آنے سے پہلے ہی مقتول کے گھر سے نکل گئی تھی۔“

”آئی او صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا آپ پوری دیانت داری کے ساتھ مجھے ایک بات بتائیں گے؟“

”وکیل صاحب! میں نے ابھی تک معزز عدالت کے روبرو جو کچھ بھی کہا ہے اس میں دیانت داری کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کیا۔“ وہ قدرے ناراضی سے بولا۔ ”پوچھیں، آپ کو مجھ سے کون سی بات پوچھنا ہے۔ جو میری نظر میں سچ ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔“

”یہ جو معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں مثلاً مزدور، محنتی، جفاکش اور سخت کام کرنے والے یا گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں وغیرہ......“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کے خیال میں ان کی کھوپڑی میں دماغ نہیں ہوتا؟“

”میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں......“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ”اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟“

”میرا مطلب ہے، کیا یہ لوگ آپ کی نظر میں عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔“ میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان میں اور ایک گدھے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا آپ کو......؟“

جج نے اپنے ہاتھ میں موجود قلم سے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر چند سطریں گھسیٹیں اور دوبارہ ہماری

جانب متوجہ ہوگیا۔

آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''میں تو ایسا نہیں سمجھتا جناب! جب اللہ نے ان کے سر کے اوپر کھوپڑی بنائی ہے تو یقیناً اس کے اندر دماغ بھی رکھا ہے اور یہ بھی معاشرے کے دوسرے یعنی بالائی طبقوں کے مانند سوچتے اور سمجھتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں تو ان کا دماغ کچھ زیادہ ہی چلتا ہے۔''

''دماغ کے استعمال اور سمجھ بوجھ کے حوالے سے ملزمہ وحیدہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''وہی خیال ہے جس کا میں آپ کے پہلے سوال کے جواب میں اظہار کر چکا ہوں۔'' وہ خاصے اطمینان کے ساتھ بولا۔

''یعنی ملزمہ بھی ایک سمجھ دار اور باشعور انسان ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اسے ''الو کی پٹھی'' کہنا درست نہیں ہوگا؟''

''ایسے الفاظ کا استعمال تو کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن اس سے ملزمہ کے جرم کی سنگینی کم یا ختم نہیں ہوجاتی......''

''ٹھیک ہے، ہم جرم اور اس کی سنگینی کی طرف آجاتے ہیں۔'' میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ''میری مؤکلہ پر اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کا الزام ہے اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ کوئی ڈفر یا الو کی پٹھی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے (استغاثہ کے مطابق) اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے بعد آلۂ قتل کو اسی کے بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔ آپ کو وہ خطرناک تیز دھار چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی سے ملی تھی نا؟''

''جی ہاں...... وہیں سے ملی تھی۔'' آئی او نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

''وہ اگر چاہتی تو اس چھری کو کسی جگہ بھی چھپا سکتی تھی جہاں سے آسانی سے ڈھونڈی نہ جاسکتی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''وہ آلۂ قتل کو گھر سے باہر کسی کچرادان میں بھی پھینک سکتی تھی۔ اس نے اپنے سنگین جرم کے سب سے بڑے ثبوت کو مقتول کے بیڈ کے نیچے کیوں ڈال دیا تھا؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ...... آبیل، مجھے مار!''

''آپ کا سوال یقیناً بہت اہم ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں، ملزمہ نے بوکھلاہٹ اور پریشانی میں آلۂ قتل کو بیڈ کے نیچے پھینک دیا ہوگا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس پر وحشت اور دہشت سی طاری ہوگئی ہوگی اور وہ چھری کو وہیں چھوڑ کر جلد از جلد بنگلے سے فرار ہوگئی ہوگی۔''

''وحشت زدہ یا دہشت زدہ یا بوکھلایا ہوا پریشان شخص پہلی فرصت میں کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے زہریلے انداز میں کہا۔ ''جبکہ ملزمہ کا ریکارڈ اس کے برعکس گواہی دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''آپ کے مطابق......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''ملزمہ اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس قدر بوکھلا گئی تھی اور دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ پریشانی اور وحشت میں آلۂ قتل کو مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی پھینک کر گھر سے فرار ہوگئی تھی جبکہ واقعات کے مطابق وہ اپنے مقررہ وقت پر فیاض شیخ کے گھر پہنچی تھی اور پورے دو گھنٹے اس نے شیخ صاحب کے گھر میں معمول کے مطابق پُرسکون انداز میں کام کیا تھا۔ اس امر کی گواہی فیاض شیخ کی بیوی اینہ دے سکتی ہے۔ میں اس سلسلے میں اینہ سے بات کر چکا ہوں۔ اگر معزز عدالت کا حکم ہوگا تو میں اپنی مؤکلہ کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مسز فیاض شیخ اینہ بیگم کو عدالت تک لانے کا فرض پورا کر سکتا ہوں۔ اینہ ایک خصہ ور اور سخت گیر عورت ہے۔ وہ تو عام حالات میں ملزمہ کے کام میں سے کافی عیب نکالتی رہتی تھیں، کجا یہ کہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ خاموش کیسے رہ سکتی تھیں۔ ایک عورت جس نے پانچ منٹ پہلے کسی شخص کا گلا کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو وہ صبر و سکون کے ساتھ پورے دو گھنٹے کسی گھر میں اپنے معمول کے کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت اور نفسیات ہی کے خلاف ہے آئی او صاحب......''

تفتیشی افسر صفدر علی میرے اس بھرپور منطقی ایک پر بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے وکیلِ استغاثہ کی یاد آگئی۔ میں اس قسم کے دھواں دھار حملے وکیلِ استغاثہ پر کیا کرتا تھا لیکن ابھی تک اس کیس میں وکیلِ استغاثہ کی باری نہیں آئی تھی۔ جس طرح آئی او سے جرح کے جواب میں یہ کیس اور اس کیس کے معاملات پرت در پرت کھلتے چلے جارہے تھے اور کیس تیزی سے اپنے اختتام کی طرف بڑھ

رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وکیلِ استغاثہ کو بہت کم ''زحمت'' اٹھانا پڑے گی۔

''آئی او صاحب!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میری مؤکلہ پر اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے علاوہ بھی دو الزامات ہیں۔ نمبر ایک، دس ہزار نقدی کی چوری۔ نمبر دو، چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ نے جب ملزمہ کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تو خانہ اور جامہ تلاشی بھی لی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ یہ رقم اور طلائی زیورات برآمد کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ہم نے ملزمہ کے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا لیکن مالِ مسروقہ اور نقدی کہیں سے برآمد نہیں ہوسکی۔''

''ریمانڈ کی مدت کے دوران میں آپ نے ملزمہ کی زبان کھلوانے کے لیے کڑی تفتیش بھی کی تھی۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''دس ہزار نقدی اور طلائی زیورات کے بارے میں کچھ پتا چلا آپ کو؟''

اس نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلادی۔ اب اس کے چہرے پر وہ پہلے والی تازگی اور بشاشت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاصا تھکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ میں وقفے وقفے سے جج کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب بھی میں آئی او کے سامنے کوئی خاص نکتہ اٹھاتا اور آئی او اس کا جواب دیتا تو جج اپنے پاس کچھ نوٹ کر لیتا تھا یعنی وہ اہم پوائنٹس اپنے پاس جمع کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری جرح خاصی سود مند ثابت ہو رہی تھی۔

''آئی او صاحب!'' میں دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''آپ کے خیال میں، دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات مقتول اشتیاق بیگ کے تکیے کے نیچے رکھے ہوئے تھے؟''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!'' وہ برہمی سے بولا۔ ''نقدی اور زیورات بھلا کون تکیے کے نیچے رکھتا ہے......؟''

''آپ کی تفتیش اور استغاثہ کی رپورٹ سے تو یہی لگتا ہے۔'' میں نے چوٹ کی۔

''کیا مطلب......؟''

''بھئی...... میری مؤکلہ نے استغاثہ کے مطابق اشتیاق بیگ کی گردن پر چھری پھیری، تکیے کے نیچے سے دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات نکالے اور چلتی بنی......'' میں نے طنز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ میں یہ کہاں لکھا ہے کہ دس ہزار کی نقدی اور طلائی زیورات مقتول کے تکیے کے نیچے رکھے تھے؟''

''آبجیکشن یور آنر......!'' وکیلِ استغاثہ نے اپنی موجودگی کے اظہار کے لیے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ''وکیلِ صفائی حد سے بڑھتے جارہے ہیں۔''

جج نے گہری سنجیدگی سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت ہے۔'' وہ بڑے مضبوط لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور وکیلِ صفائی آدھے پون گھنٹے سے آئی او صاحب کو پکڑے کھڑے ہیں۔ کام کی کوئی بات نہیں ہو رہی اور محض...... عدالت کا قیمتی وقت برباد کیا جارہا ہے اور اب تو انہوں نے حد ہی کردی ہے......'' وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر امداد طلب نظر سے جج کو تکنے لگا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کا جواب دوں۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

''جناب عالی! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک انکوائری آفیسر صفدر پر جرح کے دوران میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا لہٰذا عدالت کے قیمتی وقت کے برباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وکیلِ استغاثہ کے اعتراض کو ایک سیکنڈ کے لیے درست بھی مان لیا جائے تو پھر سر! آپ نے اس جرح کے دوران میں زیرِ سماعت کیس کے حوالے سے اپنے پاس جو اہم پوائنٹس نوٹ کیے ہیں انہیں بھی بیکار اور فضول سمجھتے ہوئے کاٹ دینا ہی مناسب ہوگا اور...... مجھے یقین ہے سر، آپ ایسا نہیں کریں گے......''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے وکیلِ استغاثہ اور تفتیشی افسر سمیت حاضرینِ عدالت پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر دوبارہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ اب میرے انداز میں ایک خاص قسم کا

جذباتی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔
''جنابِ عالی! اگر میں نے پچھلے تیس چالیس منٹ تک عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی غرض سے جھک ماری ہے تو میں اپنے اس فعل پر انتہائی شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں...... دیٹس آل یور آنر۔''
''اب آپ کیا فرماتے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے وکیلِ استغاثہ سے پوچھا۔
''میں کیا کہوں جنابِ عالی!'' وہ بلا سوچے سمجھے بول گیا۔ ''جب میرے فاضل دوست نے خود ہی اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے......''
جج نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ کے فاضل دوست اور اس کیس کے ڈیفنس کونسل مسٹر بیگ نے اپنی کسی غلطی کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان کے اٹھائے ہوئے نکتے عدالت کی نظر میں بے معنی اور لغو ہیں تو وہ اپنی جرح کو موقوف کرنے پر تیار ہیں......''
وکیلِ استغاثہ خاموش اور الجھن زدہ انداز میں جج کو دیکھتا چلا گیا۔ جج نے مزید کہا۔ اس کا مخاطب صد فیصد وکیلِ استغاثہ ہی تھا۔
''اگر آپ کی بات کو درست مان کر یہ عدالت وکیلِ صفائی کو مزید سوالات سے روک دے تو پھر آپ کو ان تمام امور کی وضاحت کرنا ہوگی، چاہے یہ نکات بے معنی ہیں یا بامعنی؟''
''یور آنر! وکیلِ صفائی کے اس سوال کو معزز عدالت کس خانے میں فٹ کرے گی جو انہوں نے سب سے آخر میں تفتیشی افسر سے پوچھا ہے......'' وکیلِ استغاثہ نے شاکی لہجے میں کہا۔
''یعنی مقتول کے تکیے اور نقدی و زیورات والا سوال؟''
''یس یور آنر......!'' وہ قدرے جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''معزز عدالت بخوبی اندازہ لگا سکتی ہے کہ زیرِ سماعت کیس کی عدالتی کارروائی کے دوران میں ایسے بچکانہ سوال کی کیا تک بنتی ہے......؟''
''ایسے بچکانہ سوال کی کیا تک بنتی ہے۔'' جج نے زیرِ لب دہرایا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! وکیلِ استغاثہ کے اس سوال کا جواب آپ کو دینا ہے۔''
''ضرور جناب......'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر معزز عدالت مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائے تو میں اپنے فاضل دوست کے اعتراضات کا بڑا مدلل اور شافی جواب دینے کے لیے بے قرار ہوں۔''
جج نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''مسٹر بیگ اپلیز پروسیڈ......''
میں بڑے چاؤ کے ساتھ اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر صفدر علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''آئی او صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''تو آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ چوری ہونے والے چالیس ہزار کے طلائی زیورات اور دس ہزار نقدی مقتول نے تکیے کے نیچے نہیں رکھے تھے؟''
''جی بالکل نہیں!'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔
''پھر ان دونوں چیزوں کو کہاں سے چرایا گیا؟''
''الماری کے اندر سے۔''
''کون سی الماری؟'' میرے سوالات میں تیزی آتی گئی۔
''مقتول کی بیوہ نرگس کی الماری میں سے۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے پوچھا۔ ''کیا مذکورہ الماری بھی مقتول کے بیڈروم میں رکھی ہوئی تھی؟''
''نہیں۔'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''دونوں میاں بیوی کے بیڈروم الگ الگ تھے۔ جس الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات چرائے گئے وہ نرگس کے بیڈروم میں رکھی تھی۔''
''آپ نے یقیناً اس بیڈروم اور خصوصی طور پر اس الماری کا بھی معائنہ کیا ہوگا جہاں سے زیورات اور نقدی چرائی گئی تھی؟''
''جی ہاں...... یہ تو میرا فرض تھا۔'' اس نے بڑے فخر سے بتایا۔
''آپ کا اس سے زیادہ بڑا ایک اور فرض بھی تھا۔'' میں نے اسے طنزیہ انداز سے گھورا۔ ''کیا آپ نے وہ فرض بھی پورا کیا تھا؟''
''کون سا فرض؟'' وہ پریشانی سے مجھے دیکھنے لگا۔
''مذکورہ الماری سے فنگر پرنٹس اٹھانا۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور ان فنگر پرنٹس کا ملزمہ کے فنگر پرنٹس سے موازنہ کرنا......''
''یہ کام ہم نے کیا تھا......'' وہ کمزوری آواز میں بولا۔ ''لیکن افسوس کہ اس الماری پر سے ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات نہیں مل سکے تھے۔'' میں نے بہ دستور اس کے

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب......؟''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''اس الماری کے کسی حصے پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔''
''یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آلۂ قتل پر سے تو ملزمہ کے فنگر پرنٹس مل جاتے ہیں مگر الماری کے کسی حصے خصوصاً اس کے ہینڈل پر فنگر پرنٹس موجود نہیں ہیں؟''
''کیا کہا جا سکتا ہے۔'' وہ جاہلانہ انداز میں بولا۔ ''ہوسکتا ہے، ملزم نے پہلے نقدی اور زیورات چرائے ہوں اور الماری پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کردیے ہوں، پھر مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ خوفزدہ ہوگئی ہو جس کے سبب آلۂ قتل پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کا اسے ہوش نہ رہا ہو اور وہ چھری کو وہیں بیڈ کے نیچے پھینک کر بنگلے سے فرار ہوگئی ہو۔''
''ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے آئی او صاحب!'' میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''لیکن جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ عقل سے باہر ہے۔ خیر......'' میں نے تھوڑی دیر رک کر ایک آسودہ سانس لی پھر خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔
''آئی او صاحب! ملزمہ زینا تھوڑی مدت کے دوران میں لگ بھگ ایک ہفتہ آپ کی کسٹڈی میں رہی ہے۔ آپ نے اسے اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور مختلف اشیا کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہوگا......؟''
''جی ہاں، بار بار دیکھا تھا......'' وہ متذبذب انداز میں مجھے تکنے لگا۔
''آپ نے اسے کس ہاتھ کا پایا تھا؟''
''میں سمجھا نہیں......'' اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔
''مطلب یہ کہ ملزمہ کس ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے؟'' میں نے فوراً وضاحت کردی۔
''دائیں ہاتھ سے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''جیسا کہ عموماً لوگ ہوتے ہیں...... رائٹ ہینڈڈ!''
''آئیں ذرا، مقتول کے بیڈروم میں چلتے ہیں......'' میں نے کہا۔
''جی......؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔
''آپ پریشان نہ ہوں آئی او صاحب!'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''ہم عدالتی کارروائی کو ادھورا چھوڑ کر مقتول کے بیڈروم یعنی جائے وقوعہ پر نہیں جا رہے بلکہ اس کمرے کا ذکر کریں گے۔''
وہ ایک بوجھل سانس خارج کرکے رہ گیا۔
''آئی او صاحب!'' میں نے دھیمے انداز میں اسے سمجھنے کی کوشش کی۔ ''آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی بڑی توجہ اور غور سے جائزہ لیا ہوگا؟''
اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ''میں نے بھی اپنے ذرائع کی مدد سے اس بیڈروم کا ایک نقشہ بنایا ہے۔ میں کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ تصدیق کیجیے گا کہ میں غلط ہوں یا صحیح......!''
''ٹھیک ہے۔'' وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔
''وہ بارہ ضرب بارہ فٹ کا ایک کشادہ بیڈروم ہے؟''
''درست......!''
''کمرے میں داخل ہونے کا راستہ مغربی دیوار سے ہے؟''
''جی ہاں، ایسا ہی ہے۔''
''کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ مقتول کا بیڈ اس طرح بچھا ہوا ہے کہ بیڈ کا سرہانہ مشرقی دیوار کو ٹچ کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی مشرقی اور جنوبی دیوار کے اتصال سے وجود پانے والے کونے پر بیڈ کا قبضہ ہے۔''
''بالکل درست فرمایا آپ نے۔'' اس نے جواب دیا۔
میں سوالات کے زاویے تبدیل کرکے رفتہ رفتہ اسے اپنے جال میں پھانسنے کی سعی میں مصروف تھا اور آئی او بے خبری میں میری کھینچی ہوئی لکیر پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔
''بیڈ اپنے سائز میں چھ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے۔'' میں نے کہا۔
اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ......'' میں نے اپنے ''کام'' کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سرہانے کی طرف سے مشرقی دیوار پانچ فٹ اور سائڈ سے جنوبی دیوار چھ فٹ بیڈ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے؟''
''جی ہاں...... بیڈ اور دیواروں کی یہی صورتِ حال ہے۔''
''مقتول کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے حوالے کیا گیا۔'' میں نے کہا۔ ''اور بہ وقتِ موت وہ بیڈ پر سویا ہوا تھا یعنی اس کا سر مشرقی دیوار کی جانب اور پاؤں مغربی دیوار کی سمت تھے۔ اگرچہ اس رخ پر سونا مذہبی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن یہاں پر شریعت کی بات نہیں ہو رہی۔ آپ صرف اتنا بتائیں کہ میں نے مقتول کے لیٹنے کے حوالے

سے جو تفصیلات بتائی ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں؟"
"آپ نے بالکل درست نقشہ کھینچا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مقتول اسی پوزیشن میں اپنے بیڈ پر مردہ پایا گیا تھا۔"
"پھر تو آپ اس بات سے بھی اتفاق کریں گے کہ قاتل نے جنوبی اور مشرقی سمت سے مقتول پر حملہ نہیں کیا تھا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"بالکل اتفاق کروں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "جن دوسمتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، ادھر سے تو بیڈ دیواروں کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔"
"اور مغربی جانب سے بھی اس نوعیت کا قاتلانہ حملہ ممکن نظر نہیں آتا......؟"
"جی ہاں...... وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلانا ناممکن تھا۔" اس نے کہا۔ "پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شمالی جانب سے حملہ کیا ہوگا جدھر سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔"
"اللہ آپ کا بھلا کرے آئی او صاحب!" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے......"
وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تک سوچوں میں گم نہیں رہنے دیا۔
"آئی او صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے مقتول کی کٹی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟"
"جی ہاں...... یہ تو بہت ضروری تھا۔"
"کٹ کا اینگل تو آپ کو یاد ہوگا؟"
"جی بالکل یاد ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
میں اس حوالے سے اپنے مختلف ذرائع استعمال کرکے بڑی تفصیلی اور مصدقہ معلومات حاصل کر چکا تھا گویا، مقتول کی کٹی ہوئی گردن کا ہر زاویہ اور ہر منظر میرے تصور کی نگاہ میں محفوظ تھا اور یہی اس کیس کا وہ اہم رخ تھا جس سے ماہرانہ انداز میں کھیلتے ہوئے مجھے اپنی مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔
"بالکل یاد ہے......" میں نے پُرسوچ انداز میں آئی او کے الفاظ دہرائے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ "آپ ذرا اس کٹ کی وضاحت کردیں جس سے واضح ہو جائے کہ مقتول کی گردن چھری کے مہلک وار سے، کہاں سے کہاں تک متاثر ہوئی تھی؟"
"دیکھیں جناب......" وہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گردن کے ساتھ مصروف کرتے ہوئے بتانے لگا۔ "وہ خوف ناک کٹ......" اس نے انگشت شہادت کو اپنے دائیں کان کی لو کے نیچے، چہرے کی ہڈی کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے شروع ہوا تھا اور......" پھر وہ اسی انگلی کو بائیں کندھے پر، گردن کی جڑ کے قریب لے گیا اور ایک جگہ ٹھہراتے ہوئے بولا۔ "یہاں تک گیا تھا......"
"اوہ......!" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "یہ تو خاصا لمبا چوڑا اور خطرناک کٹ تھا اور...... شہ رگ بے چاری اس کٹ کے سینٹر میں آتی ہے۔ اسے تو کٹنا ہی تھا۔"
"جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "جبھی تو مقتول موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔"
میں نے کہا۔ "آئی او صاحب! میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟"
"کیسا تجربہ......؟"
"آپ ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو بتاؤں۔"
"ٹھیک ہے...... میں تیار ہوں۔"
اس مقصد کے لیے میں پوری تیاری کے ساتھ عدالت میں پہنچا تھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک تہ شدہ پوسٹر نکالا اور اس کی تہیں کھول ڈالیں۔ اس پوسٹر پر ایک عورت چت لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ یعنی وہ کسی سوئی ہوئی عورت کی قدِآدم تصویر کا پوسٹر تھا۔ میں نے مذکورہ پوسٹر کو ایک میز پر پھیلا دیا پھر اپنے بریف کیس میں سے پھل کاٹنے والی ایک چھری نکال کر آئی او کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
"جناب! سمجھ لیں کہ یہ ایک عورت سوئی ہوئی ہے۔" میں نے پوسٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر اس کی گردن کاٹیں گے، بالکل ویسے ہی جیسے قاتل نے مقتول اشتیاق بیگ کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"
وہ لمحاتی ہچکچاہٹ کے بعد اس عجیب و غریب تجربے کے لیے راضی ہوگیا۔ جج گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ میں کون سا شعبدہ دکھانے والا ہوں۔ وکیل استغاثہ کی حالت سب سے جدا تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ بے چارہ تو جج کے انہماک کے پیشِ نظر

"آبجیکشن یور آنر" کا نعرہ لگانے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود افراد کو گویا سانپ نے سونگھ گیا تھا۔ سب کی نظریں تفتیشی افسر اور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔
آئی او نے ڈیمو دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ...... چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کرے گا۔
آئی او نے اس سوئی ہوئی عورت کی گردن کاٹ ڈالی۔ چھری کا ایک لمبا کٹ پوسٹر پر نمایاں ہوگیا جو مذکورہ "عورت" کے بائیں کان سے دائیں کندھے کی سمت تھا یعنی کندھے سے شروع ہو کر کان کی طرف گیا تھا۔
"یہ آپ نے کیا کر دیا آئی او صاحب......؟" میں نے جلدی سے کہا۔
"کیوں...... کیا ہوگیا؟" وہ بوکھلا کر میری جانب دیکھنے لگا۔
میں نے کہا۔ "مقتول اشتیاق بیگ کی کٹی ہوئی گردن پر کٹ کا اینگل یہ تو نہیں تھا۔"
وہ الجھن زدہ انداز میں پوسٹر کو تکنے لگا۔
"آئی او صاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اشتیاق بیگ کی گردن کا کٹ دائیں کندھے سے شروع ہو کر بائیں کان کے نیچے تک چلا گیا تھا جبکہ آپ کا لگایا ہوا کٹ بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں کان تک گیا ہے۔ یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہوگیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
"آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں......" وہ متذبذب بھرے انداز میں کبھی عورت کی تصویر کو اور کبھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔
"پھر......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔
"شاید میرا ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا......" وہ بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "اسی لیے کٹ کا زاویہ بدل گیا ہے۔"
"ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا تو ہاتھ کو بدل کر دیکھیں۔" میں نے اسے ٹپ دی۔
اس نے میکانکی انداز میں چھری کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا۔ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے عورت کی گردن کاٹنے والا عمل دہرایا تو ہو بہو ویسا کٹ لگا جیسے مقتول کی گردن پر پایا گیا تھا۔
آئی او سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔
"کچھ آیا سمجھ میں جناب کی......؟"
"یہی سمجھ میں آیا کہ......" وہ ہیجان آمیز سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "قاتل نے الٹے ہاتھ سے چھری کا استعمال کرتے ہوئے اشتیاق بیگ کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"
"یعنی قاتل لیفٹ ہینڈڈ ہے۔" میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی......؟"
"جی...... جی بالکل!" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"آپ تھوڑی دیر پہلے اس امر کی بھی تصدیق کر چکے ہیں کہ اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل وحیدہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے یعنی وہ رائٹ ہینڈڈ ہے...... ہیں نا؟"
"جی ہاں......" اس نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔
اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر میں نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر صفدر علی پر خاصی طویل اور معنی خیز جرح کی تھی جس سے کافی مثبت اور مفید نتائج برآمد ہوئے تھے۔ میں اپنی کارکردگی کو تسلی بخش اور حوصلہ افزا کہہ سکتا تھا۔ میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ عدالت کے علم میں لانے میں کامیاب رہا تھا کہ اشتیاق بیگ کو جس بھی شخص نے قتل کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا یعنی وہ لیفٹ ہینڈڈ تھا جبکہ آئی او نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میری مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ وحیدہ رائٹ ہینڈڈ تھی۔
اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں صرف ایک کا بیان قابلِ ذکر اور اہمیت کا حامل ہے۔ میں یہاں پر اسی گواہ کا احوال بیان کروں گا۔
مقتول کے بنگلے کے عین سامنے جو بنگلا واقع تھا اس کے چوکیدار نے وقوعہ کے روز ملزمہ کو اپنے بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا یعنی مقتول کے بنگلے سے۔ مذکورہ چوکیدار نما ملازم کا نام افضل خان تھا۔ افضل خان کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک اور عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ افضل خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔
"افضل خان! تم نے وقوعہ کے روز جس عورت کو مقتول کے بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا کیا وہ یہی ہے؟" بات

کے اختتام پر وکیلِ استغاثہ نے انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑی میری مؤکل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

''جی جی...... بالکل یہی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''ذرا سوچ کر بتاؤ، یہ کتنے بجے کا واقعہ ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے استفسار کیا۔

''ساڑھے دس بجے کا۔'' گواہ نے بڑے اعتماد سے بتایا۔

مجھے یہ سمجھ لینے میں کوئی دقت...... محسوس نہیں ہوئی کہ گواہ ایک رٹا ہوا بیان دے رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی گواہ کے ساڑھے دس بجے والے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ملزمہ اپنے مالک کو قتل کرنے کے بعد بنگلے سے نکلی تھی۔

''تم نے ملزمہ کے انداز میں کوئی خاص بات نوٹ کی؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''اس نے باہر آ کر گیٹ کو بند کیا اور کنڈی بھی لگا دی۔''

''یعنی گیٹ کو باہر سے کنڈی لگا دی؟'' وکیلِ استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے افضل خان کی طرف دیکھا۔

''جی بالکل...... باہر سے کنڈی لگا دی۔'' گواہ نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ ''مجھے اس کی اس حرکت پہ حیرت ہوئی تھی۔''

''کیا تم نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ گیٹ کو باہر سے کنڈی کیوں لگا کر جا رہی ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''میرے دل میں تو آیا تھا کہ اس سے پوچھوں لیکن اس نے اتنا موقع ہی نہیں دیا......''

''موقع نہیں دیا...... کیا مطلب؟'' وکیلِ استغاثہ نے سنسنی خیز انداز میں استفسار کیا۔

''جناب! اس اللہ کی بندی نے جلدی سے گیٹ بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی اور اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا اور کوئی سوال کرتا، یہ آناً فاناً میری نگاہ سے غائب ہو گئی......''

''نگاہ سے غائب ہو گئی......'' وکیلِ استغاثہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزمہ نے کوئی جادوئی عمل کیا تھا؟''

''نن...... نہیں جناب۔'' وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی تھی جیسے...... جیسے......''

''کیا جیسے؟'' وکیلِ استغاثہ نے لقمہ دیا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر یہ ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہری تو کوئی اسے پکڑ لے گا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔''

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیلِ استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر فاتحانہ انداز میں میری جانب تکنے لگا۔

میں وکیلِ استغاثہ کے اس انداز کی تہ میں چھپے ہوئے فاتحانہ جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ گواہ کی زبان سے یہ کہلوا کر بہت خوش تھا کہ وقوعہ کے روز جب ملزمہ مقتول کے بنگلے سے رخصت ہوئی تو بے حد گھبرائی ہوئی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے پکڑ نہ لے یعنی...... وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے کر بنگلے سے نکلی تھی جس کے نتیجے میں گرفتاری کا اندیشہ ہو۔

میں اپنی باری پر وٹنس باکس کے قریب آ گیا پھر استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''افضل خان! تم نے جھوٹی گواہی دینے کے لیے کتنی رقم وصول کی ہے؟''

''یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں......'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیلِ استغاثہ نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ ''میرے فاضل دوست، استغاثہ کے معزز گواہ پر الزام لگا رہے ہیں۔ دس از ناٹ فیئر۔''

جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں متعلقہ امور کو مدِنظر رکھتے ہوئے گواہ سے سوال کروں۔ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے سر کو اثباتی جنبش دی اور گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''افضل خان! تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم نے گھبرائے ہوئے انداز میں ملزمہ کو مقتول کے بنگلے سے نکلتے دیکھا اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے۔''

یہ بات میں نے گواہ کو چکر دینے کے لیے کہی تھی۔ میں نے افضل خان کے حوالے سے کافی ہوم ورک کر رکھا تھا اور اسے جکڑنے کے لیے ایک نادیدہ جال بھی اس کے اوپر پھینک چکا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں وہ ترت بولا۔ ''میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا......''

''پھر تم نے کیا بتایا تھا؟'' میں نے بہت معصومیت سے پوچھا۔

''میں نے تو کہا تھا کہ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔''

''فکس ساڑھے دس؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

''جی بالکل۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا تم وقت کا درست اندازہ لگانے کے ماہر ہو یا تم نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا جو اتنے وثوق سے بتا رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''او کے...... تمہاری گھڑی کا وقت تو درست ہے نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھا دیے۔ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

''جنابِ عالی! یہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کا مقتول کے ٹیلی فون کا کال ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ کے مطابق مذکورہ نمبر پر دن کے پہلے حصے میں، پہلے ساڑھے نو بجے اور پھر پونے گیارہ بجے کال آئی تھی۔ ان دونوں کالز کی گزشتہ پیشیوں پر وضاحت کی جا چکی ہے لیکن میں ایک مرتبہ پھر مختصر ذکر کروں گا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ساڑھے نو بجے کسی کا فون آتا ہے۔ مقتول کی بیوہ نرگس فون اٹینڈ کرتی ہے اور ملزمہ کو بتاتی ہے کہ کسی میڈیکل اسٹور والے کا فون ہے۔ اس کے بعد نرگس بنگلے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ پھر دس پینتالیس یعنی پونے گیارہ بجے اسی نمبر پر ملزمہ، نرگس کی کال ریسیو کرتی ہے اور نرگس اسے بتاتی ہے کہ وہ دس پندرہ منٹ میں واپس آ جائے گی۔ اگر وہ مزید چند منٹ لیٹ ہو جائے تو ملزمہ اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے چلی جائے۔ ملزمہ نے اپنی مالکن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گیارہ بج کر پانچ منٹ پر بنگلا چھوڑا اور گیٹ کو باہر سے کنڈی لگا کر فیاض شیخ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی لیکن......'' میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر استغاثہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن...... افضل خان کا دعویٰ ہے کہ اس نے ملزمہ کو ٹھیک ساڑھے دس بجے بنگلے سے گھبرائے ہوئے انداز میں نکلتے، گیٹ کو باہر سے کنڈی لگاتے اور وہاں سے فرار ہوتے دیکھا تھا جبکہ حالات و واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ افضل خان کے بتائے ہوئے وقت پر ملزمہ مقتول کے بنگلے کے اندر موجود تھی اور کم از کم پونے گیارہ بجے تک وہ بنگلے ہی میں موجود تھی کیونکہ ٹھیک پونے گیارہ بجے نرگس اور ملزمہ کی فون پر بات ہوئی تھی۔

جج نے گھور کر افضل خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔ کیا تمہیں پتا ہے، اس دروغ گوئی پر تمہارے خلاف تعزیری کارروائی بھی ہو سکتی ہے؟''

''مجھے معاف کر دیں جناب۔'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے، اس دن میری گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ ساڑھے دس بجے ملزمہ بنگلے کے اندر موجود تھی اور پونے گیارہ بجے اس کی نرگس سے فون پر بات بھی ہوئی تھی تو میں ایسا بیان نہ دیتا۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''افضل خان!'' میں اپنے کام سے لگ گیا۔ ''تم نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزمہ نے تمہیں بات کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا ورنہ تم اس سے بہت کچھ کہنے والے تھے۔''

''جی، میں نے یہی کہا ہے۔'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''میں اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔''

انچارج

میاں، بیوی چوری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔

خاوند۔ ''جو شخص چوری کرتا ہے وہ بعد میں ضرور پچھتاتا ہے۔''

بیوی رومانٹک موڈ میں بولی۔ ''اور آپ نے جو شادی سے پہلے میری نیندیں چرائی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

خاوند۔ ''بکواس کر تو رہا ہوں، وہ بعد میں ضرور پچھتاتا ہے۔''

مرسلہ۔ قاضی عرفان احمد عاجز، چوآسیدن شاہ

''تم جسے میری غلط فہمی کہہ رہے ہو نا، وہ ایک سفاک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے نصف درجن گواہ بھی ہیں جن میں تمہاری گلی کے کونے پر واقع جنرل اسٹور کا مالک ظہیر الدین اور اس کے برابر میں موجود پان فروش شاکر بھی شامل ہے...... آئی سمجھ...... یا پہلی بھی چلی گئی؟''

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر تکنے لگا۔ جج نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! یہ غلط فہمی والا کیا معاملہ ہے؟''

''جناب عالی!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بڑی کراری آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''استغاثہ کا معزز گواہ افضل خان کافی عرصے سے ملزمہ پر ''نگاہ'' رکھے ہوئے تھا اور میری معلومات کے مطابق یہ کوئی اچھی نگاہ نہیں تھی۔ میری معلومات کی تصدیق کے لیے جنرل اسٹور کے مالک ظہیر الدین اور پان فروش شاکر کو عدالت میں بلایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں افراد اس شرمناک واقعے کے عینی شاہد ہیں جب نصف درجن افراد نے افضل خان کی درگت بنائی تھی اور وہ بھی بیچ چوراہے پر......'' میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات کو دراز کرتے ہوئے مزید کہا۔

''جیسا کہ میں نے بتایا، گواہ ملزمہ پر کافی عرصے سے بری نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا، یہ ملزمہ سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسی ہی ایک نازیبا کوشش گواہ کو بہت مہنگی پڑ گئی۔ جب گلی کے کونے پر گواہ نے ملزمہ کو زبردستی روکنے کی کوشش کی۔ ملزمہ نے اس کے منہ پر زناٹے دار طمانچہ رسید کیا تو آس پاس موجود افراد ان کی جانب متوجہ ہو گئے پھر اس سرعام بدتمیزی پر ''عوام'' نے افضل خان کی خوب خاطر تواضع کر ڈالی تھی اور اب......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''اور اب...... یعنی وقوعہ کے روز جب افضل خان نے دیکھا کہ ملزمہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو یہ اپنی اس دن والی بے عزتی کا ملزمہ سے بدلہ لینے کے لیے اس نوعیت کا بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وقوعہ کے روز ملزمہ کچھ اس قدر گھبرائے ہوئے انداز میں مقتول کے بنگلے سے رخصت ہوئی تھی جیسے وہ اشتیاق بیگ کو قتل کرکے فرار ہو رہی ہو۔''

میں خاموش ہوا تو عدالت کے کمرے میں موجود افراد کی سرگوشیاں ایک مخصوص نوعیت کی بھنبھناہٹ کی صورت میں ابھرنے لگیں۔ لوگوں کی اکثریت ناپسندیدہ نظروں سے استغاثہ کے گواہ افضل خان کو دیکھ رہی تھی چہ میگوئیاں بھی کر رہی تھی۔

جج نے ''آرڈر...... آرڈر'' کی صدا بلند کرکے عدالت کے کمرے کے مخصوص سکون کو قائم کیا اور خاصے سخت الفاظ میں گواہ افضل خان کو سرزنش کی۔ اس کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟''

''نہیں جناب عالی!'' میں نے نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''استغاثہ کے معزز گواہ کی بدنیتی اور دروغ گوئی عدالت کے ریکارڈ پر آچکی ہے۔ مجھے افضل خان سے مزید کچھ نہیں پوچھنا البتہ...... عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔''

''کیسی درخواست؟'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔

''فیاض شیخ کی بیوی امینہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''میں نے امینہ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اس کی گواہی ہو جائے تو میری مؤکل کی بے گناہی مزید ثابت ہو جائے گی۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے امینہ بیگم کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

امینہ، فیاض شیخ کی بیوی بہت موٹی اور غصہ ور عورت تھی۔ فیاض شیخ بھی اس کے سامنے بھیگا بلا ہی نظر آتا تھا۔ ملزمہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی تھی اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتی تھی۔ میرے شماریات کے مطابق امینہ کی گواہی میری مؤکل کے لیے کافی سودمند ثابت ہونے والی تھی۔

امینہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا تو میں مختصری جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔

''امینہ جی......!'' میں نے انگلی سے اکیوزڈ باکس میں موجود اس کیس کی ملزمہ وحیدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟''

''جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کچھ عرصہ پہلے یہ میرے گھر میں کام کرچکی ہے۔''

''پھر اس نے آپ کے گھر کا کام کیوں چھوڑ دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کام چھوڑا نہیں بلکہ یہ قتل کے کیس میں گرفتار ہو گئی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے یہ میرے گھر میں کام کرنے نہیں آسکی۔''

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس بے چاری نے اپنے مالک اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہوگا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ تو اللہ کو پتا ہوگا یا پھر آپ جیسے قانون دانوں کو۔'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ''میں کیا جانوں!''

''اوکے......'' میں نے مصلحت آمیز انداز میں گردن ہلائی۔ ''آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ ملزمہ کس کردار کی مالک ہے؟''

''میں آپ کا سوال سمجھ نہیں پائی۔'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، یہ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں کیسی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں چوری چکاری کی عادت تو نہیں ہے؟''

''جی بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''مجھے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے اور خدا کو حساب دینا ہے اس لیے میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اس عورت نے میرے گھر سے کبھی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی۔ یہ اپنے کام سے کام رکھنے والی بی بی ہے اور اپنا کام جوان مار کر بڑی محنت سے کرتی ہے۔''

''اس کے باوجود بھی اسے آپ کی ڈانٹ ڈپٹ سننا پڑتی ہے۔'' میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ڈانٹ ڈپٹ بہت ضروری ہے۔ اس سے انسان کا دماغ درست رہتا ہے۔''

''میری معلومات کے مطابق، ملزمہ روزانہ دوپہر گیارہ بجے سے ایک بجے تک آپ کے گھر کام کرنے آیا کرتی تھی۔'' میں نے اصل نکتے کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''کیا وقوعہ کے روز بھی یہ اپنے وقت پر ہی آئی تھی؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ عموماً گیارہ بج کر پانچ منٹ پر آجایا کرتی تھی لیکن اس روز یہ تقریباً پانچ چھ منٹ لیٹ آئی تھی لہٰذا میں نے اسے چھٹی بھی لیٹ ہی دی تھی۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو وقوعہ کے روز آپ نے اسے دیر سے چھوڑا تھا؟''

''زیادہ دیر سے نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''یہ پانچ چھ منٹ لیٹ آئی تھی۔ میں نے اسے دس منٹ لیٹ چھوڑا۔ یہ ایک بج کر دس منٹ پر میرے گھر سے نکلی تھی۔''

''امینہ جی! ایک نہایت ہی اہم سوال کر رہا ہوں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے گا۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کو ملزمہ نے دوپہر گیارہ دس سے ایک دس تک آپ کے گھر میں کام کیا۔ کیا آپ نے اس کے انداز میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی؟''

''کس قسم کی تبدیلی؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''مثلاً کسی نوعیت کی بے چینی، اضطراب، پریشانی، بوکھلاہٹ یا گھبراہٹ......؟''

''نہیں، میں نے اس میں ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔'' اس نے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''اس نے معمول کے مطابق کام کیا اور چلی گئی۔''

''معزز عدالت کے سامنے حقیقت بیانی کا بہت شکریہ۔'' میں نے امینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب رخ پھیر کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ......!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں اس کیس کی سب سے اہم گواہ یعنی مدعی نرگس کھڑی تھی۔ گزشتہ بیس جنوری کو نرگس کے شوہر اشتیاق بیگ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا لیکن نرگس کے بناؤ سنگار اور پہناوے سے لگتا نہیں تھا کہ وہ بیوہ ہو۔

وکیل استغاثہ اپنا ''کام'' مکمل کر چکا تو میں جرح کے لیے نرگس والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''نرگس صاحبہ! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ کچھ عرصہ قبل آپ کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ میں آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ کارروائی بھی ضروری ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ''جب یہ کیس عدالت میں لگا ہوا ہے تو پھر یہ سب تو ہونا ہے۔ آپ اپنا کام شروع کریں۔''

''نرگس صاحبہ! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کی صبح آپ کو اچانک گھر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ ایک فون آیا تھا اور......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''جی، یہ درست ہے۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور والے کا فون تھا۔ ڈاکٹر نے میرے شوہر کو جو ادویات لکھ کر دی تھیں ان میں ایک گولی اکثر مارکیٹ سے شارٹ رہتی تھی اور اسے تلاش کرنے میں مجھے کافی دشواری ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس میڈیکل اسٹور والے سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی اس کے اسٹور پر یہ گولی آئے تو وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔''

''تو یہ ٹیلی فونک اطلاع اسی سلسلے میں تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے اپنی فائلوں کے پاس رکھی ایک کتاب کو اٹھا کر نرگس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ فیض احمد فیض صاحب کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟''

اس نے عجیب سی الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھا اور لمحاتی تذبذب کے بعد وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے کر سرسری انداز میں اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان نے ہر کتاب پڑھ رکھی ہو۔'' میں نے مذکورہ کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''اگر میری معلومات غلط نہیں ہیں تو آپ کی رہائش نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں ہے۔ آپ دو سو گز کے ایک عالیشان بنگلے میں رہتی ہیں جو دو بیڈروم ایک ڈرائنگ روم، ایک ٹی وی لاؤنج اور خوب صورت لان پر مشتمل ہے۔''

''آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔'' وہ میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔ ''یوں محسوس ہوتا ہے آپ نے میرے بنگلے کا وزٹ کر رکھا ہو۔''

''ابھی تک تو نہیں کیا......'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ پیشی سے پہلے یہ نیک کام بھی کرنا پڑے گا۔ اینی ہاؤ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جس شخص نے وقوعہ کے روز آپ کو کسی مخصوص ٹیبلٹ کے بارے میں فون کیا تھا، اس کا اسٹور بھی نارتھ ناظم آباد ہی میں ہے۔''

''جی!'' اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''نارتھ ناظم آباد کراچی کا خاصا وسیع و عریض علاقہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے گھر کے نزدیک ہی ہے یا کچھ فاصلے پر؟''

''نہ زیادہ دور نہ زیادہ نزدیک۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ ہوگا۔''

''دس سے پندرہ منٹ۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پیدل یا کار میں؟''

''جی پیدل...... مطلب واکنگ ڈسٹینس ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوکے...... مگر آپ تو وقوعہ کے روز اپنی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھیں؟''

''جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ایک دو کام اور بھی تھے لہٰذا گاڑی ضروری تھی۔''

''وقوعہ کے روز آپ نے پہلے وہ اہم دوا حاصل کی تھی یا پہلے وہ دوسرے ایک دو کام نمٹائے تھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ظاہر ہے، میں نے پہلے وہ دوا حاصل کی تھی۔'' اس نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''دوسرے کام تو کسی وقت بھی کیے جاسکتے تھے۔''

''نرگس صاحبہ! کیا آپ معزز عدالت کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا پسند کریں گی جس نے وقوعہ کے روز فون کر کے آپ کو اس دوا کی دستیابی کی اطلاع دی تھی۔''

''کیوں......'' وہ بدکے ہوئے انداز میں بولی۔ ''اس کے نام کی کیا ضرورت ہے؟''

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''ڈیفنس استغاثہ کی معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''اٹ از ناٹ فیئر'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میری صورت ایسی خوف ناک ہے، نہ میں نے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک کوئی جارحانہ

دھمکی آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پھر معزز گواہ کس چیز سے ہراساں ہو رہی ہیں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔''

جج نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بی بی! آپ کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا ہوگا جس نے وقوعہ کے روز آپ کو فون کیا تھا۔ ہوسکتا ہے تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے اسے عدالت میں طلب کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔''

''جی...... فرحان۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''اس کا نام فرحان ہے۔''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''نرگس صاحبہ! میری معلومات اور محکمۂ ٹیلی فون کے ریکارڈ کے مطابق صبح ساڑھے نو بجے آپ کے گھر کے فون پر کسی کی کال آئی تھی۔ آپ نے بتایا کہ اس میڈیکل اسٹور والے فرحان نے بیس جنوری یعنی وقوعہ کے روز ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ کو اس مخصوص ٹیبلٹ کے بارے میں فون کر کے اطلاع دی تھی۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی لہجے میں بولی۔

''آپ اپنی گاڑی لے کر بنگلے سے نکلیں۔ سب سے پہلے آپ نے وہ ٹیبلٹس حاصل کیں پھر اپنے دوسرے کام نمٹانے چلی گئیں۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''جی...... جی...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے بنگلے سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے بہ قول دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ...... گاڑی میں تو اور بھی کم وقت لگا ہوگا......؟''

''جی۔ میں پانچ چھ منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔''

''یعنی زیادہ سے زیادہ نو بج کر چالیس منٹ پر آپ نے وہ میڈیسن حاصل کرلی تھی؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں سوال کیا۔

''جی، بالکل......'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''نرگس صاحبہ! ذرا سوچ کر بتائیں......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

''بیس جنوری کو کراچی میں سن رائز (طلوعِ آفتاب) صبح سات بج کر سترہ منٹ پر تھا اور سن سیٹ (غروبِ آفتاب) شام چھ بج کر چھ منٹ پر تھا۔''

''مگر...... میں کیا کروں......'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں......؟''

''اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کرنا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''کون سا اہم سوال؟'' اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔

''بیس جنوری کی صبح کراچی کے مشرقی افق پر صبح سات بج کر سترہ منٹ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک دو گھنٹے تیرہ منٹ بعد یعنی ساڑھے نو بجے فرحان صاحب آپ کو فون کر کے ٹیبلٹ لے جانے کے لیے کہتے ہیں اور آپ نے ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے نو بج کر چالیس منٹ پر وہ دوا حاصل کرلی تھی یعنی پونے دس بجے سے بھی پہلے......'' میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر استغاثہ کی گواہ سے استفسار کیا۔

''نرگس صاحبہ! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کراچی کی ہسٹری میں کبھی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیکل اسٹورز گیارہ بجے یا اس سے بھی کچھ بعد میں کھلتے ہیں۔ کیا فرحان صاحب کا میڈیکل اسٹور کراچی کی حدود سے باہر ہے یا وہ بیس جنوری کو علی الصباح اپنا اسٹور کھول کر کراچی کی ہسٹری میں اپنا نام ذرا مختلف انداز میں لکھوانے کے متمنی تھے......؟''

''وہ...... وہ جی......'' وہ بری طرح پریشان ہوگئی۔

''وہ جی اور یہ جی سے کام نہیں چلے گا۔'' میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ''آپ جو بھی جواب دیں گی اس کی تصدیق کے لیے فرحان صاحب کو عدالت میں بلایا جائے گا۔''

وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وہ دراصل، فرحان کا اسٹور اس وقت بند تھا۔ اس نے اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا......''

اس کی آنکھیں اور چہرہ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس پر چڑھائی کردی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے وہ میڈیسن فرحان کے میڈیکل اسٹور سے نہیں بلکہ اس کے گھر سے جاکر حاصل کی تھی؟''

''جج...... جی......'' وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"یہ ایمرجنسی عقل سے ماورا ہے؟" میں نے سخت الفاظ میں کہا۔ "خیر...... فرحان کو تو عدالت میں طلب کرنا ناگزیر ہو ہی چکا ہے کیونکہ تھوڑی دیر پہلے آپ بتا چکی ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ نے وہ میڈیسن فرحان کے میڈیکل اسٹور سے حاصل کی تھی۔ اب تو مجھے آپ کی اس بات پر بھی یقین نہیں رہا کہ یہ کتاب......"

میں دانستہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر فیض صاحب کے شعری مجموعے کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر وہ کتاب نرگس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

"اچھی طرح سوچ کر بتائیں، یہ کتاب آپ نے پڑھ رکھی ہے یا نہیں؟"

"نہیں...... بالکل نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولی۔

"اوکے۔" میں نے ایک بار پھر وہ کتاب اس سے واپس لے کر چوبی میز پر رکھ دی پھر استغاثہ کی سب سے اہم گواہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ "نرگس صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ نے دس بج کر پینتالیس منٹ پر یعنی پونے گیارہ بجے ...... اپنے بنگلے پر فون کر کے ملزمہ سے کہا تھا کہ آپ گھر کے قریب ہی کہیں موجود ہیں اور دس پندرہ منٹ بعد آپ پہنچ رہی ہیں؟"

"جی...... میں نے یہی کہا تھا۔" اس نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

"اور ملزمہ سے آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے چھٹی کر کے چلی جائے اور......"

"نہیں!" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میری واپسی تک بنگلے پر ہی رکے۔ میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزمہ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ظاہر ہے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"پونے گیارہ بجے آپ اپنے بنگلے سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھیں۔" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ "لیکن آپ کی واپسی ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے یہ پونے دو گھنٹے کہاں گزارے تھے؟"

"جب میں نے ملزمہ کو فون کیا اس وقت میں واقعی گھر سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ایک جگہ پر تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن پھر اچانک مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں مطمئن تھی کہ میں نے ملزمہ کو گھر پر رکنے کے لیے کہہ دیا ہے۔"

"اوہ...... اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کے اس اچانک یاد آ جانے والے ضروری کام کی تفصیلات بھی طلب کر لی جائیں گی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "میری مؤکلہ اور اس کیس کی ملزمہ وحیدہ کے بیان کے مطابق آلۂ قتل یعنی گوشت کاٹنے والی وہ تیز دھار چھری جس سے آپ کے شوہر کو ذبح کیا گیا، چند روز پہلے وہ چھری کچن میں سے غائب ہو گئی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔" وہ ناپسندیدہ نظر سے ملزمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"اوکے...... جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی یہ عدالت لگی ہوئی ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس عدالت میں ملزمہ پر دو کیس چل رہے ہیں۔ نمبر ون، اس نے آپ کے شوہر اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہے۔ نمبر ٹو، اس نے آپ کی الماری میں سے دس ہزار نقدی اور لگ بھگ چالیس ہزار کے زیورات چرائے ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

"جی......" اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"میں آپ کے بنگلے کے دو بیڈ رومز کی وقوع پذیری بیان کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر میں کہیں غلطی پر ہوا تو ٹوک دیجیے گا اور ہاں......" میں نے ایک مرتبہ پھر چوبی میز پر سے فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ اٹھا لیا پھر اسے نرگس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب تک میں اپنی بات مکمل کرتا ہوں، اس کتاب کو آپ پکڑے رکھیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اب آپ سے وہ سوال نہیں کروں گا جو پہلے دو بار کر چکا ہوں۔"

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے بولنا شروع کیا۔

"دونوں بیڈ رومز بنگلے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ہیں۔ دونوں کا سائز بھی ایک جیسا ہی ہے یعنی بارہ بائی بارہ فٹ اور دونوں کے داخلی دروازے مغربی سمت میں ہیں۔"

"بالکل درست۔" اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مقتول کا بیڈ اور وہ الماری جس میں سے نقدی اور زیورات چرائے گئے، یہ دونوں چیزیں دو مختلف بیڈ رومز میں ہیں۔ مقتول کا بیڈ اپنے کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ اور آپ کی الماری آپ کے بیڈ روم کی شمالی دیوار کے ساتھ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ

حیرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ نے میرے گھر کا سروے کر رکھا ہو۔"

"وکیل کو اس نوعیت کی ساری معلومات رکھنا پڑتی ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اور میرے خیال کے مطابق، مقتول اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر آپ کے بیڈ روم کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا تھا؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

"استغاثہ کے مطابق ملزمہ نے پہلے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے۔ اس کے بعد آپ کے شوہر کو قتل کر کے بنگلے سے روانہ ہو گئی۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کہتی ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ دونوں کام ملزمہ نے میرے سامنے تھوڑی کیے ہیں۔" وہ ناگواری سے بولی۔ "رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے، وہی درست ہے۔"

"استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق پہلے ملزمہ نے نقدی اور زیورات چرائے پھر خود کو دیکھ لیے جانے کے خوف سے اس نے آپ کے شوہر کو قتل کر دیا لیکن آپ اس امر کی تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ کا شوہر اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے دوسرے بیڈ روم میں رکھی آپ کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا لہٰذا فرض محال، اگر ملزمہ نے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے بھی تھے تو یہ عمل آپ کے شوہر کے علم میں آ ہی نہیں سکتا اور پھر......" لمحاتی توقف کر کے میں نے نرگس کے چہرے پر ابھرنے والے پریشانی کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔

"اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ آپ کے شوہر کی موت نیند کے دوران میں ہوئی ہے یعنی اگر ملزمہ نے چوری کی بھی تھی تو آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر اسے دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ناشتے والی دوا کے طفیل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "اشتیاق کی ایک دوا ایسی ہے جس سے نیند آتی ہے۔"

"گویا استغاثہ کا بیان درست نہیں۔" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر ملزمہ نے نقدی اور زیورات چرا ہی لیے تھے تو اسے آپ کے شوہر کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؟"

"مگر اس چھری پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔" وہ ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آپ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟"

"جیسے دوسری اتنی بڑی حقیقت کو استغاثہ نے نظر انداز کر دیا ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... م...... میرا مطلب ہے...... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولی۔

"میرا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ آپ کی الماری پر ملزمہ کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے لیکن استغاثہ کو یقین ہے کہ نقدی اور زیورات اسی نے چرائے ہیں۔ دوسری جانب چھری پر ملزمہ کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ قتل میری مؤکلہ نے نہیں کیا......"

"پتا نہیں آپ کس قسم کی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"سب سمجھ میں آ جائے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ آج عدالت میری مؤکلہ کو بے گناہ مان کر رہا کر دے گی۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ "لائیں، یہ کتاب مجھے دے دیں۔ اس کا کام ختم ہو چکا......"

اس کے چہرے پر الجھنوں کا جال سا پھیل گیا۔ شعری مجموعے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "اس کتاب کا کیا کام تھا جو پورا ہو گیا اور عدالت کس بنا پر ملزمہ کو بری کر دے گی؟"

"نرگس صاحبہ! میں آپ کے دونوں سوالوں کا جواب دوں گا۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا جواب بعد میں۔ آپ کو میری اس بے ترتیبی پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"جی نہیں۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ "عدالت آج میری مؤکلہ کو اس لیے بری کرے گی کہ وہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی یعنی رائٹ ہینڈڈ ہے جبکہ آپ کے شوہر کا قاتل بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی یعنی لیفٹ ہینڈڈ ہے اور...... اس امر کی تصدیق ایک پچھلی پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر نے بھی کی ہے۔"

"اوہ......" وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر مضطرب نظر سے ادھر ادھر تکنے لگی۔

قبل اس کے کہ وکیل استغاثہ ہمارے بیچ کود پڑتا،

میں نے نرگس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے فیض صاحب کے اس شعری مجموعے کا تین بار آپ سے "لین دین" کیا ہے صرف یہ چیک کرنے کے لیے کہ آپ کس ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہیں اور آپ نے ہر مرتبہ یہ ثابت کیا ہے کہ آپ لیفٹ ہینڈڈ ہیں لہٰذا اشتیاق بیگ کا قتل......"

"میں نے اشتیاق کو قتل نہیں کیا......" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "فرید غوری بھی تو لیفٹ ہینڈڈ ہے......"

"فرید غوری......"

میں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا تھا کہ نرگس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے لیکن وہ میری بات کو خود پر لے گئی تھی اور اپنی سمت آنے والے تیر کو اس نے فرید غوری کی جانب پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

"آخاہ...... مقتول کا منیجر...... وہ وقوعہ کے روز اس وقت جائے واردات پر موجود تھا جب پولیس وہاں پہنچی......" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہ شخص وہاں کیا کر رہا تھا......؟"

"مم...... مجھے پتا نہیں...... یہ تو آپ اسی سے پوچھیں......" وہ کٹہرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ "مجھے جانے دیں......"

"ارے میڈم...... آپ کہاں جارہی ہیں؟" میں نے نرگس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ "آپ تو یہاں سے سیدھی جیل جائیں گی...... اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں۔"

"میں نے اشتیاق کو قتل نہیں کیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

جج کے فوری حکم پر متعلقہ عدالتی عملے نے نرگس کو عدالت کے کمرے سے باہر جانے سے روک دیا۔ میں نے روئے سخن اس مقدمے کے منصف کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! جیسا کہ گزشتہ پیشی پر میں نے انکوائری آفیسر صفدر علی کی تصدیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی تھی کہ اشتیاق بیگ کو کسی لیفٹ ہینڈڈ شخص نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس پیشی پر میں نے کوشش کر کے اس کیس سے متعلق افراد میں سے ایک لیفٹ ہینڈڈ شخصیت یعنی مقتول کی بیوہ نرگس صاحبہ کو ایکسپوز کر دیا ہے۔ انہی کی زبانی پتا چلا ہے کہ مقتول کا منیجر فرید غوری بھی لیفٹ ہینڈڈ ہے۔ فرید غوری وقوعہ کے روز پولیس کی آمد کے وقت جائے واردات پر موجود پایا گیا ہے اور اس کی موجودگی کے حوالے سے نرگس کچھ بتانے پر تیار نہیں لہٰذا......" میں نے لحاتی توقف کر کے ایک طویل گہری سانس لی پھر سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا معزز عدالت سے میری پُرزور استدعا ہے کہ نرگس اور فرید غوری کو شاملِ تفتیش کرتے ہوئے استغاثہ کو نیا چالان پیش کرنے کی ہدایت کی جائے۔ یہ تو واضح ہو چکا کہ اشتیاق بیگ کو میری موکل وحیدہ نے قتل نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے، نرگس اور فرید غوری پر اگر پولیس تھوڑی سی بھی "محنت" کرے تو ان کی یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی...... ویٹس آل یور آنرز!"

میرے متاثر کن دلائل اور منطقی انکشافات کی روشنی میں عدالت نے نرگس اور فرید غوری کو فی الفور شاملِ تفتیش کرنے کے احکامات صادر کردیے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکل وحیدہ کو باعزت بری کر دیا۔ میں اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

نرگس اور فرید غوری جیسے پولیس کسٹڈی میں آئے تو اپنی جان بچانے کے لیے انھوں نے ایک دوسرے پر الزام لگانا شروع کر دیے تاہم پولیس نے اپنے مخصوص ہتھکنڈے آزما کر انہیں سچ بولنے پر "راضی" کر ہی لیا چنانچہ فرید غوری کو اقبالِ جرم کرنا ہی پڑا۔

واقعات کے مطابق نرگس اور فرید غوری میں ایک خاص قسم کی کھچڑی پک رہی تھی اور اشتیاق بیگ کی بیماری کے بعد تو ان کے معاملات کافی حد تک آگے بڑھ چکے تھے لہٰذا اپنے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے نرگس کی فرمائش پر فرید غوری نے ایک منصوبہ بنایا اور گھریلو ملازمہ وحیدہ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلادی۔

فرید غوری بہت ہی کائیاں اور چالاک شخص تھا۔ اس کے ریکارڈ سے پتا چلا کہ وہ پہلے بھی اسی نوعیت کی دو تین کامیاب وارداتیں کر چکا ہے لیکن اس کی اور نرگس کی بدقسمتی کہ یہ کیس میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔

فرید غوری بلاشبہ اپنے کام کا ماہر ایک کہنہ مشق کھلاڑی تھا مگر وہی بات کہ شاطر سے شاطر شخص کو بھی ایک روز اس کی عیاری لے ڈوبتی ہے۔ فرید غوری کو بھی منہ کی کھانا پڑی تھی......

(تحریر: حسام بٹ)



راہِ عشق

سید احتشام

کسی کو چاہنا اور چاہے جانا اگرچہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں بلکہ یہ تو فطرت کا تقاضا ہے لیکن . . . چاہتوں کا ثبوت دینا گویا اپنی تمام عمر، احساسات و جذبات کو گروی رکھ دینے کے مترادف ہوتا ہے مگر یہ مشکل کام اس سچے عاشق نے کر دکھایا تھا جس کی منزل کسی اور کے رستوں میں گم ہو گئی تھی۔

محبت کا بھرم رکھنے والے ایک دلبر کی بہادری کا دلچسپ کارنامہ

مجھے زندگی میں پہلی بار جیوری کا ایک رکن بننے کا موقع ملا تھا۔ قتل کے اس کیس میں میرے علاوہ گیارہ افراد ارکانِ جیوری کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن دس روز گزر جانے کے باوجود ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کیونکہ جیوری کے گیارہ ارکان ملزم کو سزائے موت دینے کے حامی تھے جبکہ میں فردِ واحد ملزم کو بری کرنے کے حق میں تھا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے اس کی بے گناہی کا یقین تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ واقعات وہ

نہیں ہیں جو بہ ظاہر نظر آ رہے ہیں بلکہ ملزم کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اسی شک کی بنیاد پر جیوری کے باقی گیارہ ارکان سے دس روز تک الجھتا رہا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو وہ قائل ہو رہے تھے اور نہ ہی مجھے قائل کر سکے تھے۔ وہ اپنی سرتوڑ کوشش کے باوجود مجھے میرے موقف سے ہٹانے میں ناکام رہے تھے۔ بعدازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ میرا شک اپنی جگہ درست ہے۔ قتل کے پس پردہ وہی واقعات تھے جن کا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ ملزم جارج نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کوئی قتل بھی ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ مقدمے کے دوران یہ بات سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ وہ احمق عدالت کو یہی بیان دینا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا وکیل ہوریس، بے حد محتاط اور زیرک واقع ہوا تھا۔ وکیل استغاثہ کا نام ریکٹ تھا۔ وہ ایک تجربہ کار وکیل تھا اور اس کیس کے پرخچے اڑانے پر تلا ہوا تھا۔ شکاگو جیسے ہنگامہ خیز شہر میں ہر سال ایک دو بڑے اور سنسنی خیز مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ عرصے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

میں شروع ہی سے اس مقدمے میں دلچسپی لیتا رہا اور حتیٰ کہ میرے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ کاش مجھے اس مقدمے میں جیوری کا ایک رکن بنا لیا جائے اور...... ایک روز خلافِ توقع عدالت سے میرا بلاوا آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس وقت تک اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا جب تک باقی ارکان مجھ سے نجات نہیں حاصل کر لیتے۔ بہرحال یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ سالہا سال کے بعد مجھے ایک ایسے کیس میں جیوری کے رکن کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

اخبارات میں کیس کی تفصیل پڑھنے کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو جیوری کے ایک رکن کی شدید ضرورت ہے اور اب عدالت کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس سے قبل عدالت فیصلہ سنانے والے ممبران کی دو عدد فہرستیں خارج کر چکی تھی کیونکہ ہر رکن اخبارات پڑھ کر اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ یہ ملزم جارج کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہاں پہلے سے دس اراکین جیوری جلوہ افروز تھے۔ یہ لوگ اس جھوٹے مقدمے کا بڑی.... بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر مجھے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں بھی دوسروں کی طرح شدت سے جیوری کے رکن کے فرائض انجام دینے کا خواہش مند تھا۔ مجھ سے کئی سوالات کیے گئے جن کا میں نے تسلی بخش جواب دیا۔ تب مجھے اس فرض کی ادائیگی کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے ان کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا کہ میں نے اس مقدمے کی بابت بہت تھوڑا پڑھا ہے اور کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتا اور یہ کہ میں سزائے موت کے خلاف نہیں ہوں۔ میں نے ساری عمر لگاتار تین جھوٹ نہیں بولے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد لوگ ایک اور بڑے جھوٹے کو پکڑ لائے اور اس طرح ہم بارہ ہو گئے۔ بارہ معصوم جھوٹے۔

اگلے روز سے اس کیس کی جزئیات سامنے آنے لگیں۔ میں نے نگاہیں گھما کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی گیارہ مضحکہ خیز احمق و دماغ یکجا نہیں دیکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکاری وکیل اور شاید وکیلِ صفائی بھی یہی چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا لیکن میں پہلے ہی اس کیس کی تفصیل سے واقف تھا اور سب کچھ جانتا تھا۔ مقدمے کا سب سے اہم سرکاری گواہ گشتی پولیس مین ویٹی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام اور خوش طبع شخص تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ایک رات تقریباً دو بجے اس نے ملزم جارج کو ریوالور بدست کھڑا پایا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور ملزم ہکا بکا اپنے ریوالور کو گھور رہا تھا۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا کہ اس نے اس شخص کو کیوں قتل کیا تو ملزم نے اعترافِ جرم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور کا کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر رہا۔

ویٹی کے بیان کے مطابق ملزم جارج نشے میں دھت تھا۔ اس نے موقعِ واردات سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب ویٹی نے اس سے کہا کہ وہ زیرِ حراست ہے تو وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مقتول کی جلد ہی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کا نام ہووارڈ تھا۔ وہ ایک رنڈوا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن میں اور دوسری سینے میں۔ اس کی لاش اسی وقت تجہیز و تکفین کے ادارے کو بھیج دی گئی اور ملزم جارج کو پولیس اسٹیشن کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا جہاں وہ ساری رات گھوڑے بیچ کر سوتا

رہا اور دن چڑھے بیدار ہونے کے بعد اس نے جرم کی صحت سے انکار کر دیا تھا لیکن بعدازاں اس پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا تھا۔

ملزم جارج کا کہنا تھا کہ مقتول ہووارڈ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ نشے میں دھت ہونے کے باوجود اس کے پاس ہووارڈ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ اس کے پاس اس وقت یا زندگی میں کبھی ریوالور تھا۔ اس کی تصدیق اس کے دوستوں نے بھی کی جو سب کے سب معزز شہری تھے۔ جارج بذاتِ خود ایک معزز شہری تھا اور سچ پوچھیے تو بہت سی حقیقتوں میں ایک یہ حقیقت بھی اس کے خلاف جاتی تھی۔ وہ خوش حال تھا، اچھے لباس زیبِ تن کرتا تھا اور اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اس قسم کا کوئی آدمی اگر کسی سنگین جرم میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس کے کارنامے کو بری طرح اچھالا جاتا ہے اور عام شہری تو درکنار، جج اور جیوری بھی اس سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ جب اس نے عدالت کو اس رات کا واقعہ سنایا تو اس کا وکیل ہوریس تک یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل پھس پھسی اور بے جان ہے۔

ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ جب اس نے فائر کی آواز سنی تو اس کا رخ اپنے گھر کی جانب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نشے میں دھت تھا اور خود اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ولیم اسٹریٹ پر کیا کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور کیوں موجود تھا۔ یقیناً کسی نے اسے ریوالور تھما دیا ہوگا۔ بہرحال وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ اس نے ہووارڈ کو قتل نہیں کیا تھا۔

وہ ایک خوبرو آدمی تھا۔ اس کی بیوی ایک نوجوان اور دلکش خاتون تھی لیکن اس واقعے نے اس کی ساری دلکشی چھین لی تھی اور اس کی حالت کسی زندہ لاش سے مختلف نظر نہیں آتی تھی۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ اپنے وکیل ہوریس کے ساتھ عدالت کے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ سرکاری وکیل ریکٹ لمبی ناک اور چوہے جیسی آنکھوں کا مالک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے ملزم جارج کے بیان کی دھجیاں اڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جارج اپنے بیان پر سختی سے ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بے حد اہم گواہ کو توڑنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ گواہ ایک عورت تھی۔ اس کا نام مسز پیٹرسن تھا۔ وہ مدعا علیہ کی جانب سے پیش کی گئی تھی لیکن ریکٹ جیسے شاطر وکیل کی جرح کے آگے ٹھہر نہ سکی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی گواہ ہے۔ اس کا بیان خاصا واضح تھا تاہم اس گواہ پر محنت کی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بیان کے مطابق وہ اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھی، اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا تمہارا شوہر ملزم کا دوست ہے؟“ ریکٹ نے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا پھر دوبارہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے دو آدمیوں کو اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ گولیوں کے چلنے سے ذرا پہلے کا ذکر ہے۔ اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے سنا تھا۔ ان میں سے ایک خوب زور زور سے اپنا بازو لہرا رہا تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی اور ان دونوں میں کوئی بھی ملزم جارج نہیں تھا۔ دونوں اس کے مقابلے میں خوب بھاری بھرکم تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ ان میں سے ایک شخص مقتول ہووارڈ تھا۔

اس نے تسلیم کیا کہ رات اندھیری تھی لیکن چونکہ اسٹریٹ اس کے گھر کے قریب ہی واقع ہے اس لیے اس نے انہیں واضح طور پر دیکھا تھا اور ان کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آواز جارج سے ملتی جلتی نہیں تھی اور تب ریکٹ نے یکے بعد دیگرے دو دھماکے کیے اور مسز پیٹرسن کے بیان کے پرخچے اڑا دیے۔ اس نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ مسز پیٹرسن اونچا سنتی ہیں حالانکہ وکیلِ صفائی ہوریس کے سوال کے جواب کے دوران وہ ٹھیک تھی۔ دراصل وہ بلند آواز میں سوال و جواب کرتا رہا تھا لہٰذا کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ مسز پیٹرسن اونچا سنتی ہیں اور پھر وہ جانتی تھی کہ ہوریس کون سا سوال کرنے والا ہے لیکن ریکٹ نے اتنی سفاکی سے جرح کی کہ اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ریکٹ نے قصداً اپنا لہجہ مدھم رکھا تھا لہٰذا مسز پیٹرسن کو اس کے ہر سوال پر اپنا ہاتھ کان تک لے جا کر پوچھنا پڑتا۔ ”کیا...... کیسے؟“

ریکٹ نے سب سے پہلے اسے یہ اقرار کرنے پر مجبور کر دیا کہ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وکیلِ صفائی ہوریس نے اس سے قبل بڑی صفائی سے اس سے یہ سوال کرنے سے خود کو روکا تھا لیکن ریکٹ اس کمزور پہلو کو تاڑ گیا تھا لہٰذا اس نے وہیں ضرب لگائی اور بالآخر مسز پیٹرسن کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ممکن ہے وہ سب اس کا وہم ہو۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس نے جن دو افراد کی آوازیں سنی

تھیں۔ ان میں سے ایک کی آواز، ملزم جارج کی تھی یا نہیں اور یہ کہ اس نے جس شخص کو ہوورڈ سمجھا تھا ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔ ریکٹ جو کچھ ثابت کرنا چاہ رہا تھا، اس کا... بہ آسانی تصور کیا جاسکتا تھا۔ مسز پیٹرسن نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی حالانکہ اس کا مکان جائے واردات سے چوتھائی بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ریکٹ اس کے ہر جواب پر فاتحانہ انداز سے ہماری طرف دیکھنے لگتا اور مسز پیٹرسن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

وکیلِ صفائی ہوریس تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کے اونچا سننے کا یہ جواز پیش کیا کہ اس وقت وہ نزلے کا شکار ہے جس سے اس کی سماعت متاثر ہوئی ہے لیکن واردات کی رات وہ بالکل واضح طور پر سننے کے قابل تھی۔ اس کی اس دلیل پر جج بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرا اہم ترین گواہ ایک دربان تھا۔ اس نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور بس۔ وہ شخص اسے فائرنگ کے چند ہی لمحوں کے بعد جائے واردات سے کچھ فاصلے پر بھاگتا ہوا نظر آیا تھا لہٰذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہی قاتل ہے۔ یہاں تک تو یہ بات درست تھی لیکن پھر جائے واردات پر ریوالور بدست جارج کی موجودگی کا کیا جواز تھا جس کے ریوالور کے چیمبر میں تین گولیاں بھی کم تھیں۔

☆☆☆

ان تمام کمزور پہلوؤں کے باوجود وکیلِ صفائی کے پاس حکم کا اکا تھا جسے مات دینا ریکٹ کے بس کی بات نہیں تھی۔ دورانِ تفتیش یہ بات سامنے آئی کہ مقتول کے پاس اپنی بیوی کی ایک ننھی سی تصویر ہوا کرتی تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اس کی تصدیق کی تھی اور ایک نے عدالت کو حلفیہ بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا تھا کہ وہ تصویر وقوعہ کی شب بھی اس کے پاس تھی اور اس نے اپنے دوست کے ہاں سے اپنے گھر روانہ ہوتے وقت وہ تصویر اسے دکھائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ گھر پہنچنے کے بجائے عالمِ بالا پہنچ گیا تھا۔ وہ تصویر غائب تھی اور جارج کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ نہ جائے واردات کے آس پاس کہیں پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ ایک خوب صورت نکتہ تھا اور کئی سمت اشارے کرتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس پورے کیس میں یہی واحد رومانی نکتہ تھا اور اخبارات اسے لے اڑے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے اس نکتے کو اچھالنا شروع کردیا تھا اور ہر اخبار اپنے ہر ایڈیشن میں اس تصویر کو شائع کرنے لگا تھا۔ جیوری کے ہر رکن نے وہ تصویر دیکھی تھی اور جان گئے کہ مقتول کی بیوی کیسے نقش و نگار کی عورت تھی۔ وکیلِ صفائی ہوریس نے اپنا زورِ بیان اس گم شدہ تصویر پر صرف کردیا تھا لیکن سرکاری وکیل ریکٹ نے اس نکتے کو یوں مسترد کردیا گویا اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

میرے خیال میں ہر شخص کو یقین تھا کہ ملزم جارج قاتل ہے اور شاید ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس قتل کے پیچھے کوئی ایسا راز پوشیدہ ہے جس کی کڑی ملزم جارج اور مقتول کی بیوی سے یا مقتول اور ملزم جارج کی بیوی سے جا ملے گی۔

وکیلِ صفائی شروع ہی سے ایک راگ الاپتا چلا آرہا تھا اور اس کی یہ راگنی جیوری کو قطعی متاثر نہیں کررہی تھی لیکن اس کے پاس کہنے کو بھلا اور تھا ہی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا۔ آخر میں اس کے پاس ایک ہی چیز رہ گئی تھی اور وہ تھی بیان۔ وہ جانتا تھا کہ جارج کو بری کروانے کے لیے اب صرف ایک بہت ہی دھانسو قسم کے بیان کی ضرورت تھی اور وقت آنے پر اس نے وہ بیان دیا بھی۔

شکل و صورت اور حلیے سے وہ کوئی فلم ایکٹر لگتا تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود خواتین کی نظریں اس پر جمی رہتی تھیں۔ وہ بے شک ایک اچھا مقرر تھا۔ اس نے بے شمار کیس جیتے تھے اور اگر اس نے جارج کا کیس ہاتھ میں لیا ہوتا تو نوبت یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔ میں چونکہ شروع ہی سے اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ تھا اور اس کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کرچکا تھا لہٰذا اس کے بیان کے صرف وہ حصے سنے جو سننے کے قابل تھے۔ دونوں وکلا کی نوک جھونک خاصی دلچسپ تھی۔ اس کے بعض فقروں پر عدالت کا کمرا قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ پستہ قامت ریکٹ ایک جیتا جاگتا فتنہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت طنز آمیز تاثرات بکھرے رہتے تھے اور وہ طنز کے تیر چلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایک موقع پر ہوریس گشتی پولیس مین ویٹی کے بیان کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے، جائے واردات کی منظر کشی کررہا تھا اور عدالت کو بتا رہا تھا کہ جب گولی چلی تو مجرم جارج لاش سے کتنے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس وقت چاند کی کیا پوزیشن تھی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے میں ریکٹ نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ بکھیر کر تبصرہ کیا۔

"مسٹر ہوریس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے چاند کو بطور گواہ طلب نہ کرکے فاش غلطی کی ہے۔"

اس کے اس تبصرے پر عدالت کا کمرا زعفران زار بن گیا۔ اس کے جواب میں ہوریس نے کہا۔ "اگر چاند کو بطور گواہ طلب کیا جاسکتا تو ویٹی کو طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔"

اس کی اس بات پر کوئی نہیں ہنسا۔ اس کے بعد ہوریس نے ریکٹ کو آڑے ہاتھوں لیا اور مدعا علیہ کے حمایتی چہکنے اور قہقہے لگانے لگے۔ ریکٹ ہم میں سے کسی کی بھی نگاہ میں پسندیدہ نہیں تھا لیکن اسے ملزم کو سزائے موت دلوانے کا قانونی حق حاصل تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہوریس جیوری روم میں مقبول تھا۔ لیکن وہ ریکٹ کے مقابلے میں پسندیدہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ایک کیس ہار رہا تھا لیکن اس کے باوجود جم کر لڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی دونوں وکلا لڑ پڑتے اور جج کو انہیں تنبیہ کرنی پڑتی۔

☆☆☆

سارے گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد وکلاء کے دلائل کا آغاز ہوگیا۔ ریکٹ کا بیان ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔ اخبارات نے اس کا نام جلاد رکھا تھا کیونکہ وہ اس کیس میں صرف پھانسی کا طلب گار تھا۔ اس نے بہت سے دلائل دیے جن میں کچھ ٹھوس تھے اور کچھ بے بنیاد۔ سب سے غور طلب نکتہ یہ تھا کہ اب تک قتل کے محرک کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ گواہان کے بیانات سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی لیکن قتل کا محرک تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ویٹی کی گواہی کے بعد کیس مکمل ہوگیا تھا۔ ملزم جارج کسی بھی وجہ سے ہوورڈ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور یہی بات سب سے اہم تھی۔ اس نے ایک انسانی جان لی تھی لہٰذا قانوناً اس کے بدلے اس کی جان لی جانی چاہیے تھی۔

ہوریس نے اپنے بیان میں پہلے تو اس کیس کے دوران ریکٹ کے رویّے کی شکایت کی اور پھر ملزم جارج کو حالات کا شکار قرار دیتے ہوئے اس کی شرافت، نیک نامی اور سادہ لوحی کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس شخص نے اپنی حماقت سے ضرورت سے زیادہ پی کر خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کرلیا ہے۔ اس کی تقریر خاصی متاثر کن تھی اور اس نے جس طرح وہ واقعہ بیان کیا، اس سے اس منظر کی تصویر سی نگاہوں کے سامنے کھنچ گئی تھی۔ ملزم جارج نشے میں دھت تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کس سمت جا رہا

مہلت

لڑکا۔ "آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کردیں۔ میں اسے سونے میں تول دوں گا۔"

باپ۔ "مجھے کچھ دن کی مہلت دے دو۔"

لڑکا۔ "شادی کی تیاری کرنی ہے کیا؟ ویسے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

باپ۔ "دراصل میں نے بیٹی کو ڈائٹنگ سے منع کرنا ہے تاکہ اس کا کچھ وزن بڑھ جائے۔"

ایک گھنٹا

ایک اسٹیشن سے ایک بڑی مونچھوں والے خان صاحب گاڑی میں سوار ہوئے اور سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مسلسل اپنی دائیں مونچھ کو مروڑتے رہے۔ جب وہ اپنی منزل پر اترنے لگے تو ایک مسافر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "خان صاحب آپ کی بائیں مونچھ ایک گھنٹا پیچھے ہے۔"

جرمانہ

چلتی گاڑی میں بیٹھی ایک خاتون نے زنجیر کھینچ دی۔ ٹی ٹی کچھ دیر بعد ڈبے میں آدھمکا اور بولا۔ "زنجیر کس نے اور کیوں کھینچی؟"

خاتون بول اٹھی۔ "کیا گاڑی کے ٹکرانے کا اندیشہ ہے؟"

"کیوں؟"

"دراصل میں انڈے لے جارہی ہوں۔" خاتون بولی۔

ٹی ٹی نے غصے سے کہا۔ "گاڑی کے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں انشاء اللہ۔ آپ زنجیر کھینچنے کا سو روپیا جرمانہ ادا کریں۔"

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

عجیب وغریب مہارانی!

اٹھارویں صدی کے وسط میں جودھپور راج گھرانے کی سابقہ ملکہ، مہارانی کنور بائی اپنے زمانے کی ایک عجیب و غریب خاتون تھیں۔ ہر روز ان کے غسل کے لیے 150 سیر تازے گلاب کا عرق نکال کر رکھا جاتا تھا۔ پھر کنیزیں ان کو اس عرقِ گلاب سے تقریباً دو گھنٹے تک نہلاتی تھیں۔ پھر ایک دن کسی نے کہا کہ اگر آپ خچر کے خون سے نہائیں تو اور نکھار پیدا ہوگا۔ بس پھر کیا تھا محل میں روز خچر کٹنے لگے اور وہ خچر کے خون سے نہا کر سکون پاتی رہی۔

مرسلہ۔ دلدار حسین، حیدرآباد

ہے۔ ایسے میں گولیاں چلیں اور وہ مقتول کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قاتل کا ریوالور لاش کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھالیا اور ویٹی نے موقع واردات پر پہنچ کر اسے گرفتار کرلیا جبکہ اصل قاتل اپنی جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔ ایک دربان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا بھی لیکن اس اندھے کو اس کی شکل نظر نہیں آئی۔

ہوریس کے بیان کی روشنی میں ہم نے بے شک اس دربان کی گواہی اور مسز پیٹرسن کے بیان کو مدنظر رکھا تھا، جس کا بیشتر حصہ قہقہوں کی نذر ہو گیا تھا لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا کہ مسز پیٹرسن نے حقیقتاً آوازیں سنی تھیں۔ دو پراسرار افراد آپس میں لڑتے ہوئے گزر رہے تھے اور ان کی آوازیں خاصی بلند تھیں پھر ہوریس نے اس تصویر کا حوالہ دیا جو بے حد اہم تھی اور جس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ وہ تصویر ملزم جارج کو بے گناہ قرار دیتی تھی۔ تصویر مقتول کے پاس سے یا پھر جارج کے پاس سے برآمد ہونی چاہیے تھی کیونکہ جارج کو اسے پھینکنے یا چھپانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ہوریس کا بیان بلاشبہ ایک عمدہ بیان تھا۔ اس نے جارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس کی بے داغ زندگی اور اس کے معزز دوستوں کا حوالہ دیا۔ ساتھ میں یہ کہا کہ کیا ایک ایسا شخص جس نے کبھی ریوالور کو ہاتھ نہ لگایا ہو، نہیں سے کسی کا ریوالور مانگ کر یا چرا کر ایک ایسے شخص کو قتل کرسکتا ہے جسے اس نے زندگی میں نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی جس کے بارے میں سنا تھا۔ ہوریس کے دلائل سن کر ہر شخص اش اش کر اٹھا لیکن ریکٹ نے اپنے آخری بیان میں اس کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ لاکھ قیاس آرائیاں کریں، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ملزم جارج ریوالور بدست لاش کے قریب کھڑا تھا اور ریوالور سے گولیاں چلی تھیں اور جہاں تک نشے میں ہونے کا تعلق ہے تو یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں، دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔''

اتنا کہہ کر اس نے ہونٹوں کے ایک گوشے کو مخصوص انداز میں خم دیتے ہوئے مزید کہا۔ ''اگر جیوری یہ سمجھتی ہے کہ مدہوشی سفاکانہ قتل کا جواز بن سکتی ہے تو ملزم کو بری کر دے تاکہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو اور لوگ شراب پی کر بے گناہوں کو قتل کرنے نکل کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی جانوں کو شرابی درندوں سے، خواہ وہ کتنے ہی نیک نام اور معزز کیوں نہ ہوں محفوظ رکھنا ہی ہمارا فرض ہے تو خصوصی طور پر ملزم جارج کو سزائے موت دے کر ایک اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔''

ریکٹ کا بیان اگرچہ ہوریس کے بیان سے زیادہ متاثر کن نہیں تھا لیکن اس سے بہت زیادہ مدلل اور قائل کرنے والا تھا اور جہاں تک جیوری کا تعلق تھا، تو وہ بہت پہلے ہی جارج کے لیے سزائے موت تجویز کر چکی تھی۔ سب سے آخر میں جج نے .... دونوں وکلاء کے دلائل کی روشنی میں جو کچھ اخذ کیا تھا، پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ اس کا بیان... بہ حیثیت مجموعی سرکاری وکیل کی جانب داری کر رہا تھا جو غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس نے آخر میں ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں ملزم جارج کے جرم پر شک ہے تو ہم پر منحصر ہے کہ اسے سزائے موت دیں یا بری کر دیں۔ اس کے اس بیان کے بعد ہم سب اٹھ کر جیوری روم میں چلے گئے اور مقدمے کی اس کارروائی کی روشنی میں فیصلے پر بحث مباحثے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ڈین نامی ایک انتہائی تنگ نظر اور آدم بیزار شخص جیوری کا سربراہ تھا۔ وہ شروع ہی سے خود کو اتنی اہمیت دیتا آرہا تھا گویا اسے ڈبلن کی وزارت مل گئی ہو۔ وہ اس سے پہلے بھی جیوری کے فرائض انجام دے چکا تھا لیکن سربراہ کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ سارے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھا۔ سارے کے سارے گیارہ ارکان جیوری متفقہ طور پر جارج کو سزائے موت دینے کے حامی تھے اور صرف ایک رکن ایسا تھا جو اسے بری کروانے کے حق میں تھا۔ یہ انکشاف قرعہ اندازی کے ذریعے ہوا تھا۔ میں اس واحد رکن کو جانتا تھا لہٰذا باقی گیارہ ارکان کو شش و پنج میں مبتلا رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''دوستو! وہ رکن میں ہوں۔'' میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ''مجھے قائل کرو۔''

میرا یہ جملہ کسی بم کے گولے کی طرح ان کے سروں پر پھٹا۔ انہیں اس گولے کی توقع نہیں تھی۔ خاص طور سے ہمارا سربراہ ڈین تو ایسا بوکھلایا کہ مجھ سے اس طرح لڑنے لگا گویا یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو۔ اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے سے قاصر تھا کہ میں ان کے متفقہ فیصلے کی مخالفت بھی کرسکتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہم فوراً اس کے فیصلے کی تائید کر دیں گے اور وہ اسی وقت جج کو اس فیصلے سے آگاہ کر کے اس کا سہرا اپنے سر باندھ لے گا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو وہ جھلا اٹھا۔ پہلے پہل بقیہ ارکان کو میری یہ مخالفت مضحکہ خیز لگی۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں ملزم جارج کو بے گناہ کیوں تصور کر رہا ہوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ ساری شہادتیں اس کے خلاف ہیں اور اسے مجرم ثابت کرتی ہیں۔ انہیں اس سے ہمدردی ضرور تھی لیکن جہاں تک بے گناہی کا تعلق تھا تو......

''مسٹر رسل۔'' ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ ایک بالکل عام سا کیس ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وکیلِ صفائی ہوریس نے مقدمے کی بہت اچھی پیروی کی لیکن وہ اپنے موقف کی حمایت میں ایک بھی ٹھوس دلیل نہ دے سکا۔ میں عجلت میں کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہوں۔ اگر مجھے اس کے جرم پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں دوسروں کے فیصلے کو مسترد کر دیتا لیکن مجھے اس کیس میں شک کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہیں آرہی ہے۔ ملزم جارج بے شک مجرم ہے۔ اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔''

''اسے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس نے پی رکھی تھی اور شومئی قسمت کہ موقع واردات پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ قاتل اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پھنسا کر فرار ہو گیا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے اور ہوریس کا بھی یہی خیال ہے کہ ملزم عین وقت پر جائے واردات پر پہنچ گیا اور نشے میں ہونے کے باعث اس نے لاش کے قریب پڑا ہوا پستول غیر ارادی طور پر اٹھا لیا۔ عین اسی لمحے گشتی سپاہی ویٹی موقع واردات پر پہنچ گیا اور اس نے اسے ریوالور سمیت گرفتار کرلیا۔ میرے خیال میں قاتل نے فرار ہوتے وقت پستول اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا اور چونکہ وہ مدہوش تھا، اس نے وہ پستول لے لیا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔''

''بکواس۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اس نے یہ جرم ایک منصوبے کے تحت کیا تھا اور شراب اس لیے پی رکھی تھی کہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔''

''تمہارے خیال میں وہ مقتول ہووارڈ سے واقف تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بے شک۔'' ان سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا۔

''لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ریکٹ نے بھی یہی کہا تھا لیکن وہ کوئی ثبوت نہ پیش کرسکا۔''

''اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔'' ڈین نے لب کھولے۔ ''کیس کے مطالعے سے یہ بات از خود عیاں ہو رہی ہے، اگر وہ مقتول سے واقف نہ ہوتا تو اسے گولی کیوں مارتا؟''

''وکیلِ صفائی بھی یہی جاننا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اور چونکہ وہ اس سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ اور اس گم شدہ تصویر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ایسی کوئی تصویر مقتول کے پاس نہیں تھی۔'' ڈین سرے سے منحرف ہو گیا۔ ''ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جس شخص نے یہ گواہی دی تھی، وہ جھوٹ بول رہا تھا۔''

''تمہاری نانی اماں کا سر۔'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''اس شخص نے ہووارڈ کے قتل ہونے سے صرف ایک گھنٹا قبل وہ تصویر اس کے پاس دیکھی تھی۔ اگر اس تصویر کا سراغ لگ جاتا تو ہمیں ایسی بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا جن کا ہمیں علم نہیں ہے اور جارج کے سر پر تلوار نہ لٹک رہی ہوتی۔ آپ حضرات محض اس وجہ سے ملزم کے خلاف ہیں کیونکہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ میں اس کے لیے آپ لوگوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ چونکہ اس نے شراب پی رکھی تھی لہٰذا قتل بھی اسی نے کیا ہے۔''

''یہ سراسر جھوٹ ہے کہ ہم کسی خاص وجہ سے تمہارے خلاف ہیں۔'' ڈین بولا۔ ''لیکن میرے خیال میں یہ فرض کرنے کی ایک اچھی وجہ ہے۔''

یہ بحث یونہی چلتی رہی اور دس روز گزر گئے لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے ایک دو شہادتیں کھنگالیں لیکن گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ بجز میرے ہر شخص جارج کو مجرم تصور کر رہا تھا اور ان میں سے بعض اسے پھانسی پر لٹکانا چاہتے تھے۔ بحث جوں جوں بڑھ رہی تھی، لوگوں کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جارج اور میرے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ میں انہیں زہر لگنے لگا تھا۔ میری باتیں انہیں زہر لگتی تھیں۔ بہت ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ مجھے رشوت دی گئی ہے جبھی میں نے معاملے کو اب تک لٹکا رکھا ہے۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگ گھر سے دور تھے اور ان کے اہلِ خانہ ان کی واپسی کے منتظر تھے جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں کنوارا تھا اور گھر پر میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ مجھے جارج کی گردن بچانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس دوران جج گاہے بگاہے اپنے

پیش کار کو ہمارے پاس بھیجتا رہتا تاکہ ہماری پیش رفت سے آگاہ ہو سکے اور یہ جان سکے کہ ہم کسی فیصلے پر پہنچ سکے ہیں یا نہیں۔ بارہا مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ تنگ آ کر جیوری کو برخاست نہ کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ بھی اس صورتِ حال سے محظوظ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جلد یا بدیر میں ہتھیار پھینک دوں گا۔

☆☆☆

کبھی کبھی پیش کار بھی ہماری بحث میں شامل ہو جاتا۔ اس کے خیال میں، میں ایک ضدی شخص تھا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح جارج کو مجرم تصور کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھ سے کہتا۔ ”آخر تم اتنے ہلکان کیوں ہو رہے ہو؟ کہیں تمہارا جنازہ تو نہیں نکل رہا؟ جلدی سے کسی فیصلے پر پہنچ کر چھٹی کرو۔ ہمیں گھر بھی واپس جانا ہے۔“ اور کبھی کہتا۔ ”آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ چیف جسٹس یا گورنر؟ تمہیں یہ باور کروانے کا کیا حق ہے کہ جارج مجرم نہیں ہے۔ جبکہ گیارہ معزز ارکان کہتے ہیں کہ وہ مجرم ہے۔ کیا تم خود کو دوسروں سے زیادہ ذہین سمجھتے ہو؟“

اس قسم کے بحث مباحثے ہوتے رہے لیکن وہ لوگ مجھے میرے مؤقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکے اور تب انہوں نے مجھے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا کھانا ایک مخصوص ہوٹل سے آتا تھا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میرا کھانا خاصا بدمزہ ہوتا تھا پھر ایک رات کسی نے میرے بستر پر پانی انڈیل دیا۔ میرے کپڑے پراسرار طریقے سے اس وقت غائب ہو جاتے جب مجھے باہر نکلنا ہوتا۔ یہ روزانہ کا معمول بن گیا پھر ان سب نے مجھ سے بول چال ترک کر دی لہٰذا مجھے بھی ان سے بول چال ترک کرنی پڑی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال گزرتا کہ ان میں سے کوئی مجھے ایک دو ہاتھ جڑنے کا ارادہ بھی کر رہا ہے۔

بالآخر گیارھویں دن پیش کار ہمارے پاس آیا اور اس نے مژدہ سنایا کہ اگر ہم آج کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو جج ہمیں برخاست کر دے گا۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو مگر اس کی یہ بات سن کر سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن میں دل میں پریشان ہوا۔

”اب یہ سارا معاملہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔“ میں نے سوچا۔

☆☆☆

اس دن وہ لوگ مجھ سے اتنے ناراض نہیں تھے لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر جج نے جیوری کو برخاست کر دیا تو اس کا یہ مطلب [illegible] کہ جارج پر دوبارہ مقدمہ چلایا جائے گا اور میں [illegible] تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ ہرگز نہیں بچ سکے گا۔ میں نے [illegible] معاملے پر کافی غوروخوض کیا۔ اب میرے سامنے [illegible] ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ [illegible] کے بعد میں نے [illegible] مخاطب کیا۔

”معزز ساتھیو...! اب اس الجھن کو ختم [illegible] ہو جانا چاہیے۔ ہم اب تک کسی متفقہ فیصلے پر پہنچنے [illegible] قاصر رہے ہیں اور میرے خیال میں جج بھی یہی [illegible] ہے کہ ہم کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکیں لیکن مجھے یہ صورت [illegible] قبول نہیں ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جارج میری [illegible] آپ ہی کی طرح بے گناہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ [illegible] جیوری اسے مجرم قرار دے بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ یہ جیوری اسے بری کر دے۔

”گزشتہ رات میں نے اس کیس پر ازسرِنو [illegible] غوروخوض کیا اور اب میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ [illegible] ولیم اسمتھ کے گھر پر وہ واقعہ کس طرح پیش آیا [illegible] یوں سمجھ لیں کہ وہ سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے [illegible] پذیر ہوا تھا۔ بہرحال واقعہ کچھ یوں ہے...... فرض [illegible] آج سے تقریباً تین سال قبل اسمتھ نامی ایک شخص [illegible] تھا۔ اسے ایک لڑکی سے عشق تھا۔ وہ ایکسرے [illegible] کچھ کام کرتا تھا اور اوہائیو کے ایک شہر میں رہتا تھا۔ [illegible] ایک لڑکی سے عشق تھا۔ لڑکی بھی وہیں رہتی تھی۔ میرے خیال میں اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ [illegible] محبوبہ سے شادی کر سکتا۔

”شب و روز اسی طرح گزرتے رہے اور ان [illegible] پھلتا پھولتا رہا۔ دونوں اس دن کی آس میں جی رہے [illegible] کبھی نہ کبھی ان کی شادی ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ اگر وہ دونوں چاہتے تو اس [illegible] میں بھی شادی کر سکتے تھے لیکن فرض کیجیے کہ اسمتھ [illegible] دوسرے شہر میں پیسا کمانے کا سنہرا موقع مل گیا اور [illegible] گیا۔ لڑکی بے شک اس کا انتظار کرتی رہی اور ممکن ہے [illegible] کیا ہو لیکن اسی اثنا میں ایک اور لڑکا درمیان میں آ گیا۔ [illegible] کیجیے وہ ہارڈ ویئر سیلز مین تھا اور گاہے بگاہے اس [illegible] کاروباری دورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ خوب رو، صحت مند [illegible] حال تھا۔ وہ بھی اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس [illegible] ہووارڈ تھا۔“

وہ سب میرے اس انکشاف پر ہکابکا رہ گئے۔ [illegible] پہل وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ میں کیا بیان کر رہا ہوں لیکن اب وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے تھے۔

”بہرحال......!“ میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”آپ یہ سب کچھ فرض کر لیں تو باقی معاملہ سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ دنیا میں طرح طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ اسمتھ کی عدم موجودگی میں ہووارڈ اس لڑکی کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اسمتھ کے خلاف لڑکی کے کان بھرتا ہے۔ اسے اس کے متعلق عجیب کہانیاں سناتا ہے۔ لڑکی کا باپ اس کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ لڑکی اسمتھ کے خطوط کا جواب دینا چھوڑ دیتی ہے پھر ایک دن اسمتھ کو اس کا ایک خط موصول ہوتا ہے جسے پڑھ کر اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے شہر سے آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اور وہ واپس جا کر اپنی محبوبہ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جبکہ اس کی محبوبہ نے لکھا تھا کہ وہ ہووارڈ سے شادی کر رہی ہے لیکن آپ اس کے لیے لڑکی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہووارڈ جھوٹا، مکار اور سخن طراز تھا۔ اس نے لڑکی کو اسمتھ سے بدظن کر دیا تھا اور اسمتھ اس کی باتوں کو جھٹلانے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ اس غریب کو تو خبر ہی نہیں تھی کہ ہووارڈ نے کیسی کیسی باتیں اس سے منسوب کر کے لڑکی کو سنائی تھیں اور اس نے اسے اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے قطعی لاعلم تھا لہٰذا وہ سخت حواس باختہ ہو گیا لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ لڑکی نے اس سے بے وفائی کی اور بس۔ ہو سکتا ہے اس واقعے نے اس کا دل نہ توڑا ہو۔ مردوں کے دل اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ ہاں انہیں ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہووارڈ کو شروع سے ناپسند کرتا آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ یہ عام سی ناپسندیدگی تھی جو مردوں میں ایک دوسرے کے لیے پائی جاتی ہے۔ بہرحال اسمتھ جہاں تھا، وہیں رہا۔ چند دنوں کے بعد اسے اپنی محبوبہ کی شادی کی خبر موصول ہوئی اور عشق کا وہ باب ختم ہو گیا۔ کم از کم اسمتھ نے اپنے تئیں یہی سمجھا اور ممکن ہے ہووارڈ نے بھی یہی سمجھا ہو......“

وہ سب اپنی جگہ خاموش تھے۔ شاید انہیں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا لیکن ڈین آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

دعا

دعا پر اعتقاد ہی نیکی ہے، جب ہم تنہائی اور خاموشی میں دعا مانگیں تو ہم اس یقین کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تنہائی میں ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی سنتا ہے۔ دعا میں خلوص آنکھوں کو پُرنم بنا دیتا ہے۔ یہی آنسو دعا کی منظوری کی دلیل ہیں۔

دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دعا زمانے بدل دیتی ہے۔ یہ گردشِ روزگار کو روک اور آنے والی بلاؤں کو ٹال سکتی ہے۔ دعا میں بڑی قوت ہے۔ جب تک سینے میں ایمان ہے، دعا پر یقین رہتا ہے۔ جس کا دعا پر یقین نہیں، اس کے سینے میں ایمان نہیں۔

اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں ہماری دعاؤں کی افادیت سے مایوس نہ ہونے دے۔ آمین

طالب حسین طلحہ، ہائی سیکیورٹی،
نیو سینٹرل جیل، ملتان

لفظوں سے خوشبو آئے

میرا مشاہدہ ہے کہ لوگ ترقی کرنے کے لیے دو مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی ٹانگ کھینچتے ہیں اور انہیں پیچھے دھکیل کر خود آگے ہونا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً ناکام رہتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی سعی کرتے ہیں وہ عموماً نہیں بلکہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

(Elihu root)

☆ سوچنا اور غوروفکر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ یہ زحمت گوارا کرتے ہیں۔ (ہنری فورڈ)

☆ لوگ پہاڑوں پر سے نہیں اکثر کنکروں پر سے پھسلتے ہیں۔ (کنفیوشس)

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

"بہت خوب۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "میں تمہارے تخیل کی داد دیتا ہوں۔ تم اس پر ایک اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن جارج کا اس کہانی سے کیا تعلق؟"

"مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے، یہ ایک فرضی داستان ہو لیکن تم دیکھو گے کہ یہ حقیقت کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے...... پھر وقت گزرتا رہتا ہے۔ کئی سال بیت جاتے ہیں۔ ایک روز اسمتھ کو لڑکی کی ماں کا ایک خط موصول ہوتا ہے۔ وہ اسمتھ کو شروع ہی سے پسند کرتی آئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی بیٹی یعنی مسز ہووارڈ مرگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شروع سے آخر تک ہووارڈ کا سارا کچا چٹھا بیان کردیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی کے بعد ہووارڈ نے اس کی بیٹی کو ایک لمحے کا بھی سکھ نہیں دیا تھا۔ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اس کی انہی حرکتوں نے اس کی بیٹی کی جان لے لی تھی۔ وہ اس سے طلاق لے سکتی تھی لیکن وہ اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ طلاق لینے کے بجائے اس نے خودکشی کرلی تھی۔ آپ سوچ سکتے ہیں وہ کتنی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہی ہوگی۔ آپ لوگوں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ ممکن ہے، آپ کو تصویر دیکھ کر اس کی فطرت کا اندازہ ہوگیا ہو۔

"بہرحال اسمتھ اس کے خط کا جواب دیتا ہے اور تعزیت کرنے کے ساتھ ہی لکھتا ہے کہ اگر ہووارڈ کبھی اسے مل گیا تو وہ اس کا بہت برا حشر کرے گا کیونکہ وہی لڑکی کی خودکشی کا ذمے دار تھا۔ ایسے ہی جیسے اس نے اس معصوم ہستی کا قتل کیا ہو۔ ہم اسے قتل نہیں کہہ سکتے لیکن کیا واقعی یہ قتل نہیں تھا؟"

ان میں سے نصف درجن ارکانِ جیوری نے میری تائید میں سر ہلایا۔ وہ سب کے سب شادی شدہ تھے۔ ممکن ہے ان کی بیٹیاں بھی ہوں۔ میں نے سلسلۂ کلام از سرِ نو جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"لڑکی کی ماں نے اس کے سارے کرتوت اسمتھ کے گوش گزار کردیے تھے اور اب وہ جان گیا تھا کہ ہووارڈ نے کس طرح اسے اپنی راہ سے ہٹایا تھا۔

"پھر ایک رات ان دونوں کی مڈبھیڑ ولیم اسٹریٹ کے نکڑ پر ہوگئی۔ یہ وہی رات تھی جب مسز پیٹرسن اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کررہی تھی۔ اسے نزلے کی شکایت نہیں تھی۔ یہ لڑکی کی خودکشی کے بہت عرصے بعد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دونوں رقیبوں کی سرِراہ ملاقات ہوئی تھی اور ہووارڈ، اسمتھ کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا جبھی اسمتھ کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے۔"

وہ سب ہمہ تن گوش تھے کیونکہ اب ان پر حقیقت واضح ہوتی جارہی تھی کہ میں اسمتھ سے اور اس کی داستانِ حیات سے واقف ہوں اور میں بے شک واقف تھا۔ تاہم ان میں سے ایک نے فقرہ چست کیا۔ "معلوم ہوتا ہے، تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "اس رات ایک بار پھر ان دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ ہووارڈ اس ناگہانی مڈبھیڑ کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے پاس ریوالور موجود تھا۔ وہ اس پچھلی ملاقات کے بعد سے ہر وقت اپنے پاس ریوالور لیے پھرتا تھا۔ دراصل وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا جبکہ اسمتھ قطعی غیر مسلح تھا۔ وہ ہووارڈ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ملاقات اتفاقیہ تھی۔ دونوں میں تلخ کلامی ہونے لگی۔ ہووارڈ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ مسز پیٹرسن نے انہیں اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی بحث و تکرار سنی تھی۔ اسمتھ نسبتاً خاموش تھا۔ وہ ایک فیصلہ کرچکا تھا اور اب اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ہووارڈ کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا۔ بالآخر ہووارڈ نے اپنی بیوی سے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر اپنے پرس میں سے اس کی ننھی سی تصویر نکال لی اور مگرمچھ کے آنسو بہانے لگا۔ اس کی اس ریاکاری پر اسمتھ کا خون کھول اٹھا۔ اس نے وہ تصویر جھپٹ لی اور دوسرے ہاتھ کا مکا پوری قوت سے اس کے منہ پر مارنا چاہا مگر ہووارڈ نے پھرتی سے غوطہ لگایا، ساتھ ہی اپنا ریوالور بھی نکال لیا۔ اسمتھ نے اس کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا اور اسی کشمکش میں ریوالور چل گیا لیکن پہلا فائر ہوائی تھا۔ اس کے بعد مزید دو فائر ہوئے۔ میں سچ سچ اسمتھ کی طرف داری نہیں کررہا۔ ممکن ہے اس وقت اس سے غیر ارادی طور پر وہ حرکت سرزد ہوگئی ہو اور وہ اس حرکت کا ذمے دار نہ ہو یا ممکن ہے، ذمے دار ہو۔ ہووارڈ نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسمتھ نے اس پر دو فائر جھونک دیے۔ ایک ہی سیکنڈ میں معاملہ ختم ہوگیا اور اسمتھ ایک قاتل بن گیا۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم وہ حرکت کرگزرتے ہیں جس کے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، کوئی منصوبہ نہیں بناتے۔ ممکن ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے اندر ایک جانور چھپا بیٹھا ہے، جو کبھی کبھی ہم پر غالب آجاتا ہے۔ آپ اسے اشتعال کہہ لیں۔"

ڈین غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور اب مجھ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ "یہ اسمتھ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ "کیا جارج ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسمتھ وہ شخص ہے جسے دربان نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جارج کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ عین وقت پر جائے واردات کے پاس سے نشے میں چور ڈگمگاتا ہوا گزرا تو یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔ اسمتھ جو اپنی اس حد درجہ سنگین غلطی پر انتہائی دہشت زدہ تھا اور موقع واردات سے فرار ہونا چاہتا تھا، اپنی محبوبہ کی وہ ننھی سی تصویر اٹھا کر اور مقتول کا ریوالور جارج کو تھما کر بھاگ گیا۔ اس نے اتنی چڑھا رکھی تھی کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جرم کی صحت سے انکار کردیا لیکن اس وقت تک اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔"

میں نے اتنا بیان کرنے کے بعد ایک لمحہ توقف کیا اور ایک گہری سانس خارج کرکے دوبارہ لب کھولے۔ "یہ ہے اس قتل کا پس منظر...... اور اب ہمارے کرنے کے لیے ایک ہی کام رہ گیا ہے وہ یہ کہ جارج کو باعزت بری کردیں۔"

ان سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ چند لمحے تک وہ سب ایک ٹک مجھے گھورتے رہے پھر ڈین کے پیکر میں جان پڑ گئی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔ "رسل! یہ بلاشبہ ایک اچھی کہانی ہے اور اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو تم یقیناً اس شخص کو جانتے ہوگے۔ میری مراد اسمتھ سے ہے۔ نیز تمہیں اپنی کہانی... سچ ثابت کرنا پڑے گی اور جونہی یہ سچ ثابت ہوئی، ہم جارج کو باعزت بری کردیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن اگر تم جارج کو بے گناہ ظاہر کرکے رہا کروانے کے لیے یونہی والی کہانی سنا رہے ہو تو......"

"بہتر ہے۔" میں درمیان میں ہی بول پڑا۔ "تمہیں بطور ثبوت کیا چاہیے؟"

اس نے ایک لمحہ غور کیا اور پھر لب کھولے۔ "اگر تم اسمتھ کو پیش کردو تو بات بن جائے گی۔ کیوں دوستو! لیکن اسمتھ کو وہ تصویر پیش کرنی پڑے گی تاکہ ہمیں یقین آجائے کہ وہی اسمتھ ہے اور اس کی کہانی سچی ہے۔ میرے خیال میں، وہ تصویر ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے، کیوں دوستو؟" باقی ارکانِ جیوری نے اس سے اتفاق کیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی باتوں سے اتفاق کرتے تھے سوائے میرے......

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسمتھ کا کیا بنے گا؟ کیا وہ جارج کی جگہ لے لے گا؟ تم لوگوں کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے کیا تم لوگ اسے ہووارڈ کے قتل کے الزام میں تختۂ دار پر لٹکا دو گے؟ واضح رہے کہ میں نے جو کچھ کہا، سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت تم لوگ اسمتھ کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہو۔ تم اسے سزائے موت دو گے یا رہا کردو گے؟ اگر تم نے عدالت کو اسمتھ کے بارے میں بتادیا تو دوسری جیوری اس معاملے کو اس طرح نہیں دیکھے گی جس طرح تم لوگوں نے سمجھا ہے۔ تم لوگوں پر حقیقت منکشف ہوگئی ہے۔ کہو، کیا کہتے ہو؟"

"ہم اسے رہا کردیں گے۔" ایک نے کہا۔

دوسروں نے بھی اس پر غور کیا لیکن ان کا جواب ان کے چہرے پر تحریر تھا۔ وہ اسمتھ کو رہا کرنے کے حق میں تھے۔ اس سے جو غیر شعوری فعل سرزد ہوا تھا، وہ کسی سے بھی سرزد ہوسکتا تھا۔

"یہ رہی وہ تصویر......!" میں نے تصویر اپنی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "اسے خوب غور سے دیکھو۔ یہ قتل کی اس رات سے اب تک میری جیب میں پڑی ہوئی ہے اور اب مجھے غور سے دیکھو...... میں ہی اسمتھ ہوں۔"

کمرے کے ایک سرے سے دوسرے تک زبردست سنسنی پھیل گئی۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے ایک ٹک مجھے گھورتے چلے گئے۔ بہت دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ تصویر وہی تھی۔ انہوں نے وہ تصویر درجنوں بار اخبارات میں دیکھی تھی۔ کبھی وہ تصویر کو، کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے۔ ان سنسنی خیز لمحات میں مجھے پھانسی کا پھندا اپنی گردن پر پھنسا ہوا محسوس ہورہا تھا لیکن میں ان کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ ان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا لیکن انہیں میری بات پر یقین آگیا تھا پھر ان میں سے ایک پستہ قامت رکن نے جو جارج کو سزائے موت دینے کا زبردست حامی تھا، خوش طبعی سے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ڈرومت، ہم میں سے کوئی بھی تم پر فردِ جرم عائد نہیں کرے گا۔ آؤ دوستو! یہ آخری قرعہ اندازی ہے۔ جارج بے گناہ ہے اور اسمتھ بھی بے گناہ ہے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

محفلِ شعر و سخن

❁ جبران احمد ملک ...... گلشن اقبال، کراچی
کسی نے پھر ہمیں تسخیر کرلیا آخر
کوئی مثال تو آئی تری مثال کے بعد

❁ زاہد چودھری ...... چھور کینٹ
موسم ہجر میں یہ بارش کا برسنا کیسا؟
اک صحرا سے سمندر کا گزرنا کیسا؟
اے میرے دل نہ پریشان ہو تنہا ہوکر
وہ تیرے ساتھ چلا کب تھا بچھڑنا کیسا؟

❁ کمال انور ...... کراچی
اس کے بعد اور بھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا

❁ زخمی کرشن ...... عمرکوٹ
جو ستم کشوں کا ملتا دوا مرجھے شام غم کے سامنے
کبھی رو پڑا تبسم کبھی زخم مسکرائے

❁ احسان سحر ...... میانوالی
تنگ آچکے ہیں اب تو فریب نظر سے ہم
گھبرا گئے ہیں اپنے ہی دیوار و در سے ہم

❁ قیصر اعوان ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زبان سے ادا ہوئی
جو آنکھ سے کہنے کی بات تھی وہ حروف میں نہ سمائے گی
کوئی پھول چھتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے تمہیں زندگی ہی بتائے گی

❁ عبدالجبار رومی انصاری ...... لاہور
لاکھ خاموش رہیں ضبط کے خوگر ہوکر
آنسوؤں سے بھی تو کچھ راز عیاں ہوتا ہے

❁ جنید احمد ملک ...... گلستانِ جوہر، کراچی
جانے کیا مجھ سے زمانہ چاہتا ہے
میرا دل توڑ کر بھی مجھے ہنسانا چاہتا ہے
جانے کیا بات جھلکتی ہے میرے چہرے پہ
ہر شخص مجھے ہی آزمانا چاہتا ہے

❁ عتیق الرحمن، لیاقت گجر، ارشد کمسن ...... فیصل آباد
کیوں بھلا یاد دلاؤں انہیں وعدہ ان کا
پھر وہ کہہ دیں گے ہمیں تیری قسم یاد نہیں

❁ اسد عباس ...... سرگودھا
دنیا کے سب کارج چھوڑے نام پہ تیرے انشا نے
پہلے کیا غم تھوڑے تھے، تیرا عشق مزید ہوا

❁ امتیاز علی ...... سرگودھا
رات کو شمع کی مانند پگھل کر دیکھو
زندگی کیا ہے کسی طاق میں جل کر دیکھو
اپنے چہرے کو بدلنا تو بڑا مشکل ہے
جی بہل جائے گا آئینہ بدل کر دیکھو

❁ محمد اکبر تاج ...... لودھراں
چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

❁ تفسیر عباس بابر ...... اوکاڑہ
شبِ خیال وخواب حسین وصل کی وہ راتیں
مقسوم میں پھر ہجر کا زندان اس نے لکھ دیا
پس و پیش سا درپیش تھا بوقتِ رخصت یوں ہوا
قرطاسِ کذب وریا پہ اک بیان اس نے لکھ دیا

❁ سعدیہ بخاری ...... ضلع اٹک
اب کسی بات پہ کیا اس سے خفا ہونا ہے
زندگی بھر کے لیے جس سے جدا ہونا ہے
تم سے بچھڑے ہیں تو اب سینے کی محرابوں میں
کون دیکھے گا جو اک حشر بپا ہونا ہے

❁ مہرین ناز ...... حیدرآباد
جو ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا
اس شخص کے لوٹ آنے کا امکان سا کیوں ہے
مٹی کا بنا ہے تو پگھل کیوں نہیں جاتا
پتھر کا اگر ہے تو پھر انسان سا کیوں ہے

❁ راجہ افتخار علی ...... چوآسیدن شاہ (موہڑہ)
کبھی سجدے کبھی آنسو ہزاروں کوششیں لیکن
جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے نہیں ملتا

❁ عمران علی ...... عمرکوٹ تھرپارکر
کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے
مٹھی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

❁ شبانہ حسن ...... لاہور
سفر زیست میں چلتے چلتے
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
بے تحاشا محبت کرنے والے
سب چھوڑ جاتے ہیں

❁ محمد آصف شہزادہ ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اب تیرے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

❁ محمد قدرت اللہ نیازی ...... حکیم ٹاؤن، خانیوال
بلا کا تضاد ہے تیرے حسن و تکلم میں
نرم ہونٹوں سے بہت سخت بولتے ہو

❁ ایم رشید سیال ...... روہڑی، سکھر
لہجہ ایسا کہ مطمئن کردے!
لفظ سچے ہیں اس کے جھوٹ!

❁ طالب حسین طلحہٰ ...... نیو سینٹرل جیل ملتان
شامِ غم ایسی بلاخیز نہ دیکھی تھی کبھی
آسمان پہ نہ رہا کوئی بھی تارا باقی
اب نہیں جمتی نہیں محفل ارباب چمن
میں ہی رہ گیا اس بزم میں تنہا باقی

❁ احمد علی صدیقی ...... نیو سینٹرل جیل ملتان
ہم اپنے زخم دکھاتے کے زمانے میں
کسی نے قصۂ غم شوق سے سنا ہی نہیں
ملے جو اشک تو ہم پی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں کبھی ہوا ہی نہیں

❁ سید اکبر شاہ ...... مانسہرہ
خاک نکلی آرزو اگر نکلی
ہر سعی اپنی بے اثر نکلی
کوئی باخبر ہے دوراں سے
شکل اپنی ہی بے خبر نکلی

❁ ناصر علی صدیقی ...... رحیم یار خان
بہت سکون سے ہو میرے بن
جیسے الجھن کوئی سلجھ گئی ہو

❁ عبدالغفور خان ساغری خٹک ...... چھب، ضلع اٹک
بہت پختہ مزاج ہے وہ شخص
اسے یاد ہے کہ مجھے یاد نہیں کرنا

❁ زوہیب احمد ملک ...... گلستانِ جوہر، کراچی
اس طرح لیے پھرتے ہیں تیری محبت کو ہم
ٹوٹا ہوا بازو جیسے سینے سے لگا ہو

❁ عرفان احمد عاجز ...... چوآسیدن شاہ
بنا کے گردشِ دوراں کو زندگی ہم نے
یہ بارِ زیست اٹھایا ہنسی خوشی ہم نے
اٹھا کے ناز ترے صبح وشام جانِ کلیم
بڑھا دیا ترا اندازِ دلبری ہم نے

❁ ریاض بٹ ...... حسن ابدال
تم مکانوں میں ہو مقید تمہیں کیا معلوم
دل میں اخلاص ومحبت ہو تو گھر بنتے ہیں

❁ امجد ہرل ...... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
بچھڑ کے تجھ سے نہ دیکھے گئے وصال کے موسم
کسی کو ملتے ہوئے دیکھا تو ڈھانپ لیں آنکھیں

❁ سید محی الدین اشفاق......فتح پور، لیہ
یہ علم کا سودا، یہ رسالے یہ کتابیں
ایک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے

❁ کائنات مریم، عائشہ ثانی......حیدرآباد
ہم تو مٹی سے اگائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو، ستارے جاؤ

❁ احمد حسن عرضی خان......قبولہ شریف ہائی پاس
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے

❁ ہارون نمبرس......مردان
ذرا سی بھول پہ جنت سے نکلا
میں بہکا کب تھا بہکایا گیا ہوں

❁ رائمہ......کورنگی
کس منہ سے جاؤ گے خدا کے روبرو محشر میں تم
عمر ساری عشقِ بُتاں میں اب گزر جانے کے بعد

❁ نعیم الحسن شاہ......اسلام آباد
رہتے بھی دل میں ہو، دکھاتے بھی دل ہی ہو
اپنا مقام دیکھو اور اپنے کام دیکھو

❁ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
اس وطن کے واسطے دی جتنی قربانی نہ پوچھ
چشم گردوں کی مگر یہ فتنہ سامانی نہ پوچھ

❁ ڈاکٹر محمد عنصر عباس......خوشاب
دل کے دروازے پہ پھر سے ہے شناسا دستک
پھر وہی شخص نیا روپ لیے آیا ہے

❁ شازیہ کمال......نارتھ کراچی، کراچی
سفر کا بوجھ ہے سر پہ، لدے ہوئے زر سے
تھکے ہوئے مسافر، چلے تھے جو گھر سے

❁ نورین عباس......پشاور
اک ایسے عالم وارفتگی سے گزرا ہوں
جہاں سمیٹتا خود کو تو میں بکھر جاتا

❁ زرمین اعجاز......فیصل آباد
رستے گلیوں پہ ہنستے ہیں، آنکھیں ویرانی پہ
کیسا منظر بدل گیا اس خوش رفتار کے ساتھ

❁ افتخار احمد......کوٹری
اس عمر میں خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو وعدوں کے حوالے نہیں کرنا

❁ امجد عباس......کوئٹہ
اس قدر تنگ نہیں وسعتِ صحرائے جہاں
ہم تو اک اور ہی وحشت میں ملے ہیں تجھ سے

❁ مدحت......کراچی
جس بات کو پھرتے ہو چھپائے ہوئے دل میں
وہ بات کسی سے بھی چھپانے کی نہیں ہے

❁ محمد افضل......لاہور
وہ کوئی نشہ نہیں تھا کہ ٹوٹتا مجھ میں
وہ سانحہ بھی نہیں تھا کہ جو گزر جاتا

❁ اعجاز احمد......اسلام آباد
تم نے چاہا بھی تو کس حال میں چاہا ہے ہمیں
جب ہمیں وقت بدلتے ہوئے ڈر لگتا ہے

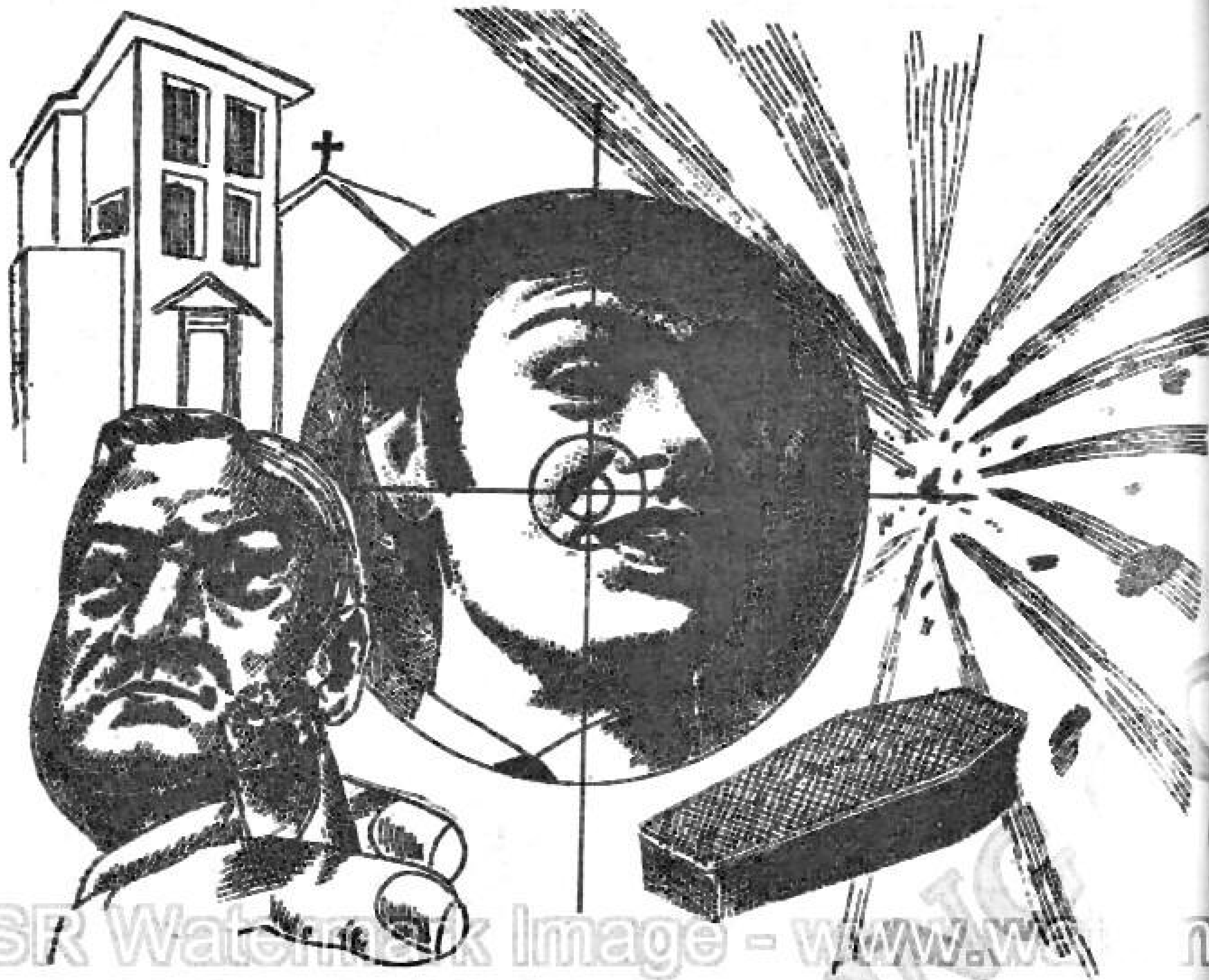
❁ بادل خان......پشاور
سنا ہے اب انہیں رستے فریب دیتے ہیں
جو لوگ چھوڑ گئے تھے مجھے شرارت میں

❁ ثانیہ......حیدرآباد
دکھائی کچھ نہیں دیتا نگاہ ہوتے ہوئے
بچا ہوا ہے وہ قاتل گواہ ہوتے ہوئے

❁ عنبرین خورشید......ملتان
اب جو تکتی ہے تو تنہائی یہی پوچھتی ہے
تم ہو بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے والے

❁ محمد فراز......کراچی
خاموشی سے ظلم سہے جاتے ہیں لوگ
کتنی تن آسانی بڑھتی جاتی ہے

کوپن برائے شمارہ فروری 2015	محفلِ شعر و سخن نام: -- پتا: --



شکنجہ

سلیم انور

کھاکھاکر گوشت کا پہاڑ بننا اور پھر فاقے کرکرکے رفتہ رفتہ اس پہاڑ کو گھٹانا ہر زمانے کا فیشن رہا ہے شاید... وہ بھی اس اذیت کا شکار تھا کہ ایک روز اس کے ہاتھ ایسا گر لگا کہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا... کیونکہ یہ سب تو زندگی کے جھمیلے ہیں مگر وہ کیوں دھیرے دھیرے موت کے قریب ہوتا جارہا تھا۔

فاقے کی فکر میں گھلنے والوں کی عجیب منطقوں کا اظہار

جس روز میری ملاقات وینڈی ہاپکنز سے ہوئی، میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔

رٹز کارلٹن ہوٹل کے بار کا ماحول نہایت پُرسکون تھا اور ہر شے سے نفاست ٹپک رہی تھی۔ میری پوری زندگی بوسٹن شہر میں گزری تھی لیکن مجھے کبھی رٹز کارلٹن میں جانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ باہر سڑک پر لوگ جولائی کی نم آلود فضا سے بچنے کے لیے تیز تیز قدموں سے اِدھر سے اُدھر جارہے تھے اور پبلک گارڈنز کی جانب رواں ٹریفک دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔

لیکن رٹز کارلٹن کے بار کی فضا میں مدھم سرگوشیوں اور برف کے ڈلوں کی ٹن ٹن کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں کھڑکی کی جانب سے

پھیرتے ہوئے میز کے مقابل بیٹھی وینڈی پر مرکوز کرلیں۔ ہماری یہ ملاقات بارہ برس بعد ہورہی تھی اور جب اس نے نیو بیری اسٹریٹ پر مجھے پہچان لیا تو اسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔

وینڈی اپنی انگلی کرسٹل گلاس کے کنارے پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ''وہ ایک عذاب کی زندگی تھی، جم۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے متعلق میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ کیا تم ہمارے دیرینہ تعلقات کے پیش نظر اس موضوع کو زیر بحث لانے سے گریز نہیں کرسکتے؟''

میں نے مٹھی بھر چھوٹے بسکٹ منہ میں ڈالے اور بیئر کے ساتھ انہیں حلق سے نیچے اتارلیا۔ باوردی ویٹر مشروبات کی ٹرے لیے چھوٹے چھوٹے قدموں سے میزوں کے درمیان منڈلا رہا تھا۔ میرے ذہن کے پردے پر ہائی اسکول کے دور کا منظر گھومنے لگا۔

میں اور وینڈی دونوں ہی بھونڈے پن کی حد تک بھاری بھر کم تھے اور ہمیں اپنے ہم جماعتوں کے طعن وطنز اور تمسخر کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وینڈی ہوشیار اور ذہین تھی اور لوگوں، جانوروں اور پودوں پر مہربان رہتی تھی۔ وہ ہر ایک پر اعتماد کرتی تھی اور ان کی ظالمانہ حرکات کو نہیں سمجھتی تھی۔ ان برسوں میں ہم امتحانات میں اس لیے پاس ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ہم یک جان دو قالب کی طرح تھے۔ ہمارے جسم تو دو تھے لیکن روح ایک تھی۔ یہ مان لیا کہ یہ دونوں جسم بے حد بھاری بھر کم تھے۔

گریجویشن کے بعد وینڈی نے برکلے سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اسے نیویارک کی ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی۔ اس نے اپنے کالج کے دور کے ایک ساتھی سے شادی کرلی اور اپنا وزن ڈھیروں گھٹالیا۔

میں بوسٹن یونیورسٹی چلا گیا اور ایک اکاؤنٹنٹ بن گیا۔ چار سال قبل میں نے سینڈرا سے شادی کرلی تھی اور شادی کے بعد سے میرا وزن چھیالیس پونڈ بڑھ گیا تھا۔ میری پانچ فٹ آٹھ انچ کی قامت اب دو سو ساٹھ پونڈ کا وزن اٹھائے پھرتی تھی۔

اپنا وزن گھٹانے کے لیے میں نے ہر قسم کا ڈائٹ پلان آزمایا، ہپناٹائز کے کورس مکمل کیے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

''تمہارے اندر ایک سے زیادہ انداز سے تبدیلیاں آچکی ہیں۔'' میں نے قدرے خفگی سے کہا۔ اپنے وزن گھٹانے کے راز سے متعلق گفتگو سے گریز پر مجھے وینڈی پر غصہ آگیا تھا۔ ''یاد ہے ہم نے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا تھا۔ میں تم سے کسی قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں پھر کیا بات ہے؟''

وینڈی اپنی انگلیاں اپنے سرخ لانبے بالوں میں پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس نے جو ڈارک پینٹ سوٹ پہنا ہوا تھا، وہ قیمتی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہی نیلی شرٹ اور پتلی سیاہ ٹائی پہنی ہوئی تھی جو میں ہفتے میں تین دن پہنتا تھا کیونکہ یہ ان چند اشیا میں شامل تھیں جو میری ملکیت تھیں۔

''بات یہ ہے کہ میں اسے دہرانا نہیں چاہتی۔'' وینڈی نے آہستگی سے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ چھولیا۔ ''اوکے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا تاکہ یہ ظاہر ہوکہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں۔ ''لیکن تم نے مجھے بے انتہا حیرت میں ڈال دیا ہے۔ تم نے کتنا وزن گھٹایا؟ اسی پونڈ؟''

''حقیقت میں بیانوے پونڈ۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ صرف مقصد کی جانب درست طور پر راغب کرنے کا سوال تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں دنیا کا سب سے زیادہ ترغیب پانے والا شخص ہوں۔ جب میں نے سینڈرا سے شادی کی تھی تو میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا وزن گھٹالوں گا۔ لیکن ہوا یوں کہ میرا وزن مزید بڑھ گیا۔ میں نے تصور کیا تھا کہ سینڈرا اور میں زندگی بھر ساتھ رہیں گے، ہمارے بچے ہوں گے اور مضافات میں ایک مثالی گھر بنائیں گے جس کا احاطہ سفید جالی دار ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے قدرے توقف کیا۔

وینڈی خاموشی سے میری بات سن رہی تھی۔

''چند روز قبل میں نے اپنا طبی معائنہ کرایا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا، میرا دل میرے اضافی وزن کی تاب کب تک لاسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میں چالیس برس کی عمر پا جاؤں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ لیکن میں پھر بھی کھائے چلا جارہا ہوں۔ یہ ایک بیماری ہے جو مجھے لاحق ہوگئی ہے۔ سینڈرا یہ دیکھنے کے لیے عارضی علیحدگی چاہتی ہے کہ شاید مجھے کچھ ہوش آجائے اور میں اپنا وزن گھٹالوں۔'' میں نے سر ہلا دیا۔ ''یہی وہ واحد چیز ہے جو میری زندگی بچا سکتی ہے۔''

''مجھے یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔''

میں نے بیئر کا ایک گھونٹ بھرا۔ ''سنو! یہ میرے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی مجھے اس معاملے میں سنجیدہ

نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ اپنے کام پر بھی میں وہ موٹا آدمی ہوں جو ہر وقت مذاق کرتا رہتا ہے۔ مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے؟ تم نے وزن گھٹالیا تو پھر میں اپنا وزن کیوں نہیں گھٹا سکتا؟''

وینڈی نے ایک چھوٹا بسکٹ اٹھایا، اس کا کنارہ دانتوں سے چبایا اور باقی بسکٹ اپنے نیپکن پر رکھ دیا۔ ''مجھے یہ تجویز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ہم یہاں ملاقات کریں۔ تم سے سرِراہ ملاقات ہوگئی تھی، بس یہی کافی تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر پرانے دور کی یادوں کو تازہ کرلیں گے۔''

میں نے اپنی کرسی پیچھے سرکائی تو اس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ میں نے تصور میں کرسی کو لڑھکتے اور خود کو چاروں خانے چت قالین پر پکے ہوئے تربوز کے مانند ڈھیر پایا جو اٹھنے سے قاصر ہو۔ ''آئی ایم سوری۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تم سے اعانت طلب کیے جارہا ہوں جیسا کہ ہائی اسکول کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔ تم اپنی زندگی کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ وہ کون خوش قسمت ہے جس سے تم نے شادی کی تھی؟''

وینڈی نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ ''چند سال قبل اس کا انتقال ہوچکا ہے۔''

''اوہ گاڈ، وینڈی! یہ تو بڑی ہولناک بات ہے۔ ابھی میں ہولناک ... اپنے مسائل کا ذکر ... رہا ہوں جبکہ یہ تم ہو جسے عذاب جھیلنا پڑا ہے۔''

وینڈی نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ''نہیں، تم...... تم جو کچھ جھیل رہے ہو اگر اس عذاب کو کوئی سمجھ سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ میں خود غرض ہوگئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے چند سیکنڈ کے لیے اپنی نظروں کا رخ پھیرلیا۔ پھر جب اس نے دوبارہ نظریں گھمائیں تو اس کی آنکھوں کے تاثرات نرم پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہے۔

''شاید تمہارا کام بھی بن جائے۔ میں ایک ترغیب دینے والی اسپیشلسٹ کے پاس گئی تھی۔ اضافی وزن والے افراد کے معاملے میں اس کی کامیابی کا ریٹ اٹھانوے فیصد ہے۔''

''اس کا راز کیا ہے؟''

''کوئی راز نہیں۔ یہ معاملہ شرائط کا ہے۔ اس کی خدمات مہنگی ہیں اور وہ صرف وہ کلائنٹس لیتی ہے جو اس کے ساتھ اپنے عہد کو بھرپور اور مکمل برقرار رکھیں۔'' وینڈی نے بتایا۔

''کیا تمہارے خیال میں وہ میری مدد کرسکتی ہے؟''

''وہ اس معاملے میں عمدہ ہے لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گی کہ اس کا طریقہ کار قدرے مختلف ہے۔''

''میں اس نہج تک پہنچ چکا ہوں کہ کسی بھی چیز کو آزمانے کے لیے تیار ہوں۔''

وینڈی نے اپنا پرس کھولا اور ایک کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کارڈ لے کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔

''سمانتھا ایلسٹن، موٹی ویشن تھراپسٹ۔''

نیچے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

''وہ اپنا اشتہار نہیں دیتی۔'' وینڈی نے کہا۔ ''میں نے اس کے بارے میں اپنی ایک دوست سے سنا تھا۔ اس کا دفتر یہاں سے چند گھنٹوں کی مسافت پر اسپرنگ فیلڈ میں ہے۔''

وینڈی نے میرے ہاتھ کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اس سے قبل کہ تم اس سے رابطہ کرو، اس بات کی یقین دہانی کرلو کہ تم واقعی یہی چاہتے ہو۔''

میں نے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ''یہ میں نے طے کرلیا ہے۔ میں آج رات اس سے فون پر بات کروں گا۔''

وینڈی چند سیکنڈ تک خاموش رہی۔ مجھے اس کی آنکھوں کے تاثرات سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔

پھر وہ گویا ہوئی۔ ''ویل، تو پھر یہ طے ہوگیا۔ سمانتھا ایلسٹن تمہاری زندگی ہمیشہ کے لیے تبدیل کرنے والی ہے۔''

☆☆☆

اسپرنگ فیلڈ ریاست میساچوسٹس کے وسطی حصے میں واقع ایک قدیم صنعتی قصبہ تھا۔

جب میں قصبے کی مرکزی سڑک پر کار ڈرائیو کررہا تھا تو میرے وجود میں ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہ دن ہے جو میری زندگی کو بدل دے گا۔

سمانتھا ایلسٹن کے پاس دستیاب اپائنٹمنٹ اس شب سے چھ ہفتے بعد کا تھا جب میں نے اسے فون کیا تھا۔ میرے خیال سے یہ ایک اچھی علامت تھی۔ یقیناً اس کی خدمات کے حصول کے لیے لوگ لمبی قطار میں تھے۔ اسی لیے اس نے مجھے چھ ہفتے بعد کا ٹائم دیا تھا۔

اس نے مجھے جو راستہ سمجھایا تھا، اس پر چلتے ہوئے میں سمانتھا ایلسٹن کے دفتر پہنچ گیا جو شہر کے کمتر حصے میں ایک پرانے ویئر ہاؤس میں واقع تھا۔ اس عمارت کی پہلی منزل پر ایک بار اور ایک گل فروش کی دکان تھی۔ دوسری منزل کی ایک کھڑکی پر سمانتھا کا نام... جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ بیرونی دیوار پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے اور دونوں جانب کی عمارتیں خالی تھیں جن کو تختے لگا کر بند کردیا گیا تھا۔ سامنے سڑک پار خالی میدان دکھائی دے رہا تھا اور یہ پورا علاقہ صفائی چاہتا تھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ ایک کامیاب تھراپسٹ اپنے دفتر

کے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کرسکتی ہے۔ اگر معاملہ وینڈی کی سفارش اور میرے عزم صمیم کا نہ ہوتا تو میں وہیں سے گھر واپس چلا جاتا۔

جو سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں ان پر ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ ہر طرف خالی بوتلیں اور کھانے پینے کی اشیا کے ریپر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری منزل کے بیشتر دفاتر کے دروازے بند تھے اور ہر شے کی سطح پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

مجھے آگے کی جانب ایک دروازے پر پیتل کی پلیٹ دکھائی دی جس پر سامنتھا ایلسٹن کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے شیشے پر دستک دی۔ جب کسی نے جواب نہیں دیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔

کمرے کی دیواریں پیلے رنگ کی تھیں اور ان پر کسی بھی تصویر نظر نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک موٹیل ماڈرن میز اور دو زنگ آلود فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''ہیلو!'' میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

اتنے میں زینے پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند سیکنڈ بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دفتر میں قدم رکھا۔ اس نے اپنے خاکستری بال بن کی شکل میں باندھے ہوئے تھے اور چہرے پر گول شیشوں کی عینک نمایاں تھی۔ وہ عورت دبلی پتلی اور اس کا قد لانبا تھا۔ اس کا لباس ڈارک بلیو کلر کے اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز پر مشتمل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا فولڈر دبا ہوا تھا۔

''میں سامنتھا ایلسٹن ہوں۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور تم یقیناً جم ہیرس ہو اور ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔''

پھر وہ فولڈنگ کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہوگئی اور اپنا اسکرٹ درست کرنے کے بعد مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کردیا۔ اس نے فولڈر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھول دیا۔

''آپ کا حوالہ وینڈی بانچو نے دیا تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی کامیابی کا ریٹ اٹھانوے فیصد ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ جب میں نے یہ بلڈنگ دیکھی تو قدرے بےزار ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر اپنے مقصد کی خاطر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا آپ اپنے تمام کلائنٹس سے اسی جگہ پر ملاقات کرتی ہیں؟''

وہ فولڈر میں موجود کاغذات کو پڑھنے میں یوں مگن رہی جیسے میں نے کچھ پوچھا ہی نہ ہو۔ پھر اپنی عینک دوبارہ ناک پر جماتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔ ''میں یہاں تمہارا مسئلہ حل کرنے کے لیے موجود ہوں۔ ہماری ملاقات کہاں ہورہی ہے، یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں بوکھلا سا گیا۔ اس لیے کہ میں توقع کررہا تھا جو فرد میری اس پریشانی کا حل نکالے گا، وہ ہمدردی کے جذبے سے معمور اور حساس طبیعت کا مالک ہوگا۔ شاید اکھڑا اکھڑا لہجہ میرے مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھا، یہ سوچ کر میں چپ رہا۔

سامنتھا نے اپنا فولڈر بند کردیا اور ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ پھر بولی۔ ''میرے خیال سے تمہارے لیے ایک سو پچاس پونڈ تک کا وزن کافی رہے گا۔''

میں مسکرا دیا۔ ''ایک سو پچاس پونڈ وزن زبردست رہے گا۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتادوں۔ میں کھانا دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔''

وہ اپنے فولڈر پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے راجرز اینڈ ڈکنن کے یہاں بہ طور اکاؤنٹنٹ چار سال تک کام کیا ہے۔ تمہاری آمدنی چھتیس ہزار ڈالرز ہے۔ تمہاری بیوی سینڈرا بہ طور سیکریٹری عارضی ملازمت کرتی ہے اور گزشتہ برس اس کی آمدنی بارہ ہزار ڈالرز تھی۔ تم دونوں کو بچوں کی خواہش ہے لیکن سینڈرا تمہارے مٹاپے اور وزن کے بارے میں فکرمند رہتی ہے اور اسے امید ہے کہ عارضی علیحدگی تمہیں اپنا وزن گھٹانے اور دبلا پتلا بننے پر مجبور کردے گی۔''

یہ سن کر میرا منہ لٹک گیا۔ ''آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟''

''میری کمپنی ہمارے تمام کلائنٹس پر مکمل ریسرچ کرتی ہے مسٹر جم۔ میں ہر سیشن کی فیس تین سو ڈالرز لیتی ہوں اور نتائج کی ضمانت دیتی ہوں۔''

میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھادیا۔ ''آپ میرے معاملے میں کچھ زیادہ تیز جارہی ہیں۔'' میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''میں خود کو کسی بھی چیز کا پابند بنانے سے قبل یہ جاننا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا طریقہ کار کیا ہے؟''

سامنتھا ایلسٹن نے اپنا رخ میز کی طرف کیا، ایک دراز کھولی اور کاغذ کی ایک شیٹ نکالی۔ ''میرا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔ تمہارا جو جی چاہے کھا پی سکتے ہو۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے وہ کاغذ میری طرف بڑھادیا۔ ''پلیز اس پر دستخط کردو۔''

"میں اس وقت تک کوئی دستخط نہیں کروں گا جب تک اس بارے میں مزید نہ جان لوں کہ آپ کرتی کیا ہیں۔ مجھے تین سو ڈالرز کے عوض کیا ملے گا؟" میں نے اصرار کیا۔

"ترغیب مسٹر جم۔ اگر تم دستخط نہیں کرنا چاہتے تو پھر تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

میں نے کاغذ کی سمت اشارہ کیا۔ "مجھے حقیقت میں کس بات کے لیے دستخط کرنا ہیں؟"

"یہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے تم اس بات کے پابند ہو گے کہ میری ہدایات کے مطابق یقینی عمل کرو گے اور اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ مزید یہ کہ تمہیں اقرار کرنا ہوگا کہ میرے طریقہ کار کو کسی پر آشکار نہیں کرو گے۔ کسی بھی قسم کے انحراف کا مطلب خاتمہ ہے۔" یہ کہہ کر سامنتھا ایلسٹن نے اپنی آنکھیں نیم وا کرلیں۔ "تم یہاں سے رخصت ہونے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اپنی مدد کے لیے میری ضرورت ہے۔ کوئی بھی تمہیں وہ نتائج نہیں دے سکتا جو میں دوں گی۔"

میں نے معاہدے پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ اس پر درج دونوں پیراگراف من و عن وہی تھے جو ابھی سامنتھا نے زبانی بتائے تھے۔

لیکن میں اب بھی دستخط کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔

سامنتھا ایلسٹن کی سرد مہری مجھے کھل رہی تھی اور اس کی رازداری کی شرط کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر وینڈی ہاپکنز کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس نے اسی تھراپسٹ کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور وزن گھٹانے میں کامیاب رہی تھی۔

اس لحاظ سے سامنتھا ایلسٹن میری آخری امید ہو سکتی تھی۔

میں نے میز پر سے ایک پین اٹھایا اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کردیے۔

سامنتھا ایلسٹن نے معاہدے کا دستخط شدہ کاغذ اٹھا کر اپنے فولڈر میں لگا دیا اور فولڈر اپنی میز کی دراز میں بند کردیا۔

"پروگرام میں خوش آمدید۔ تمہیں ہفتے میں ایک بار اپنا وزن چیک کرانے کے لیے مجھے رپورٹ کرنا ہوگی اور اس وقت تک آتے رہنا ہوگا جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ اس وزن کے حصول کے بعد تمہیں وزن چیک کرانے کے لیے سال میں صرف ایک بار آنا پڑا کرے گا۔ تم اپنے حصول کردہ وزن ایک سو پچاس پونڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونے دو گے۔ یہ لازمی ہوگا۔ ہماری کوئی اسپیشل ڈائٹ یا گولیاں نہیں ہیں جو تمہیں کھانا پڑیں گی۔ صرف ایک سادہ اصول ہے جس پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا اور تم اس سے کبھی انحراف نہیں کرو گے۔"

"وہ سادہ اصول کیا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ہر ہفتے جب تم اپنا وزن کرانے آؤ گے تو تمہارا وزن لازمی طور پر کم از کم تین پونڈ گھٹا ہوا ہونا چاہیے۔" سامنتھا ایلسٹن نے جواب دیا۔

"کیا یہ کسی قسم کا لطیفہ ہے؟"

"یہ مذاق یا لطیفہ نہیں ہے مسٹر جم! میں تمہیں اس بات کا یقین دلا رہی ہوں۔" سامنتھا ایلسٹن کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ہر ہفتے تین پونڈ وزن گھٹانا ناممکن ہے۔ یقیناً ابتدائی چند ہفتوں تک تو ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ چند ہفتے میں کوئی وزن گھٹا نہ سکوں۔"

"کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟"

"یقیناً کرتا ہوں لیکن کیا وہی ترغیب کافی نہیں ہے۔"

"وہ کافی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے۔ اس وقت تمہاری بیوی اپنی بہن کے ساتھ ایک شاپنگ مال میں ہے۔ وہ اس وقت تک [illegible] جب تک تمہارا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹ نہیں جاتا۔ اگر کوئی ہفتہ ایسا رہا کہ تم اپنا وزن کم از کم تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہ ہوئے تو تمہاری بیوی کا خاتمہ کردیا جائے گا۔" سامنتھا ایلسٹن نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ "خاتمہ؟ خاتمے سے آپ کی مراد کیا ہے؟" میں اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے مسکرانے لگا۔ "کیا آپ اسے قتل کردیں گی؟"

"قتل ایک گندی اصطلاح ہے۔ میں خاتمے کے لفظ کے استعمال کو ترجیح دیتی ہوں۔" سامنتھا ایلسٹن نے کہا۔

میں نے میز کی دراز کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ معاہدہ جس پر میں نے دستخط کیے ہیں، اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کی ہدایات سے کسی بھی قسم کے انحراف کا مطلب خاتمہ ہوگا۔ کیا آپ مجھے بھی قتل کردیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"اگر نوبت یہاں تک آگئی تو!"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل دگنی رفتار سے دھڑکنے لگا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے اپنی انگلی سے گھونسے کے انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا اور قدرے بلند آواز سے

بولا۔ "تم پاگل ہو۔ میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔" اب میں اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر رہا تھا۔

"اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری بیوی کا فوری طور پر خاتمہ کردیا جائے گا اور اس کا الزام تمہارے سر دھر دیا جائے گا۔ ہم نے تمہارے گھر سے ایسی بہت سی چیزیں ہٹا دی ہیں جن کی وجہ سے تم اس جرم میں بہ آسانی ملوث ہو جاؤ گے۔ اب ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ.... تمہاری بھی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی شروع کردی جائے۔ تمہاری تھراپسٹ کی حیثیت سے میں سینڈرا کو قتل کرنے کے تمہارے ذہن پر سوار خیال اور اس سے متعلق ہماری خفیہ گفتگو کو پولیس پر آشکار کرنے پر مجبور ہو سکتی ہوں۔ پولیس تم پر کبھی یقین نہیں کرے گی کیونکہ تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جبکہ ایک تھراپسٹ کی حیثیت سے میری بات پولیس کی نگاہ میں زیادہ وزن دار اور اہمیت کی حامل ہوگی۔ سو تم دیکھ سکتے ہو کہ جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹا نہیں لیتے، تم میرے کنٹرول میں ہو۔ اب تمہارے بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔"

"اوہ شٹ۔" مجھے اپنی آواز کانپتی محسوس ہوئی۔ "تم جو چاہ رہی ہو وہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی ہر ہفتے اپنا وزن تین پونڈ نہیں گھٹا سکتا۔ مجھے اس کا کوئی حصہ قبول نہیں ہے۔"

"میں ایک کاروباری عورت ہوں مسٹر جم۔ اگر میں چاہوں تب بھی تمہیں اس پروگرام سے باہر نہیں نکال سکتی۔ میرے ساتھی میرے لیے نامعلوم ہیں۔ میں ان کے رابطے کے طور پر کام کرتی ہوں۔ تمہاری ادا کردہ رقم کو میں الحاق کمپنی کے پوسٹ آفس بکس کے پتے پر روانہ کردیتی ہوں۔ پھر وہ مجھے میری تنخواہ بھیج دیتے ہیں۔ وزن کنٹرول کرنا ایک بڑا بزنس ہے اور میرے جو باس ہیں انہوں نے اسے اپنے لیے انتہائی منافع بخش بنانے کا ایک طریقہ وضع کیا ہوا ہے۔ وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں جو تمہارے عہد کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔"

"میں اس بات پر یقین کرتا ہوں۔ دیکھو، تم اپنے ساتھیوں کو بتا دو کہ اگر وہ اس معاملے کو یہیں ختم کردیں تو میں انہیں جو وہ چاہیں گے، ادا کردوں گا۔" میں نے کہا۔

سامنتھا ایلسٹن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "یہ بات ہمارے کاروبار کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ ہماری ایک شہرت ہے جس کی بدولت ہم جی رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا استثنا نہیں ہے۔ ہمیں اپنی کامیابی کے تناسب پر بے حد فخر ہے۔ ایک بار جب آپ معاہدے پر دستخط کردیتے ہیں تو پھر آپ ہمارے کلائنٹس میں سے ایک بن جاتے ہیں۔ میں اس بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔" سامنتھا نے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"فرض کرو کہ میں اپنا وزن کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوگا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ہم جانور نہیں ہیں۔ ہم لچک دکھا سکتے ہیں۔ لیکن ہم منطقی طور پر قابلِ قبول جواز کے بغیر غیر حاضری تسلیم نہیں کرتے۔ میرے ساتھی ہر وقت تم پر نگاہ رکھے رہیں گے اور میں متنبہ کردوں کہ اگر انہوں نے محسوس کیا کہ تمہاری غیر حاضری کا جواز اطمینان بخش نہیں تو پھر میں ان کے ردعمل کی ذمے دار نہیں ہوں گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہر ہفتے باقاعدگی سے رپورٹ کرنا تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔" سامنتھا ایلسٹن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

☆☆☆

جب میں اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک طوفان سا برپا تھا۔

سامنتھا ایلسٹن کے دفتر سے نکلتے ہی سیاہ رنگ کی ایک لنکن کار نے میرا تعاقب شروع کردیا تھا۔ انہوں نے میرے تعاقب اور نگرانی کو خفیہ رکھنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنی کار کا اسٹیئرنگ اتنی مضبوطی سے تھاما ہوا تھا کہ میری انگلیوں کے گٹے سفید پڑ گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ یقیناً سینڈرا کو قتل کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔

یہ میں نے اپنے آپ کو کس جنجال میں پھنسا لیا ہے؟

یہ میں نے سینڈرا کو کس جنجال میں پھنسا دیا؟

اس پاگل پن سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ہوگا۔

جب میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سینڈرا گھر پر موجود نہیں تھی۔ میں لپک کر اندر پہنچا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر کی طرف دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لنکن کار سڑک پار موجود تھی۔ اگر میں پولیس کو فون کرتا ہوں تو وہ لوگ سینڈرا کو قتل کردیں گے۔

مجھے اس بارے میں منصوبہ تیار کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔

میں نے سنک کے نیچے سے کوڑے کا ایک خالی تھیلا نکالا اور کچن کے کیبنٹ کھول کر ان میں رکھی ہوئی اشیا جیسے بسکٹ، کیک، بٹر کے جارز، آلو کے چپس، کینڈی بارز نکال کر تھیلے میں بھرنا شروع کردیں۔ جو بھی شے مجھے کھانے پر ورغلا سکتی تھی، وہ اس تھیلے میں منتقل ہو رہی تھی۔

جب میں ان اشیا سے دوسرا تھیلا بھر رہا تھا تو سینڈرا

گھر میں داخل ہوئی۔

"تم کیا کر رہے ہو، ہنی؟" اس نے پوچھا۔

میں چند سیکنڈ تک اس کی صورت تکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں۔ ہم دونوں کی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ انہوں نے ہمارے مکان میں بھی آواز سننے کا خفیہ آلہ لگا دیا ہو؟

جس معاہدے پر میں نے دستخط کیے تھے، اس کی رو سے میں نے یہ راز آشکار نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔

سینڈرا کی ہڈیاں چوڑی چکلی تھیں مگر وہ فربہ نہیں تھی۔ جب وہ اپنے سنہری بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھتی تھی تو دیکھنے میں اٹھارہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ہم نے باہم بہت سی مشکلات سہی تھیں اور میں کئی مرتبہ اسے اذیں بھی کر چکا تھا لیکن اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے کتنا زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اسے کھو دینا میرے دل کو چیر دینے کے مترادف ہوگا۔

"اس مرتبہ میں یہ کر کے رہوں گا۔" میں نے اپنی آواز کو کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی۔ "میں اپنا وزن گھٹانے جا رہا ہوں۔"

سینڈرا نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیے اور میرے ہونٹوں کا ہلکا سا بوسہ لے لیا۔ "تھینک گاڈ! یہ نئی تھراپسٹ یقیناً حیرت انگیز ہوگی۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔"

"کچھ زیادہ بتانے کو نہیں ہے۔ اس کا راز ترغیب ہے۔ میں نے ایک فارم پر دستخط کیے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ میں اس کے طریق کار کا راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا...... حتیٰ کہ تم پر بھی نہیں۔ لہٰذا تم خود ہی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "تم جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کچھ بھی۔ ہم مچھلی اور مرغی کھائیں گے۔ ہر قسم کی سبزیوں پر گزارہ کریں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ "تم نے مجھے بے حد خوش کر دیا ہے۔ آج ہماری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہو رہا ہے۔"

سینڈرا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ کس حد تک حقیقت اور سچائی پر مبنی تھے۔

☆☆☆

ہماری چوبیس گھنٹے کی کڑی نگرانی مستقل جاری تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی لنکن کار ہر جگہ میرا پیچھا کرتی تھی۔ دو خواتین گرے رنگ کی شیورلیٹ کار میں سینڈرا کا تعاقب کرتی تھیں۔ اگر سینڈرا اپنے تعاقب سے باخبر تھی تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

دفتر میں میرا کام متاثر ہو رہا تھا۔ میں اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا تھا اور مجھ سے غلطیاں سرزد ہونے لگی تھیں۔ جمعے تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ دفتر میں لوگوں نے میرے بارے میں باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ باس نے بھی کہہ دیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو درست نہیں کیا تو وہ مجھے نوکری سے برخاست کر دے گا۔

لیکن میں نے اپنا وزن گھٹا لیا۔

پہلے ہفتے میرا وزن آٹھ پونڈ کم ہو چکا تھا۔ اس سے اگلے ہفتے چھ پونڈ اور اس کے بعد تیسرے ہفتے مطلوبہ تین پونڈ گھٹ گیا۔

میں نے ہر مرتبہ سامنتھا ایلسٹن سے منت سماجت کی کہ وہ مجھے اس پروگرام سے نکال دے اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

یہ چوتھا ہفتہ تھا جب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

جمعرات تک میں صرف ایک پونڈ وزن گھٹا پایا تھا اور مجھے علم تھا کہ اگر میں سنیچر تک چھ پونڈ گھٹا لوں تب بھی شاید اپنا وزن مطلوبہ تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی معجزہ رونما ہو جاتا ہے اور میں مطلوبہ وزن تک گھٹا لیتا ہوں تب بھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کبھی نہ کبھی تو میں سامنتھا ایلسٹن کے ہدف کو پانے میں ناکام رہ سکتا ہوں...... پھر کیا ہوگا؟

اس سہ پہر میں سوچوں میں گم بوسٹن کی سڑکوں پر یونہی گھومتا رہا۔ میں سینڈرا سے مدد طلب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ہمارے گھر میں آواز سننے کا خفیہ آلہ نہ نصب ہو۔ اگر ہم اس بارے میں گفتگو کرنے کی خاطر باہر چہل قدمی کے لیے جاتے تب بھی شاید ان کے پاس کوئی ایسا طریقۂ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری گفتگو سن لیں۔

اس رات جب میں گھر پہنچا تو سینڈرا سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اگر میں وزن گھٹانے کی کوشش کروں تو تم میری مدد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے ایک نوٹ بک اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ میں نے تمام باتیں اس نوٹ بک میں تحریر کر دی تھیں اور وہ منصوبہ بھی بیان کر دیا تھا جس

کے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ہماری جانیں بچا سکتا ہے۔

سینڈرا کاؤچ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور نوٹ بک کی تحریر کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ اسے مکمل تحریر پڑھنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں اس بات کا اسے کریڈٹ دیتا ہوں کہ اس نے بالکل بھی کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب وہ پڑھ چکی تو میں نے اس کی آنکھوں میں پکے ارادے کے تاثرات دیکھے۔ میں جان گیا کہ اب ہم باہم ان لوگوں کو شکست دے دیں گے۔

پھر سینڈرا نے اپنی بہن کو فون کیا اور وہ دونوں شاپنگ مال چلی گئیں۔

اگلے روز جب سینڈرا کی ٹویوٹا اس مینوفیکچرنگ پلانٹ روانہ ہوئی جہاں وہ گزشتہ ماہ سے بہ طور سیکریٹری کام کر رہی تھی تو گرے رنگ کی شیورلیٹ کار نے حسبِ معمول اس کا تعاقب کیا۔

البتہ اصل بات یہ تھی کہ سینڈرا کی کار اس کی بہن وائلٹ چلا رہی تھی جس نے اپنے حلیے اور لباس سے سینڈرا کا بہروپ اختیار کیا ہوا تھا۔

سینڈرا ان کے جانے کے چند منٹ بعد گھر سے نکلی۔ اس نے ہمارے عقبی لان کے احاطے کو عبور کیا اور ائرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسی پکڑ لی۔ بعد میں جب دو گھنٹے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں سمجھ گیا کہ وہ بہ حفاظت جہاز میں سوار ہو چکی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ہمارے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہماری زندگیاں محفوظ ہوں گی تو وہ مجھ سے خود ہی رابطہ کر لے گی۔

میں نے گھر کو تالا لگایا اور پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سیاہ لنکن کار معمول کے مطابق میرا تعاقب کرنے لگی۔ جب میں پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو یہ بات نوٹ کی کہ اس سیاہ لنکن کار کا ڈرائیور سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سینڈرا کی نگرانی کرنے والوں کو پیغام دے رہا تھا کہ وہ سینڈرا کو قابو کر لیں۔ لیکن اس وقت تک سینڈرا کی بہن وائلٹ پلانٹ کے عقبی دروازے سے نکلنے کے بعد اپنی کار میں سوار ہو کر... بحفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی جو اس نے گزشتہ شب وہاں پارک کر دی تھی۔

جب میں اندر پہنچا تو شیشے کے پارٹیشن کے پیچھے بیٹھی ہوئی خاتون پولیس افسر نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی بیوی کو قتل کرنے والا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرے موٹاپے کا مذاق اڑاتی ہے۔ بالآخر آج میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا ذہن چیخ رہا ہے۔ وہ محفوظ نہیں ہے۔ تمہیں اسے بچانے کی خاطر مجھے لاک اپ میں بند کرنا ہوگا۔"

☆☆☆

میرے نفسیاتی ٹیسٹ لیے گئے جنہیں میں جان بوجھ کر ناکام بناتا رہا۔ مجھے پرکھنے کے ان سلسلوں کے بعد عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ میری ذہنی کیفیت نارمل نہیں اور میں معاشرے کے لیے خطرناک ہوں۔

ایک جج نے حکم دیا کہ مجھے رج وے ایکرز نامی مینٹل اسپتال میں اس وقت تک لاک اپ میں رکھا جائے جب تک کہ ڈاکٹرز اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتے کہ میں ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے فٹ ہو چکا ہوں۔ تب ہی میں عام زندگی میں لوٹ سکتا تھا۔

میرا اسپتال پہنچنا یقینی طور پر سنیچر کے روز وزن کرانے کے لیے حاضر نہ ہونے کا منطقی طور پر قابلِ قبول جواز تھا۔

اپنی بابت نجی تصور کی بہتری کے لیے انہوں نے مجھے پندرہ سو کیلوریز فی یوم کی غذا پر رکھ دیا۔ اگر میں نے تھراپی پر حسبِ ہدایت بہتر عمل کیا تو وہ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

اس وقت تک میرا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو چکا ہوگا۔ اور اس طرح میں نے سامنتھا ایلسٹن کو مات دے دی۔

☆☆☆

میرا نیا تھراپسٹ آفس بڑا اور چوکور بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ سفید تھا اور ان پر فریم شدہ کئی... سرٹیفکیٹ آویزاں تھے۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو تھراپسٹ نے اپنی کرسی کا رخ کھڑکی کی سمت کیا ہوا تھا۔ میں میز کے سامنے پہنچ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد تھراپسٹ نے اپنی گھومنے والی کرسی کا رخ میری طرف کیا تو بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔

وہ سامنتھا ایلسٹن تھی جو تھراپسٹ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔



محی الدین نواب

چودہویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتی، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی نتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کی ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ وہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا... مراد زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوسی سیکرٹ ایجنٹ بے رحم کو رہا کرانے کے لیے امکانات لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور ودارا آکر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب ایک نیکی سے ان کا مددگار رہا اور حق کہ ماروی محبوب... جیل میں... بوجھ کر غائب ہوگئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہو کر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جج صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے قتل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ مگر قسمت کی دیوی مراد پر مہربان تھی جو مرینہ کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا، اتفاق سے راستے میں ماروی، چاچی اور چاچا اس کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ ادھر غیرملکی ایجنٹ نے مراد کو قتل کرنے کا حکم دیا اس پر حملہ ہوا تاہم وہ بچ گیا۔ مراد نے ایک ایجنٹ کو پکڑلیا۔ ایجنٹ بلا مراد کے ساتھ مل گیا۔ مراد ہر کوٹ میں تھا۔ پولیس نے مراد کو چاروں طرف سے گھیرلیا مگر اسی دوران مرینہ نے دھاوا بول دیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر گوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کے راستے میں پھر رکاوٹ بن گیا۔ اس نے خفیہ معاہدے کی مائیکرو فلم حاصل کرلی۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر جگ دیو مراد کو سرحد پار کرانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتا ہے مرینہ آرمی والوں کو اطلاع کردیتی ہے۔ جگ دیو مارا جاتا ہے اور مراد مرینہ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ مرینہ گولیاں مار کر مراد کو زخمی کردیتی ہے اور اسے اپنا اسیر بنالیتی ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسائی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے پاس پہنچا دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی مراد کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہی تھی، وہ مراد کو حاصل کر کے اور اس کے ساتھ کچھ وقت بتا کر اسے ریڈ الرٹ والوں کو پیش کرنے والی تھی جس کے بدلے اسے اور اس کے ڈپارٹمنٹ کو پچاس لاکھ ڈالرز کی رقم ملتی۔ وہ ماروی کو بھی اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

مراد نے قدآدم آئینے کے سامنے آکر اپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ اب چہرہ بدلنا ضروری ہوگیا تھا۔ پچاس لاکھ ڈالرز کی مٹھاس پر ہر سمت سے زہریلی مکھیاں آکر منڈلا رہی تھیں۔ ہر قاتل کے ایک ہاتھ میں گن اور دوسرے ہاتھ میں اس کی تصویر تھی۔ ان قاتلوں کے ذہن میں اس کی صورت اس کا ناک نقشہ اچھی طرح نقش ہوگیا تھا۔

مراد کے لیے سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ سارے ہی جان کے دشمن اسے پہچانتے تھے، وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ وہ جے پور کی پناہ گاہ سے نکل کر آنے کے بعد دہلی شہر کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے ہوئے بڑی نادانی کررہا تھا۔ ابھی تک قسمت اچھی تھی کہ سلامتی سے تھا۔

''مگر ماروی! میں تیرے لیے اجنبی بن جاؤں گا۔ بڑی مشکلوں سے یقین دلا پاؤں گا۔ پھر بھی صورت سے پرایا لگتا رہوں گا۔ کیسی عجیب سی بات ہوگی' تیرا مراد علی منگی تجھے دکھائی نہیں دے گا۔''

اس نے آئینے میں خود سے کہا۔ ''پہلے ماروی کو بتانا چاہیے کہ میں بدلنا چاہتا ہوں۔ ذرا دیکھوں کہ وہ کیا کہتی ہے؟''

اس نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ وہ خفگی دکھانے لگی۔ ''یہ تم کیا کرتے ہو؟ بات پوری نہیں کرتے اور فون بند کردیتے ہو۔ تم نے جھوٹی تسلی دی کہ پچیس دنوں کے اندر یہاں آجاؤ گے۔ کیسے آجاؤ گے؟ یہاں کی پولیس اور جاسوس تمہیں دیکھتے ہی گولی ماردیں گے۔ کیوں مجھے بہلا رہے ہو مراد؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''یہ میرا حوصلہ ہے کہ آؤں گا۔ بلا سے جان جائے گی' ایک بار تمہیں دیکھ تو لوں گا۔''

''کیوں رُلانے والی باتیں کررہے ہو؟ جان دینے کے لیے آؤ گے تو میرے لیے کیا رہ جائے گا۔''

''میرا رقیب رہ جائے گا۔ تمہیں آخری بار دیکھ تو لوں گا پھر اس اطمینان سے دم توڑوں گا کہ میرے بعد عیش و آرام سے اور سلامتی سے رہا کرو گی۔''

''میں تم سے بات نہیں کروں گی۔ فون بند کردوں گی۔'' یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''اتنی بڑی دنیا میرے لیے قبر کی طرح تنگ ہوگئی ہے۔ نہ چھپنے کا مستقل ٹھکانا ہے۔ نہ بھاگنے کا راستہ ہے۔ تمہاری طرف جانے والے تمام راستے بند ہوچکے ہیں۔ پھر بھی تمہیں ایک بار دیکھنے ضرور آؤں گا۔''

''چپ ہو جاؤ۔ مریں گے تمہارے دشمن۔ میں آخری سانسوں تک تمہارے ہی نام رہنا چاہتی ہوں لیکن کیا کروں؟ اپنے ہی فیصلے اپنی ہی زبان کے مطابق دو تاریخ کو محبوب کی دلہن بننا ہی پڑے گا۔ اس سے پہلے ہی آجاؤ مراد... !پولیس والوں سے بچ بچا کر مجھے اغوا کر کے لے جاؤ۔ مجھ پر الزام نہ آئے کہ میں نے محبوب کی دلہن بننے سے انکار کیا ہے۔''

''سچ پوچھو تو میں نے بھی کئی بار سوچا ہے کہ پاکستان میں نہیں رہ سکوں گا۔ کیوں نہ تمہیں وہاں سے بھگا کر لے آؤں۔ ابھی میں نہیں جانتا' کیا کرسکوں گا۔ تمہیں فون پر بتاتا رہوں گا کہ کس حال میں ہوں اور کیا کرنے والا ہوں؟''

''میں روز ہی تمہارے فون کا انتظار کرتی رہوں گی۔ مجھ سے روز ایسی ہی حوصلہ دینے والی باتیں کرتے رہو۔''

''ابھی میں نے ایک ضروری بات کہنے کے لیے فون کیا ہے۔ تمہیں پتا ہے' دشمن میری تصویر لیے پھر رہے ہیں تاکہ مجھے پہچان کر گولی مارسکیں۔''

وہ بولی۔ ''ہاں محبوب کہہ رہے تھے کہ خطرناک لوگوں کے پاس تمہاری تصویر ہے۔''

''اس طرح سمجھو کہ جو لوگ میری جان کے دشمن ہیں، وہ مجھے چہرے سے پہچانتے ہیں۔ اس کے برعکس میں کسی دشمن کو نہیں پہچانتا ہوں۔ وہ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے سامنے آئیں گے تو میں انہیں پہچان نہیں سکوں گا۔''

''یا اللہ... !پھر تو تم بے خبری میں ان سے مات کھاؤ گے۔''

''سیدھی سی بات سمجھو کہ بے خبری میں گولی کھاؤں گا۔''

''مراد! تم کیسے ہر طرف سے پھنسے ہوئے ہو؟ تمہارا اپنا چہرہ ہی جان کا دشمن ہورہا ہے۔''

''ہاں، یہ چہرہ قاتلوں کو بڑی آسانی سے اپنی طرف بلانے والا ہے۔ میں اس سے پہلے ہی اس چہرے سے نجات حاصل کرنے کی تدبیر کررہا ہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کرنے والے ہو؟''

''میں جلد سے جلد پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنی صورت بدلنا چاہتا ہوں۔''

''میں نہیں جانتی پلاسٹک سرجری کیا ہوتی ہے۔ کیا اس کے بعد دشمن تمہیں نہیں پہچانیں گے؟''

''دوست بھی نہیں پہچانیں گے۔ تم میری بچپن کی ساتھی ہو۔ تم بھی نہیں پہچان سکو گی۔''

''ہاں، میرے سامنے آؤ گے تو میرے مراد کا چہرہ نہیں رہے گا۔ تم کوئی اجنبی دکھائی دو گے۔''

''جب تک اپنی پہچان نہیں کراؤں گا، پچھلی تمام

باتیں بیان نہیں کروں گا' تم یقین نہیں کرو گی۔"

"صرف ایک ہی بات سے یقین کرلوں گی۔ تم کوڈ ورڈز ...ادا کرو گے۔ یاد ہے نا؟ بولو' کیا بولو گے؟"

"میں بولوں گا' میری ماروی کسی عمر کے شکنجے میں کبھی نہیں آئے گی۔"

وہ بولی۔ "ہاں، تب میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گی کہ اجنبی بن کر آنے والے تم ہی ہو۔"

"تو پھر یہ چہرہ مٹادوں؟"

"ہاں، میں ہر حال میں تمہیں پہچان لوں گی۔ تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ جتنی جلدی ہوسکے اپنی شخصیت کو بدل دو۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں فون بند کررہا ہوں۔ چہرہ تبدیل ہونے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔"

مراد نے رابطہ ختم کر کے اطمینان کی سانس لی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی' ایک ماروی کی طرف سے فکر تھی کہ وہ اس نئے چہرے کو قبول نہیں کرے گی۔ مگر اب اس نے اسے بھولے ہوئے کوڈ ورڈز یاد دلائے تھے۔ اب وہ اطمینان سے پیدائشی چہرے کو الوداع کہہ سکتا تھا۔

اس نے اپنا فون اُٹھا کر ایم این اے دھرم داس سے رابطہ کیا پھر پوچھا۔ "اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو ضروری باتیں کرنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔"

وہ بولا۔ "مصروفیات تو ہیں۔ یہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ مگر تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔ آجاؤ۔"

وہ آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ "مراد... !تم نے دشمن کی بہن کو ہلاک نہیں کیا۔ اس کی جان بچائی ہے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔"

مراد نے پوچھا۔ "ہڈسن آپ سے کچھ کہہ رہا تھا؟"

"تم نے اسے الجھا دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ لیزا کو نئی زندگی دینے والا اگر کوئی دیوتا ہے تو وہ اس سے ملاقات کیے بغیر کیوں چلا گیا اور اس نے ہاتھی کا ماسک پہن کر اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا تھا۔ وہ دیوتا بھی ہوسکتا ہے اور دشمن بھی۔"

"وہ ہوشیار ہوگیا ہے۔ کل کرسمس ڈے ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہال میں جشن منایا جائے گا وہاں سکیورٹی کے لیے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ یہ غیر ملکی سفارت خانے والوں کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ سکیورٹی سخت کردی جائے گی۔ تم بولو' کل کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے وائی ایم سی اے ہال کی عمارت باہر سے دیکھی ہے۔ اسے اندر سے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"کیسے دیکھو گے؟ تمام دشمن تمہاری صورت کو دور سے پہچان لیں گے۔"

"میں اسی مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ کسی پلاسٹک سرجری کے ماہر سے رابطہ کرا سکتے ہیں؟ میں آج ہی بلکہ ابھی چہرہ بدلنا چاہتا ہوں۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "تم بر وقت صحیح قدم اٹھا رہے ہو۔ ڈاکٹر ٹمینی سن بہت ہی ماہر اور تجربہ کار سرجن ہے۔ میں نے سنا ہے، دو چار گھنٹے میں سرجری ہوجاتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں ڈاکٹر ٹمینی سن سے معلومات حاصل ہوجائیں گی۔"

"آپ ان سے اتنا کہہ دیں کہ چہرہ آج ہی بدل جائے۔ کل ہڈسن کے معاملے میں مصروف رہوں گا۔"

دھرم داس فون اٹھا کر ڈاکٹر ٹمینی سن کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

جرائم کی دنیا میں اٹلی کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ پہلا گاڈ فادر یہیں سے اُبھرا تھا۔ تب سے اب تک اس ملک میں گاڈ فادر کی فیملی نسل در نسل پھلتی پھولتی جارہی ہے۔ ملکی سیاست میں ان کا بڑا عمل دخل ہے اور قانون تو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہتا ہے۔

دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی مجرموں کی تنظیمیں اتنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں کہ بلیک لسٹ میں ہونے کے باوجود آزادی سے آگ اور لہو کا کھیل جاری رکھتی ہیں۔ یہ تنظیمیں لاکھوں پاؤنڈز اور کروڑوں ڈالرز کی ڈیلنگ کرتی رہتی ہیں۔

تمام تنظیمیں ایک دوسرے کی دوست بھی ہوتی ہیں اور دشمن بھی۔ ان خطرناک لوگوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ سب سے الگ اپنی سوسائٹی ہے۔ یہ حرام موت بھی مرتے ہیں اور عیش و عشرت سے زندگی بھی گزارتے ہیں۔

سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کا ہیڈ کوارٹر سسلی میں تھا۔ مراد نے ان کے سب سے اہم کارندے برنارڈ کو ہلاک کیا تھا۔ برنارڈ ایک بڑے ملک کا سیکرٹ ایجنٹ تھا اور ریڈ الرٹ کے سربراہ میکی البرٹ کا بہنوئی بھی تھا۔ مراد نے بہنوئی برنارڈ کے بعد سالے میکی البرٹ کو بھی جہنم میں پہنچا دیا تھا۔

اب دوسرا سالا میکی براؤن' ریڈ الرٹ کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز لگائی تھی۔ اس سلسلے میں وہ دن رات تمام خطرناک تنظیموں سے

اور انڈر ورلڈ کے مجرموں سے رابطے میں رہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے تمام تنظیموں کے سربراہوں کو ایک سیون اسٹار ہوٹل میں شراب و شباب کی دعوت دی تھی۔ دو سو پچاس کمروں کے سات منزلہ ہوٹل میں ہر سربراہ کے لیے کمرے اور سوئٹس ریزرو کرائے گئے تھے۔ ایک خوبصورت سے سوئمنگ پول میں انتہائی حسین عورتیں بالشت بھر کے لباس میں تیر رہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر بڑے ناز و انداز سے مہمانوں کو شراب کے جام پیش کررہی تھیں۔ پھر وہاں سے پلٹ کر پول کے شفاف پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔

تمام سربراہ پول کے کنارے بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ شبابی نظاروں سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ حسینائیں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ مہمانوں کے سامنے سے شراب کی بوتلیں اٹھالی گئیں۔ ایک مہمان نے میکی براؤن سے کہا۔ "مسٹر براؤن ......!یہ کیا؟ ابھی تو پینا شروع کیا تھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "ابھی حسینائیں مست کرنے والی تھیں ہائے یہ کیا کیا؟ تم نے اچانک ہی سب کو غائب کردیا۔"

میکی براؤن نے کہا۔ "ابھی ہم جس بات کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں صرف وہ بات ہوگی۔ عیش و عشرت کے لیے ساری رات پڑی ہے۔

"میرے دوستو! ہماری جرائم سے بھرپور ایک الگ دنیا ہے۔ ہم اس دنیا میں ایک لمبی زندگی گزارتے آرہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے خطرناک مجرم آتے جاتے رہے ہیں جو کسی سے زیر نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کسی دشمن کی گولی سے حرام موت مر گئے۔

"لیکن وہ... وہ مراد علی منگی کسی کے نشانے پر نہیں آرہا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ناقابلِ شکست ہے۔ نہیں' ہم میں سے کوئی بھی اسے ایک چٹکی میں مسل دے گا لیکن وہ نظر آئے تب...... وہ اب تک اس لیے سلامت ہے کہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہمارے شوٹرز اس کی تصویر لیے پھرتے ہیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے' وہ جانا پہچانا چہرہ کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔"

ایک تنظیم کے سربراہ نے کہا۔ "جب وہ دکھائی دیتا تھا تب ہم نے کون سا تیر مار لیا؟"

ایک انڈر ورلڈ کے سربراہ نے کہا۔ "بڑے شرم کی بات ہے ایک مچھر مارا نہیں جارہا ہے اور ہم تالیاں پیٹتے جارہے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آنے کے بعد کراچی شہر میں آزادی سے گھومتا رہا۔ کتنا آسان ٹارگٹ تھا لیکن اسے گولیاں مارنے والے شوٹرز خود ہی موت کے گھاٹ اُترتے چلے گئے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہماری معلومات کے مطابق مرینہ اسے انڈیا لے گئی تھی اور وہ اب تک وہیں چھپا ہوا ہے۔"

ڈی بلیک نے کہا۔ "مرینہ کا قصہ عجیب ہے، اس نے مراد کے بچے کی ماں بننے کے لیے اسے چھپا رکھا ہے۔ بڑی عجیب عورت ہے۔ ایک بچہ پیٹ میں لینے کے لیے پچاس لاکھ کی جیکپاٹ کو ٹال رہی ہے۔ اس کے MET ڈیپارٹمنٹ والے اسے فوراً کیش کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلی تمام رات جے پور کے لوگ جاگتے رہے۔ ہیلری ہڈسن کے اور میرے کارندے وہاں ایک ایک گھر میں گھس کر اسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔

"میرا خیال ہے ہڈسن کوئی چال چل رہا ہے۔ اس نے مراد کو جے پور سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں کوشش کررہا ہوں۔ میرے آدمیوں نے دہلی میں ہڈسن پر حملہ کیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ ہوکر مجھے مراد تک پہنچا دے۔"

میکی براؤن نے کہا۔ "MET سے ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اگر مراد ہڈسن کے پاس ہوتا تو وہ پچاس لاکھ حاصل کرنے کے لیے فوراً اسے ہمارے حوالے کردیتا۔"

ڈی بلیک نے کہا۔ "MET والوں کا مراد سے ایسا کوئی سمجھوتا ہے' جس کی وجہ سے وہ ابھی پچاس لاکھ جیسی بڑی رقم نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے اہم معاملے کو نظر انداز کررہے ہیں۔

"آج صبح میرے دو ماتحتوں نے ہڈسن کی بہن لیزا کو اغوا کرنا چاہا تو اچانک ایک شخص نے آکر اسے بچا لیا۔ میرے دونوں ماتحتوں کو اس نے مار ڈالا۔ اس کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔

"میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہڈسن کی بہن کو بچانے والا وہ مراد علی منگی ہوگا۔ مراد' مرینہ' ہڈسن اور ان کے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی کے درمیان خفیہ گٹھ جوڑ ہے۔"

میکی براؤن نے کہا۔ "اسے اپنی نفسانی خواہش کی خاطر چھپا کر رکھنے والی مرینہ ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ پہلے مرینہ کو ہی اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔"

ڈی بلیک نے کہا۔ "آج میں نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غضب کی فائٹر ہے۔ اس نے ایک ہی حملے میں میرے چاروں فائٹرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

اس نے بتایا کہ مرینہ نے کیسی چالبازی سے انہیں ہلاک کیا تھا۔ان میں سے ایک نے حقارت سے کہا۔"عورت کتنی ہی زبردست فائٹر بن جائے۔پہاڑ جیسے مرد کے مقابلے پر آئے تو چوکڑیاں بھول جاتی ہے۔"

ڈی بلیک نے اس سے پوچھا۔"بار بروس...!تم واقعی زبردست ہو۔کیا اسے زیر کرسکو گے؟"

بار بروس نے پوچھا۔"قیمت کتنی ہوگی؟"

"اگر اسے جان سے نہیں مارو گے، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے اپاہج بنا کر میرے حوالے کرو گے تو میں ہزار ڈالرز دوں گا۔"

"بہت کم ہیں۔"

میکی براؤن نے کہا۔"مرینہ قابو میں آجائے گی تو اس سے اگلوایا جاسکے گا کہ مراد کو کہاں چھپا رکھا ہے۔وہ مراد سے دور ہوجانے کے باوجود اس کی موجودہ پناہ گاہ کے بارے میں اور اس کی مصروفیات کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔"

"بے شک یہ آسان راستہ ہے۔ہم مرینہ کی گردن دبوچ کر مراد تک پہنچ جائیں گے۔"

میکی براؤن نے کہا۔"جو بھی مرینہ کو اپاہج بنا کر لائے گا،میں اسے پچاس ہزار ڈالرز دوں گا۔"

بار بروس نے کہا۔"پھر تو میں ہی اسے توڑ پھوڑ کر آپ کے سامنے پیش کروں گا۔"

دوسرے فائٹر ارمزی نے کہا۔"یہاں تم سے بھی سوا سیر بیٹھے ہیں۔تم سے پہلے میں اسے اپاہج بنا کرلے آؤں گا۔"

ان کے درمیان ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جارہے تھے......اس نے کہا۔"آپس میں نہ لڑو۔جب وہ ہاتھ آجائے گی تو ثابت ہوجائے گا کہ کون کس سے برتر ہے۔"

وہ بوڑھا استنبول سے آیا تھا۔اس کی تنظیم کا نام... "ترکے بلند" تھا۔ترکی زبان میں اس کے معنی تھے، بلندی پر اُڑنے والا پرندہ۔اس بوڑھے کا نام نظام تھا. تھا۔بڑا پہنچا ہوا تھا۔سب اسے نظام بابا کہتے تھے۔

میکی براؤن نے کہا۔"نظام بابا!تم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو۔تم نے سوچا ہوگا کہ مراد علی منگی تک کیسے پہنچو گے؟"

"ہاں تم پچاس لاکھ ڈالرز کا معاوضہ دے رہے ہو۔جرائم کی دنیا میں مراد علی منگی پہلا دشمن ہے،جس کے سر کی اتنی بڑی قیمت لگائی گئی ہے۔"

اس نے میکی براؤن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔"تم غصے اور جوش وجنون میں ہو۔مراد نے پہلے تمہارے بھتیجے برنارڈ کو مارا پھر تمہارے بھائی میکی البرٹ کو ختم کردیا۔میں تم سے کہوں گا کہ چھ ماہ تک صبر کرو اور اسے بھول جاؤ تو نہ صبر کروگے نہ بھولو گے۔"

میکی براؤن نے پوچھا۔"میرے صبر کرنے سے کیا وہ گرفت میں آجائے گا؟"

نظام بابا نے بڑے اعتماد سے کہا۔"ہاں۔چھ ماہ بعد وہ تمہارے سامنے اپاہج بن کر آئے گا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ایک نے پوچھا۔"کیا جادو سے اپاہج بن کر آجائے گا؟"

وہ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔"یہاں بیٹھ کر ہنس رہے ہو اور تمہارے جانباز جاسوس اور شوٹرز ہر دوسرے تیسرے دن مراد کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں۔آپ ذرا حساب لگائیں۔اگلے چھ ماہ تک ہر تنظیم کے ہر انڈر ورلڈ والے کے کتنے وفادار اور جاں نثار مارے جائیں گے۔"

ایک نے فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔"چھ ماہ کی بات نہ کرو۔ہم چھ دنوں کے اندر اس کی لاش گرادیں گے۔"

نظام بابا نے کہا۔"اپنا گھونسا جیب میں رکھو۔مجھے معلوم ہے، اس نے تمہارے چار بہترین فائٹروں کو اوپر پہنچا دیا ہے۔آئندہ بھی مارے جائیں گے۔بے چارے جاں نثار جان سے جائیں گے۔تمہارا کیا جائے گا؟"

میکی براؤن نے کہا۔"ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے مزید آدمی مارے جائیں۔نظام بابا...!آپ بتائیں چھ ماہ تک اسے بھولنے کا مطلب یہی ہوا نا کہ ہم اسے تلاش کرنا چھوڑ دیں۔وہ کہیں نظر آئے تو اسے گولی نہ ماریں؟"

اس کی انگلی تسبیح کے دانوں پر پھسل رہی تھی۔اس نے کہا۔"وہ نظر نہیں آئے گا۔اسے صرف مرینہ ہی نہیں،سنڈیکیٹ دی ماسٹر کے سربراہ ماسٹر کوبوبو بھی زبردست سیکیورٹی دے رہا ہے۔

"آپ معلومات حاصل کریں تو معلوم ہوگا' ماسٹر کوبوبو کی اور کئی دوست تنظیمیں ہیں' جن کی مدد سے مراد چھپنے میں کامیاب رہتا ہے۔"

"آپ پلیز یہ بتائیں' چھ ماہ بعد آخر ایسا کیا ہوگا؟ وہ کیسے ہمارے ہاتھ آئے گا؟"

"وہ چھپنے والا ہر روز' دن رات اس انتظار میں رہے گا کہ کوئی کہیں سے اس پر حملہ کرنے آئے گا اور حیران ہوتا رہے گا کہ کوئی اسے سینگ مارنے نہیں آرہا ہے۔

"اسے سیکیورٹی دینے والے کوبوبو' مرینہ اور دوسرے مددگار ہر روز ہر مہینے اس کے دشمن کو کہیں نہیں پائیں گے تو یقین کرلیں گے دشمنوں نے مراد کو بھلا دیا ہے۔انہوں نے مراد سے خوفزدہ ہوکر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

"تب وہ بہت محتاط ہوکر اپنی پناہ گاہ سے کبھی کبھی نکلنے لگے گا۔سرِعام آنے کے بعد بھی اس پر حملہ نہیں ہوگا تو وہ رفتہ رفتہ سیکیورٹی کے معاملے میں بے پروا ہوجائے گا۔ایسے وقت یعنی کم از کم چھ ماہ بعد اچانک اسے چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کیا جائے گا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

ایک نے کہا۔"یہ تو وہی بات ہوئی کہ کب باپ مرے گا اور کب جائداد ملے گی۔وہ پناہ گاہ سے نکلے یا نہ نکلے،ہم آس لگائے بیٹھے رہیں گے۔"

میکی براؤن نے کہا۔"نظام بابا!آپ کی پلاننگ بہت اچھی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ نامراد چھ مہینوں میں اور زیادہ طاقتور ہوجائے گا۔آج مرینہ اور کوبوبو وغیرہ کا محتاج ہے۔کل کسی ملک میں انڈر ورلڈ کا گینگ لیڈر بن جائے گا۔ہم اسے پاؤں پھیلانے کا موقع نہیں دیں گے۔"

"چلو میری اس پلاننگ کو جانے دو۔ایک دوسری تدبیر ایسی ہے کہ مراد پر گولی نہیں چلانی پڑے گی۔وہ خود ہی تمہارے پاس دوڑا چلا آئے گا۔"

"نظام بابا!آپ کو ایسی تدبیر پہلے بتانی چاہیے۔"

اس نے کہا۔"تدبیر پر عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔"

"آپ بولیں۔ہم عمل کرکے دکھائیں گے۔"

پتا نہیں وہ تسبیح ہاتھ میں لیے بولنے کے دوران کیسے پڑھ رہا تھا۔انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جارہے تھے۔

اس نے کہا۔"مراد علی منگی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور وہ ایک بہت ہی حسین لڑکی ہے۔اس کے عشق میں حالات نے ایسی کروٹ بدلی ہے کہ وہ ایک گدھا گاڑی والے کی غریبی اور شرافت کو بھول کر جرائم کی دنیا میں آگیا ہے۔

"محبوب نامی اس کا ایک ہم شکل ہے۔اسے دیکھتے ہی آپ سمجھیں گے کہ وہ مراد علی منگی ہے۔وہ اس ملک میں ایک بہت بڑا ارب پتی صنعت کار ہے۔مراد کی محبوبہ کا نام ماروی ہے۔وہ محبوب کی سخت سیکیورٹی میں رہتی ہے۔وہ بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔وہاں کی انٹیلی جنس والے اس سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔

"اگر سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود آپ ماروی کو وہاں سے اغوا کرکے لانے میں کامیاب ہوجائیں گے تو مراد پاگل ہوکر اس کے پیچھے دوڑا چلا آئے گا۔"

میکی براؤن نے کہا۔"ایسی بات ہے تو ہم ماروی کے متعلق اپنے طور پر معلومات حاصل کریں گے۔اگر وہ مراد کے لیے مقناطیس ثابت ہوگی تو جان جوکھم میں ڈالنے والے ہمارے جانباز ہر حال میں اس معشوقہ کو اٹھا کرلے آئیں گے۔

"ہم اب تک ان تدابیر سے متفق ہوئے ہیں کہ مرینہ کو اپاہج بنا کر اس پر ٹارچر کرکے مراد کا پتا ٹھکانا معلوم کریں۔

"دوسری تدبیر یہ ہے کہ اس کی محبوبہ ماروی کو کراچی شہر سے اٹھا کر یہاں لایا جائے پھر دیکھیں گے کہ وہ دیوانہ عاشق ادھر خود ہی آئے گا یا نہیں؟

"ہمارے ماتحت کام کرنے والے جان کی بازی لگاتے رہتے ہیں۔ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ہم مراد کے مقابلے پر جانے والوں کی قیمت بڑھائیں گے اور کوشش کریں گے کہ ان کی لاشیں نہ آئیں۔وہ زندہ آئیں۔صرف ایک لاش' مراد کی لاش جلد سے جلد گرادی جائے۔"

میکی براؤن نے یہ کہہ کر ایک بٹن کو دبایا۔گھنٹیاں بجنے لگیں۔اس کے ساتھ ہی حسینائیں مختصر سے لباس میں نمودار ہونے لگیں۔پھر وہی جام والا دور شروع ہوگیا......بے چارے ماں کے پیٹ سے بھوکے پیاسے تھے۔عیش وطرب کی محفلیں پھر سے گرم ہوگئیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر مینی سن پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا۔لوگ اسے مینی سن کریزی کہتے تھے کیونکہ وہ ایک ذرا خبطی یا ابنارمل سا لگتا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔اس نے اکلوتے جوان بیٹے رابن سن کو صرف اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ دینِ اسلام سے متاثر ہوگیا تھا اور اکثر ایک عالمِ دین کے گھر جاکر اچھا خاصا وقت گزارتا تھا۔وہ جوان بیٹا گھر سے نکلنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا پھر اس نے پلٹ کر باپ سے فون پر بھی رابطہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر اس کے جانے کے بعد اداس رہنے لگا تھا اور کوئی اولاد نہیں تھی۔بیوی مرچکی تھی۔تنہا رہ جانے کے بعد بیٹے کی طرف دل کھنچا جاتا تھا۔وہ اکثر بیٹے کے بیڈروم میں آکر اس کے خالی بستر کو دیکھتا تھا۔اس جگہ آکر فرش پر بیٹھ جاتا تھا' جہاں اس نے بیٹے کو ایک بار نماز پڑھتے دیکھا تھا۔پھر اس نے غصے سے پوچھا تھا۔"کیا تم نے مسلمانوں کا دین قبول کرلیا ہے؟اپنے دین سے پھر گئے ہو؟"

اس نے کہا تھا۔ ''الحمدللہ۔ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرا نام ایمان علی ہے۔''

یہ سنتے ہی اس نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اب پچھتا رہا تھا۔ ایمان علی نے فون کی سم بدل دی تھی۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ایک بار اپنے باپ سے ملنے ضرور آتا۔ وہ سنگدل نہیں ہے۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پانچ برس تک اس کی گمشدگی اور لاتعلقی نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ تب ڈاکٹر مینی سن نے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ پھر سے بیٹے کو زندہ کرے گا۔

یہ سراسر خدائی دعویٰ تھا۔ بیٹے کی جدائی اسے ابنارمل بنا رہی تھی۔ اسی لیے سب اسے کریزی کہتے تھے۔

وہ کبھی خلا میں تکتا ہوا کہتا تھا۔ ''میرے بیٹے نے مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ڈیڈی! دروازہ کھلا رکھو۔ میں جلد ہی آنے والا ہوں۔''

وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ بیٹا اس دنیا میں رہا ہے یا نہیں ہے؟ اگر مر چکا ہے تو اسے پھر سے زندہ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ پھر وہ دن آیا کہ اس نے معجزہ کر دکھایا۔ جو بیٹا کھو چکا تھا اُسے زندہ اور متحرک کر دیا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے مگر ہو گیا تھا۔

اس وقت سرجری روم میں آئینے کے سامنے ایمان علی سرجری چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر مینی سن کھڑا ہوا اپنے بیٹے کو سانسیں لیتے دیکھ رہا تھا۔

مراد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ یہ تو کمال ہو گیا۔ میں تو اپنے اندر ایسے گم ہو گیا ہوں کہ خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر! آپ نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ مجھے غائب کر دیا ہے۔ کیا میں کبھی خود کو دکھائی نہیں دوں گا؟''

وہ بولا۔ ''جب چاہو گے سرجری کے ذریعے تمہارا چہرہ واپس لے آؤں گا۔ ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو زندہ کیا ہے۔ آج سے تم مجھے ڈاکٹر نہیں ڈیڈی بولو گے۔''

پھر وہ ایک محدب شیشہ اٹھا کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ''خود کو آئینے میں دیکھ رہے ہو، یہ بتاؤ میرا بیٹا کتنا ہینڈسم تھا۔''

''بہت ہی خوبرو تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے خوبصورت نہ بنائیں۔ معمولی سی صورت ہوتا کہ عورتیں مجھ سے دور رہیں۔''

''کیا تم ارادے کے کمزور ہو؟ عورتیں تمہاری طرف جھکتی ہیں اور تم ان کی طرف جھک جاتے ہو؟ میرے بیٹے کیا تمہارے اندر ایمانی قوت نہیں ہے؟''

''میں پارسا رہنے کے لیے ایمانی قوتوں کا ہی سہارا لے رہا ہوں۔ صنفِ نازک سے کتراتا آ رہا ہوں۔ اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ مجھ میں خوبروئی اور کشش نہ ہو اور آپ نے تو مجھے بہت ہی خوبرو اور پُرکشش بنا دیا ہے۔''

''میرا بیٹا ایسا ہی گلفام تھا۔ لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اور وہ ان سے دین ایمان کی باتیں کرتا تھا۔ دراصل اپنی نیت کھری اور مستحکم ہو تو قدم نہیں ڈگمگاتے۔ شیطان دور کھڑا تکتا رہ جاتا ہے۔ دھرم جی نے تمہارے حالات بتائے ہیں۔ تم ایک شریف مجرم ہو۔ پہلے انتہائی سیدھے سادے اور شریف تھے لیکن تمہیں مجرم بننے پر مجبور کیا گیا ہے۔ صرف مجرموں کے لیے ہی مجرم نہیں ہو قانون کے محافظ کہلانے والے بھی تمہیں مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔

''اب کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ میں یہاں کا ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔ کبھی ضرورت ہوئی تو میں بیان دوں گا کہ تم میرے بیٹے ہو۔

''اس علاقے کے بے شمار لوگ اور یہاں سے لندن تک پھیلے ہوئے میرے رشتے دار گواہی دیں گے کہ تم میرے بیٹے رابن سن ہو اور تم نے دین اسلام قبول کیا ہے۔ میرے پاس رابن سن کا شناختی کارڈ اور تعلیمی ڈگریاں ہیں۔ میں ایمان علی ولد ڈاکٹر مینی سن کے نام سے تمہارا نیا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا دوں گا۔''

مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میں آپ کے یہ احسانات کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ میرے رازدار بن کر رہیں گے تو کوئی مجھ پر کبھی شبہ نہیں کرے گا۔''

''تمہارا فرض ہے کہ میرے احسانات کا بدلہ مجھے دو اور میری ایک خواہش پوری کرو۔''

''جہاں تک میرے اختیار میں ہوگا، میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں ہمیشہ میرے بیٹے بن کر رہو۔''

''میں یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکوں گا۔ پاکستان میں میری جانِ حیات ہے۔ آپ کی ہونے والی بہو کا نام ماروی ہے۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔''

''میں تمہیں بہو کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا لیکن وہاں کیسے جاؤ گے؟ دھرم داس جی نے کہا ہے کہ

تمہارے وطن کی زمین تمہارے لیے تنگ ہوگئی ہے۔"

"اب وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں چھپ کر ماروی سے ملوں گا۔ وہاں اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے لیے اس نئے روپ میں نیک نامی سے... پُرامن شہری کی طرح رہوں گا۔ ہتھیار پھینک دوں گا۔"

"وہاں نہیں رہ سکو گے۔ اگرچہ کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا لیکن ماروی کی وجہ سے تم پہچان لیے جاؤ گے۔"

"ہاں، یہ اندیشہ ہے۔ میں سوچوں گا۔ کوئی تدبیر کام نہ آئی تو ماروی کو یہاں لے آؤں گا۔"

وہ خوش ہوکر بولا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ اس سے اچھی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا بیٹا میری بہو میرے پوتی پوتے یہاں میرے گھر میں رہیں گے۔"

"اگر کسی وجہ سے یہاں نہ آسکا تو؟"

"تو لندن میں میرا ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ میرے بعد اور کون میرا ہوگا؟ تم ہی بیٹے کی حیثیت سے میری تمام دولت اور جائداد کے مالک بن جاؤ گے۔"

ڈاکٹر ٹیمی سن کے ذریعے اسے بڑی سہولتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ ایمان علی کے نام سے ایک پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بن جاتا تو وہ بہ آسانی سرحد پار اپنی ماروی کے پاس جاسکتا تھا۔

اگر ماروی کے ساتھ پاکستان میں رہنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اپنی شریکِ حیات کو لے کر دہلی ڈاکٹر ٹیمی سن کے پاس پھر سے پُرامن شہری کی طرح شریفانہ زندگی گزارنے لگتا۔

اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ بیٹے سے محروم ہوگئے تھے۔ اب میں اس کی کمی پوری کروں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آجاؤں گا۔"

وہ خوش ہو رہا تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ مراد نے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد دشمنوں سے نجات حاصل کرلوں اور اپنی دلی خواہش کے مطابق یہاں ماروی کے ساتھ رہ کر محفوظ اور پُرامن زندگی گزاروں۔"

اس نے کہا۔ "تم انگریزی بولتے ہو لیکن لندن کے عیسائیوں والا لہجہ اور اسٹائل نہیں ہے۔ اسے سیکھنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ رہو گے تو یہ سیکھ لو گے۔

"میرے بیٹے کی حیثیت سے وہاں تمہارے کئی عیسائی رشتے دار بھی ہیں۔ وہ مزاج کے کیسے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ تمہارے لیے یہ سب جاننا لازمی ہے۔ میں البم سے ان کی تصویریں تمہیں دکھاتا رہوں گا۔ ان سب کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا رہوں گا۔"

ایک ملازم نے آکر کہا۔ "دھرم داس جی آئے ہیں۔"

ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد آئے، مراد کی صورت تبدیل ہوجائے گی۔ وہ دونوں کلینک کے وزیٹنگ روم میں آئے۔ دھرم داس نے اس کے بیٹے کو دیکھ کر حیرانی سے کہا۔ "رابن سن! تم واپس آگئے؟ تم کیسے بیٹے ہو؟ باپ کو پانچ برسوں سے ترساتے اور پریشان کرتے رہے ہو؟"

مراد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے اچھی طرح دیکھیں، میری یہ انگریزی لینگویج سنیں۔ کیا میں واقعی رابن سن ہوں؟"

وہ بولا۔ "اس میں کیا شبہ ہے؟ تم ڈاکٹر کے بیٹے ہو۔ میں برسوں سے تمہیں دیکھتا آیا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے ہندی بھاشا میں بولا۔ "دھرم داس جی میں آپ کا سیوک مراد علی منگی ہوں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میری مہارت دیکھ رہے ہو۔ میں نے مراد کو نیا چہرہ دے کر اپنے بیٹے کو زندہ کردیا ہے۔"

دھرم داس بالکل قریب آکر مراد کے چہرے کو چھوکر دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔ "ہے بھگوان! ڈاکٹری دنیا میں کیا ایسا بھی ہوجاتا ہے؟ ڈاکٹر! تم نے چمتکار دکھایا ہے۔ مراد علی منگی کو بالکل ہی غائب کردیا ہے۔ دشمن تو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرجائیں گے۔"

وہ پھر اسے چھوکر بولا۔ "وہ ہتیارے اس کے سامنے آکر بھی اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ تم نے کمال کردیا ہے ڈاکٹر!"

پھر اس نے مراد سے پوچھا۔ "اس نئے چہرے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ تم ایک بہت ہی مشہور و معروف اور بہت ہی عزت دار ڈاکٹر کے بیٹے بن گئے ہو۔ تمہیں قسمت سے یہ موقع مل رہا ہے۔ ڈاکٹر کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اسلحہ پھینک دو۔ اپنے تمام دشمنوں کو بھول جاؤ۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "دھرم جی بہت اچھی بات کہہ رہے ہیں۔ آج تم نے نیا جنم لیا ہے۔ آج سے تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس لیے اب نہ اسلحہ اٹھاؤ، نہ نئے دشمن پیدا کرو۔"

مراد نے کہا۔ "میری ماروی دل سے چاہتی ہے کہ میں پُرامن شہری کی طرح شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آؤں۔"

وہ سر اُٹھا کر خلا میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر

میں چوبیس دن کے اندر نیک نامی حاصل کرکے اس کے پاس نہیں جاؤں گا تو وہ پرائی ہوجائے گی۔

"میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس ربِ کریم سے وعدہ کیا تھا کہ گناہوں سے باز آجاؤں گا اور پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرتا رہوں گا۔ شکر ہے میرے معبود...! تب سے میری زندگی میں بہتری آرہی ہے۔ میں گناہوں سے دامن بچاتا آرہا ہوں اور یہ تو ناممکن نظر آتا تھا کہ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے پاکستان جاکر یقین دلاسکوں گا کہ میں اب مجرم نہیں رہا ہوں۔ میں نے ہتھیار پھینک دیے ہیں۔

"صرف وہی ہمارا معبود ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔ یا اللہ...! اب میں ہتھیار پھینک کر ماروی کے ساتھ شریفانہ زندگی گزار سکوں گا۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں۔ جیسے ہی ایمان علی کے نام سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنے گا، میں یہاں سے پاکستان چلا جاؤں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "دھرم داس جی! یہ آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنا آپ کے لیے گھر کی بات ہے۔ میرے بیٹے کا اسلامی نام ایمان علی ہے۔ کیا دو چار روز میں اس کے لیے قانونی کاغذات تیار ہوجائیں گے؟"

اس نے کہا۔ "آپ ابھی بیٹے کے لیے درخواست لکھیں اور اس کی تصاویر دیں۔"

وہ چٹکی بجا کر بولا۔ "یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کل ہی آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ تیار ہوجائے گا۔"

مراد خوشی سے کھل گیا۔ اس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے میں اپنی ماروی کے پاس دو چار روز میں جاسکوں گا۔"

"بے شک جاسکو گے لیکن وعدہ کرو۔ وہاں سے بہو کو میرے پاس لاؤ گے۔"

"اللہ کو منظور ہوا تو اسے اسی پناہ گاہ میں لاؤں گا لیکن کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ بات یہاں آکر اٹکتی ہے کہ ماروی میرے ساتھ پاکستان یا انڈیا میں یا لندن میں رہے۔ اس کی وجہ سے میں اس بہروپ کے باوجود پہچان لیا جاؤں گا۔"

دونوں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ دھرم داس نے کہا۔ "جہاں جاؤ گے ماروی تمہاری پہچان بن جائے گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "میری بہو مصیبت نہیں بنے گی۔ میں اس کی بھی صورت بدل دوں گا۔"

مراد نے کہا۔ "نہیں ڈیڈ! میں ایسی پیاری من موہنی سی صورت کو مٹنے نہیں دوں گا۔ ایسا لاجواب قدرتی حسن نہ اس دنیا میں ہے نہ ہوگا اور نہ ہی آپ جیسے ماہر سرجن سرجری کے ذریعے ایسا حسن پیدا کرسکیں گے۔ ہم اس پہلو پر بعد میں گفتگو کریں گے۔ ابھی رازداری کے سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ڈیڈی نے میرا یہ چہرہ بنایا ہے اور دھرم داس جی ہمارے رازدار ہیں۔

"دھرم جی! آپ ماسٹر کوبو کے وفادار ہیں۔ کیا اس سے یہ بات چھپائیں گے کہ میں ڈاکٹر ٹیمی سن کا بیٹا بن کر زندگی گزارنے جا رہا ہوں؟"

اس نے کہا۔ "ماسٹر کوبو میرے کام آتا ہے۔ میں اس کے کام آتا ہوں۔ اس حد تک اس کا وفادار ہوں۔ ورنہ وہ انڈیا میں اور بہت سے اہم معاملات مجھ سے چھپاتا ہے میں بھی اپنے بہت سے اہم راز کی ہوا اسے لگنے نہیں دیتا۔ تم مجھ پر شبہ کرسکتے ہو۔ لیکن مجھ پر بھروسا کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ڈاکٹر کے بعد میں دوسرا رازدار ہوں۔"

وہ مراد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "تم رفتہ رفتہ یقین کرلو گے کہ میں تمہارا سچا رازدار ہوں۔"

ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رنگ ٹون نے مداخلت کی۔ اس نے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر کہا۔ "کوئی اجنبی کال کر رہا ہے۔" اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر پوچھا۔ "ہیلو۔ کون ہیں آپ؟"

کسی نے کہا۔ "میں تمہاری موت ہوں۔ اگر پوری زندگی جینا چاہتے ہو تو بتاؤ، مراد علی منگی کہاں ہے؟"

اس نے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ "میں کسی مراد علی منگی کو نہیں جانتا۔ تم شاید رانگ نمبر پر بول رہے ہو۔"

مراد اپنی جگہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ دھرم داس کا منہ تکنے لگا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "پانچ گھنٹے پہلے ہمارے ایک مخبر نے تمہیں مراد کے ساتھ تمہارے گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ تم اسے چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ ہم نے تمہارے پی اے سے مراد کا پتا پوچھا تھا۔ اس نے بتانے سے انکار کیا تو اسے گولی ماردی۔ تم اس کے گھر جاکر اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔ یہ تمہارے لیے وارننگ ہے۔ اگر تم نے ایک گھنٹے کے اندر مراد تک نہیں پہنچایا تو اپنی چتا کا ایندھن بن جاؤ گے۔"

دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ دھرم داس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اپنے پی اے کی خیریت معلوم کی تو دشمن کی دھمکی درست ثابت ہوئی۔ اس بے چارے کو کسی نے گولی ماردی تھی۔

مراد نے اس سے کہا۔ ”ابھی آپ اور ڈیڈی نصیحت کر رہے تھے کہ مجھے اسلحہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اب بتائیں' میں کس دل سے آپ کو دشمنوں کا نشانہ بننے دوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ ابھی اپنے اطراف سکیورٹی سخت کرلوں گا۔“

”دھرم جی! آپ نے ہیلری ہڈسن کے لیے بھی سکیورٹی بڑھادی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بہن کو اغوا کر رہے تھے۔ آپ اپنی جوان بیٹیوں اور بیٹوں کو کیسے سکیورٹی دیں گے۔ وہ میری بہنیں ہیں۔ کالج اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ آپ کے بیٹے میرے بھائی ہیں۔ سرکاری عہدوں پر ڈیوٹی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت کہیں سے ایک اندھی گولی آکر انہیں لگ سکتی ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں' آپ کے حفاظتی انتظامات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔“

وہ اپنے صوفے پر پریشانی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایک باپ خود تو خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ جوان اولاد کی طرف موت آئے۔ فون کال سے ملنے والی دھمکی کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹیاں اور بیٹے نادیدہ گن پوائنٹ پر ہیں۔

وہ بولا۔ ”تم نے لیزا کو بچالیا تھا۔ تم سکیورٹی گارڈز سے زیادہ تیز طرار اور قابلِ اعتماد ہو۔ تم ہی دشمنوں کو میری بیٹیوں اور بیٹوں کے قریب آنے سے روک سکو گے۔“

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”دھرم جی کے بچے میرے بچے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ میرے بیٹے ایمان علی! تمہیں اسلحہ نہیں پھینکنا چاہیے۔ میں بہت مجبور ہوکر کہہ رہا ہوں۔ کچھ روز کے لیے... دھرم جی کے بچوں کی سلامتی کے لیے اسلحہ اٹھالو۔“

وہ بولا۔ ”کچھ روز کے لیے نہیں ڈیڈ! یہ اسلحہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ آگے جاکر دشمن مجھے نہیں پائیں گے تو ماروی کو اغوا کرنا چاہیں گے۔ مجھے اسلحہ ہاتھوں میں رکھنا ہی ہوگا۔“

دھرم داس اپنے تمام بچوں کو فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ آج اور کل گھر سے نہ نکلیں۔ نامعلوم دشمنوں نے پی اے کو ہلاک کیا ہے' انہیں بھی گولی مار سکتے ہیں۔ وہ گھر آکر انہیں تفصیل بتائے گا کہ معاملات کیا ہیں؟

پھر اس نے فون کے ذریعے سکیورٹی گارڈز کو بلایا۔ مراد نے کہا۔ ”میں باہر جارہا ہوں۔ موٹر سائیکل پر دور تک جاؤں گا' چاروں طرف دیکھوں گا۔ جو لوگ مشکوک لگیں گے' انہیں دور سے نشانے پر رکھوں گا۔ جب آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے تو میں واپس آجاؤں گا۔ آپ بچوں کے متعلق بتائیں' وہ کہاں ہیں۔“

”ایک بیٹی اور تین بیٹے گھر میں ہیں۔ بڑی بیٹی پریمنا پریکٹیکل کلاس اٹینڈ کرنے گئی تھی۔ وہیں رُکی رہے گی۔ میں دو گارڈز کو بھیج رہا ہوں۔“

”آپ پریمنا سے بولیں' وہیں گارڈز کے ساتھ رہے۔ جب میں وہاں پہنچوں تو کالج سے نکلے۔“

دھرم داس بیٹی کو کال کرنے لگا۔ مراد نے اپنے ریوالور کو چیک کیا۔ اسے لباس کے اندر چھپایا۔ دو فاضل میگزین جیبوں میں رکھے پھر ہیلمٹ پہن لیا۔ اس طرح اس کی صورت کسی کو نظر نہ آتی۔ پھر وہ کلینک سے باہر آگیا۔

وہ موٹر سائیکل کے پاس آکر دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے بچوں کا پارک تھا۔ شام کے وقت بچے کھیل رہے تھے۔ اس کے بعد ایک شاہراہ تھوڑک سنگھ تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ادھر جانے لگا۔ وہ پارک کے ایک طرف گھوم کر جارہا تھا پھر بیس گز کے فاصلے پر جاکر رک گیا۔ پارک کے اس حصے میں لڑکیاں اور لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ تالیاں بجارہے تھے۔

وہ بہ ظاہر تماشا دیکھنے کے بہانے پارک میں دور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہوگئے تھے۔ اب تب میں رات کی تاریکی چھانے والی تھی۔

وہاں ایک جالی دار پنجرہ تھا۔ بچے اس پنجرے میں گھس کر رینگتے ہوئے دور تک جاتے ہوئے پنجرے کے دوسرے سرے سے باہر نکلتے تھے۔ اب بچوں کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے باعث وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ واپس جارہے تھے۔ ایسے وقت مراد نے دو مشکوک افراد کو اس پنجرے میں دیکھا۔

وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے پنجرے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ اس دوسرے سرے کا رخ ڈاکٹر کے کلینک کی سمت تھا۔

کلینک سے صرف پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔ دھرم داس دروازہ کھول کر باہر گاڑی میں بیٹھنے آتا تو گاڑی تک پہنچنے سے پہلے بڑی آسانی سے ٹارگٹ بن جاتا۔

قاتلوں کے فرار ہونے کے لیے پارک کے احاطے کے باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ احاطے کے باہر جہاں مراد تھا' وہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو دھکیلتا ہوا پنجرے کے دوسرے سرے کے سامنے

آگیا۔ احاطے کی دیوار نے اور تاریکی نے اسے چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں شوٹرز صاف نظر آرہے تھے اور بہت ہی ایزی ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔

اس نے فون پر کہا۔ ”دھرم جی! آپ اپنے گارڈز کا انتظار نہ کریں۔ آپ دروازہ کھول کر ابھی اسی وقت کلینک سے باہر آئیں۔ میں آپ کے قریب ہی رہوں گا۔“

اس نے فون بند کرکے اسے جیب میں رکھا پھر ریوالور کو نکال کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر دھرم داس کے باہر آتے ہی وہ گولی نہ چلاتا یا اس کا نشانہ چوک جاتا تو دشمنوں کی گنوں سے نکلی ہوئی گولیاں باہر آنے والے ایم این اے کا کام تمام کردیتیں۔

ہوسکتا تھا' وہ اسے جان سے نہ مارتے زخمی کرنے کے بعد اس سے مراد کا پتا پوچھتے رہتے۔ اس وقت انہوں نے اپنا اسلحہ ایک تھیلے میں چھپا رکھا تھا پھر جیسے ہی کلینک کا دروازہ کھلا' انہوں نے پھرتی سے اپنی گنیں باہر نکال لیں۔

ان دونوں کی گنوں میں ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ نشانہ خطا نہیں ہوسکتا تھا۔ ان سے پہلے ہی مراد ان کی تاک میں احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا۔ گولی ایک کی کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئی۔

دوسرا شوٹر بدک گیا۔ چشم زدن میں سمجھ گیا کہ کسی کے نشانے پر ہے۔ ایسی پچویشن میں فوراً جگہ بدلنی تھی۔ وہ وہاں سے اچھل کر ایک مجسمے کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن اچھلنے کے بعد گولی کھا کر زمین پر واپس آیا اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے اسے کان سے لگایا۔ دھرم داس نے واپس اندر جاکر دروازے کو بند کرلیا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے باہر آنے کو کہا تھا۔ وہاں کہیں سے گولیاں چل رہی ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے گولیاں چلائی ہیں۔ جو آپ کو قتل کرنے آئے تھے' ان میں سے ایک مرگیا ہے۔ دوسرا شاید زندہ ہے' زخمی پڑا ہے۔ سپاہیوں سے بولیں فوراً اسے اسپتال لے جاکر اگلوائیں کہ وہ کس خطرناک گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا' اس کی شامت آگئی۔ ایک گولی اس کے ہیلمٹ سے ٹھن کی آواز کے ساتھ ٹکراتی ہوئی خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دھپ سے زمین پر گر کر لڑھکتا ہوا احاطے کی دیوار سے لگ گیا۔

آدھا لیٹ کر آدھا بیٹھ کر دور تک نیم تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی دور تاریکی میں جیسے شعلہ سا لپکا' ایک گولی چلی۔ اس کے سامنے کسی کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ فائرنگ کی زد میں آئی۔ اس گاڑی نے آنے والی گولی کو روک لیا تھا۔

اسی لمحے میں مراد کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے کسی کو آخری بار چیخنے پر مجبور کیا۔ دوسرا بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کی سمت متواتر گولیاں چلانے لگا۔ ایک فائر دوسرا فائر پھر تیسرا... آخر چوتھے فائر پر بھاگنے والا گر پڑا۔

ایسے وقت پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی کلینک کے سامنے آکر رک گئی تھیں۔ مراد فوراً ہی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے نئے روپ میں ایمان علی کو گن فائٹر کے طور پر دیکھے۔ اس نے دور جاکر فون پر دھرم داس سے کہا۔ ”یہ یاد رکھیں۔ کسی سے یہ نہ بولیں کہ ڈاکٹر نمی حسن کے بیٹے نے ان قاتلوں سے مقابلہ کیا ہے۔ آپ انجان بن جائیں۔ یہ کہہ دیں کہ آپ کلینک کے اندر تھے باہر نہ جانے کن لوگوں کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی تھی۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”بہت خوب مراد...! میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا ہوں۔ ابھی پولیس سے نمٹ کر تم سے بات کروں گا۔“

وہ فون کو جیب میں رکھ کر تیزی سے بائیک دوڑاتا ہوا ایک ریسٹورنٹ میں آگیا۔ صبح ناشتے کے بعد کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک میز پر آکر کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے فون پر نمبر پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

ماروی ننھے شہزادے سے کھیل رہی تھی۔ محبوب ایک گھنٹے بعد ڈنر کے لیے آنے والا تھا۔ اس کے نصیب میں مراد کے ساتھ کھانا پینا نہیں تھا۔ وہ دن رات اس کے بچے سے بہلتی رہتی تھی۔ اس نے سر گھما کر اپنے فون کو دیکھا۔ رنگ ٹون اسے بلا رہی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے فون کو اٹھایا۔ دل کہہ رہا تھا مراد آیا ہے اور واقعی وہ اسے پکار رہا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ گویا دل سے لگایا۔ دل والے نے پوچھا۔ ”میری جان! کیسی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تمہارے بغیر کیسی ہوسکتی ہوں یہ خود سوچو۔“

”انشاء اللہ جدائی کے دن ختم ہوجائیں گے۔ ایک اچھی بات سنا رہا ہوں۔ تم سے مشورہ کرنے اور تم سے

اجازت لینے کے بعد چہرہ تبدیل کر چکا ہوں۔ آج سے کوئی دوست اور دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ تمہارے سامنے آؤں گا تو تم بھی مجھے اجنبی سمجھو گی۔“

”میرے سامنے آؤ اور آزماؤ۔ میں کوڈ ورڈز کے ذریعے تمہیں پہچان لوں گی۔ یہ تم نے چہرہ بدل کر بہت اچھا کیا ہے۔ اب تو نہ دشمن تمہارے پیچھے آئیں گے نہ تم بندوق اٹھاؤ گے۔“

”بندوق تو میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ چہرہ بدلنے کے بعد میں محفوظ ہو گیا ہوں لیکن تم غیر محفوظ ہو گئی ہو۔ دشمن جانتے ہیں کہ تم میری جان ہو۔ میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ وہ تمہیں گن پوائنٹ پر اغوا کر کے کہیں لے جائیں گے۔ پھر تم سمجھ سکتی ہو۔ وہ درندے تمہاری زندگی کا سودا مجھ سے کریں گے اور مجھے گن پوائنٹ پر آنے کے لیے مجبور کر دیں گے۔“

”یا اللہ! یہ نئی بات کیا کہہ رہے ہو؟ عقل کہتی ہے دشمن ایسا ضرور کریں گے۔ پھر کیا ہوگا مراد؟“

”یہی تو کہہ رہا ہوں کہ بندوق پھینک نہیں سکتا۔ آئندہ تمہارے لیے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ یاد رکھو، سب سے زیادہ خطرہ مرینہ کی طرف سے ہے۔ جب وہ مجھے نہیں پائے گی تو تمہیں نقصان پہنچانے یا اغوا کرنے آئے گی تاکہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں اور اس کے ساتھ بھی ازدواجی زندگی گزاروں۔“

ماروی نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ کیسی بے شرم عورت ہے۔ کیا شرم اور شرافت اسے چھو کر نہیں گزری ہے؟“

”وہ مغربی ماحول کی پروردہ ہے۔ تم اطمینان رکھو اب وہ نہ مجھے پہچان سکے گی، نہ آئندہ میری مجبوریوں سے کھیل سکے گی۔ میں تمہیں اس کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔“

”کیا تم اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے یہاں آسکو گے؟“

”انشاء اللہ! آج نہیں تو کل یا پھر چوبیس دنوں کے اندر ضرور آؤں گا۔“

”آ تو جاؤ گے لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آئے ہو؟

”تمہاری تو صورت بدل گئی ہے۔ کیا انہیں بتاؤ گے کہ تم نے نئے چہرے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے؟“

”ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ محبوب وغیرہ کو میرے چہرے کی تبدیلی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہاں آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔“

ویٹر اس کے سامنے کھانا لا کر رکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ ماروی بول رہی تھی۔ ”خود کو یہاں آ کر ظاہر کرنا ہوگا کہ تم مراد ہو اور جرائم کی دنیا سے نکلنے کے لیے چہرہ بدل چکے ہو۔“

”محبوب کو بتانے کا مطلب یہ ہوگا کہ معروف صاحب کو، سمیرا کو اور حماد صدیقی کو معلوم ہوگا۔ میرا چہرہ تبدیل ہونے کا راز کھلتا جائے گا۔ دشمنوں کو بھنک ملے گی تو پھر وہی دشمنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ وہی بھاگ دوڑ وہی پریشانیاں، مرینہ تو جان کو آ جائے گی۔ فی الحال اسی میں بہتری ہے کہ میں نئے بہروپ میں جب تک چھپ سکتا ہوں، چھپا رہوں۔“

”پھر محبوب پوچھیں گے کہ تم کہاں ہو؟ اور ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئے ہو؟ پھر تو وہ دو تاریخ کو مجھے دلہن بنانے کے حق دار ہو جائیں گے۔“

”ہاں۔ یہ بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ حل نہ ہوا تو تمہیں پرایا ہونا پڑے گا اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔“

”نہیں مراد! حقائق کو تسلیم کرو۔ تمہاری پارسائی کا یقین صرف میں کر رہی ہوں۔ تم نے چہرہ بدلتے ہی مرینہ سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اب تم مجرم کہلانے والے مراد علی منگی نہیں ہو۔“

”لیکن یہ حقائق محبوب کو اور معروف صاحب وغیرہ کو معلوم ہونے چاہئیں۔ معلوم نہیں ہوگا اور تم گناہ گار اور مجرم کہلاتے رہو گے تو میں زبان ہار جاؤں گی۔ پھر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھے محبوب سے نکاح قبول کرنا ہوگا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے، میرا فیصلہ سن لو۔ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ تک کوئی تدبیر سوچتا رہوں گا۔ جب دوسرے دن دو تاریخ کو دیکھوں گا کہ تم پرائی ہونے والی ہو تو مجبوراً خود کو ظاہر کر دوں گا۔ یہ ثابت کر دوں گا کہ چہرہ بدل کر میں نے مجرمانہ زندگی بدل دی ہے اور اب میں گناہ گار بھی نہیں رہا ہوں۔“

”اس کے بعد تمہارے پرانے دشمن پھر سے پیدا ہو جائیں گے اور تمہاری زندگی عذاب بنا دیں گے۔“

”مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھ پر جو بھی قیامت گزرے میں تمہیں پرایا نہیں ہونے دوں گا۔“

”مراد! کچھ ایسا کرو کہ جتنی جلدی ہو سکے چپ چاپ یہاں آ کر مجھے لے جاؤ اور کہیں چھپا کر رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کسی بند کوٹھری میں زندگی گزار لوں گی۔“

”میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ تمہیں رازداری سے

یہاں لے آؤں یا لندن لے جاؤں۔ ابھی بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہے۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

وہ کھا رہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے کہا۔ ”یہ اچھی طرح جانتی ہوں، دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے تم مجھے پرائی نہیں ہونے دو گے۔ ہائے مراد! میں تم سے جتنا پیار کروں کی اتنا ہی کم ہوگا۔ میں دل ہی دل میں تم پر قربان ہو رہی ہوں۔“

”ایسی پیار بھری باتیں کرو گی تو ابھی بھاگ کر چلا آؤں گا۔ بائی دا وے، یہ یاد رکھو اب میرا فون نمبر بدل جائے گا۔ یہ سم نکال کر پھینک دوں گا۔ اگلی کال نئے نمبر سے آئے گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ماروی کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اگر وہ جلد پاکستان نہ جا سکا تو ماسٹر کو بوبو کو اس کی سلامتی اور مضبوط سیکیورٹی کے لیے بولنا ہوگا۔

وہ آخری لقمہ چباتے ہوئے دل ہی دل میں بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو کل صبح ہونے تک ماروی کے چاروں طرف سیکیورٹی کی آہنی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

وہ کھانے کے بعد پانی پینے لگا۔ ایسے وقت دھرم داس نے اسے کال کی۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”جی دھرم جی! وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ پتا چلا کہ وہ دشمن کون تھے؟“

اس نے کہا۔ ”تم نے تنہا چار شوٹرز کو مار گرایا ہے۔ ان میں سے ایک زندہ ہے۔ بری طرح زخمی ہے۔ وہ مقامی باشندہ ہے۔ سنڈیکیٹ ریڈ الرٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔

”مراد! پتا نہیں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ آج صبح ہیلری ہڈسن پر ڈینجرس ریکٹ کے شوٹرز نے حملہ کیا تھا۔ اس کی بہن لیزا کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی تمہارا پتا پوچھ رہے تھے۔ یہ ریڈ الرٹ والے بھی پوچھ رہے ہیں۔ بہرحال تم کالج جاؤ۔ وہاں میرے دو گن مین گاڑی لے کر گئے ہیں۔ تم جاؤ گے تو پریمنا کالج سے باہر آئے گی۔“

”میں ابھی جا رہا ہوں۔ آپ ماسٹر کو بوبو کو میرے اور اپنے حالات بتائیں۔ میں پریمنا کو سیکیورٹی دینے کے بعد ماسٹر سے بات کروں گا۔“

دھرم داس نے اسے پریمنا کا فون نمبر بتایا۔ وہ رابطہ ختم کر کے کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے باہر آیا اور کالج کی طرف جانے لگا۔

برسرِ اقتدار پارٹی کے ایک ایم این اے پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تمام پولیس اور سی آئی اے والوں نے ریڈ الرٹ اور ڈینجرس ریکٹ کے زرخرید شوٹروں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ دھرم داس... پولیس والوں کو بیان دے رہا تھا کہ خطرناک تنظیموں اور انڈر ورلڈ والے کسی مراد علی منگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یو کے ایمبیسی کے منتظم ہیلری ہڈسن پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مراد علی منگی کو کہیں چھپایا ہے۔ کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ میں پاکستان سے آنے والے کسی جاسوس کو چھپا کر رکھوں گا۔ ان خطرناک تنظیموں کے... سربراہوں سے بات کی جائے۔ انہیں حکم دیا جائے کہ ہمارے دیس سے نکل جائیں ورنہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور وہ جو مراد علی منگی پاکستانی جاسوس ہے اسے بھی جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ ہم دیس بھگت ہیں۔ دیس کے دشمنوں کو یہاں سانس بھی لینے نہیں دیں گے۔

مراد اس دیس بھگت کی بیٹی کو سیکیورٹی دینے کے لیے کالج کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر مسجد میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون نے اس کی توجہ کو پکارا۔ اس نے فون کو دیکھا۔ ایک نیا نمبر تھا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو... کون؟“

دوسری طرف سے بہت ہی مترنم آواز سنائی دی۔ ”رابن سن! یہ تم بول رہے ہو نا؟ ڈیڈی نے تمہارا نمبر دیا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”میں کبھی رابن سن تھا، اب ایمان علی ہوں۔“

وہ بولی۔ ”تم ایکس وائی زیڈ کوئی سا بھی نام رکھ لو، میرے ساتھ گزارے ہوئے پیار بھرے لمحات تو یاد ہوں گے؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ دیکھو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے کالج کے سامنے والی مسجد میں جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد فون کروں گا تو تم کالج سے باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھو گی۔“

”تم بھی میرے ساتھ بیٹھو گے نا؟“

”میں اپنی موٹر سائیکل پر دور سے نگرانی کرتا رہوں گا۔ آدھے گھنٹے تک یہ فون بند رہے گا۔“ اس نے فون کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں رکھا پھر زیرِ لب کلمہ پڑھتا ہوا مسجد کے اندر چلا گیا۔

پریمنا کالج کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی، اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اس کے یار رابن سن کی آواز بند

ہوگئی تھی۔اس نے پھر اس کا نمبر ری ڈائل کیا۔ پتا چلا' فون بند ہے۔وہ کہہ چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کال کرے گا۔

وہ اسے تصور کی اسکرین پر دیکھنے لگی۔رابن سن چھ فٹ سے بھی اونچا ایک صحت مند نوجوان تھا۔لڑکیاں اس کی خوبروئی پر مرتی تھیں۔وہ دینِ اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک کھلنڈرا لپے بوائے تھا۔ حسین لڑکیوں کو خوش کرتا رہتا تھا۔اس نے پریمنا سے بھی خوش کرنے والی دو چار ملاقاتیں کی تھیں۔وہ اس کی دیوانی ہوگئی تھی لیکن پھر اچانک ہی رابن سن بدل گیا۔لڑکیوں سے کترانے لگا۔اس نے پریمنا سے کہا۔'' مجھے بھول جاؤ۔میں نے گناہوں سے توبہ کی ہے۔میں اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے والا ہوں۔اس سے پہلے میں تمام غلطیوں سے پاک ہوجانا چاہتا ہوں۔''

اگر وہ تنہائی میں یہ بات کہتا تو پریمنا بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی۔پیاس بجھا کر رہتی لیکن اس نے ایک ریسٹورنٹ میں یہ کہا تھا اور اس سے جدا ہوگیا تھا۔اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے دینِ اسلام قبول کیا ہے اور باپ نے طیش میں آکر اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ان دنوں وہ انیس برس کی تھی۔اب چوبیس کی ہوگئی تھی۔اس نے پانچ برس بعد آکر اسے پھر بھڑکا دیا تھا۔

وہ مسجد میں تھا۔نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔''یا میرے پاک پروردگار! میں گناہوں سے بچنے کی کوششیں کررہا ہوں اور تو مجھے میری نیک نیتی کا بھرپور صلہ دے رہا ہے۔تیرا شکر ہے کہ مجھے گناہوں سے دور کررہا ہے۔

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑتا ہوں۔آج پھر آزمائش سے گزرنے والا ہوں۔پتا نہیں پریمنا کیسی لڑکی ہے اور کس حد تک جائے گی۔تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔تو ہی غلطیوں سے اور گناہوں سے بچانے والا ہے۔''

وہ دعائیں مانگ کر زیرِ لب آیتیں پڑھتا ہوا مسجد سے باہر آیا۔اس نے فون نکال کر اس کا سوئچ آن کیا پھر پریمنا سے رابطہ کرکے بولا۔''اپنے گارڈز کے ساتھ باہر آکر گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور اپنے گھر کی طرف جاؤ۔''

اس نے خلافِ توقع کہا۔''میں نہیں جاؤں گی۔''

وہ حیرانی سے بولا۔''کیا کہہ رہی ہو؟''

''تم میرے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھوگے تو میں یہاں سے نکلوں گی۔تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم میرے ساتھ بیٹھنے کی ضد کررہی ہو۔تمہارے ڈیڈی پر قاتلانہ حملے ہوچکے ہیں۔میں دور رہ کر سیکیورٹی دوں گا۔چلو باہر نکلو۔''

''پلیز رابن سن! میری بات مان لو۔تم نے میری سہیلی شیلا کے گھر میں میرے ساتھ رات گزاری تھی۔ابھی ہم اسی گھر میں جائیں گے۔ وہاں تنہائی میں دو چار گھنٹے گزاریں گے۔میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ شیلا نے مجھے روک لیا ہے۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اب رابن سن نہیں رہا۔میرا مذہب' میرا من' مزاج سب بدل چکا ہے۔میں عورتوں کے سائے سے دور رہتا ہوں۔''

''تم نے مجھے لڑکی سے عورت بنایا ہے۔اب مذہب بدل کر مجھ سے نہ بھاگو۔اپنی موٹر سائیکل دونوں گارڈز کو دو۔میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔''

اس نے فون بند کیا پھر دھرم داس سے رابطہ کرکے بولا۔''دھرم جی! میں آپ کو پریمنا کے بارے میں ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔پانچ برس پہلے رابن سن سے اس کا رومانس چل رہا تھا۔وہ اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار چکی ہے۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔''مراد! یہ کیا بکواس کررہے ہو؟''

''آپ ذرا صبر سے سنیں۔ابھی آپ کو سچائی معلوم ہوجائے گی۔وہ مجھے رابن سن سمجھ کر ضد کررہی ہے کہ ابھی ایک سہیلی کے گھر جاکر میرے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے گی۔میں نے انکار کیا ہے تو وہ کالج سے باہر آنے سے انکار کررہی ہے۔کہتی ہے میں اس کی بات مانوں گا تو گاڑی میں آکر بیٹھے گی۔ورنہ میری سیکیورٹی میں نہیں جائے گی۔آپ اسے سمجھائیں۔''

دھرم داس نے فوراً ہی مراد سے رابطہ ختم کرکے بیٹی کو مخاطب کیا۔پھر پوچھا۔''رابن سن کے ساتھ تمہارا کیا چکر تھا؟''

''وہ بولی۔''ڈیڈ! میں اسے چاہتی ہوں۔وہ بھی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔گھر آکر آپ کو یہ بتانے والی تھی مگر وہ تو چینج ہوگیا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ مسلمان ہوگیا ہے۔مجھے غصہ آرہا ہے۔وہ مسلمان ہوتے ہی بدل گیا ہے۔میرا دل توڑ رہا ہے۔''

وہ اقرار کررہی تھی کہ رابن سن کے ساتھ اس کا چکر چل رہا تھا۔باپ نے پریشان ہوکر کچھ سوچا پھر کہا۔''تم گھر آؤ تو میں تمہاری خبر لوں گا۔''

''پلیز دھمکی نہ دیں ڈیڈ...! کیا آپ نہیں جانتے کہ

میں قانون کے مطابق بالغ ہوگئی ہوں۔''

وہ طیش میں آکر دہاڑنے لگا۔'' بکواس مت کرو۔میں ایم این اے ہوں۔دہلی کے دولت مندوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔کیا تم میری عزت کو خاک میں ملانا چاہتی ہو؟''

''جہاں تک عزت اور اونچے مرتبے کی بات ہے' آپ میری شادی اس سے کرادیں۔عزت بنی رہے گی۔''

وہ سمجھ رہا تھا کہ بیٹی جو کہہ رہی ہے وہ ناممکن ہے۔کیونکہ وہ دھوکا کھا رہی تھی۔مراد کو رابن سن سمجھ رہی تھی اور مراد اپنی ماروی کے سوا کسی کو منہ لگانے والا نہیں تھا۔

اس نے کہا۔'' پریمنا! تم گھر آؤ۔ہم شادی کے مسئلے پر تمہاری ممی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔''میں جانتی ہوں میرے ڈیڈی ضرور اسے داماد بنائیں گے۔آپ میری ایک بات اور مان لیں۔وہ پانچ برس بعد آیا ہے۔میں اس کے ساتھ سہیلی کے گھر جاکر ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ نادان نہیں تھا۔یہ سمجھ گیا تھا کہ بیٹی سہیلی کے گھر جاکر مراد کے ساتھ بہت ہی رنگین و سنگین لمحات گزارے گی۔اس نے کہا۔''ابھی حالات بہت سنگین ہیں۔دشمن ہماری تاک میں ہیں۔سیدھی گھر آؤ۔یہاں آرام سے رابن سن کے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتی رہو۔''

''پلیز ڈیڈی! آپ تو ہماری ہر بات مان لیا کرتے ہیں۔یہ بھی مان لیں۔ابھی مجھے سہیلی کے گھر اس کے ساتھ جانے دیں۔''

''تم میری بات نہیں مانوگی تو میں رابن سن سے رشتے کی بات نہیں کروں گا۔تم باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھوگی یا نہیں؟''

وہ مجبور ہوکر بولی۔''آپ اس سے رشتے کی بات کریں گے تو...! ٹھیک ہے' میں باہر گاڑی میں بیٹھنے جارہی ہوں۔''

دھرم داس نے مراد سے فون پر کہا۔''وہ گاڑی میں بیٹھنے آرہی ہے۔''

''جی دھرم جی! میں دور سے دیکھ رہا ہوں۔اللہ نے چاہا تو اسے بخیریت آپ کے پاس لاؤں گا۔''

اس نے فون کو بند کرکے جیب میں رکھا۔دور کالج کے احاطے میں ایک جوان لڑکی دکھائی دی۔وہ ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھنے جارہی تھی۔مراد بھی موٹر سائیکل پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ایسے ہی وقت کسی نے پیچھے سے آکر اس کی گردن پر اپنے گن کی نال رکھ دی پھر کہا۔''ہلنا نہیں، گولی چل جائے گی۔جلدی بولو کون ہو؟ میں دیکھ رہا تھا تم بڑی دیر سے کالج کی طرف دیکھ رہے تھے اور فون پر بولتے ہی چلے

جارہے تھے۔"

مراد نے بالکل ساکت ہو کر کہا۔ "اگر تم میری طرح پیشہ ور شوٹر ہو تو سن لو۔ میں ڈینجرس ریکٹ کا ایک شوٹر ہوں۔ وہ دیکھو دھرم داس کی بیٹی گاڑی میں بیٹھ کر جارہی ہے۔ میں اسے زخمی کرنے یا ہو سکا تو اسے اغوا کرنے آیا ہوں۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔ کیا تنہا اسے اغوا کر سکو گے؟"

"نہ کر سکا تو زخمی ضرور کردوں گا۔ وہ جا رہی ہے۔ تمہارا بھی یہی مقصد ہے تو دیر نہ کرو۔ وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

اس نے کہا۔ "میں ریڈ الرٹ کے لیے کام کررہا ہوں۔ چلو ایک سے دو بھلے۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اسے زخمی کرنے میں کامیاب ہوگا تو ریڈ الرٹ کا مقصد پورا ہوجائے گا۔"

وہ دھرم داس کو صرف دھمکی دینے کے لیے اس کی بیٹی کو زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مراد نے کہا۔ "تو پھر چلو۔ دیر نہ کرو۔"

وہ شوٹر دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی بائیکس کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا۔ پھر رفتار بڑھا کر آگے جانے والی گاڑی کے پیچھے ہوگئے۔

مراد نے بڑی چال بازی سے دشمن کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ ایک لڑکی کو زخمی کر کے بھاگنے کے لیے ایک ہی شوٹر کافی ہوتا ہے۔

وہ اپنی موٹر سائیکل کو دوڑاتے ہوئے مراد کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ "اس گاڑی میں دو گن مین ہیں۔ اگر ہم کسی طرح انہیں ختم کردیں تو لڑکی کو لے جاسکیں گے۔ اسے اغوا کرنے سے مجھے ڈبل پیمنٹ ملے گی۔"

مراد نے کہا۔ "مجھے بھی ڈبل پیمنٹ ملے گی۔ چلو آج ہم ڈبل کمائی کریں گے۔"

وہ بولا۔ "اگر ہم گاڑی کے پہیوں پر فائر کریں تو یہ آگے نہیں جاسکیں گے۔ گاڑی سے نکل کر ہم پر فائر کریں گے ہم جوابی فائرنگ سے انہیں ہلاک کرسکیں گے۔ کیا ان سے مقابلہ کرو گے؟"

وہ بولا۔ "نہیں، مقابلے میں ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔ چلو گاڑی کو ناکارہ بناتے ہیں۔ پھر ہم ان سے دور جا کر دیکھیں گے کہ اس کے گارڈز کیا کرتے ہیں؟"

"تو پھر اسپیڈ بڑھاؤ، اس کار کے قریب ہو کر پہیوں پر گولیاں چلانی ہوں گی۔"

اس مقصد کے لیے دونوں نے رفتار بڑھائی۔ پھر مراد نے اچانک رفتار کم کردی۔ اس طرح وہ آگے نکل گیا۔ مراد نے فوراً ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ پہیوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ بیک وقت دونوں نے گولیاں چلائیں۔ آگے جانے والا گولی کھا کر موٹر سائیکل سے اچھلا۔ پھر نیچے سڑک پر آکر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ اُدھر ایک گارڈ نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کئی فائر کیے۔ لیکن وہ دور ہوتے جارہے تھے۔ گولیاں یوں ہی ہوا میں چلتی رہیں۔

مراد موٹر سائیکل روک کر اتر گیا۔ دور جانے والی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے پڑے ہوئے شوٹر کے پاس آیا۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی لیکن پتھریلی سڑک پر اچھل کر گرنے اور لڑھکتے رہنے کے باعث ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مراد نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "فون نکالو اور اپنے باس کو کال کرو۔ کم آن دیر نہ کرو۔"

اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے فون نکال کر نمبر پنچ کیے پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "بابو بھائی! میں نارائن بول رہا ہوں۔ پتا نہیں یہ کون ہے اس نے مجھے دھوکے سے..."

مراد نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگا کر کہا۔ "اچھا تو تم انڈیا میں ریڈ الرٹ کے ایجنٹ ہو۔ میں نے تمہارے پہلے آقا میکی البرٹ کو اسی شہر میں گولی ماری تھی۔

"اب تمہارے دوسرے آقا میکی براؤن کو معلوم ہو گا کہ اس کے درجنوں جاں نثار اسی طرح حرام موت مرتے رہیں گے۔ پتا نہیں وہ اور کتنوں کو قربانی کا بکرا بناتا رہے گا۔ اپنے اس آقا سے بولو یہاں آئے اور اپنے بھائی کا اور بہنوئی برنارڈ کا انتقام مجھ سے لے۔

"اور بابو بھائی! غیر ملکیوں کے غلام...! آج کے بعد تو بھی گیا۔ اپنی سانسیں گنتے رہنا۔"

یہ کہہ کر اس نے فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر شوٹر سے بولا۔ "یہ بابو بھائی کہاں رہتا ہے؟"

وہ بولا۔ "چاندنی چوک پر رہتا ہے۔ بہت مشہور ہے۔ سب ہی اسے جانتے ہیں۔ مجھے کسی طرح اسپتال پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

مراد نے پوچھا۔ "میں کیوں احسان کروں؟ کبھی زندگی میں کوئی اچھا کام کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو ایک بے قصور لڑکی کو زخمی کرنے اور اغوا کرنے کیوں آئے تھے؟"

اس نے جواب سنے بغیر اسے گولی ماردی۔ پھر اپنی

موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے ڈاکٹر ڈیڈی کے بنگلے میں آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے واپس آجاؤ۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "خدا نے آپ کی دعا قبول کرلی۔ میں خیریت سے آگیا ہوں۔"

"مجھ سے اسی طرح انگریزی میں بولا کرو۔ میرے لہجے اور اسٹائل پر توجہ دیتے رہو۔ لوگوں کو یقین ہونا چاہیے کہ تم برطانوی انگریز ہو اور واقعی ڈاکٹر ٹیمی سن کے مسلمان بیٹے ایمان علی ہو۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ٹیمی سن نے کہا۔ "میں تمہارا بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ وہاں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔ نیند آئے تو سوجاؤ۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے بیٹے رابن سن کے بیڈ روم میں آگیا۔ آرام دہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ "آپ اپنی ہونے والی بہو کی فکر کریں ڈیڈی...! میں اسے وہاں سے نہ لایا تو دشمن اسے ضرور نقصان پہنچائیں گے۔"

"تم اسے کسی طرح پاکستان سے... یہاں لے آؤ۔ پھر میں چاہوں گا کہ تم دونوں لندن جا کر رہو اور دشمنوں سے دور سکون سے زندگی گزارتے رہو۔"

"بہت مشکل ہے ڈیڈی! ماروی جس ملک میں بھی میرے ساتھ رہے گی میری واضح پہچان بنی رہے گی۔ دوست اور دشمن سب ہی کہیں گے کہ اس کے ساتھ رہنے والا مراد علی منگی ہی ہے۔"

اسی وقت ماروی نے کال کی۔ مراد نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "بولو مراد کی جان! کیسی ہو؟ ویسے تمہارا جواب معلوم ہے کہ میرے بغیر اور کیسے رہو گی۔ آہٹ پہ کان لگے رہتے ہیں۔ در پہ نظر رہتی ہے اور آنے والا نہیں آرہا ہے۔"

"میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ یہاں آنے کی جلدی نہ کرو۔ لیکن دو تاریخ سے پہلے ایسی ٹھوس پلاننگ کے ساتھ آؤ کہ مجھے یہاں سے لے جاسکو۔"

"میری جان...! مجھے مرینہ کی طرف سے زیادہ اندیشہ ہے اس لیے جلدی آنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی فکر نہ کرو۔ میری فرمائش پر محبوب یہاں جدید الیکٹرونکل حفاظتی انتظامات کررہے ہیں۔ کوئی بھی کوٹھی کے احاطے کی دیوار پر چڑھے گا تو یہاں اندر چار ٹی وی اسکرین پر نظر آجائے گا۔ کوئی دروازے اور کھڑکیوں کے قریب آئے گا تو خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ میں ایسے انتظامات سے بہت مطمئن ہوں۔

"محبوب نے سیکیورٹی گارڈز کی تعداد بڑھا دی ہے۔ تین گارڈز دن رات چھت پر الرٹ رہتے ہیں۔ چھ گارڈز احاطے کے اندر کوٹھی کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مراد...! یہاں تو اب کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔ مرینہ کا باپ بھی یہاں نہیں آسکے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"جب ایسے ٹھوس انتظامات ہو رہے ہیں تو میں بھی پوری طرح مطمئن رہوں گا۔"

"لیکن یاد رکھو تمہیں دو تاریخ سے پہلے یہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے پرائی نہیں ہونے دو گے۔"

"بے شک تم میری ہو۔ صرف میری ہی رہو گی، میں دو تاریخ سے پہلے آؤں گا۔"

اسے فون پر اپنے بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ماروی اسے گود میں اٹھا کر پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میرا بچہ نیند میں چونک کر اٹھا ہے۔ پتا نہیں اتنے سے بچے ایسا کیا خواب دیکھ لیتے ہیں کہ ڈر جاتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔"

اس نے فون بند کردیا۔ مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ڈیڈ! ماروی کی طرف سے فی الحال اطمینان ہوگیا ہے۔ وہ بہت مضبوط سیکیورٹی میں رہے گی۔ اب جلدی نہیں ہے۔ میں دس بارہ دن بعد بھی وہاں جاسکتا ہوں۔"

"یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ کل تمہارا پاسپورٹ تیار ہوجائے گا۔ تم میرے ساتھ لندن چلو۔ میرے بیٹے کی حیثیت سے اپنے تمام رشتے داروں سے ملو۔ میں تمہیں البم سے ان سب کی تصویریں دکھاؤں گا۔ ویڈیو متحرک فلم کے ذریعے تم شادی بیاہ اور کرسمس ڈے کی تقریبات میں تمام رشتے داروں کو ہنستے بولتے دیکھو گے اور انہیں یاد رکھو گے۔"

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے ہوئے دروازے پر ایک بونا کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "عبداللہ! تم...؟"

عبداللہ نے مراد کو دیکھ کر خوشی سے چیخ ماری۔ "میرے دوست رابن سن... نہیں، ایمان علی تم آگئے؟"

وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلائے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ بونا اتنا چھوٹا تھا کہ مراد کو اس سے گلے ملنے کے لیے اٹھنا نہیں پڑا۔ وہ بیٹھا رہا۔ عبداللہ آکر اس کے گلے لگ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ تمہارے بچپن کا یار عبداللہ ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ کوئی سات برس پہلے دو بدمعاش تم سے الجھ رہے

تھے۔عبداللہ نے ان کی خوب پٹائی کی تھی۔ یہ بہت زبردست فائٹر ہے۔ یہ جوڈو کراٹے اور جمناسٹک کے کرتب بھی جانتا ہے۔"

عبداللہ نے حیرانی سے کہا۔"انکل! آپ اسے میرے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں؟ کیا یہ مجھے بھول گیا ہے؟"

"ہاں بیٹے! ایسی ہی بات ہے۔ یہ پچھلی بہت سی باتیں بھول گیا ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟"

عبداللہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ڈونٹ وری مائی فرینڈ! تم اپنے ڈیڈی کے پاس اور اس دیوانے دوست کے پاس آگئے ہو۔ ہم تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلائیں گے۔"

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔"تم یہ بتاؤ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟ تقریباً ایک برس بعد آئے ہو۔"

"کیا بتاؤں انکل! دل ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو میرا یہ یار آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھ سے بھی مل کر نہیں گیا۔ اس کے بعد میری جان میری محبوبہ کینسر کے مرض میں اللہ کو پیاری ہوگئی۔"

وہ سر جھکا کر قریبی صوفے کے پاس گیا۔ وہ صوفہ اس کے قد سے اونچا تھا۔ وہ اچھل کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔"اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ سوچ رہا تھا ممبئی جا کر فلموں میں کام کروں گا لیکن میرا یار واپس آگیا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

ڈاکٹر اس کی باتیں سن رہا تھا اور دور تک سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔"عبداللہ! تم غضب کے فائٹر ہو۔ اکیلے دو چار پر بھاری پڑتے ہو۔ یہ بتاؤ کبھی تم نے گن چلائی ہے؟"

"انکل! میں اڑتی چڑیا کو مار گراتا ہوں۔ بچپن سے میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ میرا قد چھوٹا ہے۔ کیوں نہ میں ایسے ہنر اور ایسے کمالات سیکھ لوں جن کے ذریعے دوسروں سے برتر ہو جاؤں۔ قد آور لوگوں کو مات دے کر ان سے اونچا ہوتا رہوں۔"

ڈاکٹر نے مراد سے کہا۔"بیٹے! تم اسے آزما کر دیکھ لو۔ یہ واقعی تیز طرار اور بے باک فائٹر ہے۔ تمہارا بہترین ساتھی اور محافظ بن کر رہا کرے گا۔"

عبداللہ نے کہا۔"انکل! اس سے کیا پوچھتے ہو؟ میں خود اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اب اسے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر آجاؤں گا۔"

"یہ لندن جائے گا پھر پاکستان جائے گا۔ کیا تم اس کے ساتھ جاؤ گے؟"

اس نے کہا۔"میں اپنے یار کے ساتھ صرف جنت میں ہی نہیں، جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا۔"مراد! میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ زبان کا دھنی ہے اور میرے بیٹے کا سچا یار تھا۔"

عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔"آپ "تھا" کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ بیٹا آپ کے سامنے موجود ہے؟"

مراد نے کہا۔"میں موجود ہوں لیکن ان کا بیٹا اور تمہارا یار موجود نہیں ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔"موجود ہو اور موجود نہیں ہو۔ یہ کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر نے کہا۔"عبداللہ... یہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا بیٹا تمہارا یار واپس نہیں آیا ہے۔ گاڈ جانتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے سرجری کے ذریعے گمشدہ بیٹے کو زندہ کیا ہے۔"

وہ بڑی حیرانی سے اور بے یقینی سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔"میرا نام مراد علی منگی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اور انڈر ورلڈ والے ہی نہیں یہاں کی پولیس اور سی آئی اے والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے اب تک درجنوں دشمنوں کو گولی ماری ہے اور درجنوں کو زخمی کیا ہے پھر بھی دشمن ہیں کہ برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ان سب سے چھپنے کے لیے تمہارے یار کے اس چہرے کے پیچھے پناہ لی ہے۔"

وہ اسے ابتدا سے اب تک کی اہم باتیں بتانے لگا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد دنیا کے بدترین اور خطرناک مجرم اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ایک خطرناک عورت مرینہ لندن کی MET آفیسر ہے۔ وہ بھی بہ ظاہر اس کی دوست اور باطن میں جانی دشمن ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔"یہ پیدائشی مجرم نہیں ہے۔ افسوس! یہ جتنا شریف ہے، دشمن اتنی ہی کمینگی سے اسے بندوق پکڑے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عبداللہ! اس کی صورت دیکھو، اب یہ میرا بیٹا ہے۔ تم بولو اسے یار تسلیم کرو گے؟"

وہ صوفے سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہوگیا۔ پھر مراد کے پاس آ کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔"تم سر سے پاؤں تک انکل کے بیٹے رابن سن ہو۔ میرے یار ایمان علی ہو۔ خدا کرے کہ ہم تمہارے کام آتے رہیں اور ہمیں انعام کے طور پر ایمان علی زندہ سلامت مل جائے۔ اللہ چاہے گا تو وہ کہیں سے ضرور واپس آئے گا۔

"میری محبوبہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ میں تمہاری محبوبہ کو تم سے ملانے کے لیے نیکی کروں گا۔ تمہارے کام آتا رہوں گا۔ میرا یار جانتا تھا کہ میں کیسے کمالات دکھاتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ اٹھو لاؤنج میں آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گا۔"

وہ تینوں بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آگئے۔ وہاں اس نے کہا۔"جمناسٹک کے کمالات دیکھو۔"

وہ پنجوں کے بل جوگنگ کرتا ہوا اچانک ہی بلندی کی طرف اچھلا پھر فضا میں قلابازی کھاتا ہوا مراد کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا گیا۔ مراد نے فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فرش پر پہنچ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اگر ذرا بھی ڈگمگاتا تو کھڑا نہ ہوتا، فرش پر اوندھے منہ گرتا۔ یہ اس کی مہارت تھی کہ دونوں پیروں پر جم کر کھڑا ہوگیا تھا۔

مراد اور ڈاکٹر نے داد دینے کے لیے تالیاں بجائیں۔ وہ بولا۔"میرا کمال دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میں کبڈی کا کھلاڑی لگتا ہوں۔ سب مجھے عبداللہ کبڈی کہتے ہیں۔"

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔"ہاں۔ تمہارے کرتب اور چھوٹے قد کے حوالے سے یہ نام اچھا لگتا ہے۔ میں بھی تمہیں کبڈی کہا کروں گا۔"

اس نے کہا۔"ایمان علی! میز پر چھوٹا سا گلدان ہے۔ اسے ایک ہاتھ سے اٹھاؤ۔ سمجھو کہ تم نے ریوالور پکڑا ہے۔"

مراد نے گلدان کو نہیں اٹھایا۔ اس نے مسکرا کر لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ کبڈی نے کہا۔"یہ ٹھیک ہے۔ میرا نشانہ لو جیسے گولی مارنے والے ہو۔"

مراد نے نشانہ لیا۔ وہ بولا۔"یاد رکھو میں اسے گراؤں گا اور تم گرنے نہیں دو گے تو بچ زخمی ہو جاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟"

اس نے کہا۔"منظور ہے۔ میں نے بڑے زخم کھائے ہیں۔ ایک معمولی چوٹ کھانے سے نہ ڈراؤ۔"

اس نے پھر جوگنگ کی۔ پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ وہ فضا میں اچھلتا ہوا، قلابازیاں کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا۔ ریوالور کے نشانے سے ہٹ گیا۔ مراد نے فوراً ہی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔

ہاؤہو ہاؤہو... وہ فضا میں اچھل کر مراد کے بائیں طرف آگیا۔ وہ اتنی تیزی سے چھلانگیں لگا رہا تھا اور فضا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے فٹ بال کی طرح گھوم رہا تھا کہ مراد کی آنکھیں ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ نشانہ لینے کے لیے ریوالور کا رخ ادھر سے ادھر کر رہا تھا۔

وہ واقعی چھوٹے قد کی وجہ سے فضا میں قلابازیاں کھاتے وقت فٹ بال کی طرح دکھائی دیتا تھا پھر اچانک ہی مراد کی آنکھوں کو اور توجہ کو ادھر سے ادھر نچاتے ہوئے فضا میں اڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ٹھوکر مار کر گزر گیا۔

وہ ٹھوکر پتھر کی طرح لگی تھی۔ مراد کے حلق سے ہلکی سے کراہ نکلی۔ کبڈی نے درست کہا تھا کہ وہ زخمی ہوگا۔

ریوالور اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور فرش پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ مراد اسے اٹھاتا، وہ ایک قلابازی کھا کر اسے اٹھاتا ہوا دور جا کر فرش پر جم کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے مراد کو نشانے پر رکھ لیا۔

مراد ایسے کمالات دیکھ کر اس کا گرویدہ ہوگیا۔ اسے گلے لگانے کے لیے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔

مراد نے اس کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔"بخدا میں نے پہلی بار ایک فائٹر کی ایسی پھرتی اور مہارت دیکھی ہے۔ اب تو میں چاہوں گا کہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرو۔"

وہ بولا۔"اور میں جی جان سے رہوں گا۔"

"تمہارے ہاتھ پاؤں پتھر کی طرح سخت ہیں۔ میرے ہاتھ دُکھ رہے ہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"برسوں سے مشقیں کرتا آ رہا ہوں۔ میں عام بونوں کی طرح نرم و نازک نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر نے کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔"خدا تم دونوں کی دوستی کو سلامت رکھے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے مراد کو اپنے بیٹے کی صورت دی ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم اس کے ساتھ باڈی گارڈ بن کر رہتے ہو۔"

مراد نے کہا۔"میں ہتھیاروں کے بغیر لڑتے وقت کمی محسوس کرتا تھا۔ اپنی طاقت سے دشمنوں کو زیر کرتا تھا لیکن لڑنے کی تکنیک یا داؤ پیچ نہیں جانتا تھا۔ جوڈو کراٹے بھی نہیں جانتا۔"

وہ بولا۔"میں ہوں نا۔ تمہیں سکھاتا رہوں گا۔ دشمنوں نے تمہیں خطرناک شوٹر بنا دیا ہے۔ میں تمہیں... خطرناک فائٹر بنا دوں گا۔ اب ذرا گھڑی دیکھو۔ آدھی رات ہو رہی ہے اور میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔"میں نے بھی نہیں کھایا ہے، ابھی ملازم کھانا لگائے گا۔"

وہ چلا گیا۔ مراد نے کہا۔"میں نے شام کو سات بجے کھایا تھا پھر بھی ساتھ دوں گا۔ میرے دوست! تمہارے ساتھ ایک نئی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر نے کھانے کی میز پر کہا۔ ”تم دونوں میرے سامنے انگلش لینگویج میں بولتے رہو۔ میں تمہیں برطانوی لہجہ اسٹائل اور محاورے وغیرہ بتاتا رہوں گا۔“

وہ کھانے کے دوران ان کی کلاس بھی لیتا رہا اور ضروری باتیں بھی کرتا رہا۔ مراد بار بار عبداللہ کبڈی کو دیکھتا جارہا تھا اور کچھ سوچتا جارہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آکر چائے پینے لگے۔ کبڈی نے کہا۔ ”ایمان! تم بار بار مجھے دیکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو' بات کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک بات پک رہی ہے۔ ذرا یہ پک جائے تو بولوں گا۔“

ایسے وقت ماسٹر کو بوبو نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ”یس ماسٹر! میں حاضر ہوں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ابھی دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم ایک نئے چہرے کے پیچھے چھپ گئے ہو۔ یہ تم نے بہت ہی دانشمندی کی ہے۔ اب کوئی دشمن تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔“

وہ بولا۔ ”میں اس نئے چہرے کا رازدار کسی کو نہیں بنانا چاہتا۔ صرف میرے اپنے اعتماد کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا مجھے اس سلسلے میں چھپت راؤ پر بھروسا کرنا چاہیے؟“

”چھپت راؤ پچھلے چھ برسوں سے میرا وفادار ہے۔ اس پر بھروسا کرسکتے ہو۔ میرے دوسرے وفاداروں پر نہ کرو۔ میں یہ بات چھپت راؤ کو سمجھا دوں گا۔ وہ ابھی تم سے بات کرے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ماسٹر! میرے ایک وفادار نے ریڈ الرٹ کے پاکستانی ایجنٹ عالی جناب کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ آپ نے اس کی تعریف نہیں کی۔“

”سوری مراد! میں بہت زیادہ مصروفیات کے باعث بھول گیا تھا۔ وہ تمہارا دستِ راست کہاں ہے؟ واقعی انعام کا حق دار ہے۔ میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔“

”وہ بے چارہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے چھپتا پھر رہا ہے۔ آپ اسے سیکیورٹی دیں۔ یہی اس کا انعام ہوگا۔“

”میں اسے پاکستان میں سیکیورٹی نہیں دے سکوں گا۔ البتہ وہاں سے اسے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دوں گا۔“

”وہ میری طرح آپ کے بہت کام آنے والا بندہ ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس کی بیوی کے ساتھ اسے اپنے پاس سن سٹی میں بلالیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کل تک اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔“

بلا بلوچستان کے ایک علاقے میں چھپا ہوا تھا۔ مراد نے اس کا پتا بتایا پھر کہا۔ ”جس طرح میں آپ کے لیے ہیرا ہوں، اسی طرح بلال احمد عرف بلا میرے لیے ہیرا ہے۔ آپ فوراً اس پر توجہ دیں۔ وہ مصیبت میں ہوگا۔“

”فکر نہ کرو۔ وہ کل تک اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس آجائے گا۔ اور بولو؟“

”اور کچھ نہیں بولنا ہے۔ مجھے اطمینان ہوگیا ہے کہ وہ کل تک آپ کی چھتر چھایا میں پہنچ جائے گا۔“

”تم کمال کر رہے ہو مراد! دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم نے میرے دشمن ریڈ الرٹ والوں کو پھر نقصان پہنچایا ہے۔ آج دھرم داس اور اس کی بیٹی کو سیکیورٹی دیتے ہوئے تم نے ریڈ الرٹ کے پانچ شوٹرز کو مار گرایا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔ تمہارا ہیرا بلا کل یہاں آجائے گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ مراد اپنے فون کی سم بدلنے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”مرینہ کسی وقت بھی کال کرنے والی ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے بعد اس سے باتیں کروں گا۔ پہلے سوچوں گا کہ چہرے کی تبدیلی کے متعلق اسے بتاؤں یا وہ چال چلوں جو میرے ذہن میں ابھی پک رہی ہے؟“

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ ”ابھی تم نے مجھے بار بار دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ذہن میں کوئی بات پک رہی ہے۔ کیا کھچڑی پکا رہے ہو' کچھ بولو تو سہی؟“

مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آپ نے مجھے غائب کردیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مراد علی منگی پیدا ہوجائے تو؟“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”دوسرا کہاں سے پیدا ہوجائے گا؟“

”آپ غائب کرتے ہیں تو آپ پیدا بھی کریں گے۔ کسی دوسرے کو میرا چہرہ دے سکیں گے۔“

”اچھا تو تم چاہتے ہو میں سرجری کے ذریعے کسی دوسرے کو مراد بنا دوں؟ کیا پک رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“

”سوچ رہا ہوں' ایک تو میں ایمان علی کے پیچھے چھپ کر دشمنوں کو دھوکا دیتا رہوں گا۔ پھر آپ کا دوسرا بنایا ہوا مراد علی منگی بھی انہیں الّو بناتا رہے گا۔“

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”اچھا آئیڈیا ہے۔“

کبڈی نے ہنستے ہوئے اس کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یار! بڑا مزہ آئے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”مزہ اس وقت زیادہ آئے گا جب

ڈیڈی تمہیں مراد علی منگی بنادیں گے۔“

دونوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اب بولو کتنا مزہ آئے گا' جب دشمن پورے مراد کی جگہ آدھے مراد کو دیکھیں گے اور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کریں گے کہ تم مراد ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں گے اور ایمان علی سمجھتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہارے دماغ میں بڑا اچھا خیال آیا ہے۔ ابھی اس کے کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ دشمن عارضی طور پر چکرا جائیں گے۔ انہیں جادو منتر اور آتما شکتی والی کوئی کہانی سنانی پڑے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ تمہیں کالے جادو کے ذریعے ایک سے آدھا کردیا گیا ہے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”جب میں بڑی کامیابی سے مراد کے انداز میں بولوں گا، اس کی طرح چلتا پھرتا رہوں گا اور اس کی طرح خود کو فائٹر اور گن مین ثابت کروں گا تو سب حیران بھی ہوں گے اور اصلیت معلوم کرنے کے لیے میرے پیچھے بھی پڑ جائیں گے۔“

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”یار! بہت مزہ آئے گا۔ ہم دن رات تماشے کرتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر ٹیمی سن نے کہا۔ ”مراد! تم اپنوں کے اور بیگانوں کے دوستوں کے اور دشمنوں کے سامنے کبڈی کو یعنی آدھے مراد علی منگی کو کس طرح پیش کرو گے؟ کیسی باتیں بناؤ گے؟ پہلے یہ اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ رات بہت ہوگئی ہے ابھی جاکر سوجاؤ۔ سوچنے سمجھنے کا بہت وقت ہے۔ میں کل شام کو کبڈی کا چہرہ تبدیل کروں گا۔“

ڈاکٹر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آئیڈیا زبردست ہے۔ لیکن خوب سوچ سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

مراد اور کبڈی ایک کمرے میں آکر ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ایسی ہلچل مچانے والی بات ذہن میں آئی تھی کہ انہیں فوراً ہی نیند نہیں آسکتی تھی۔ کبڈی آئندہ مراد بننے کے لیے اس کا لب و لہجہ سیکھتے سیکھتے سوگیا۔ مراد تھکا ہوا تھا، اسے بھی نیند آگئی۔

☆☆☆

مرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اسے آفیسر کا بیج اور آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کا آئی ڈی کارڈ مل گیا تھا۔ اسے قانونی طور پر ایسے اختیارات حاصل ہوگئے تھے جنہیں وہ غلط طریقوں سے بھی استعمال کرسکتی تھی۔

اس کے ذہن میں جو سب سے اہم غلط خیال پرورش پا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ماروی کو مراد کی دنیا سے غائب کردے۔ وہ اسے ڈھونڈتا پھرے اور جب اسے معلوم ہو کہ اس کی ماروی مرینہ کی قید میں پڑی ہے تو وہ اس کے سامنے آکر گھٹنے ٹیک دے۔

سب ہی دشمن کہہ رہے تھے کہ مراد لاپتا ہوگیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آرہا ہے۔ وہ شاید بھیس بدل کر رہنے لگا ہے۔ مرینہ نے اسے کال کی تو رابطہ نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اس کا فون بند ہے۔

ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی نے کہا۔ ”دیکھو۔ اس نے تم سے بھی رابطہ ختم کردیا ہے۔ اسی دن کے لیے سمجھا رہا تھا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ ہم اس کی نگرانی کرتے رہیں گے تو وہ فرار نہیں ہوسکے گا۔ نہ کہیں چھپ سکے گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ مجھ سے نہیں چھپ رہا ہے۔ اس نے مجبوراً فون کو بند رکھا ہے یا فون اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ وہ ضرور بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔“

مرینہ کو یقین تھا کہ اس نے مراد کو اچھی طرح ٹریپ کرلیا ہے۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہے۔ وہ حالات پر قابو پاتے ہی ضرور اسے کال کرے گا لیکن وہ اندر سے پریشان بھی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مراد اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل اور ہڈسن کے آدمی اسے تلاش کرنے بے پور گئے تھے۔ تب سے وہ مرینہ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے۔

وہ زیرِلب بڑبڑائی۔ ”وہ مجھے بڑے جذبے سے میری جان مرینہ کہتا تھا۔ اب شاید نہیں کہے گا۔ میرے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ والوں نے کام بگاڑ دیا ہے۔“

اس نے اپنی رہائش گاہ میں آکر ماسٹر کو بوبو کو کال کی اور کہا۔ ”ماسٹر! تمہیں خوش خبری سنا رہی ہوں۔ میں نے آج MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

ماسٹر نے خوش ہوکر کہا۔ ”مبارک ہو مرینہ! میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہوسکتی ہے؟

”ویل مرینہ! جب اس ڈیپارٹمنٹ والوں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا اور ریڈ الرٹ والوں نے بھی تمہارا ہاتھ نہیں تھاما تھا تب میں نے تمہیں سر پہ بٹھایا تھا۔ اب کیا خیال ہے؟ میری دوستی کا جواب دوستی سے دو گی؟ ضرورت کے وقت میرے کام آؤ گی؟“

”ضرور کام آؤں گی۔ مراد آپ کا خاص آدمی ہے۔ آپ اسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میں اس کی خاطر

آپ کے کام آتی رہوں گی۔ ابھی میں نے اسی کی بات کرنے کے لیے آپ کو کال کی ہے۔"

ماسٹر کو بو بو سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ "مراد کی بات کیا کرو گی؟ چمپت راؤ نے اسے دشمنوں سے بچا کر راتوں رات کولکتہ پہنچا دیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کی خیر خیریت سے پوچھنے والا تھا۔"

"میں بھی اسے کال کر رہی ہوں لیکن بات نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔"

"ہمارا بھی یہی خیال ہے، وہ ایسی مصیبتوں میں ہے کہ اپنے فون سے بھی محروم ہو گیا ہے۔"

مرینہ نے کہا۔ "ماسٹر! ایک گھبراہٹ سی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے اسے گولی تو نہیں ماردی؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔ جب بھی وہ دشمنوں کے ہاتھوں مرے گا، وہ خوشیاں منائیں گے بلکہ جشن منائیں گے اور مجھے طعنے دینے کے لیے فون کریں گے۔ اس کے لیے اچھا سوچو۔ وہ موت کا رخ پھیرنے والا شیر دلیر کہیں زندہ ہے۔ ہم جلد ہی اسے شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے سنیں گے۔"

مرینہ نے کچھ باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ سوچنے لگی۔ "جب سے اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ دربدر ہو رہا ہے۔ نہ آتی تو MET آفیسر نہ بنتی۔ ایک طرف سے فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سے نقصان اٹھا رہی ہوں۔ مجھے جلد سے جلد انڈیا جانا ہو گا پتا نہیں وہ کہاں پھنسا ہوا ہے اسے میں ہی وہاں سے نکال کر لا سکوں گی۔"

پھر اچانک ہی دل میں ایک خیال آیا۔ "کہیں وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا ہے؟"

ایسا سوچتے ہی اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی ماسٹر کو بو بو اور جگ دیو نے مراد کو اس سے چھپایا تھا۔ اسے دھوکا دیا تھا۔

اسے کہا تھا کہ مراد انڈر ورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ مائیکرو فلم حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہی تھی کہ ماسٹر نے بڑی رازداری سے مراد کو وہ مائیکرو فلم حاصل کرنے کے لیے اس پر سوا سیر ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ پہلے بھی ماسٹر، جگ دیو اور مراد نے دہری چالیں چل کر اسے الو بنایا تھا۔ اب بھی یہی کر رہے ہوں گے۔

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچنے لگی۔ "میں دھوکا کھا رہی ہوں۔ وہ بھیس بدل کر کہیں آرام سے ہے۔ ماسٹر اسے چھپا رہا ہے۔ پھر مجھے الو بنا رہا ہے۔ اگر ایسا ہو رہا ہے۔ تو میں ماسٹر کو بو بو کے سنڈیکیٹ کو تہس نہس کر کے رکھ دوں گی۔ اب میں مراد کے جھانسے میں نہیں آؤں گی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے کیش کروں گی۔ پورے پچاس لاکھ وصول کروں گی۔"

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "ڈی جی جان انتھونی درست کہتا ہے۔ مجھے اس کی دیوانگی سے باز آ جانا چاہیے۔ مجھے کسی بھی پہلی فلائٹ سے انڈیا جا کر اسے ڈھونڈ کر پچاس لاکھ ڈالرز جیسی بڑی رقم وصول کر لینا چاہیے۔"

وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مگر وہ کہاں چھپا ہو گا؟"

سوکن کے دماغ نے کہا۔ "ماروی کے اندر چھپا ہو گا۔ ہاں وہ کہیں بھی ہوتا ہے، کسی بھی حال میں ہوتا ہے موت سے بھی لڑتا رہتا ہے۔ تب بھی ماروی سے ضرور رابطہ رکھتا ہے۔"

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر سوچنے لگی، پھر اس نے ماروی کے نمبر پنچ کیے۔ اُدھر وہ مراد کے بچے سے لگی ہوئی تھی۔ بچہ اپنے باپ کی طرح ضدی تھا۔ وہ اسے کھلونوں سے بہلا رہی تھی۔ ضدی جونیئر مراد ابھی روتے روتے چپ ہوا تھا۔ اس نے فون پر اٹھایا۔ ... نمبر ... کو پڑھ کر کہا۔ ... پتا نہیں کون ہے۔ لو تم بات کرو۔"

ختی نے فون لے کر بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ پھر پوچھا۔ "ہیلو کون ہو بھائی؟"

مرینہ نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

ختی نے کہا۔ "یہی میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کون ہو؟"

"میں مرینہ ہوں۔ ماروی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا تو تُو ہے شیطان کی بچی؟ تُو ماروی سے کیا بات کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟"

مرینہ نے کہا۔ "لینگویج پلیز۔"

وہ بولی۔ "میں انگریزی سمجھ لیتی ہوں۔ تیری پلیز کو جھاڑو ماروں۔ چل بھاگ یہاں سے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ "تم نے اچھی سنائی ہے۔ کمبخت ہمارے پیچھے لگنے سے باز نہیں آ رہی ہے۔"

مرینہ نے رابطہ ختم ہونے پر اپنے فون کو دیکھا۔ چاچی کی باتیں سن کر اسے آگ لگ رہی تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو اس بڑھیا کی ہڈی پسلی توڑ کے رکھ دیتی۔ وہ اپنی انسلٹ پر تلملا کر صوفے پر پہلو بدلنے لگی۔ وہ ماروی سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مراد اس

سے فون پر رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ معلوم ہوتا تو پتا چل جاتا کہ مراد نے اپنے فون کی سم بدل دی ہے اور ایسا اس نے صرف اپنی ماروی سے باتیں کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے اہمیت دیتا ہے۔

وہ اپنے فون کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا کرے؟ کیسے معلوم کرے؟ وہ تو فون اٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے مجبوراً پھر ماروی کے نمبر پنچ کیے پھر چاچی کی گالیاں سننے کے لیے تیار ہو گئی۔

دوسری طرف کال بیل جا رہی تھی پھر بند ہو گئی۔ ختی اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ مرینہ نے زیرِ لب کہا۔ "کب تک فون کاٹتی رہے گی۔ ایک بار گالیاں دینے کے لیے ضرور بولے گی۔ اس سے پہلے ہی چاچی بھتیجی کے دماغوں کو ایسا جھٹکا پہنچاؤں گی کہ دونوں ہی تڑپنے لگیں گی۔"

اس نے پھر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر ماروی کی آواز سنائی دی۔ "تم کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہو؟"

مرینہ نے کہا۔ "مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ مراد مر چکا ہے۔"

فون پر ماروی کی چیخ سنائی دی۔ "نہیں۔ نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

وہ بولی۔ "تم بیوقوف ہو۔ یہ میں جانتی ہوں کہ اس کی لاش کہاں پڑی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی اسے معلوم ہونے والا تھا کہ مراد اس سے رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مرینہ نے مسکرا کر اپنے فون کو دیکھا پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ اب کیوں فون کر رہی ہو؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "مرینہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ سچ بولو۔ مراد زندہ ہے؟"

"مجھ سے کیا پوچھتی ہو، اسے فون کرو۔ خود معلوم کرو۔"

وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ کیسی مکاری سے صحیح معلومات حاصل کر رہی ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مراد نے پچھلی رات کہا تھا کہ فون کی سم بدل دے گا۔ پھر مجھ سے باتیں کرے گا۔ ابھی میرے پاس اس کا نیا نمبر نہیں ہے اور اس نے کل رات سے اب تک مجھے کال نہیں کی ہے۔"

"اس نے آخری بار تم سے کب بات کی تھی؟"

"کل رات گیارہ بجے۔"

مرینہ نے فون بند کر دیا۔ اس نے پچھلی رات انڈین ٹائم کے مطابق ایک بجے فون کیا تھا۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ مراد کا فون بند ہو چکا ہے۔ یعنی گیارہ بجے ماروی سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے فون سے سم نکال دی تھی۔ آئندہ نئی سم کے ذریعے کسی وقت اپنی معشوقہ سے بولنے والا تھا۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگی۔ 'کیسا کمینہ ہے؟ اس نے ماروی کو بتایا کہ سم بدلنے والا ہے۔ مجھے نہیں بتایا۔ اب سم بدل کر مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔'

'یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ میں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ وہ بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ آئندہ میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ اب تو اس کی کمینگی اچھی طرح سمجھ میں آ گئی ہے۔ اب میں اس دشمن کو تلاش کرتے ہی ریڈ الرٹ کے حوالے کر دوں گی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس کا بچہ میرے پیٹ میں آ رہا ہے۔ اگلے مہینے تصدیق ہو جائے گی۔'

وہ کچن کی طرف جانے کے لیے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ کچھ محسوس کر رہی تھی اور انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی واش روم میں گئی۔ وہاں سے اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی چیخ سنائی دی اور خاموشی چھا گئی جیسے مر گئی ہو۔ مراد کے بچے کی ماں بننے کی امید دم توڑ چکی تھی۔ جس کے باپ کے سر کا سودا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی، وہ بچہ ہی وجود میں آنے سے پہلے نابود ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد واش روم سے نکل کر کمرے میں آ گئی اور سر جھکا کر چلتی ہوئی صوفے کے پاس آئی پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ حالات نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ بعض عورتیں مرینہ کی طرح پاگل ہوتی ہیں۔ اپنے مرد کے بچے کو کوکھ میں رکھنے اور اسے جنم دینے کے لیے ایک ایک دن گنتی رہتی ہیں۔ اس روز اس کی گنتی ختم ہو گئی تھی۔ نئی گنتی شروع کرنے کے لیے پھر مراد علی منگی کی مردانگی اسے پکار رہی تھی۔

ہائے کس دل سے اس کے سر کا سودا کروں گی؟ ہرگز نہیں کروں گی۔ وہ شاید مجھ سے بدظن نہیں ہوا ہے۔ مجھ پر شبہ نہیں کر رہا ہے۔ مجبوراً مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا ہے۔ آج شام تک یا رات تک ضرور نئے نمبر سے بات کرے گا۔

اس کی سوچ پہلے منفی تھی پھر مثبت ہونے لگی۔ وہ پٹری

بدل کر سوچ رہی تھی۔ میں خوامخواہ اس سے بدظن ہو رہی ہوں۔ نہیں، میں پھر اسے محبت سے قابو میں کروں گی۔ وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرے گا۔ وہ مجھے بھول ہی نہیں سکتا...'

دیکھتے ہی دیکھتے مزاج بھی بدل گیا۔ ارادے بھی بدل گئے۔ اب وہ آئندہ ہونے والے بچے کے باپ کو کلیجے سے لگانے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ سوچتے رہنے سے یہ بات عقل میں آئی کہ مراد کو جیتنے کے لیے ماروی کا دل بھی جیتنا ہوگا۔ اگرچہ یہ مشکل ہے پھر بھی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔

اس نے ماروی سے بات کرنے کے لیے پھر فون کو اٹھایا۔

ادھر وہ ہائے ہائے کر رہی تھی کہ مراد مارا گیا ہے اور اس کی لاش کہیں پڑی ہوئی ہے۔ ختی نے کہا تھا۔ "بیٹی! اس ڈائن کی بات پر بھروسا نہ کرو۔ وہ پکی جھوٹی اور مکار ہے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں کیسے معلوم کروں کہ وہ زندہ ہے؟"

"ذرا صبر کرو۔ وہ جیسے ہی کسی مشکل سے نکلے گا، سب سے پہلے تمہیں فون کرے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی نے لپک کر فون کو اٹھایا پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر بولی۔ "وہی چڑیل ہے۔"

ختی نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لاؤ مجھے دو۔ ابھی اسے کھری کھری سناتی ہوں۔"

"نہیں چاچی! میں دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔"

اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہاں بولو۔ کیا سچ بولنے آئی ہو؟"

"ہاں ماروی! اس وقت میں غصے میں تھی۔ جو منہ میں آیا بول گئی۔ مجھے معاف کردو۔"

"تعجب ہے تم مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔"

"اگر معاف کردو گی تو میں تمہاری بہن بن کر رہوں گی اور بہن کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالوں گی۔ مراد سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

"میں تمہاری اس تبدیلی پر حیران بھی ہوں اور خوش بھی ہوں۔ یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جلدی جلدی کیسے بدل جاتی ہو۔ تم کہہ رہی ہو کہ میرے حق پر ڈاکا نہیں ڈالوگی۔ مراد سے بھی نہیں ملوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں ماروی! خدا اسے دشمنوں سے بچائے۔ مجھے غلط خبر ملی تھی۔ دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں کسی اور کو مار ڈالا ہے۔"

وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ "یا اللہ! میرا مراد زندہ ہے۔"

"ہاں۔ اسی خوشی میں مجھے معاف کردو۔"

وہ بولی۔ "میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔"

"وعدہ کرو۔ مراد سے کہوگی کہ ہم بہنیں بن چکی ہیں اور آئندہ میں کبھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

"مرینہ! خدا تمہارے اس نیک ارادے پر تمہیں قائم رکھے۔ مراد فون کرے گا تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ تم بالکل ہی بدل گئی ہو۔ میری بہن بن گئی ہو۔ ابھی کچھ خیال نہ کرنا، فون بند کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کرنے جا رہی ہوں۔"

اس نے فون بند کردیا۔ مرینہ نے اپنے فون کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "نماز پڑھنے گئی ہے۔ خدا سے کہنے گئی ہے کہ میں مراد کے سامنے کبھی نہ جاؤں۔ اسے کبھی ہاتھ نہ لگاؤں۔"

"الو کی پٹھی! مراد کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتی ہے۔ وہ جاگیردار پہلے میری زمین کا ہے۔ میں اسے تیری زمین تک پہنچنے ہی نہیں دوں گی۔"

وہ اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں تھی۔ پھر سے وہی سبق دہرانے والی تھی یعنی پہلے محبت سے اسے راضی کرنے والی تھی۔ وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسے اپاہج قیدی بنا کر حاصل کرنے والی تھی۔ جب یقین ہو جاتا کہ وہ اس کے بچے کو جنم دینے والی ہے تو پھر اس قربانی کے بکرے کو پچاس لاکھ میں ضرور فروخت کردیتی۔

☆☆☆

اس سرجری روم کا آئینہ جادوئی کمالات دکھاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس آئینے میں مراد کا چہرہ غائب ہوگیا تھا اور ایمان علی کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ اب اسی آئینے میں عبداللہ کبڈی کا چہرہ مٹ گیا تھا۔ مراد کا چہرہ پھر سے ابھر آیا تھا۔

مراد، کبڈی کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر کمپنی فاتحانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں دو چہرے بدل گئے تھے۔

کبڈی نے مسکرا کر مراد کے انداز اور لب و لہجے میں کہا۔ "سائیں! مجھ کو کیا دیکھتے ہو؟ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ میرا نام مراد علی منگی ہے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تم کسی شک و شبے کے بغیر مراد بن گئے ہو۔ صرف قد سے مات کھا گئے ہو۔"

"قد کے معاملے میں یہ کہانی یاد کرلی ہے کہ کس طرح ایک تانترک مہاراج نے کرودھ میں آکر میرے قد کو آدھا

کردیا ہے۔ میں مرینہ کو اور محبوب علی چانڈیو کو اور اس کے ساتھ رہنے والے معروف تجلی اور سمیرا کو بھی کہانی سناؤں گا لیکن ابھی ایک کمی ہے۔ میں ان سب کو چہروں سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہاں سے ان کی تصویریں حاصل کرو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مراد! تم ماروی سے حقیقت نہیں چھپانا چاہتے۔ اسے بتانا چاہتے ہو کہ کبڈی کو مراد بنایا گیا ہے۔ ماروی سے کہو کہ ان سب کی تصویریں میرے ای میل پر Send کرے۔ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "میں ابھی ماروی سے بات کروں گا اور اسے اپنا رازدار بناؤں گا۔ کبڈی! تم جب تک ان سب کے چہرے اچھی طرح ذہن نشین نہیں کروگے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی باتیں یاد نہیں کروگے اور میں جب تک برطانوی لہجے میں انگریزی بولنا نہیں سیکھوں گا، تب تک ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔"

اس نے کہا۔ "میں تو بہت بڑا نقال ہوں۔ دس بارہ دنوں میں تمام سبق یاد کرلوں گا۔"

"اس سے پہلے تمہیں مراد کی حیثیت سے مرینہ کا سامنا کرنا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت سی اہم باتیں تمہیں یاد کراؤں گا اور آج رات دس بجے فون پر اس سے باتیں کراؤں گا۔"

کبڈی نے کہا۔ "وہ یہاں آنے کے لیے مچل جائے گی۔ میرا پتا پوچھے گی۔"

اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے دور ایک بنگلا کرائے پر لینا ہوگا۔ مرینہ کو بتایا جائے گا کہ مراد وہاں چھپ کر رہتا ہے۔ وہ وہیں اس سے ملنے آئے گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہاں سے بہت دور آگرہ میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے تین بنگلے ہیں۔ کیا آگرہ جا کر رہنا چاہو گے؟"

"چھپ کر رہنے کی خاطر آگرہ زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ اپنے دوست سے بات کریں۔"

ڈاکٹر کے فون سے رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون اٹھا کر بولا۔ "میں یہ کال اٹینڈ کرنے کے بعد اپنے دوست سے بات کروں گا۔"

مراد اور کبڈی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہ کبڈی کو مرینہ کی باتیں ابتدا سے بتانے لگا۔ مرینہ سے ہونے والی گفتگو جتنی اسے یاد تھی وہ سب اسے یاد کرانے لگا۔

اس نے وہ واقعات تفصیل سے بتائے جب مرینہ اسے گولی مار کر زخمی اور لاچار بنا کر ایک مکان میں لے آئی تھی اور اس سے جسمانی تعلقات قائم کیے تھے۔

کبڈی نے کہا۔ "میں پھر سے تمام باتیں یاد کرتا ہوں۔ کوئی بات بھولوں گا تو تم سے پوچھ لوں گا۔"

ڈاکٹر نے آکر کہا۔ "بات ہوگئی ہے۔ اس کے تینوں بنگلے خالی ہیں۔ تم دونوں کل صبح مالک مکان کے پاس جا کر ایک لاکھ روپے ایڈوانس کے طور پر ادا کرو۔"

مراد نے کہا۔ "ہم وہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ مرینہ سے ملاقات کے بعد اس سے ضرور دشمنی ہوگی۔ اس کے جاتے ہی ہم وہ بنگلا چھوڑ دیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

وہ رہائش کا انتظام کر رہا تھا۔ کبڈی، مرینہ کو سبق کی طرح یاد کر رہا تھا۔ مراد ان سے کچھ دور ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے ماروی کے نمبر پنچ کیے۔

ماروی نے فون کی ننھی سی اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے۔ مراد اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ آئندہ سم بدل کر رابطہ کرے گا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو؟"

اس کی آواز سنائی دی۔ "ماروی! میں بول رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں پچھلی رات سے انتظار کر رہی ہوں۔ مرینہ نے تو یہ کہہ کر رلا دیا تھا کہ تمہیں گولی مار دی گئی ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "او گاڈ...! اس نے تمہیں کال کی تھی؟ میں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ تمہاری طرف کبھی رُخ نہ کرے۔"

"وہ کب ماننے والی ہے۔ پہلے تو تمہاری موت کی جھوٹی خبر سنائی۔ پھر دوسری بار فون کر کے معافی مانگی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے بھی کسی نے تمہارے بارے میں غلط اطلاع دی تھی پھر اس نے مجھے بہن کہا اور وعدہ کیا کہ کبھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ اپنی زبان سے تمہارا نام بھی نہیں لے گی۔"

"مراد! میں کیا سمجھوں؟ وہ اچانک ہی شیطانی بلا کی طرح نازل ہو جاتی ہے۔ کیا وہ تمہارا پیچھا چھوڑ سکتی ہے؟"

"وہ ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار ہے۔ وہ بھلا میرا پیچھا کیا کرے گی۔ تم اطمینان رکھو، وہ آئندہ میرے نئے بہروپ میں کبھی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ ماروی! میں پندرہ یا بیس دنوں میں ایک زبردست پلاننگ پر عمل کرتے ہوئے تمہارے پاس آؤں گا۔ اب میں جو کہہ رہا ہوں، اسے توجہ سے سنو۔"

وہ عبداللہ کبڈی کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ وہ

حیرانی سے مسکراتے ہوئے سننے لگی کہ اب دنیا والوں کو چار فٹ کا بونا مراد علی منگی نظر آیا کرے گا۔

وہ بونا مراد اس سے ملنے کراچی آئے گا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان ایمان علی ہوگا۔وہی ماروی کا اصل مراد ہوگا۔

وہاں ماروی کی کوٹھی میں مراد اور کبڈی کس طرح ہیرا پھیری سے رہیں گے، یہ باتیں ماروی کو تفصیل سے بتانے لگا۔وہ تمام باتیں اچھی طرح سننے اور سمجھنے کے بعد بولی۔"تم کہتے ہو تو میں اس بونے مراد کو سب کے سامنے اپنا مراد تسلیم کرلوں گی اور اس سے لگاوٹ ظاہر کرتی رہوں گی لیکن تم سے کیسے ملوں گی؟"

"میں رازداری سے ملنے کے راستے نکال لوں گا۔تم فکر نہ کرو۔فی الحال محبوب معروف تجلی سمیرا چاچی چاچا اور میڈم روزی کی تصویریں چاہتا ہوں۔تم یہ تمام تصویریں چاچا کو دے کر کہو کہ وہ کسی نیٹ کیفے میں جا کر میرے بتائے ہوئے ای میل ایڈریس پر انہیں بھیج دیں۔ ہماری اس پلاننگ میں صرف چاچی اور چاچا ہی رازدار رہیں گے۔میں یہاں کا ای میل ایڈریس Send کر رہا ہوں۔"

اس نے ماروی کو اپنے موجودہ حالات اور منصوبے سے اچھی طرح آگاہ کردیا۔اس کے بعد مرینہ سے نمٹنا تھا۔

ڈاکٹر نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"دھرم جی تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔"

مراد نے اپنی سم نکال دی تھی۔دھرم داس کو نیا نمبر معلوم نہیں تھا۔اس نے کہا۔"مراد! آج کرسمس نائٹ کی بڑی دھوم دھام ہے۔تم فینسی ڈریس شو کی تقریب میں آنے والے تھے۔کیا یہاں وائی ایم سی اے ہال میں آرہے ہو؟ میں خود کو اور ہڈسن کو یہاں بھرپور سیکیورٹی دے رہا ہوں۔"

اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں ایک ہڈسن بھی تھا۔مراد نے اس کی بہن لیزا کو دشمنوں سے بچایا تھا لیکن اس کے بھائی کو زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

وہ فی الحال کبڈی کو مراد بنانے کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہوگیا تھا کہ ہڈسن کو نظر انداز کر رہا تھا۔سوچ رہا تھا پھر کسی دن اسے موت کے سرد خانے میں پہنچائے گا۔

اس نے دھرم داس سے کہا۔"میں اپنے معاملات میں بہت مصروف ہوں، گھر سے نکلنا نہیں چاہتا۔کیا آپ میری ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟"

"ہاں تم رہتے ہو تو لگتا ہے کہ سیکیورٹی کے لیے پوری فوج آگئی ہے۔تمہارے آگے دشمن دم نہیں مارتے ہیں۔

ایک اور بات سنو۔میں ہڈسن کو سیکیورٹی پہنچا رہا ہوں اور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں دوہری چالیں چل رہا ہوں۔ریڈ الرٹ سے کسی نے اسے فون پر کہا ہے۔میرے خلاف زہر اُگلا ہے کہ مراد کو دھرم داس کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔"

"اچھا تو ہڈسن بھی آپ سے پوچھ رہا ہے کہ آپ نے مجھے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"ہاں کہتا ہے، اگر میں تمہاری خفیہ پناہ گاہ کا پتا بتا دوں تو وہ مجھے دس لاکھ ڈالرز دے گا۔"

مراد نے کہا۔"میری جان کے دشمن سودے بازی سے باز نہیں آئیں گے۔"

کبڈی نے کہا۔"یار! فینسی ڈریس شو میں چلو۔تفریح بھی رہے گی۔اس دشمن سے نمٹ بھی لوگے۔"

مراد نے کچھ سوچ کر فون پر پوچھا۔"دھرم جی! کیا ہڈسن آپ کے ساتھ ہے؟"

اس نے کہا۔"ابھی ایک گھنٹے بعد وائی ایم سی اے ہال میں جانے کے لیے وہ میری کار میں بہن کے ساتھ بیٹھے گا۔آگے پیچھے گاڑیوں میں مسلح گارڈز ہوں گے۔"

"آپ جن راستوں سے گزریں گے، وہاں کسی جگہ کرسمس نائٹ منایا جارہا ہوگا؟"

"ہاں جگہ جگہ رنگین قمقموں سے دکانوں اور ہوٹلوں کو سجایا گیا ہے۔جوان لڑکیاں اور لڑکے گروہ کی صورت میں مستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔"

"آپ کوئی ایسی جگہ بتائیں جہاں ناچ گانا ہو رہا ہو۔"

"وومن کلب کے سامنے ناچ گانے اور طرح طرح کے تماشے ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ہڈسن کو وہاں مراد نظر آئے گا۔"

"کیا تم پھر اصلی روپ میں آگئے ہو؟"

"نہیں۔وہ ایک نقلی مراد ہوگا۔آپ کو اس کے بارے میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔جب آپ ہڈسن کو لے کر نکلیں گے، تب ہم بھی یہاں سے نکل پڑیں گے۔"

مراد نے رابطہ ختم کرکے صوفے سے اٹھتے ہوئے کبڈی سے کہا۔"چلو، دشمنوں کے سامنے آؤ اور انہیں اپنے پیچھے دوڑاؤ۔"

مراد نے اپنے کمرے میں آکر سانتا کلاز کا ماسک اور لباس پہن لیا۔دونوں نے اپنی اپنی گنز کو اچھی طرح چیک کرکے لباس کے اندر چھپایا۔بلٹس سے بھرے ہوئے میگزین سانتا کلاز کے بیگ میں رکھے پھر وہاں سے چل پڑے۔

اُدھر لیزا اور ہڈسن اپنے بنگلے سے باہر آئے۔اس وقت

لیزا ایک لومڑی کے بہروپ میں تھی۔ ہڈسن نے چیتے کا ماسک پہن لیا تھا۔ وہ دونوں دھرم داس کی کار میں آ کر بیٹھ گئے۔

دھرم داس اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ وہ ڈرائیور بھی ہتھیاروں سے لیس تھا۔ بہت محتاط سیکیورٹی تھی۔ وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو ان کے آگے پیچھے مسلح گارڈز کی گاڑیاں تھیں۔

ہڈسن نے راستے میں دھرم داس سے کہا۔ ”مسٹر داس! میں نے مراد کے سلسلے میں آپ پر شبہ کیا۔ مجھے افسوس ہے۔ میں نے بعد میں سوچا کہ ریڈ الرٹ کے کسی کارندے نے مجھے آپ کے خلاف بھڑکانے کے لیے جھوٹ کہا ہے۔ بھلا آپ جیسا معزز ایم این اے مراد کے ساتھ کیوں دیکھا جائے گا جبکہ آپ اس کے خلاف مجھے سیکیورٹی دے رہے ہیں۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”مسٹر ہڈسن! آپ نہیں جانتے ریڈ الرٹ والے میرے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ صرف مجھ پر ہی نہیں‘ میری بیٹی پر بھی حملہ کر چکے ہیں۔“

”ایسا لگتا ہے ہم سب نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ تم پر‘ ہم پر حملے ہو رہے ہیں۔ پھر بھی ہم لائف انجوائے کرنے فینسی ڈریس شو میں جا رہے ہیں۔“

”کتنے ہی مسائل اور مصائب موت بن کر دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ انسان ہے کہ مسرتیں حاصل کرتے رہنے سے باز نہیں آتا۔ میرے بیٹے بیٹیاں بھی منع کرنے کے باوجود ہنسنے اور ناچنے گانے کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔“

وہ بولتے بولتے رک گیا پھر ڈرائیور سے بولا۔ ”گاڑی روکو‘ فوراً گاڑی روکو...“

گاڑی رُک گئی۔ ہڈسن نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”مسٹر ہڈسن...! وہ من کالج کے سامنے دیکھو۔ سب ناچ گا رہے ہیں۔ وہاں مراد ہے۔“

ہڈسن کے اعصاب یکلخت تن گئے۔ اس نے فوراً ہی اپنا ریوالور نکال لیا پھر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے...؟ وہ کہاں ہے...؟“

کلب کے سامنے درجنوں لڑکیاں اور لڑکے ایک فلمی گانے کی دھن پر ناچ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مراد علی منگی بھی بہت مست ہو کر ناچتا گاتا دکھائی دے رہا تھا۔

دھرم داس اور ہڈسن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔ ہڈسن نے کہا۔ ”ارے یہ تو آدھا ہے۔“

دھرم داس کو معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر ٹیمی سن نے عبداللہ کبڈی کو مراد بنا دیا ہے۔ وہ بھی حیرانی سے بولا۔ ”یہ تو بونا ہے لیکن بالکل مراد ہے۔ یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ہڈسن نے کہا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دوں گا مگر کیا اسے ہلاک کرنا مناسب ہوگا؟“

دھرم داس نے کہا۔ ”نہیں ہڈسن! پتا نہیں یہ کون ہے۔ اسے خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔“

لیزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا منک منک کر ڈانس کر رہا ہے۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”میں گارڈز سے کہتا ہوں اسے پکڑ کے لے چلیں۔ اس سے معلوم کریں کہ یہ کون ہے؟“

آگے پیچھے کی دو گاڑیوں سے دو گارڈز اتر کر دھرم داس کے پاس معلوم کرنے آئے کہ وہاں رُکنے کی وجہ کیا ہے؟

ہڈسن نے کھڑکی سے سر نکال کر گارڈ سے کہا۔ ”وہاں دیکھو ایک بونا ڈانس کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنی گاڑی میں بٹھا لو۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”جاؤ۔ اسے پکڑو...“

ایسا کہتے ہوئے انہوں نے ڈانس کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے ہجوم میں دیکھا تو چونک گئے۔ وہ نہیں تھا۔ بھیڑ میں گم ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا‘ پلک جھپکتے ہی غائب ہو گیا ہے۔

وہ دونوں کار کے دروازے کھول کر تیزی سے باہر آئے پھر ہجوم کی طرف جاتے ہوئے گارڈز سے بولے۔ ”جلدی آؤ‘ اس بونے کو دیکھو وہ کہاں گیا ہے؟“

وہ ادھر ادھر جا کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ جس مراد کو ڈھونڈ رہے تھے، وہ ایمان علی بن کر وہاں موجود تھا۔

دھرم داس... اسے دیکھ کر اس کا بازو تھام کر ہجوم سے دور آ کر بولا۔ ”تمہارے کہنے کے مطابق میں نے یہاں گاڑی رکوائی ہے لیکن میں نے یہاں ایک چمتکار دیکھا ہے۔ بالکل تمہاری شکل صورت کا ایک بونا یہاں ناچ رہا تھا۔ تم یہاں کب سے ہو؟ تم نے اپنے ہم شکل کو دیکھا ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”دیکھا ہے۔ آپ ایمان علی کے دوست عبداللہ کبڈی کو تو جانتے ہوں گے؟“

”ہاں اچھی طرح اس بونے کو جانتا ہوں۔“

اس نے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”دھرم جی! یہ وہی ہے۔ ڈاکٹر ڈیڈی نے اسے میرا ہم شکل بنایا ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”ہے بھگوان! یہ تم لوگوں کو کیا سوجھی ہے؟“

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں کبڈی کو جانتا ہوں پھر بھی دھوکا کھا گیا۔ دشمن تو اس کے پیچھے ناچتے پھریں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”اچھا میں جا رہا ہوں۔ کبڈی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اب ہم وائی ایم سی اے ہال میں نظر

آئیں گے۔“

وہ سب اسے ہجوم میں تلاش کر رہے تھے۔ مراد تیزی سے چلتا ہوا وومن کلب کے پیچھے جانے لگا۔ وہاں انہوں نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ مراد ادھر پہنچتے ہی ٹھٹک گیا۔

کلب کے پیچھے نیم تاریکی میں کبڈی موٹر سائیکل کے پاس دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص اپنی گن سے اس کا نشانہ لیے کھڑا تھا۔

کبڈی چاہتا تو جمناسٹک کا کرتب دکھا کر اس کی گن گرا سکتا تھا لیکن وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔

وہ گن مین حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم آدھے کیسے ہو گئے؟ یہ کیا راز ہے جلدی بتاؤ؟“

وہ بولا۔ ”جلدی کیا بتاؤں۔ میں پیدائشی بونا ہوں۔ میرا نام عبداللہ کبڈی ہے۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”بکواس مت کرو۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تم مراد علی منگی ہو۔ جلدی بتاؤ‘ اتنے چھوٹے کیسے ہو گئے ہو؟“

کبڈی نے کہا۔ ”جب سے پیدا ہوا ہوں کسی نے مجھے گود میں نہیں اٹھایا۔ ایسا کرو۔ مجھے گود لے لو۔ میرے گھر چلو۔ میرے ماں باپ اور رشتے دار تمہیں یقین دلائیں گے کہ میں منگی وِنگی نہیں ہوں‘ کبڈی ہوں۔“

پھر وہ پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے بولا۔ ”کبڈی کبڈی۔ کبڈی کبڈی...... کبھی تم نے کبڈی کھیلی ہے؟ آ تُو تُو۔ تُو تُو۔ کہاں کا میں اور کہاں کا تُو۔ آ تُو تُو۔ تُو تُو...“

اس نے یکبارگی فضا میں اچھل کر اس کے ہاتھوں پر کک ماری۔ جیسے پتھر آ کر لگا ہو۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ گن ہاتھوں سے نکل کر فضا میں اوپر کی طرف گئی۔ جب نیچے آئی تو مراد نے اُچھل کر اسے کیچ کر لیا۔

اس نے سر گھما کر دیکھا تو مراد نے گن کے دستے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی پھر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ جلدی بولو کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”م...... میں نہیں جانتا...... میرا ایک ساتھی کسی کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے مراد کی تصویر دی تھی اور دس ہزار روپے دیے تھے کہا تھا کہ اسے ہلاک کرو گے تو اور چالیس ہزار روپے دیے جائیں گے اور کہا تھا کہ اسے زخمی کر کے قیدی بناؤ گے تو اور دس ہزار زیادہ ملیں گے۔“

کبڈی نے اپنے ریوالور میں سائیلنسر لگا کر پوچھا۔ ”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“

”وائی ایم سی اے ہال میں ہے۔“

کبڈی نے اسے گولی مار دی۔ پھر مراد سے کہا۔ ”تم کیا صورت لے کر پیدا ہوئے ہو؟ مجھے یہ صورت ملی ہے تو اب ساری بندوقیں میری طرف آتی رہیں گی۔ کیا جب پیدا ہوئے تھے میرے یار! تو آس پاس گولیاں چل رہی تھیں؟“

مراد نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جماتے ہوئے کہا۔ ”چلو بیٹھو۔ آگے تمہاری صورت کا استقبال کرنے والے اور ملیں گے۔“

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ کبڈی پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ رفتار بڑھاتے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔

جب وہ چلے گئے تب بونے مراد کو تلاش کرنے والے ادھر آئے۔ وہاں سناٹے اور ویرانی میں ایک لاش پڑی تھی۔ کرسمس کی رنگینیاں سامنے شاہراہوں پر تھیں۔

وہ سب کرسمس نائٹ انجوائے کرنے نکلے تھے۔ ایک لاش کی رپورٹ دے کر تھانے پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ چپ چاپ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔

ہڈسن نے کہا۔ ”تعجب ہے۔ وہ بونا چھلاوا تھا۔ اِدھر دکھائی دیا۔ اُدھر غائب ہو گیا۔“

دھرم داس کو حقیقت معلوم ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے تو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم نے مراد علی منگی کو دیکھا تھا۔ بھلا وہ ایک سے آدھا کیسے ہو جائے گا؟“

ہڈسن نے فون پر ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ ”ابھی میں نے مراد علی منگی کو دیکھا ہے۔ مگر وہ ایک بونا ہے۔“

ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کسی بونے کو مراد کا ہم شکل پایا ہے؟“

”یس سر! وہ ہو بہو مراد تھا۔ ہم اسے پکڑ کر اس کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اچانک ہی بھیڑ میں کہیں گم ہو گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کہاں تلاش کریں؟“

جان انتھونی نے کہا۔ ”کیوں تلاش کرو گے؟ وہ مراد تو نہیں ہے۔ میں کرسمس نائٹ انجوائے کر رہا ہوں۔ تم نے ایک بونے کو دیکھ کر خواہ مخواہ مجھے ڈسٹرب کیا ہے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ہڈسن زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ ”وہ کون تھا؟ اس نے الجھا دیا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک مراد تھا۔ اگر مراد تھا تو پاکٹ ایڈیشن کیسے بن گیا ہے؟“

اس نے پاس بیٹھی ہوئی بہن کو دیکھ کر پوچھا۔ ”جس نے تمہیں دشمنوں سے بچایا تھا‘ وہ پورا تھا یا آدھا؟ میرا

مطلب ہے کیا وہ چھوٹے قد کا تھا؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "وہ تو بہت اونچا پورا لمبا چوڑا تھا۔ میں اس کی بائیک پر پیچھے بیٹھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑ کے دامن میں بیٹھی ہوں۔"

کبڈی منظرِ عام پر آکر ایک دشمن کی موت اور دوسرے دشمنوں کی پریشانی بن گیا تھا۔ اب وہ مراد کے ساتھ فینسی ڈریس شو میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں تو مختلف ماسک کے پیچھے دشمن ہی دشمن تھے۔

اس محفل میں ہر سو حسن کی جلوہ نمائی تھی۔ شباب کی گرمی سے ائرکنڈیشنڈ ہال گرم ہو رہا تھا۔ دسمبر کی کڑکڑاتی ہوئی سردی تھی۔ ایسے میں حسیناؤں کی دھوپ نکل آئی تھی اور آتش کو جواں رکھنے کے لیے شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

عورتوں اور مردوں نے طرح طرح کے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کوئی لومڑی بنی ہوئی تھی' کوئی بلی اور کوئی خرگوش اور اسی کے مطابق انہوں نے بڑے ہی دیدہ زیب لباس پہنے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماسک کے بغیر اصلی شکل میں تھے۔ مراد سانتا کلاز بنا ہوا تھا۔ دھرم داس نے اسے بتا دیا تھا کہ ہڈسن تائیگر کے ماسک میں چھپا ہوا ہے۔ عبداللہ کبڈی ماسک کے بغیر مراد کا چہرہ لے کر ہال میں پہنچا تو چھپے ہوئے دشمنوں میں کھلبلی پیدا ہوئی۔

جو مراد کو تلاش کرنے اور ہڈسن کو ہلاک کرنے آئے تھے' وہ آدھے مراد کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگر مراد ہے تو بونا کیسے بن گیا؟ عقل کہہ رہی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو حرام موت مرنے منظرِ عام پر نہ آتا۔

وہ سب پی رہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ پیتے رہنے سے مرنے کا خوف نہیں رہتا۔ مارنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ پینے کے بعد ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ گدھا' گھوڑا اور گھوڑا' گدھا دکھائی دیتا ہے اور قد آور شکو کر بونا بن کر ناچنے لگتا ہے۔

کبڈی ایک اسٹیج نما چبوترے پر کچھ لوگوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ شیطان کے ماسک والا ایک شخص نشے میں مست ہو کر کبڈی کے پاس آیا پھر اس پر جھک کر بولا۔ "ہیلو مراد!"

اس نے موسیقی کی دھن میں تھرکتے ہوئے کہا۔ "تم نے زیادہ پی لی ہے۔ میں مراد نہیں عبداللہ کبڈی ہوں۔"

وہ بولا۔ "یہ ہو نہیں سکتا۔ اتنا بتا دو تمہارا قد ففٹی پرسنٹ کیسے ہو گیا۔ تم تو ہنڈرڈ پرسنٹ تھے۔"

کبڈی نے دور کھڑے ہوئے مراد کو آنکھ ماری۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر شیطانی ماسک مین کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بونے مراد کا ایک راز بتاتا ہوں۔"

وہ اسے ہال سے باہر ایک اسٹور روم میں لے آیا پھر بولا۔ "تم کس کے لیے مراد کو ڈھونڈ رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "تم کوئی سوال نہ کرو۔ مجھے بونے مراد کا راز بتاؤ۔"

مراد نے سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کو اس کے سینے سے لگا کر کہا۔ "ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فون نکالو اور اپنے باس کو بولو۔ مراد تمہارے سامنے کھڑا ہے۔"

موت سینے سے آکر لگی تو نشے کی مستی ہوا ہو گئی۔ اس نے فون پر نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "باس! میں مراد کے نشانے پر آ گیا ہوں۔ اس سے کسی طرح سمجھوتا کرو۔ مجھے بچا لو۔"

باس نے کہا۔ "مراد سے میری بات کراؤ۔"

وہ فون بڑھا کر بولا۔ "باس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "کچھ کہنے سے پہلے یہ بتاؤ ریڈ الرٹ ہو یا ڈینجرس ریکٹ؟"

"میں ڈینجرس ریکٹ کا ڈی بلیک بول رہا ہوں۔"

"مت بولو۔ میرے ریوالور میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔ اس کی دھیمی آواز کو سن سکو گے۔"

یہ کہتے ہی اس نے پچاک کی آواز کے ساتھ گولی مار دی' فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر ریوالور کو لباس میں چھپا کر بڑے ہال کی رنگین محفل میں آ گیا۔ وہاں کبڈی موسیقی کی دھن پر گا رہا تھا اور لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

میں ہوں بونا بازی گر۔ میں ہوں بونا بازی گر۔

میں ہنستا ہی رہتا ہوں دشمن کو ناچ نچا کر۔

ایک بلی بن کر آنے والی لڑکی ناچنے گانے اور پینے کے دوران مراد سے دو بار آکر ٹکرائی تھی پھر تیسری بار آکر اس سے لپٹ گئی۔ وہ خود کو اس سے چھڑانے لگا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ "میں تین راتوں تک تمہارے پسینے میں نہاتی رہی تھی۔ یہ پریمنا تمہارے پسینے کی بو سے تمہیں پہچان رہی ہے۔"

"میں وہ نہیں ہوں' جو تم سمجھ رہی ہو۔"

اور واقعی پریمنا اس کے پسینے کو پہچاننے کا غلط دعویٰ کر رہی تھی۔ جس رابن سن یا ایمان علی کے ساتھ راتیں گزار چکی تھی' اب وہ نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نشے میں تھی۔ بول رہی تھی۔ "مجھے بازوؤں میں اٹھا کر لے چلو۔ یہاں فرسٹ فلور میں کئی کمرے خالی ہیں۔"

وہ بولتے وقت بہت ہی جذباتی ہو کر اپنے بھرے ہوئے بدن سے اس کے بدن کو سہلا رہی تھی۔ مراد نے الگ ہونے کے لیے ایک زور کا جھٹکا دیا تو وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی ٹرالی پر گری۔ کئی بوتلیں اور شیشے کے نازک جام ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پریمنا کے ساتھ نیچے جا گرے۔ کتنے ہی لوگ اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ مراد ناچنے والوں کی بھیڑ میں دوسری طرف چلا گیا۔

وہ غصے میں بول رہی تھی۔ "یو ایڈیٹ۔ نان سنس! میں تجھے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ آئی ول کِل یو...."

وہ کئی ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ گئی۔ دور تک دیکھنے لگی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھرم داس نے آکر اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم نے بہت پی لی ہے۔ چلو یہاں سے۔"

ایک عورت وچ لیڈی (جادوگرنی) کے ماسک میں تھی۔ وہ کبڈی کا ہاتھ تھام کر ڈانس کرتی ہوئی اسے کھینچ کر ایک طرف لے گئی پھر کہا۔ "مراد علی منگی! یہ کیا بھید ہے؟ تم سب کو حیران کر رہے ہو۔ تمہارا قد چھوٹا کیسے ہو گیا ہے؟"

وہ بولا۔ "کسی کا قد نہ گھٹ سکتا ہے اور نہ بڑھ سکتا ہے۔ ہماری دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور میں کوئی منگی وگی نہیں ہوں۔ دیکھو میوزک آن ہے۔ میں گا رہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر پھر رقص کرنے والوں کے درمیان ناچنے گانے لگا۔ مراد نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی وچ لیڈی اسے ایک طرف لے جا کر اس کے مراد ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔

کبڈی نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔ "ابھی اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر بتاؤں گا کہ وہ کون تھی؟"

وہ گانے لگا۔ "میں ہوں بونا بازی گر۔ میں ہوں بونا بازی گر۔"

وہ ناچتے ہوئے ایک ایک عورت کو چھو کر کہنے لگا۔

"انگوٹھے بھر بیبی بو۔ اتی تو بے پورے سو

سو میں نکلا دھاگا۔ ارے پکڑو دشمن بھاگا۔"

اس نے وچ لیڈی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شراب کا جام ہونٹوں سے لگائے پی رہی تھی۔ مراد نے آکر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ "ارے چھوڑو۔ میں جوان لڑکی نہیں ہوں۔"

وہ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ "میں ریڈ الرٹ کا شوٹر ہوں۔ پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے آیا ہوں۔"

وہ ہال کے باہر آ گئے تھے۔ وہ مچھلی کی طرح پھڑ پھڑا کر اس کے بازوؤں سے اتر گئی۔ پھر اسے گھور کر بولی۔ "وہ سامنے والا کمرا خالی ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ فوراً چلو۔ ورنہ یہاں کہیں سے اندھی گولی آکر ہم میں سے کسی کو چاٹ جائے گی۔"

وہ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ وچ لیڈی نے فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے لباس کے اندر سے سائلنسر لگا پستول نکال لیا۔ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ "تھو ہے تمہارے پچاس لاکھ ڈالرز پر۔ وہ مراد علی منگی میرے دیش میں ہے۔ اس کی رکھشا کرنا میرا کرتو (فرض) ہے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی لگائے گا تو میں اسے نرک میں پہنچا دوں گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر کو دبایا۔ دھیمی آواز میں گولی چلی وہ عین وقت پر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر جھک کر اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ دوسری گولی چھت پر جا کر لگی۔ یہ اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ وہ زبردست لڑاکا عورت تھی۔

مراد نے اسے سمجھایا۔ "میری بات سنو۔ گولی نہ چلاؤ۔ میں دشمن نہیں ہوں۔ میں تمہیں..."

بات پوری ہونے سے پہلے اس نے مراد کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا لیکن ایسی بھی تکلیف نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس نے وچ لیڈی کو دبوچ کر رگیدتے ہوئے پیچھے دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کا سر ذرا جھکا تو مراد نے اس کی گردن میں بازو کا پھندا ڈال دیا۔ ذرا زور لگایا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ایسے میں پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے لڑنے والی کو ایک جھٹکے سے فرش پر پھینک دیا۔ پھر پستول کو اٹھا کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔

وہ نہتی ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ فرش پر سے اٹھتے ہوئے مراد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں موت سے کھیلتی رہتی ہوں۔ چل گولی چلا۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی مرے گا۔ میری بیٹیاں تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

"میں گولی نہیں چلاؤں گا کیونکہ دشمن نہیں ہوں اور ریڈ الرٹ کا شوٹر بھی نہیں ہوں۔"

وہ بے یقینی سے بولی۔ "ابھی تو نے کہا تھا۔"

"میں جھوٹ بول کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم کس گروہ

سے تعلق رکھتی ہو؟"

"میں کیسے یقین کروں کہ اب سچ بول رہے ہو؟"

وہ بڑی محبت سے بولا۔ "تم مراد کے لیے نیک جذبات رکھتی ہو۔ پچاس لاکھ ڈالرز پر تھوکتی ہو۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔"

اس نے جھک کر پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے مراد کو دیکھا پھر پستول لے کر فرش سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم کون ہو؟"

وہ بولا۔ "پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ؟"

وہ بولی۔ "میرا نام جگنی بائی ہے۔ میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ہم نے انیائے (ناانصافی) کے خلاف لڑنے کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس تنظیم کا نام گھا گھرا پلٹن (Peticoat Army) ہے۔ یہ نام ہم نے نہیں لوگوں نے رکھا ہے کیونکہ ہماری دَل (جماعت) میں صرف تعلیم یافتہ ہنرمند اور خطرناک فائٹر کہلانے والی عورتیں ہیں۔

"ہم نے مراد علی منگی کی ہسٹری معلوم کی ہے .... وہ بے قصور ہے۔ پاکستانی جاسوس نہیں ہے۔ ہم اسے انصاف دلائیں گے۔ جو اس کا دشمن ہوگا اسے ہم جینے نہیں دیں گے۔"

مراد اسے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ جگنی بائی نے کہا۔ "اب تم بولو کون ہو؟ کیا اس بونے مراد کو جانتے ہو؟"

مراد نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ہاں بے چارہ مراد... میں تمہارے اندر انسانی ہمدردی اور مراد سے اپنایت دیکھ کر سچ کہوں گا۔ ابھی ہم نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا ہے۔ پہلے تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم جادو ٹونے کو اور کسی تانترک مہاراج کی جادوئی شکتیوں کو مانتی ہو؟"

"کیوں نہیں مانوں گی؟ ضرور مانتی ہوں۔ ہمارے دیس میں جادو ٹونا بہت ہے۔"

"تو سنو! ابھی جو ہال میں ناچ رہا ہے اور گا رہا ہے وہی مراد علی منگی ہے۔ ایک تانترک مہاراج نے کرودھ (طیش) میں آ کر اسے جادوئی شکتی سے بونا بنا دیا ہے۔"

جگنی بائی نے حیرت سے اپنا ہاتھ کھلے ہوئے منہ پر رکھ لیا۔ مراد نے کہا۔ "بے چارہ مراد دشمنوں سے چھپنے کے لیے شمشان گھاٹ میں گیا تھا۔ وہاں ایک تانترک مہاراج ایک تھال میں گیندے کے پھول، ماش کی دال کا آٹا، سیندور اور تلی کا تیل رکھ کر آسن جمائے بیٹھے تھے اور کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ مراد دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ادھر سے بھاگتا ہوا جانے لگا تو مہاراج کی تھال کو ٹھوکر لگی۔ ان کے تمام جنتر منتر کا سامان دور تک بکھر گیا۔ سب ہی مٹی میں مل گیا۔

"تب تانترک مہاراج نے کرودھ میں آ کر ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ سکڑتا اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد گھٹ گیا اور وہ بونا بن گیا۔"

جگنی بائی نے بڑے دکھ سے کہا۔ "ہائے.... بے چارہ! ہم اس تانترک مہاراج سے ملیں گے۔ اس سے بنتی کریں گے۔ اس کے چرنوں میں گر جائیں گے تو وہ اسے واپس قدآور بنا دیں گے۔"

"بے چارہ مراد نہیں جانتا کہ وہ مہاراج کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور اب وہ کہاں ہوں گے؟"

دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر کسی لڑکی کی آواز آئی۔ "ماتا جی! تم بڑی دیر سے یہاں ہو۔ خیریت تو ہے؟"

جگنی بائی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میری بیٹی ورشا آئی ہے۔"

اس نے دروازہ کھولا تو وہاں تین جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے دور عبداللہ کبڈی چھپا ہوا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ مراد بند کمرے سے باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟

مراد نے ہاتھ اٹھا کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں اندر آ رہی تھیں۔ کبڈی بھی ان کے پیچھے کمرے میں آیا تو ایک نے اپنی ماں سے کہا۔ "ماتا جی! یہ دیکھو مراد آیا ہے۔"

دوسری نے کہا۔ "مراد نہیں اس کا ہم شکل ہے۔"

تیسری نے کہا۔ "میں شرط لگانے کو تیار ہوں مراد تو پہاڑ جیسا ہے، وہ بونا ہو ہی نہیں سکتا۔"

وہ آپس میں بحث کرنے لگیں۔ جگنی بائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ یہ مراد علی منگی ہے۔"

سب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ جگنی بائی نے آگے بڑھ کر کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹے! ابھی تمہارے دوست نے بتایا ہے۔ تانترک مہاراج نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم اس مہاراج کو ڈھونڈیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح تمہیں واپس قدآور نہیں بنائے گا تو ہم عورتیں اسے الٹا لٹکا دیں گی۔"

وہ تینوں لڑکیاں ہمدردی اور محبت سے کبڈی کو دیکھ رہی تھیں۔ جگنی بائی اسے سینے سے لگا کر بولی۔ "آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔ تم دشمنوں کے مقابلے میں اکیلے نہیں رہو گے۔ یہاں سے کولکتہ تک گھا گھرا پلٹن (Peticoat Army) میں دو سو فائٹر عورتیں ہیں۔"

وہ جگنی بائی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ "میری امی

وفات پا چکی ہیں۔ میں آپ کو امی کہوں گا۔ آپ میرے لیے فائٹ کریں۔ بھارت سرکار کو یقین دلائیں کہ میں نہ تو پاکستانی جاسوس ہوں اور نہ ہی پیشہ ور مجرم ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ گھا گھرا پلٹن میں چھ مانی ہوئی بیرسٹر ہیں۔ پندرہ پریس رپورٹر اور فوٹو گرافر ہیں۔ دور کی کوڑیاں لانے والی جاسوس ہیں۔ یہ سب کی سب تمہارے لیے فائٹ کریں گی۔"

پھر وہ اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ تینوں بہت مایوس ہو کر بونے مراد کو دیکھ رہی تھیں۔ جگنی بائی نے کہا۔ "مراد! ان تینوں نے تمہیں اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ ایک دوسرے سے لڑتی تھیں اور کہتی تھیں کہ وہ تم سے شادی کریں گی۔"

ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی ماں کہہ رہی تھی۔ "یہ میری بڑی بیٹی مینا ہے۔ یہ دوسری ڈولی ہے اور یہ سب سے چھوٹی ورشا ہے۔"

ورشا چور نظروں سے سانتا کلاز کو دیکھ رہی تھی اور انجانے میں اصلی مراد کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بونے مراد کے مقابلے میں چھ فٹ سے بھی اونچا صحت مند جوان تھا۔ لڑکیاں ایسی شخصیت کا تصور کرتی ہیں۔

مراد نے کبڈی سے کہا۔ "ہمیں ہال میں جانا ہے اور دشمنوں سے نمٹنا ہے۔"

کبڈی نے جگنی بائی سے کہا۔ "امی! آپ اپنا فون نمبر دیں اور میرا نمبر لیں۔ میں کل آپ سے بات کروں گا اور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کے نمبر Save کیے۔ کبڈی تینوں لڑکیوں کے سامنے آ کر بولا۔ "ماتم نہ کرو۔ اگر میں تمہارا آئیڈیل تھا تو پھر ماتم کیسا؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ تم تینوں میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر روز اپنی اپنی طرف کھینچتی رہو گی تو لمبا ہو جاؤں گا۔"

جگنی بائی ہنسنے لگی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر بڑے ہال میں آ گئے۔ وہاں کرسمس نائٹ کا جشن شباب پر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے علاوہ شراب کی ٹرالیاں بھی گردش میں تھیں۔

ریڈ الرٹ اور ڈینجرس ریکٹ کے شوٹرز بھی پی کر مست تھے۔ بونے مراد نے انہیں الجھا دیا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو کر ہیلری ہڈسن کو ڈھونڈ رہے تھے۔

ڈی بلیک نے حکم دیا تھا کہ ہڈسن کو گولی مار دی جائے تب ہی ڈائریکٹر جنرل مجبور ہو کر مراد کا پتا بتائے گا جبکہ MET ڈیپارٹمنٹ کی مرینہ بھی اس کا موجودہ پتا نہیں جانتی تھی۔

ہڈسن اپنے ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ کسی قاتل کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شراب اسے لے ڈوبی۔ اس پر نشہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جوان عورت کو آغوش میں لے کر چومنے کے لیے ماسک کو چہرے سے ہٹایا تو ایک شوٹر نے اسے دیکھ لیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پیچھے آیا پھر اس کی پشت سے ریوالور کی نال کو لگاتے ہوئے کہا۔ "گن میرے کوٹ کی جیب میں ہے، کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ چپ چاپ باہر چلو۔ منہ سے ذرا آواز نکالو گے تو یہیں گولی مار دوں گا۔"

وہ سہم کر بولا۔ "پلیز گولی نہ چلانا۔ مجھ سے دوستی کرو۔ میں تمہارا مطالبہ کرنسی کی صورت میں ادا کروں گا۔"

"او کے باہر چل کر باتیں ہوں گی۔ کم آن، آگے بڑھو۔"

اسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اس کے لباس کے اندر بھی ایک پستول تھا۔ سوچ رہا تھا، جب جان دینی ہی ہے تو باہر جاتے جاتے پستول نکال کر اس سے مقابلہ کرے گا۔

شوٹر بھی مجبور تھا۔ اس عمارت کے اندر گولی مار کر بھاگنا چاہتا تو درجنوں سیکیورٹی والے اسے گولی مار دیتے۔

وہ بڑے ہال سے باہر آ گئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرنے لگے۔ ہر جگہ جشن منانے والے موجود تھے اور مسلح گارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔

شوٹر نے کہا۔ "تیزی سے چلو۔"

ہڈسن اس کے آگے تیزی سے چلتے چلتے اچانک بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے پیچھے والا فوراً ہی رک نہ سکا۔ ہڈسن کے اوپر سے گزرتا ہوا آگے آ کر گرا۔ اتنی سی مہلت ملتے ہی ہڈسن نے لباس سے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔

دور کھڑے ہوئے گارڈز دوڑتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ مراد ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ اس نے گولی چلائی تو وہ ہڈسن کے ہاتھ میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا۔ اس کی طرف آنے والے گارڈز پلٹ کر اس سے دور ہو گئے۔ جواباً گولیاں چلانے سے پہلے ادھر ادھر چھپنے لگے۔

ایسے ہی وقت ہر سو تاریکی چھا گئی۔ کسی نے مین سوئچ کو آف کر دیا تھا۔ ریڈ الرٹ کے شوٹرز متحد ہو کر بڑی پلاننگ سے ایکشن میں آئے تھے۔ ان میں سے دو شوٹرز مین سوئچ کے پاس تھے۔ جو گارڈ اسے آن کرنے آ رہا تھا۔ اس کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ باقی شوٹرز اس حصے میں تھے جہاں ہڈسن فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں

رینگتا ہوا اپنے پستول کی طرف جا رہا تھا لیکن صحیح سمت سے بھٹک گیا تھا اور مراد کی طرف ستون کے پاس چلا آرہا تھا۔ اندھیرے میں شوٹرز گولیاں چلا رہے تھے۔ فائرنگ کے لحاتی شعلے جل بجھ رہے تھے۔ مراد نے ستون کے پیچھے محفوظ رہ کر اُن لحاتی شعلوں کی سمت گولیاں چلائیں تو دو افراد کی چیخیں سنائی دیں۔ پتا نہیں وہ دشمن تھے یا گارڈز تھے؟ پھر اس نے فرش پر بیٹھ کر ذرا جھک کر کسی کے سانس لینے کی آواز سنی۔ پرفیوم کی مہک سے پہچانا کہ وہ ہڈسن ہے۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”فوراً لیٹ جاؤ۔ ورنہ کوئی گولی ابھی اِدھر آئے گی۔“

وہ گھوڑے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا آرہا تھا۔ فوراً ہی فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں تمہارے پرفیوم کی مہک سے پہچان رہا ہوں۔ تم ہڈسن ہو۔ ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں جس نے تمہاری بہن لیزا کی جان بچائی تھی۔“

وہ بولا۔ ”تھینکس گاڈ! مجھے ایک ہتھیار دو۔ مہربانی ہوگی۔“

”میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ میرا لباس تھام کر رینگتے ہوئے چلو۔“

اس کی بات پوری ہوتے ہی آواز کی سمت ایک گولی آئی۔ اس نے منہ سے آواز نکال کر نادانی کی تھی۔ چونکہ وہ فرش پر لیٹے ہوئے تھے اس لیے بچ گئے۔ تیزی سے رینگتے ہوئے ایک سمت جانے لگے۔

مراد کسی بھی نئی جگہ جاتا تھا تو پہلے وہاں سے نکلنے کے راستے ذہن نشین کر لیتا تھا۔ وہ وائی ایم سی اے کی عمارت سے بھی نکلنے کے راستے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت فرش پر چپ چاپ رینگتا ہوا ہڈسن کو اپنی راہنمائی میں لے جا رہا تھا۔

وہ خطرے سے دور ہو گئے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ کرائے کے شوٹرز اور مسلح سپاہیوں کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مراد نے فون کے ذریعے کبڑی کو میسج دیا۔ ”گاڑی کے پاس آؤ۔ میں آرہا ہوں۔“

پھر وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے۔ باہر شاہراہ کی روشنی کے باعث اندر گہری تاریکی نہیں رہی تھی۔ وہ جھکتے ہوئے، چھپتے ہوئے عمارت کے باہر ایک تنگ گلی میں نکل آئے۔

وہاں کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کے پاس کبڑی کھڑا ہوا تھا۔ ہڈسن اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ کبڑی نے کہا۔ ”رک کیوں گئے۔ میرے سر کی قیمت حاصل کرنے کے لیے اپنے دن رات حرام کر رہے ہو۔ آؤ میرے شانے سے سر اُتار لو۔“

ہڈسن نے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں ہال میں بھی تمہیں دیکھتا رہا۔ کسی پہلو سے یقین نہیں آرہا ہے کہ تمہارا قد اتنا چھوٹا ہو گیا ہے۔“

وہ سائیلنسر لگا ہوا ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ ”میں پچاس لاکھ ڈالرز ہوں۔ گولی چلے گی تو یقین آجائے گا لیکن یقین کرنے والے نے دیر ہو چکی ہوگی۔“

ہڈسن نے فوراً ہی پلٹ کر مراد کو دیکھا پھر چیخ کر کہا۔ ”مجھے اپنا ریوالور دو۔“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ مار کھا کر کبڑی کی طرف ریوالور کے نشانے پر آ گیا۔ پیچھے سے مراد نے اس کی کمر سے ریوالور لگا کر کہا۔ ”میں وہیں ہال میں تمہیں ختم کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا۔ ایک فون کال ضروری تھی۔ چلو اپنا فون نکالو اور مرینہ کو کال کرو۔“

اس کے آگے پیچھے موت تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ رابطہ ہونے پر دوسرے طرف موسیقی، گانے اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں بھی کرسمس نائٹ کی دھوم دھام تھی۔ مرینہ بھی نشے میں مست ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”ویل ہڈسن! کیا تم وہاں انجوائے کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”وہاں بہت شور ہے۔ کہیں دور آکر بات کرو اور میری بات سنو۔ میرے آگے پیچھے موت ہے۔“

”جسٹ اے منٹ! میں دوسری جگہ جا رہی ہوں۔“

ہڈسن نے مراد سے پوچھا۔ ”میں مرینہ سے کیا بولوں؟“

”بولو کہ تم مراد کو دیکھ رہے ہو اور وہ بونا ہو گیا ہے۔ اس سے یہ نہ کہنا کہ مراد کے ساتھ یہ سانتا کلاز تمہارے پیچھے ہے۔“

دوسری طرف مرینہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہڈسن! یہاں شور ہنگامہ نہیں ہے۔ اب بولو۔“

”میں کیا بولوں؟ ایسے وقت بولتے ہیں، پیچھے کنواں آگے کھائی۔ میں کیا کروں میری مائی؟ مراد موت بن کر آگیا ہے۔ یہ شاید مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سے کسی طرح سمجھوتا کرو۔“

وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ ”کیا مراد وہاں ہے؟ اسے فون دو۔ ہائے، میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔“

ہڈسن نے کبڑی کی طرف فون بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مرینہ! تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

کبڑی نے فون نہیں لیا۔ اُدھر منہ کر کے بولا۔ ”سوری مرینہ! میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ سو سوری! ابھی دشمنوں سے نمٹ رہا ہوں۔“

اِدھر سے مرینہ نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ یہ مراد کے لب و لہجے میں بول رہا ہے لیکن آواز ویسی نہیں ہے۔“

ہڈسن نے کہا۔ ”اس کی آواز دب گئی ہے اور قد سکڑ گیا ہے۔ تمہارا مراد بونا ہو گیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”کیا بکواس ہے۔ وہ پہاڑ جیسا مرد بونا کیسے ہو جائے گا؟ اس سے بولو، مجھ سے بات کرے۔“

کبڑی نے مراد کا اشارہ پاتے ہی کوئی بات نہیں کی۔ ہڈسن کو گولی مار دی۔ وہ کراہتا ہوا فون سمیت زمین پر گر پڑا۔ مراد نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک ماری۔ کبڑی ہڈسن کا فون اٹھا کر پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ فون سے مرینہ کی آواز آرہی تھی۔ ”ہڈسن! چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے کیوں نہیں؟“

کبڑی فون کو منہ کے سامنے لا کر گانے لگا۔

”میں ہوں بونا بازی گر۔ مجھ سے کرو نہ اگر مگر۔ میں ہوں بونا بازی گر۔“

اس نے فون کو دور پھینک دیا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح انڈیا کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے ہاکر چیختے پھر رہے تھے۔ ”آج کی تازہ خبر... دہلی کی کرسمس نائٹ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ شراب پینے والوں کے اندر لہو باہر۔ آج کی تازہ خبر...“

اخبارات کی سرخیاں کہہ رہی تھیں۔ ”وائی ایم سی اے ہال میں جہاں کرسمس نائٹ منا رہے تھے، وہاں دہشت گرد گولیاں برسا رہے تھے۔“

تمام ٹی وی چینلز کہہ رہے تھے، وہ دہشت گرد نہیں تھے۔ برطانوی سفارت خانے کے منتظم ہیلری ہڈسن کے دشمن تھے۔ اسے ہلاک کرنے آئے تھے۔ خبروں میں یہ بھی کہا جا رہا تھا۔ بدنام زمانہ قاتل بیرونی ملکوں سے آرہے ہیں اور کسی مراد علی منگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ مراد علی منگی پاکستانی جاسوس ہے۔ وہ یہاں سے ایک اہم راز چرا کر فرار ہونا چاہتا تھا۔ سب ہی کے بیانات کا لب لباب یہی تھا۔

اب تک راجستھان اور یوپی کے علاقوں میں مراد کا چرچا محدود پیمانے پر تھا۔ اس روز 25 دسمبر کو پہلی بار اس کا نام پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا۔ تمام اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ اب وہ کسی علاقے میں چھپ کر نہیں رہ سکے گا۔

پھر اسی دن اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے۔ ٹی وی کی خبروں میں بتایا گیا کہ پچھلی رات مراد کو وائی ایم سی اے ہال میں دیکھا گیا تھا۔ وہ چھپنے والا سرِعام آگیا تھا اور وہاں ناچتا گاتا رہا تھا۔

ان خبروں میں ایک حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین بات کہی گئی کہ مراد علی منگی کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اب وہ گھٹ کر چار فٹ کا بونا ہو گیا ہے۔

یہ واقعی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ لوگ ہر گلی اور محلے میں اس بونے پر تبصرے کر رہے تھے اور اس کے متعلق اپنے اپنے طور پر خیال آرائی کر رہے تھے۔

ایم این اے دھرم داس نے بیان دیا۔ ”میں نے اس بونے کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے باتیں کی ہیں۔ وہ ہرگز مراد علی منگی نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا ناچنے گانے والا اور تماشے دکھا کر ہنسانے والا جوکر ہے۔ میں اسے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس اور انڈین انٹیلی جنس والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا تا کہ اس کی صحیح شناخت ہو جائے اور وہ بے چارہ معصوم بونا، مراد علی منگی کے دھوکے میں مارا نہ جائے۔

”اس نے مجھے کہا تھا کہ کرسمس نائٹ کے جشن کے بعد میرے پاس آئے گا لیکن وہاں گولیاں چلنے لگی تھیں۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ وہ بھی خوف زدہ ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔

”مجھے امید ہے، وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میرا فون نمبر اس کے پاس ہے۔ ایک تو مجھے اس بونے سے ہمدردی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اصل مراد علی منگی جو پاکستانی جاسوس ہے وہ بونے کا ہم شکل ہو کر فائدہ اٹھائے گا۔ وہ ہم سب کی توجہ اس بونے کی طرف لگا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم اس جاسوس کو سرحد پار نہیں کرنے دیں گے۔“

دھرم داس اگرچہ دیس بھگت بن کر مراد کے خلاف بیان دے رہا تھا لیکن اپنے دل اور دھرم سے اور یقینی سچائی سے مراد کو بے قصور مانتا تھا۔ وہ اس پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا جھوٹا الزام مٹا نہیں سکتا تھا لیکن در پردہ اس کا حامی ہو کر اسے سرحد پار کرا سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ کر رہا تھا۔ ایمان علی کی حیثیت سے مراد کا نیا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ آئندہ عبداللہ کبڑی کو آئی جی آف پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے سامنے پیش کر کے اس کا بھی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے والا تھا۔

دوسرے دن جگنی بائی نے کبڑی کو فون پر مخاطب

کیا۔ وہ نیند سے بیدار ہو کر جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ”سوری امی! تمام رات بڑی بھاگ دوڑ رہی۔ اس لیے لمبی تان کر سو رہا تھا۔“

”چلو میں نے جگا دیا۔ نیند تو پوری ہو گئی ہے نا؟“

”ہاں۔ آپ اجازت دیں گی تو شاور لے کر فریش ہو کر آپ سے بات کروں گا۔“

”تم جب بھی بات کرو۔ ابھی یہ سن لو کہ اچانک ہی پورے دیس میں تمہارا نام گونجنے لگا ہے۔ ٹی وی دیکھو۔ اخبار پڑھو۔ تمہیں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ میں نے آج شام کو پریس کانفرنس بلائی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے لوگ بھی آئیں گے۔ میری گھا گھرا پلٹن کی اہم عورتیں بھی ہوں گی۔ ”گھا گھرا پلٹن کی طرف سے اخبارات اور ٹی وی کو بیان دیا جائے گا کہ تم مراد علی منگی نہیں ہو۔ تمہیں پاکستانی جاسوس نہ سمجھا جائے اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کہنے کے لیے تم ..... سے میٹنگ ضروری ہے۔ تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں ٹھیک دو بجے گاڑی لے کر آؤں گی اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ اپنا پتا بتاؤ۔“

کبڈی نے کہا۔ ”میرا جگری دوست ایمان علی بھی ساتھ رہے گا۔ آپ ڈاکٹر مجنی سن کے کلینک میں دو بجے آجائیں۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد سو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”تم باتھ روم سے آجاؤ گے تو میں جاؤں گا۔“

اس نے کہا۔ ”دو بجے امی آنے والی ہیں۔ واقعی ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ تم پر سے یعنی مجھ پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ختم کرنا چاہتی ہیں۔“

”یار! مرینہ کل سے ہمارے فون کے انتظار میں سلگ رہی ہو گی۔ میں نے جیسا تمہیں سمجھایا ہے اسی طرح اس سے دو باتیں کر لو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“

وہ باتھ روم میں جاتے ہوئے بولا۔ ”آل رائٹ' میں ابھی اسے کال کر رہا ہوں۔“

اس نے باتھ روم میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر مرینہ کے نمبر پنچ کر کے اپنا لباس اتارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وائڈ اسپیکر سے آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔ کون؟“

وہ فون کے پاس آکر بولا۔ ”میں ہوں تمہارا مراد۔“

وہ جھنجلا کر بولی۔ ”تم مراد کیسے ہو سکتے ہو؟ ہڈسن نے پہلے ڈائریکٹر جنرل سے کہا تھا کہ اس نے ایک بونے مراد کو دیکھا ہے پھر آدھی رات کے بعد ہڈسن نے مجھے فون کیا تو تم وہاں موجود تھے۔ ہڈسن نے کہا تھا کہ تمہاری آواز دب گئی ہے اور قد سکڑ گیا ہے۔ تم بونے ہو گئے ہو۔

”یہ کیا بچوں جیسی باتیں ہیں۔ پلیز سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ میں نہیں مانتی کہ مراد بونا ہو گیا ہے؟ یہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو کبھی نہیں مانوں گی۔“

”ٹھیک ہے کہ یہ نہ ماننے والی بات ہے' کیا مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہیں مانو گی؟“

اس نے یہ کہتے ہوئے تکلیف سے کراہنے کے بعد ایک لمبی سانس لی۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا تم کسی تکلیف میں ہو؟“

”ہاں واش روم میں ہوں۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”نو نان سنس! کیا ایسے وقت مجھ سے بات کر رہے ہو؟“

”مجبوری ہے۔ دشمنوں نے اتنا مصروف کر دیا ہے۔ تم سے کیا چھپانا۔ جب ہم جے پور میں چھپے ہوئے تھے۔ یاد کرو وہاں تم میرے ساتھ شاور لیتی تھیں۔ اسی طرح اس وقت بھی میرے تن پر کچھ نہیں ہے۔ ہائے مرینہ! آجاؤ نا۔“

وہ حقارت سے بولی۔ ”اے بونے...! بالشت بھر کے وجود...! ایک تنکا ہوں گی تو سمندر میں جا کر غرق کرے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا قد گھٹ جانے سے پیار بھی گھٹ گیا ہے۔ کیا آئندہ میرے ساتھ نہیں رہو گی؟“

”تو ہے کون؟ یہ بونا مراد کیسے بن گیا ہے؟ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ تو مراد علی منگی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”اگر میں ثابت کر دوں تو کیا مجھے گود میں لے کر میرے بچے کی ماں نہیں بنو گی؟“

مرینہ کا دکھ تازہ ہو گیا۔ وہ ماں بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اسے پھر سے مراد کی ضرورت تھی لیکن جو مراد آنے والا تھا اس کے گلے لگنے کے لیے اسے گود میں اٹھانا پڑتا۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کل رات ہڈسن نے کہا تھا کہ مراد اس کے سامنے ہے۔ سچ بولو کیا تم نے ہڈسن کو گولی ماری تھی یا وہاں اور بھی کوئی تھا؟“

”میں تنہا تھا۔ میں نے ہی اسے گولی ماری تھی۔ جب سے تم مجھے جے پور میں چھوڑ کر گئی ہو، تب سے ہڈسن اور اس کے آدمی مجھے مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کا قصہ ہی تمام کر دیا ہے۔“

”کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم ہی مراد علی منگی ہو؟“

"ہاں تمہیں یقین کرنا چاہیے۔ ایک تانترک مہاراج نے مجھ سے ناراض ہو کر مجھے پورے سے آدھا کر دیا ہے۔"

وہ اسے بتانے لگا کہ شمشان گھاٹ میں تانترک مہاراج کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ "میں مانتی ہوں۔ جادو ٹونے کے ذریعے عجیب ہیبت ناک تماشے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں مانوں گی کہ کسی مہاراج نے تمہیں پھونک مار کر بونا بنا دیا ہے۔"

"پھر تم کیسے یقین کرو گی کہ میں تمہارا مراد ہوں؟"

وہ بولی۔ "میری اور مراد کی ایسی پرسنل بات بتاؤ جسے میں اور وہ جانتا ہے۔ کوئی تیسرا جان ہی نہیں سکتا۔"

وہ بولا۔ "رات کو تنہائی میں بند کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے نہیں آتا۔ میں تیسرا نہیں ہوں۔ تمہارے ایک ایک انداز کو بیان کر رہا ہوں۔"

وہ بیان کرنے لگا تو مرینہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایسی باتیں بتا رہا تھا جسے وہ جانتی تھی اور صرف مراد جانتا تھا۔

بونے نے پوچھا۔ "کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں؟ مجھ سے اور کوئی سوال کرنا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہماری دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ مجھے آنا ہی ہوگا۔ تمہیں آنکھوں سے دیکھنا ہی ہوگا۔"

"آنے سے پہلے یہ اچھی طرح سن لو۔ میں نے اب تک کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا ہے کہ میں مراد ہوں۔ یہاں میرے حمایتی مجھے ایک سیدھی سادی سی زندگی گزارنے والا بونا ثابت کرنے والے ہیں۔

"یہ راز صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ تم وہاں کسی سے یہ بول کر نہیں آؤ گی کہ ایک بونے مراد سے ملنے جا رہی ہو۔ یہ کہو گی کہ تمہارا مراد بونا ہو ہی نہیں سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم جانے انجانے میں دشمنوں کو ساتھ لگا کر نہیں آؤ گی۔"

"مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں کہ مجھے کس طرح محتاط رہ کر وہاں آنا چاہیے۔ اپنا پتا بتاؤ۔"

"جب یہاں ائر پورٹ کے باہر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ تم بتاؤ کب آ رہی ہو؟"

"میں ٹکٹ او کے کرانے کے بعد بتاؤں گی۔" ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔

مرینہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے مراد کو تصور میں دیکھ رہی تھی اور دیکھنے کے دوران میں بار بار اس کا قد گھٹتا رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں گھٹ رہا تھا۔ پہاڑ کو تصور میں تنکا بنانے سے وہ تنکا نہیں بن جاتا۔ مراد قد میں بلند و بالا تھا اور اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔

وہ زیر لب بڑبڑائی۔ "نہیں۔ وہ بونا کوئی بہروپیا ہے۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مراد کا ہم شکل بن گیا ہے۔"

"اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا پھر اصلی مراد کہاں ہے؟"

اس نے ذہانت سے سوچا۔ 'وہ چہرہ بدل کر چھپا ہوا ہے۔ ایک بونے کے ذریعے دشمنوں کو دھوکا دے رہا ہے۔'

وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑائی۔ "میں جاؤں گی اور اس بونے کی گردن دبوچ کر اصل مراد کو سامنے آنے پر مجبور کروں گی۔ وہ سچ نہیں اگلے گا تو اسے گولی مار دوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ انڈیا پہنچ کر کس طرح محتاط رہنا تھا۔ محتاط رہنے کے لیے لازمی تھا کہ مراد پر بھروسا نہ کرے۔

اگر وہ قد آور مراد سامنے آئے گا، اس سے دوستی رکھے گا تو اس کے بچے کی ماں بننے تک نہ اسے نقصان پہنچائے گی، نہ کسی کو پہنچانے دے گی اور اگر یہ درست ثابت ہوگا کہ کسی تانترک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے تو وہ اس بالشت بھر کے مراد کے بچے کی ماں ہرگز نہیں بنے گی۔ ایسا کیڑے کو اپنے وجود پر رینگنے ہی نہیں دے گی۔ اسے گولی مار کے پچاس لاکھ ڈالرز وصول کر لے گی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان انتھونی سے فون پر کہا۔ "سر! میں ایک ہفتے کی چھٹی چاہتی ہوں۔"

جان انتھونی نے مسکرا کر بڑے یقین سے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ انڈیا جاؤ گی۔ مراد کے پاس۔"

"آپ صرف مراد کے حوالے سے کیوں بول رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہڈسن مارا گیا ہے۔ میں اس کے قاتلوں کو پکڑنے جا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "ہڈسن کی ہلاکت کے سلسلے میں وہاں ہمارے جاسوس تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جانے کو نہیں کہا گیا ہے اور نہ ہی میں کہوں گا۔ اب سچ سچ بول دو انڈیا کیوں جاؤ گی؟"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی غلطی درست کرنے جاؤں گی۔"

وہ غصے سے بولا۔ "کیا بک رہی ہو؟"

"آپ نے مجھے بے خبر رکھ کر ہڈسن کو حکم دیا تھا کہ وہ

جے پور میں مراد کو جا کر پکڑے۔ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ہڈسن کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"آپ نہ مانیں۔ اس ایک غلطی سے ہڈسن ڈینجرس ریکٹ اور ریڈ الرٹ والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ دشمن یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ اور ہڈسن میرے وہاں سے آنے کے بعد مراد پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی خفیہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔

"اسی لیے آپ کو فون پر دھمکی دی گئی۔ لندن پہنچتے ہی مجھ پر حملہ کیا گیا اور کل رات ہڈسن کو انہوں نے مار کر ہی دم لیا ہے۔ آپ نادان نہیں ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہڈسن کے بعد صرف میں ہی نہیں، آپ بھی ان کے ڈیتھ وارنٹ میں ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم جان بوجھ کر مراد کے ساتھ کانٹوں کے بستر پر سونے جا رہی ہو؟"

"آپ کے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اب میں مراد کو وہاں نہیں چھوڑوں گی، اسے یہاں لے آؤں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"اس شرط پر لاؤں گی کہ آپ پچاس لاکھ حاصل کرنے کی جلدی نہیں کریں گے۔ میرے ماں بننے کا انتظار کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک اس کے بچے کی ماں نہیں بنو گی، ہم اس کے سر کی قیمت وصول نہیں کریں گے۔ تم کسی بھی پہلی فلائٹ سے انڈیا چلی جاؤ۔ میں ابھی ٹکٹ او کے کراتا ہوں۔"

وہ فون بند کر کے زیر لب بولی۔ "وہ میرا قد آور مراد ہوگا۔ تب اسے پیار سے لاؤں گی۔ بونا ہوگا تو ایسا ہاتھ ماروں گی کہ ٹکڑے ٹکڑے زمین میں دھنس جائے گا۔"

اس نے تصور میں قد آور مراد کو دیکھا پھر اس کے نمبر پنچ کیے۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس بار قد آور کی آواز سنے گی لیکن دوسری طرف سے ٹیپ چل رہا تھا۔ ایک سریلی آواز کہہ رہی تھی کہ کسی وجہ سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کی پھر وہی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کمبخت بونا کوئی بھی ہو، نمبر بدل کر بولتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر جنرل نے اسے فون پر کہا کہ اسے دوسرے دن صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے جانا ہے۔ اس کی سیٹ او کے ہو گئی ہے۔

☆☆☆

جگنی بائی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اپنی کار میں آئی۔ مراد اور کبڈی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ اور عبداللہ کبڈی ماں بیٹے بن گئے تھے لیکن اس مراد کے بونے پن نے تینوں لڑکیوں کو بہت مایوس کیا تھا۔ ان تینوں نے مراد علی منگی کے متعلق سنا تھا کہ وہ دیسی بدیسی مجرموں کے ساتھ تنہا لڑتا آ رہا ہے اور دشمنوں کو نرک میں پہنچاتا جا رہا ہے۔ ایسی دلیری اور جان بازی کی باتیں لڑکیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ٹینا، ورشا اور ڈولی تینوں نے اسے اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا اور اس آئیڈیل نے اپنا قد گھٹا کر ان تینوں کے عشق کو اور ان کے جوش جذبوں کو گھٹا کے خاک میں ملا دیا تھا۔

اب وہ پٹری بدل کر ایمان علی کی پٹری پر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے چہرے، اپنے قد اور جسامت کے اعتبار سے بہت ہی خوبرو تھا۔ دیکھنے والیاں اس کی طرف کھنچی جاتی تھیں۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہاں ورشا آ کر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ٹینا نے اس کے سامنے آ کر ذرا تن کر کہا۔ "ورشا! میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھے یہاں بیٹھنے دو۔"

ورشا نے کہا۔ "اس صوفے پر چھوٹی بڑی عمر کا حساب نہیں لکھا ہے۔ میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔"

ڈولی نے کہا۔ "یہ ورشا بڑی چالاک ہے۔ جس پر چاہتی ہے اپنا قبضہ جما کر بیٹھ جاتی ہے۔" پھر وہ مراد کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "ایمان! چلو تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

ٹینا نے مراد کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہ کسی کے پاس نہیں میرے پاس بیٹھیں گے۔"

ورشا اٹھ کر صوفے پر گھٹنے ٹیک کر مراد سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ "میں بھی دیکھتی ہوں، کس میں دم ہے۔ میرے ایمان کو کون یہاں سے لے جائے گا۔"

جگنی بائی یہ تماشا دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ بڑے پیار سے بڑی ممتا سے کہہ رہی تھی۔ "ان لڑکیوں کا بچپنا نہیں جاتا۔ جب دیکھو بچوں کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔"

ورشا تو پہلے لگ کر بیٹھی تھی۔ اب اچھی طرح لپٹ کر مراد کا دل دھڑکا رہی تھی اور ماں اسے بچی کہہ رہی تھی۔ پھر وہ بڑے پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "اے لڑکیو۔ بہت ہو چکا۔ چلو ہٹو اِدھر آ کر بیٹھو۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے دو۔"

ماں نے اٹھ کر انہیں کھینچ کر وہاں سے ہٹایا پھر ورشا کا کان پکڑ کر کہا۔ "چل چھوڑ ایمان کو۔ اُدھر جا، میں یہاں

بیٹھوں گی۔"

وہ بیٹی کو ہٹا کر مراد کے پاس بیٹھ گئی۔ یوں اس ماحول میں جو ہلچل پیدا ہوگئی تھی وہ ختم ہوگئی۔

وہ جگنی بائی سے بولا۔ "صرف آپ یہ راز جانتی ہیں کہ یہ عبداللہ کبڈّی نہیں ہے' مراد علی منگی ہے۔ ایم این اے دھرم داس بھی ہماری بہتری چاہتے ہیں۔ انہوں نے فون پر کہا ہے کہ وہ مراد کو کل قانون کے اعلیٰ محافظوں کے پاس لے جائیں گے۔ انہیں یقین دلائیں گے کہ یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بے چارہ سونامی سے تباہ و برباد ہوجانے والا ایک مظلوم بونا ہے۔"

کبڈّی نے کہا۔ "میں بیان دوں گا کہ پچھلے برس جو سونامی آیا تھا، اس میں میرا پورا خاندان نیست و نابود ہوگیا ہے۔ اس سمندری طوفان کے وقت میں ناگپور میں تھا۔ اس لیے ابھی زندہ سلامت نظر آرہا ہوں۔"

مراد نے کہا۔ "کوئی اس کے بیان کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ اس کے ماں باپ اور رشتے دار اور دوست یا دشمن سچ بولنے کے لیے اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

جگنی بائی نے کبڈّی سے کہا۔ "مراد! تم یہی بیان ابھی پریس کانفرنس میں دو گے۔ ہم عورتیں تمہاری تائید کریں گی اور بولیں گی کہ تم دنیا میں تنہا رہ گئے ہو۔ گھر گھر گھوم کر کھیل تماشے کرتے ہو۔ اچھا کماتے کھاتے ہو اور اب... گھنگرا پلٹن کی چھتر چھایا میں پناہ لینے آگئے ہو۔"

وہ سوچ سمجھ کر پلاننگ کر رہے تھے۔ یہ طے کر رہے تھے کہ انہیں دنیا والوں سے آئندہ کیا کہنا ہے اور کس طرح قانون کے محافظوں کا اعتماد حاصل کر کے جلد ہی یہاں سے پاکستان جانا ہے۔

مراد کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے چیست راؤ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں ہو تم؟ اپنی سم بدل دی ہے۔ مجھے یہ نیا نمبر دھرم داس نے دیا ہے۔"

مراد نے کہا۔ "سوری میں مصروفیات کے باعث نیا نمبر دینا بھول گیا تھا۔ یہ بتاؤ کیسے فون کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "مرینہ تم سے رابطہ کرنے کے لیے مچل رہی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے بے چین ہے کہ کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے آرہی ہے۔ یہاں دہلی شام چار بجے تک پہنچے گی۔"

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کیوں اسے تڑپا رہے ہو؟ بے چاری سے دو باتیں کرلو۔"

مراد نے کہا۔ "تم اسے بیچاری کہہ رہے ہو؟ پتا نہیں وہ کیسی آفت ڈھانے آرہی ہے۔ میں اپنے طور پر سمجھ رہا ہوں کہ وہ کیا سوچ کر آرہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟ بہرحال میں ابھی اس سے بات کروں گا۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ جگنی بائی نے پوچھا۔ "یہ کون بے چاری ہے جو آفت ڈھانے آرہی ہے؟"

کبڈّی نے کہا۔ "اس کا نام مرینہ ہے۔ یہ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے اور مجھ پر وار بھی کرتی ہے۔ میرے ذریعے پچاس لاکھ ڈالرز حاصل کرنے آرہی ہے۔"

وہ بولی۔ "تھو ہے اس پر۔ یہاں آتو جائے ہم عورتیں اس کا جینا حرام کردیں گی۔"

کبڈّی نے کہا۔ "نہیں اتی! میں اس عورت سے تنہا نمٹنا چاہتا ہوں۔ کسی ایسی جگہ اس سے ملنا چاہتا ہوں جہاں کسی کی مداخلت کے بغیر اس سے نمٹ سکوں۔"

"اس شہر کے باہر ہمارا ایک فارم ہاؤس ہے، وہاں تم اس بلا سے نمٹ سکو گے۔"

مراد نے خوش ہو کر کہا۔ "اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ آپ کا یہ بیٹا مراد کل ہی اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کردے گا یا ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کردے گا۔"

"وہ خطرناک بلا ہے تو اسے ختم ہی کردو۔"

"وہ بڑی عجیب بلا ہے۔ ابھی ہم فیصلہ کریں گے کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔"

مینا نے کہا۔ "ماتا جی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ دو گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔"

ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہاں چلو۔"

ڈولی نے کہا۔ "ہم سب ایک کار میں کیسے سمائیں گے؟ ہم چار ماں بیٹیاں ہیں اور یہ دو مرد ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ یہ مراد تم لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھے گا۔ میں پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر آؤں گا۔"

ورشا یہ سنتے ہی باہر چلی گئی۔ جب وہ سب باہر آئے تو انہوں نے دیکھا، وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ "میں کار میں تنگ ہو کر نہیں بیٹھوں گی۔ اس بائیک پر ہوا کھاتی ہوئی جاؤں گی۔"

مینا نے غصے سے کہا۔ "دیکھو ماتا جی! یہ کتنی چالاک ہے۔ ہم سے پہلے یہاں آکر بیٹھ گئی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "میں نے تم سب کو سمجھایا ہے جو چالاک ہوتے ہیں وہ بازی مار لیتے ہیں۔ باقی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔"

پھر وہ مراد سے بولی۔ "بیٹے! ہم چھوٹی سی گاڑی میں ایزی ہو کر بیٹھیں گے۔ تم ورشا کو اپنی بائیک پر لے چلو۔"

وہ جواب سنے بغیر کبڈّی اور دو بیٹیوں کے ساتھ کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ مراد نے پریشان ہو کر ورشا کو دیکھا۔ وہ جیسے بائیک پر نہیں اس کے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

وہ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایک بات تمہیں سمجھا دوں کہ میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔"

وہ بولی۔ "میں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ دوستی تو ہوتے ہوتے ہوجاتی ہے۔"

کار آگے چل پڑی تھی۔ اس نے کک مار کر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔ ایک کک اسے ماروں گا تو پیچھے لگ کر بیٹھنا بھول جائے گی۔ وہ بولا۔ "پلیز ذرا الگ ہو کر بیٹھو۔"

یہ کہہ کر اس نے بائیک آگے بڑھائی تو وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ گئی۔ "ہائے میں کیا کروں؟ تمہیں کس کے نہیں پکڑوں گی تو گر پڑوں گی۔"

اس نے تو اچھی طرح کس لیا تھا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور گر پڑو۔

بلائیں اسی طرح نازل ہوتی ہیں۔ بائیک تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ آگے دسمبر کی سرد ہوائیں تھیں۔ پیچھے جون جولائی کی گرمی تھی۔ عجیب موسم تھا۔

دو ظالم موسم بیک وقت حملہ کر رہے تھے۔ ورشا کے حسن کو اور اس کی صحت مندی کو متعارف کرا رہے تھے۔

وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ "یا اللہ! اس سے پہلے کہ میں ڈگمگاؤں' یہ گاڑی ڈگمگا جائے۔ مجھے یہ نظر آرہا ہے' کوئی حادثہ ہوگا تب ہی یہ الگ ہوگی۔"

اس کی دعا قبول ہوگئی۔ حادثہ تو نہیں ہوا۔ کچھ اور ہوگیا۔ آگے جانے والی کار رک گئی تھی۔ وہ خود نہیں رکی تھی۔ اسے دو گن مینوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

مراد ان سے کچھ دور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی روک کر ورشا سے کہا۔ "فوراً کسی دکان میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم دیکھ رہی ہو لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ابھی گولیاں چلنے والی ہیں۔"

وہ اپنے جیکٹ کوٹ سے ایک پستول نکالتے ہوئے بولی۔ "ماتا جی نے ہمیں بھاگنے اور چھپنے کی نہیں مقابلہ کرنے کی تربیت دی ہے۔"

مراد نے مسکرا کر اپنا ریوالور نکال لیا۔ ادھر دو گن مین کار کی اگلی دو کھڑکیوں پر آ کر جھک کر اندر دیکھ رہے تھے۔ جگنی بائی ڈرائیونگ سیٹ پر تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر عبداللہ کبڈّی تھا۔ پیچھے دو بہنیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

ایک گن مین نے کہا۔ "تم نے پریس کانفرنس بلائی ہے۔ کیا ارادہ ہے' اس بونے مراد کو قانونی طور پر سیکیورٹی دینے کی باتیں کرنے والی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔ کیا مجھے یہ نیک کام نہیں کرنا چاہیے؟"

"ضرور کرو۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا ہے کہ یہ بونا ہی اصلی مراد علی منگی ہے۔ پتا نہیں کس طرح بونا بن کر ہمیں الجھا رہا ہے۔"

کبڈّی نے کہا۔ "میں مراد کا ہم شکل ہو کر مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ میں باہر آرہا ہوں مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ میں نے زندگی میں کبھی بندوق نہیں پکڑی۔ مراد علی منگی کیسے بن جاؤں گا۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ گویا سپاہی میدان میں اتر آیا۔ ایک گن مین نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "ہماری گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں لے جا کر تمہاری اصلیت معلوم کریں گے۔"

اسی وقت فائرنگ کی آواز کے ساتھ گن مین کے حلق سے کراہ نکلی، اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔

مراد نہیں چاہتا تھا کہ کوئی قتل ہو۔ وہ انہیں زخمی کرنا چاہتا تھا۔ قانون کے رکھوالے آکر ان سے نمٹنے والے تھے۔ دوسرا گن مین کھلی جگہ سے بھاگ کر کہیں چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ کبڈّی نے اچھل کر اس کی ٹانگ پر ایک لات ماری تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اسی لمحے میں ورشا نے ایک گولی ٹھونک دی۔

لڑکیاں بڑی تیز تھیں۔ جگنی بائی نے اچھی ٹریننگ دی تھی۔ کار کے پچھلے حصے میں بیٹھی ہوئی مینا اور ڈولی دروازے کھول کر چھلانگیں لگاتی ہوئی دشمنوں کے پاس آگئیں۔ وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے دو چار ٹھوکریں ماریں تو وہ زمین پر ہی پڑے رہ گئے۔

پھر ہر طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگ رہا تھا کیونکہ گولیاں چلانے والے قابو میں آگئے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔

جگنی بائی کو سب ہی جانتے تھے۔ گشتی پولیس کے افسر نے پوچھا۔ "مائی! انہوں نے آپ پر اٹیک کیوں کیا تھا؟"

وہ بولی۔ "آپ انہیں لے جائیں۔ میری پریس کانفرنس کا وقت ہوگیا ہے۔ میں دو چار گھنٹے بعد تھانے آکر بیان دوں گی یا ہوسکے تو آپ پریس کانفرنس میں آجائیں۔"

سپاہی زخمی ہونے والے مجرموں کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالنے لگے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ جگنی بائی، مراد اور کبڑی اپنی گاڑیوں کی طرف آئے تو ورشا ٹھٹک گئی۔ ڈولی اس سے پہلے آکر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ''یک نہ شد دو شد۔ دل میں ہو رہی ہے گھد بد۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔''

ورشا نے پاؤں پٹختے ہوئے آکر کہا۔ ''ڈولی! ہٹو یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔''

ڈولی نے کہا۔ ''حکومت کرنے والے گدی چھوڑتے ہیں تو دوسری حکومت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ آئی چیلنج یو... تم مجھے یہاں سے ہلا نہیں سکو گی۔''

ماں نے اپنی کار کے پاس سے آواز دی۔ ''ورشا! یہاں آکر بیٹھو۔ تماشا نہ کرو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔''

ورشا نے حسرت سے مراد کو دیکھا۔ پھر غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی کار میں بیٹھنے چلی گئی۔ کار اور موٹر سائیکل کا قافلہ وہاں سے چل پڑا۔ مراد نے کک مار کر بڑی سہولت سے بڑے آرام سے بائیک آگے بڑھائی۔ پھر بھی وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ کر بولی۔ ''کیسی لگتی ہوں؟''

وہ مٹھائی سے کیا بولے کہ بہت میٹھی ہو۔ مقناطیس سے کیا بولے کہ کھینچ رہی ہو۔ ایسے لمحات میں تو بڑے بڑے پارسا اپنی توبہ توڑ دیتے ہیں۔ وہ بہت ہی ملائم اور رس بھری تھی۔ توبہ کرنے کے باوجود مراد کے ہوش اُڑ رہے تھے۔ جی میں آرہا تھا گاڑی کو کہیں ٹکرا ہی دے۔ تب ہی نجات ملے گی۔ ویسے ایمان کی بات ہے۔ خدا اگر بچاتا ہے تو پہلے اپنے بندوں کی پارسائی کو آزماتا بھی ہے۔ مرینہ، مونیکا، پریمتا، لیزا، ورشا اور اب ڈولی وہ ہر آزمائشی مرحلے سے پارسائی کا بھرم رکھتا آرہا تھا۔

آگے ٹریفک کا اتنا ہجوم تھا کہ جگنی بائی کی کار دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ ''وہ اس چوراہے سے دائیں گئے ہیں یا بائیں یا ہمیں سیدھا جانا ہوگا؟''

ڈولی نے کہا۔ ''بائیں طرف چلو۔''

وہ اُدھر چل پڑا۔ آگے گاڑیاں کم تھیں۔ راستہ صاف تھا لیکن ان کی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے رک کر کہا۔ ''وہ کدھر گئے ہیں؟''

ڈولی ہنستے ہوئے بولی۔ ''انہیں تو کانفرنس اٹینڈ کرنا تھی۔ ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔ دیکھو ہم ٹھیک پارک کے پاس آکر رکے ہیں۔ بڑا خوبصورت پارک ہے۔ کئی جگہ جھاڑیوں کے درمیان لو اسپاٹ بنائے گئے ہیں۔ بہت ہی رومانٹک جگہ ہے۔ وہاں کوئی روکتا ٹوکتا نہیں ہے۔ ہمیں بڑی آزادی ہوگی۔''

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ''تم بڑی وہ ہو۔ چلو اندر جاؤ۔ پارکنگ ایریا میں گاڑی کا ٹوکن لے کر آتا ہوں۔''

اس نے جواب سنے بغیر بائیک آگے بڑھائی۔ ڈولی کھڑی ہوئی تھی، ہاتھ ہلا کر بولی۔ ''پارکنگ اِدھر ہے اُدھر کہاں جا رہے ہو؟ سنو تو۔ ارے کہاں جا رہے ہو؟''

وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ مستی میں ڈوبے ہوئے شباب کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ تمام راستے بھرے بھرے بدن کا تعارف پیش کرتی آرہی تھی۔ وہ پھر بھی نہیں پگھلا تھا۔

مراد نے ایک جگہ موٹر سائیکل روکی پھر فون پر جگنی بائی سے کہا۔ ''آپ کی بیٹیاں بڑی شوخ اور چنچل ہیں۔ آپ نے ورشا کو دیکھا تھا۔ اس نے کیسے میری بائیک پر قبضہ جمایا تھا۔''

جگنی بائی ہنستے ہوئے بولی۔ ''نادان ہیں۔ ابھی ان کے ہنسنے کھیلنے کی عمر ہے۔''

''جی ہاں۔ ڈولی ہنستے کھیلتے ہوئے مجھے راستے سے بھٹکا کر ایک پارک میں لے گئی تھی۔ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی جبکہ مجھے کانفرنس اٹینڈ کرنی تھی۔''

''میں ابھی ڈولی کے کان پکڑتی ہوں۔ فون اسے دو۔''

''میں اسے پارک کے سامنے چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔''

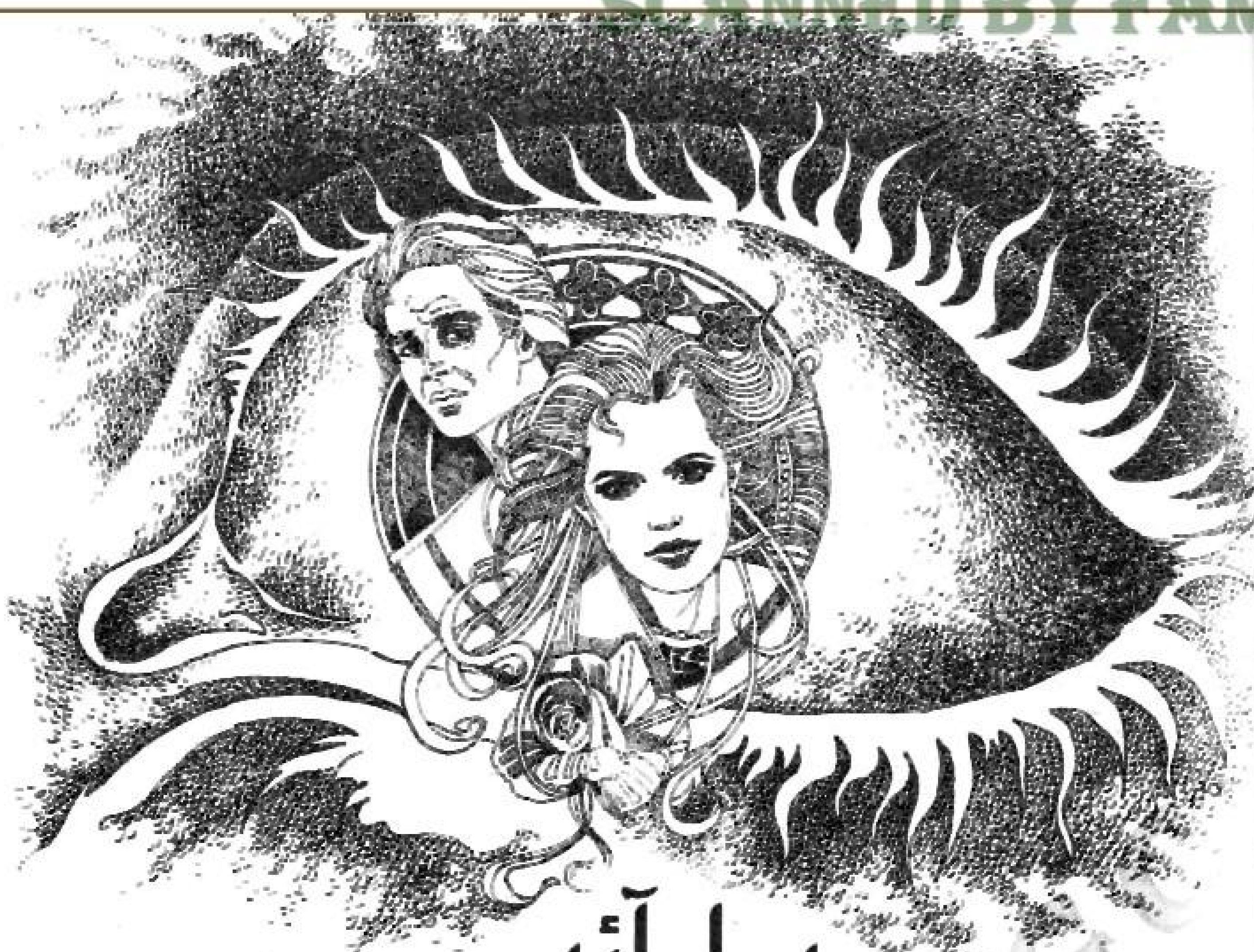
''یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ ابھی نادان ہے بچی ہے۔ ایسی سزا ملے گی تو عقل آئے گی۔''

''وہ بچی تو راستہ جانتی ہے۔ یہ بچہ نہیں جانتا۔ یہاں اندرا روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔''

''انتظار کرو۔ پریشان نہ ہونا۔ ابھی کسی کو بھیج رہی ہوں۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا۔''

وہ انتظار کرنے لگا۔ اس نے صبح کے بعد پھر ماروی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالات اتنی فرصت ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہاں فٹ پاتھ پر ٹریفک کے شور میں بات کرنا مناسب نہیں تھا لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسے یاد کرتے ہی رنگ ٹون بڑے پیار سے گنگنانے لگی۔

> حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
> سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان
> کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں



پہلے آئیے

منظر امام

عجب دستور ہے چاہے آپ حقدار ہوں یا نہیں، بس، پہلے آئیے، پہلے پائیے کے اصول کے مطابق مطلوبہ چیز آپ کے حصے میں آجاتی ہے۔ یہی غم اس کے لیے کسی ناسور سے کم نہ تھا جس کی آرزو میں وہ زندگی کے دن کم کر رہا تھا وہی کسی اور کی تمنا بن کر اس سے دور ہوگئی تھی فقط اسی عجب دستور کے مطابق۔

وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف عاشق کا اگلا سفر

آپ نے فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا۔

ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں لیکن ظالم سماج دیوار بن کر دونوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے پھر ہیرو دعا مانگنے کسی مزار پر پہنچ جاتا ہے۔ قوالی ہو رہی ہوتی ہے جو پانچ چھ منٹ تک جاری رہتی ہے۔ ہیرو اس دوران میں آنکھیں بند کیے کوئی دعا مانگ رہا ہے۔ قوالی ختم ہونے پر جب آنکھ کھولتا ہے تو ہیروئن سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔

اس قسم کے سین ہر فلم میں ہوا کرتے ہیں جب فلمی رائٹر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں کو کس طرح ملوایا جائے تو وہ قوالی اور مزار کا سہارا لیتا ہے۔

یہ ابتدائی جوانی کی بات ہے۔

میں ایک لڑکی کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بہت شوخ قسم کی لڑکی تھی لیکن تھی خوبصورت ویسے یہ

بھی ہر کہانی کا اپنا ایک خاص رنگ ہے کہ لوگ خوبصورت لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ نے کبھی کسی کہانی میں یہ نہیں پڑھا ہوگا کہ وہ بہت بدصورت لڑکی تھی اور میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔

بہرحال، میں جس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا، اس کا نام صفیہ تھا اور وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جس میں اس کے ماں باپ کے علاوہ چار عدد پہلوان قسم کے بھائی بھی تھے۔

اسی لیے یہ سوچنا فضول تھا کہ میں ہمت کر کے اس سے اپنی پسند کا اظہار کروں گا۔ البتہ دوسری قسم کے طریقے آزمائے جا سکتے تھے۔ جیسے کوئی وظیفہ پڑھ لیا یا اپنا ٹرم کی کوشش میں اپنی آنکھیں برباد کرلیں یا کسی پیر فقیر کی خوشامد شروع کردی کہ وہ محبت کے لیے راستے آسان کروادے یا آخر میں مایوس ہو کر کسی مزار پر پہنچ گئے۔

میرا ایک دوست تھا بابر علی۔ میں اس قسم کے الجھے ہوئے معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ میں نے بابر علی سے کہا۔ ”یار میں صفیہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”کون صفیہ؟“

”ارے وہی، زمان صاحب کی بیٹی جس کے چار عدد باڈی بلڈر بھائی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن اس سے تو میں بھی محبت کرنے لگا ہوں۔“ بابر نے بتایا۔

”تو پھر فیصلہ کرلو۔“

”ہاں کرلو فیصلہ۔“

یہ ہمارا ایک خاص طریقہ تھا۔ ہم بے شمار معاملات میں اس قسم کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعنی فرض کریں ہوٹل میں چائے ہی پینی ہے اب کون پلائے؟ اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا کہ ہم دونوں اپنے اپنے گھر سے قریبی ہوٹل تک کا فاصلہ قدموں سے ناپ لیا کرتے جس کا گھر پانچ قدم نزدیک ہوتا اسے چائے پلانی پڑتی تھی۔

اس معاملے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ میرا گھر اس لڑکی کے گھر سے سو قدم زیادہ قریب تھا بہ نسبت بابر علی کے گھر سے۔ اس لیے بڑی ایمانداری اور سچائی کے ساتھ فیصلہ ہو گیا کہ اس لڑکی سے محبت کرنے کا حق میرا ہے، بابر کا نہیں۔

چلیں حق تو مان لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح؟

تو بابر علی نے مزار پر جانے کی ترکیب بتائی۔ اس نے کہا تھا کہ ویسے تو کہانیوں وغیرہ میں مزار کو آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن چونکہ تمہارے پاس وقت نہیں ہوگا اس لیے مزار ہی سے آغاز کرو۔

اور ہم دونوں مزار پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے بابر علی سے کہا۔ ”دیکھو بھائی! ایسا نہ ہو کہ تم اپنے لیے دعا مانگنا شروع کردو ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔“

”نہیں یار جب میں پیچھے ہٹ گیا ہوں تو پھر کیوں مانگوں گا؟“

اور میں نے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دعا مانگنا شروع کردی۔ میرا خیال تھا کہ آنکھیں کھولنے کے بعد اس حسین چہرے کو دیکھنے کا موقع ملے گا لیکن جب اس کے بجائے مجاوروں کی صورت دکھائی دی تو میں بددل ہوگیا۔

”یار غم کیوں کرتا ہے؟“ بابر علی نے تسلی دی۔ ”اب اتنی جلدی تو دعا قبول نہیں ہوتی کچھ صبر تو کرنا پڑے گا۔“

بہرحال تین چار دنوں کے بعد اتنا ہوا کہ صفیہ نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا۔

لیکن پھر ایک ہفتہ اور گزر گیا جب کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے بابر علی سے پوچھا۔ ”یار کیا مسئلہ ہے وہ ابھی تک میری طرف راغب کیوں نہیں ہوئی حالانکہ میں نے بہت زبردست دعا مانگی تھی۔“

”پیارے! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ راغب ہوچکی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پریشان ہو کر بابر علی کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہاری طرف راغب ہوچکی ہے؟“

”میری ایسی قسمت کہاں؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ اپنے ٹیوٹر کی طرف راغب ہوچکی ہے۔“

”ٹیوٹر؟“

”ہاں تم نے شاید دھیان نہیں دیا ایک ٹیوٹر اسے پڑھانے کے لیے آتا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا وہ تو ٹیوٹر ہی ہوگا نا۔“

”یہی تو اصل کہانی ہے وہ صرف ٹیوٹر نہیں ہے بلکہ میں ان دونوں کو اس ایک ہفتے میں کئی بار باہر ملتے ہوئے بھی دیکھ چکا ہوں۔“

”یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”اس لیے نہیں بتایا کہ تمہارا دل ٹوٹ جاتا۔“

”تو اب کون سا سلامت رہ گیا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اچھا خاصا گھپلا ہوگیا ہے۔ دعائیں ہم مانگیں اور بہاریں غیر لوٹیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک بار پھر مزار پر جاؤں گا اور شکایت کروں گا کہ میرے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں ہوئی؟“

میں بابر علی کے ساتھ مزار پر پہنچ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے بہت شکوے کیے۔ ”جناب آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ میں نے اتنی دعائیں مانگیں اور آپ نے اس لڑکی کو محبت کسی اور سے کروادی۔ اب بھی وقت ہے اس لڑکی کا رخ میری طرف پھیر دیں ورنہ ایسی کہانیوں اور فلموں سے میرا اعتبار ختم ہوجائے گا۔“

جی بھر کر شکوہ کر لینے کے بعد مجھے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے بابر علی سے کہا۔ ”یار، جانے کیوں آج مجھے کچھ اطمینان سا ہوگیا ہے شاید میرا مسئلہ حل ہونے والا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو پیارے۔“

لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوا۔ پہلے تو ایک آدھ بار اس لڑکی نے مجھے مسکرا کر دیکھا بھی تھا لیکن اس شکوے کے بعد مسکرانا تو درکنار، اس نے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میری بے قراری تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ ٹیوٹر کون ہوتا ہے میری محبت کے راستے میں رکاوٹ بننے والا۔ میں نے ایک بار اس ٹیوٹر کو بھی دیکھ لیا۔ اچھا خاصا بانکا سا نوجوان تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مجھ سے بہتر تھا لیکن بہتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ میری محبت کو مجھ سے چھین کر لے جائے۔ میں اور بابر علی ایک دن سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ”یار اس ٹیوٹر کا کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ مت کرو۔ دونوں اپنی محبت میں آگے بڑھ چکے ہیں۔“ بابر علی نے کہا۔ ”اس لیے تم کچھ نہیں کرسکتے۔“

”لیکن یار میں نے جو مزار پر جا کر اتنی دعائیں مانگی ہیں ان کا کیا ہوگا؟“

”ہوسکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں خلوص نہ ہو۔“

”اب کیسا خلوص چاہیے۔ آنسو تک تو نکل آئے تھے۔“ میں نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔“ بابر علی کچھ سوچ کر بولا۔ ”تم ایسا کرو مزار پر ایک دیگ خیرات کردو اور جو لوگ کھانا کھانے آئیں ان سے کہنا کہ تمہارے حق میں دعا کریں تب بات بن جائے گی۔“

”مشورہ تو معقول ہے لیکن دیگ کتنے کی ہوگی؟“

”کم از کم تین سو کی۔“ بابر علی نے بتایا۔ (اس زمانے میں تین سو بہت ہوتے تھے)

”یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“

"بھائی تمہارا مسئلہ بھی تو ایسا ہے جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔" بابر علی نے بتایا۔

"چلو ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔"

بہرحال کسی نہ کسی طرح میں نے ایک دیگ غریبوں میں تقسیم کردی۔ دو چار نے تو بہت دل کھول کر دعائیں دی تھیں جن سے یہ امید ہوگئی تھی کہ شاید میرا کام بن جائے گا۔ وہ ظالم مہربان ہوجائے گی۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ ظالم مہربان ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہوتی چلی گئی۔ خوامخواہ بابا کے مزار پر جا کر میں خوار ہوتا رہا یا تو فلموں وغیرہ میں سب جھوٹ دکھاتے ہیں یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔

اس لڑکی کا اس ٹیوٹر کے ساتھ چکر چلتا رہا۔ دونوں کو خود میں نے کئی بار ایک ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس پر قربان ہوئے جارہی تھی۔ بابر علی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ "بھائی میرا مشورہ ہے کہ تم اب اسے بھول جاؤ۔ تم محبت کے معاملے میں زبردستی تو نہیں... کرسکتے۔"

"لیکن میں بابا کے مزار پر جا کر شکوہ ضرور کروں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ اتنی خوشامدوں کے باوجود مجھے کچھ نہ ملے۔"

"تمہاری مرضی۔ ہوسکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں خلوص شامل نہ رہا ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ میری دعا میں سوائے خلوص کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔"

بابر علی نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن میں پھر دوسرے دن مزار پر پہنچ ہی گیا۔ میں صبح کے وقت گیا تھا اس وقت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ مزار پر سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ مزار کے مجاور اور نگراں حضرات بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بہ آوازِ بلند بولنا شروع کردیا۔ "بابا! بہت پریشان اور مایوس ہو کر یہ شکوہ کر رہا ہوں۔ بابا! آپ لوگ تو اللہ کے بہت پیارے بندے تھے اسی لیے آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے میں نے آپ کے پاس صفیہ نام کی ایک لڑکی کے لیے دعا کی تھی جس کے باپ کا نام غیاث الدین ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اس لڑکی سے میری محبت کا بندوبست کروا دیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"بابا! میں نے ہزاروں فلموں میں ایسی صورت حال دیکھی ہے کہ دعا ختم نہیں ہوتی کہ محبوب سامنے آجاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہورہا؟ ایک بات اور بتادوں... کہ وہ لڑکی اپنے ٹیوٹر سے محبت کرنے لگی ہے جو اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دعا میں نے مانگی اور فائدہ کسی اور کو ہوجائے۔"

اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی ٹیوٹر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "تم!" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"تم آؤ میرے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

وہ مجھے قبر والے کمرے سے باہر لے آیا۔ احاطے میں اور بھی کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ وہ بڑی نفاست سے سجا ہوا کمرا تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ گیا مجھے حیرت ہورہی تھی۔ "میں نے تمہارا شکوہ تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تم کیا اسی کمرے میں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ میرا کمرا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور اس مزار کے جو نگراں اور متولی ہیں میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"لیکن تم تو ٹیوٹر ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک متولی کا بیٹا ٹیوٹر نہیں ہوسکتا!" اس نے کہا۔ "میں نے تمہارا شکوہ سن لیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ صفیہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"ظاہر ہے صاحب مزار سے تمہاری رشتے داری جو نکل آئی ہے۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو کس کا ساتھ دیں گے؟"

"یہ بات نہیں ہے بے وقوف۔ خود اندازہ کرلو، جب میں دن رات یہاں رہتا ہوں تو میں نے اس محبت کے لیے بہت پہلے سے دعا مانگی ہوگی۔ میری درخواست صاحب مزار کے پاس بہت پہلے پہنچی ہوگی۔"

اس کی یہ بات ایک لمحے میں سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہر جگہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، میں اٹھا اور دوسری سمت قدم بڑھا دیے...... اسی لیے شاید اللہ نے اس کائنات میں چاروں جانب رستے ہی رستے بنائے ہیں۔ چاہے جس جانب نکل جاؤ۔

امام ابوالعباس

ضیا تسنیم بلگرامی

زبانوں میں تاثیر اور دعاؤں میں اثر بلا جواز نہیں... اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے... اور جو لوگ ان ریاضتوں کو اپناتے ہیں گویا اپنا آرام تیج کر آزمائشوں سے بھرے رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی اولیائے کرام میں ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور جن کی رضا سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔

راہ حق کی عنایتوں اور کرامتوں کا قصہ



مصر کے مشہورِ زمانہ صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی علم کا سمندر تھے۔ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں میں ابوالعباس واحد وہ شخص تھے جنہیں شاذلی کے علم کا وارث قرار دیا گیا۔ شاذلی نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات محفوظ ہیں اور حفاظت کا یہ کام احمد ابوالعباس مرسی نے انجام دیا اور بعد میں انہیں سیدی امام احمد ابوالعباس کہا جانے لگا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے کسی نے سوال کیا۔

”حضرت! آپ زندگی بھر جو کچھ فرماتے رہے یا تعلیم دیتے رہے، اسے اگر تحریر بھی فرما جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اپنے پیچھے کتابیں نہیں چھوڑیں؟“
سوال کرنے والے نے عرض کیا۔ ”اگر آپ نے کتابیں تصنیف کی ہیں تو ان کا مجھے علم نہیں ہے اور میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں۔ براہِ کرم اپنی تصانیف سے مطلع فرمائیے تاکہ ان سے مسلسل اور مستقل فیض حاصل کیا جائے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں احمد ابوالعباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابوالعباس کے ذریعے ہی سمجھی جا سکیں گی۔“
شاذلی کی وفات کے بعد کسی مرید نے ابوالعباس سے پوچھا۔ ”ابوالعباس! پیرومرشد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جس طرح شیرنی کا بچہ شیرنی کی گود میں۔ آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟“
ابوالعباس نے جواب دیا۔ ”اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ طمانیت اور سکون سے رہتا ہے۔ اس کو حرص و طمع، شہرت و نمود اور دوسرے نفسانی مسائل ورغلاتے رہتے ہیں مگر اللہ اس ولی کی حفاظت کرتا ہے جس سے وہ ولی، اشرار دنیا سے محفوظ رہتا ہے بالکل شیرنی کی طرح جو اپنے بچے کو کسی بھی ورغلانے یا پھسلانے والے کے حوالے نہیں کرتی۔“
کسی دوسرے مرید نے پوچھا۔ ”جناب! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خود کو پہچانا۔ اس کا واضح مفہوم ارشاد فرمائیں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اس کی خواری اور عاجزی کے ساتھ پہچانا، اس نے اپنے رب کو اس کی عزت اور قدرت کے ساتھ پہچانا۔“
ان تشریحات نے حاضرین کو وجد میں مبتلا کر دیا اور ہر طرف سے سبحان اللہ، جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔
کسی اور نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایک سوال اور۔ حضرت شاذلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کسی ولی کی حقیقت کھول دی جائے تو وہ پوجا جانے لگتا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ولی کی پرستش جائز ہے یا یہ کلمہ کفر ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”یہاں پوجے جانے سے مراد پرستش کی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے لاتعبدوالشیطان (شیطان کو مت پوجو) اس کا واضح مطلب ہے کہ شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے وہ تم نہ مانو، یہی شیطان کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ ولی کی پرستش کا مطلب ہے اس کی پیروی کرنا، اس کی اتباع کرنا۔“
ابھی سوال و جواب میں عصر کا وقت آ گیا۔ نماز کی صفیں قائم ہوئیں اور ابوالعباس کو امامت کے لیے کھڑا کیا گیا۔ جب وہ نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے مقتدیوں نے کسی ارادے کے بغیر ہی دیکھا کہ ابوالعباس کا جسم نور سے بھر گیا اور ان پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔
نماز کے بعد لوگوں نے دبی زبان میں استفسار کیا۔ ”حضرت! یہ نور کیسا تھا جس میں آپ کا وجود چھپ گیا تھا اور وہ بارش کیسی تھی جو آپ پر ہو رہی تھی...... بالکل پھوار کی طرح؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم لوگ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو تو سنو، وہ نور جس میں، میں چھپ گیا تھا اور وہ بارش جو پھوار کی طرح مجھ پر ہو رہی تھی، شرح و تفسیر اور معانی و مطالب کی تھی۔ اگر ان کی تجسیم کی جائے تو میرے عزیزو! ان کی شکل یا تو نور کی طرح ہو گی یا پھر بارش یا پھوار کی طرح۔“
لوگوں نے متفقہ طور پر شاذلی کے اس قول کی تائید کی کہ میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں ابوالعباس میری مستقل، جامع اور مشرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابوالعباس کے ذریعے سمجھی جا سکیں گی۔
ایک دن فجر کے بعد لوگوں نے آپ کے آس پاس ہجوم کیا اور سوالات کی بھرمار کر دی۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیتے دیتے نڈھال ہو گئے۔ عین اس وقت جب آپ اٹھنے والے تھے، ایک شخص ہانپتا کانپتا مجلس میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔
آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ”ذرا اس شخص کو تو بلاؤ۔“
ایک مرید نے اس شخص کو شانے سے پکڑ لیا اور عرض کیا۔ ”بھائی! تجھے ابوالعباس یاد فرماتے ہیں، ذرا زحمت کر۔“
وہ شخص آپ کے پاس آ کھڑا ہوا۔ آپ نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ”اے شخص بتا، میں تیرا راز اپنا راز سمجھوں گا۔ خدا تجھ پر رحم کرے۔ آج تو نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس میں زنا کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ آخر کیا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو مکاشفے میں کیا نظر آیا؟ حالانکہ میں اتنی سی بات کا گنہگار ہوں کہ آج جب میں دربار شاہی سے آ رہا تھا تو میں نے ایک موڑ پر بڑی حسین عورت دیکھی۔ اس کا گدرایا ہوا شباب اور جسم اور لباس سے ابلتے ہوئے جوش اور مستی مجھے دعوتِ عصیاں دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے بے اختیار خواہش کی اے کاش یہ مجھے مل جاتی اور میں اس کو تصرف میں لا سکتا۔ پیرومرشد! اگر آپ اس کو بدکاری تصور فرماتے ہیں تو میں واقعی گناہ گار ہوں۔“
ابوالعباس نے تنبیہ کی۔ ”اول تو اپنی نظریں نیچی رکھا کر اور جب تجھ کو اپنے آپ پر اتنا اختیار ہو جائے کہ خیالات اور تصورات بھی تیرے تابع ہو جائیں، اس وقت سر اٹھا کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔“
کسی مرید نے آپ کو یوں سرگوشی میں باتیں کرتے جو دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ”معلوم نہیں ابوالعباس اس شخص کو کیا سمجھا رہے ہیں۔ اگر کوئی اچھی بات بتا رہے ہیں تو اس اچھی بات سے دوسروں کو بھی آشنا کرنا چاہیے اور اگر کوئی بری بات کر رہے ہیں تو بری بات ان کو زیب نہیں دیتی۔“
آپ نے اس مرید کو آواز دی۔ ”اے معترض! ذرا میرے پاس تو آ۔“
وہ شخص آپ کے قریب چلا گیا۔ آپ نے کہا۔ ”اے شخص! خدا جستجو پسند نہیں کرتا۔ اگر میں دوسروں کے راز کھولنا شروع کر دوں تو اس مجلس کے کتنے ہی چہرے شرم اور ندامت سے جھک جائیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ خدا ستار العیوب ہے۔ خدا نے اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی رکھ دی ہے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”پیرومرشد! میں اپنی بات پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا معاف کروں گا، معاف کرنے والا تو اللہ ہے، اس سے معافی مانگ۔“
اس شخص کے ہاتھ میں بڑی سی پوٹلی تھی۔ اسے آپ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”حضرت! اس وقت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو چند مزے مزے کی چیزیں کھلاؤں۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور میرا دل رکھنے کے لیے میرے سامنے ہی اس کو تناول فرمالیں۔“
آپ نے پوٹلی کھلوائی تو اس میں سے کباب، گوشت، روٹیاں اور کھجوریں نکلیں۔ آپ نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قریب موجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب تماشا دیکھا۔ ابوالعباس کی پانچوں انگلیاں پھڑکنے لگیں۔ بالکل ایسا لگا گویا انگلیوں کی ساری رگیں متحرک ہو گئی ہیں۔
آپ نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا اور کھانے سے پہلے میں تجھ سے چند سوال کروں گا۔ تو ان کے صحیح صحیح جواب دے گا کیونکہ سچ جوابوں میں ہی تیری نجات ہے ورنہ میں تجھ سے دست کشی اختیار کر لوں گا۔“
اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری یہ مجال کہ میں آپ سے غلط بیانی کروں۔ میں اگر جھوٹ بول بھی دوں گا تو آپ اس جھوٹ کا اپنے کشف سے پتا چلالیں گے۔ اس لیے جھوٹ کا فائدہ؟ آپ جو چاہیں پوچھیں، اللہ نے چاہا تو میں سچ ہی بولوں گا۔“
آپ نے پوچھا۔ ”سچ بتا، کیا یہ کھانا تیرے گھر کا ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! سچ بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے میری دعوت کی تھی۔ میں دعوت میں گیا لیکن کھانا نہیں کھایا اور وہ کھانا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اب آپ تناول فرمائیں گے تو مجھے خوشی ہو گی۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اپنا یہ کھانا واپس لے جا کیونکہ درویش مشتبہ کھانا نہیں کھا سکتے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! مشتبہ کھانا کیسا؟ یہ بالکل سچ ہے۔ میں آپ کو کھانے کی پاکیزگی کا یقین کس طرح دلاؤں؟“
آپ نے فرمایا۔ ”اگر تو اس پر مصر ہے کہ میں تیرے میزبان کی قلعی کھول دوں تو سن، تیرا میزبان شراب کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کاروبار کی کمائی مجھ پر اور میرے بیٹوں پر حرام ہے لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے سعادت مند اور صالح مرید ہی میری اولاد ہیں۔“
اس شخص نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”حضرت! مجھے تو بس یہ بات بتائیے کہ آپ نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ کھانا مشتبہ ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو تو نے میرے ہاتھ اور انگلیوں میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی؟“
مرید نے کہا۔ ”جی ہاں، میں نے آپ کے ہاتھ، انگلیاں اور ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم اور کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تجھ کو معلوم نہیں کہ مشہور صوفی حضرت محاسبی کی کسی انگلی میں ایک ایسی رگ تھی جو انہیں مشتبہ کھانے سے پھڑک کر باز رکھا کرتی تھی لیکن میری انگلیوں میں ساتھ ایسی رگیں ہیں جو مشتبہ کھانے کو اپنے قریب دیکھ کر بے اختیار پھڑکنے لگتی ہیں۔“

وہ شخص اتنا خوف زدہ ہوا کہ کانپنے لگا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”حضرت! مجھ کو معاف فرما دیں کیونکہ میں نے یہ مشتبہ کھانا قصداً آپ کے سامنے رکھا تھا۔ اس طرح میں آپ کی بزرگی اور روحانیت کا امتحان لے رہا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سبحان اللہ، جس کی خدا خود حفاظت کر رہا ہو، اس کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور خبردار جو تو نے کسی دل جلے کا امتحان لیا کیونکہ اگر اس نے تجھ کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا تو معلوم نہیں تیرا کیا حشر ہوگا۔“

اس کے بعد آپ نے وفورِ جوش میں اپنی ڈاڑھی پکڑلی اور فرمایا۔ ”اگر علمائے عراق اور شام کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان بالوں کے پیچھے موجود شخص میں عظمت اور بزرگی کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا ہے تو وہ میری زیارت کو حاضر ہوں اور یہ حاضری بھی منہ کے بل دی جائے۔“

آپ کا قیام قاہرہ میں ہی تھا لیکن لوگوں نے آپ کو اکثر اسکندریہ میں دیکھا، اسکندریہ میں ان کے پیر ابوالحسن شاذلی رہتے تھے۔ ان کی مجلس میں شریک ہوتے، وعظ سنتے اور ختم وعظ پر قاہرہ واپس چلے جاتے۔ شاذلی کی وفات کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس کمال کا دوسروں سے ذکر کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد جب یہ شہرہ ہوا کہ آپ مکاشفے سے دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں تو آپ کے ایک منکر کو بہت ہنسی آئی۔

اس نے کہا۔ ”یہ شعبدہ باز بھی کتنے غضب کے ہوتے ہیں، کیسے کیسے کرشمے دکھا کر ایک زمانے کو اپنا قائل اور معتقد بنا لیتے ہیں لیکن مجھ کو آج تک کوئی بھی متاثر نہیں کر سکا۔“ اس نے اسکندریہ کے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ ابوالعباس کو قاہرہ سے طلب کرے اور ان سے کرامتوں کا مطالبہ کرے۔

امیر نے اسی وقت ایک فرمان جاری کر دیا اور حکم دیا۔ ”ابوالعباس! تم میرا فرمان وصول کرتے ہی اسکندریہ آجاؤ، ورنہ میں تمہیں زبردستی بھی بلوا سکتا ہوں۔“

آپ نے یہ مختصر فرمان پڑھا اور نامہ بر کو زبانی جواب دے دیا۔ ”امیر سے کہہ دینا کہ ابوالعباس کہتا ہے تو، تو صرف اسکندریہ کا امیر ہے اور میں جس امیر کا تابع ہوں، وہاں اسکندریہ کا امیر میرے امیر کے دربانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ اس لیے افسوس! میں اسکندریہ نہیں آؤں گا۔“

حاکمِ اسکندریہ کو جب یہ جواب ملا تو وہ بہت تلملایا لیکن موقع و مصلحت دیکھ کر اس نے فوراً ہی ایک دوسرا خط لکھ دیا۔ یہ خط نرم زبان میں لکھا گیا تھا اور پورے خط کا انداز فدویانہ اور عاجزانہ تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

”پیرومرشد! مجھے احساس ہے کہ میری جانب سے آپ کو جو پہلا خط روانہ ہوا تھا، اس کا لب و لہجہ سخت تھا لیکن اب میں شرمندہ ہوں اور آپ سے اپنی پچھلی تقصیر کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسکندریہ تشریف لے آئیں تاکہ آپ کی زیارت کر لوں گا اور آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ میں نے آپ کو غائبانہ اپنا پیر مان لیا ہے، اب آپ بھی مجھ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیں۔“

آپ نے خط پڑھا اور نامہ بر سے کہا۔ ”اگر تیرا حافظہ درست ہے تو میرا جواب امیر تک پہنچا دینا۔ یونان کا بادشاہ جب مصر آیا تھا تو موجودہ شہر اسکندریہ میں اترا تھا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام اسکندریہ پڑ گیا۔ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ سکندر نے اپنے ہم عصر بے غرض اور قانع فلسفی دیوجانس سے ایک بار کہا تھا کہ دیوجانس! میرا فیض عام ہے اور میں نے بخشش اور انعام سے لوگوں کو مالا مال کر دیا ہے اگر تو بھی کبھی آ جائے اور اپنی خواہش کا اظہار کرے تو میں تجھ کو مالا کر دوں گا۔

سکندر کی پوری بات سن کر دیوجانس نے جواب دیا تھا۔ ”سکندر! میرا ایک غلام ہے، میں نے اس کو محکوم کر لیا ہے لیکن اسی غلام نے تجھ کو اپنا غلام بنا لیا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کچھ کیا مانگوں، مجھ کو مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔“

”چنانچہ اے قاصد! اپنے امیر سے کہہ دینا کہ حرص و طمع اور شہوت کو میں نے اپنا غلام بنا لیا ہے لیکن اس غلام نے اسکندریہ کے امیر کو اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں تعلق پیدا کروں اور اس کے پاس کیوں پہنچوں۔ اور اپنے امیر سے سختی سے کہہ دینا کہ مجھ جیسے آدمی سے دل لگی نہیں کیا کرتے۔ ہم دونوں کبھی بھی یک جا نہ ہوں گے۔“

نامہ بر زبانی جواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد امیر نے بڑی کوشش کی کہ خود قاہرہ جائے اور آپ سے ملاقات کرے لیکن وہ ناکام رہا اور ملاقات کی خواہش لیے ہوئے اس دنیا ہی سے کوچ کر گیا۔

امیر کے دوست نے اس پورے واقعے سے عبرت پکڑی مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ ابوالعباس بنتے زیادہ ہیں، اتنے ہیں نہیں جتنا ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے انہیں مشہور کر رکھا ہے۔ اس کے دل میں آپ کو دیکھنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ وہ اسکندریہ سے قاہرہ پہنچا اور آپ کی مجلس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ وعظ فرماتے رہے۔ آپ نے دوران وعظ فرمایا۔

”لوگو! سوظنی اچھی بات نہیں ہے۔ جب تک تم خود کسی شخص کے بارے میں ذاتی طور پر تصدیق یا تردید نہ کر لو اس کے متعلق غلط مت سوچو۔“

اس اجنبی کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کے لیے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے۔

”اتفاق سے اس مجلس میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے اسکندریہ کے امیر کو ورغلا کر مجھ سے لڑا دینا چاہا تھا۔ جو میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ فقراء کے منصب میں امرا کی دربارداری شامل نہیں ہے لیکن اس شخص نے امیرِ اسکندریہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھ پر بہ جبر اپنے دربار میں طلب کر کے میرا امتحان لے۔ میں کچھ ہوں یا نہیں اس سے اس شخص یا اسکندریہ کے امیر کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچتا تھا اور نہ نقصان مگر یہ دونوں پھر بھی درپے آزار تھے۔“

اب یہ شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! آپ اپنی تقریر میں جس شخص کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ میں ہی ہوں۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔“ پھر حاضرینِ مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”لوگو! میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ شخص تو خدائی دریا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے ربانی مدد کے فیض سے کہتا ہے۔ آج میں توبہ کر کے آپ کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں اور اس طرح شامل ہو رہا ہوں کہ اب یہاں سے کہیں اور جانے کا میں خیال تک نہ لاؤں گا۔“

آپ کسی ضرورت سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں اسکندریہ سے پہلے جس شہر میں قیام کیا، اس کے امیر نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں امراء سے نہیں ملتا۔

امیر نے کہلوایا۔ ”جناب! میں آپ کا مداح ہوں اور آپ سے ملاقات کی دیرینہ خواہش رکھتا ہوں۔“

آپ نے جواب میں کہلا دیا۔ ”وہ میرا مداح ہے لیکن میں اس کا مداح نہیں ہوں۔ پھر وہ کیسا مداح ہے کہ خود تو قاہرہ میرے پاس پہنچا نہیں اور میں اس کے شہر سے گزر نے لگا تو میرا مداح بن گیا اور ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا۔“

امیر کے قاصد نے کہا۔ ”حضرت! صبح فجر کے بعد امیر نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”آئے لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا کیونکہ فقراء کو امراء کی صحبتیں راس نہیں آتیں۔“

قاصد چلا گیا اور صبح امیر اپنے مصاحبین کے ساتھ جب آپ سے ملنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ فجر سے پہلے ہی اسکندریہ چلے گئے۔ امیر بہت مایوس ہوا اور مصاحبین سے کہا۔ ”یہ فقراء بھی عجیب لوگ ہیں جو امراء سے خواہ مخواہ بدظن رہتے ہیں۔“

☆☆☆

ایک دن آپ نے پرہیزگاری، ہمت اور استغنا پر تقریر کی۔ پوری مجلس وجد میں آگئی اور لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ وعظ کے بعد آپ کو اپنے ایک ارادت مند کے پاس جانا پڑ گیا۔ ارادت مند نے آپ کی دعوت کی تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا آنکلا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کو اس پر رحم آگیا۔ آپ نے صاحبِ خانہ سے کہا۔ ”ایک روٹی لاؤ تاکہ میں اس کتے کو بھی دعوت میں شریک کر لوں۔“

صاحب خانہ نے آپ کے سامنے کئی روٹیاں لا کر رکھ دیں۔ آپ نے اس میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں، یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آپ یہ سمجھے کہ شاید کتے کی نظر روٹی پر پڑی نہیں ہے ورنہ ضرور کھاتا۔ روٹی کو اٹھا کر کتے کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے روٹی پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

آپ نے کتے سے کہا۔ ”یہ روٹی میں نے تیرے لیے ڈالی ہے، کھاتا کیوں نہیں؟“

کتے نے آپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے روٹی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی اور کہا۔ ”یہ روٹی میں اپنے ہاتھ سے تجھ کو کھلا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ تو شکم سیر ہو کر کھالے تاکہ میں تیری شکم سیری سے مسرت حاصل کر سکوں۔“

کتے نے روٹی کی طرف دیکھا اور کھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔

آپ کو کتے کی حرکت ناگوار گزری اور کہا۔ ”کیوں کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ خدا نے تجھے رزق بھیجا ہے تو اس کو کھالے۔ تیرے انکار کی وجہ میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔“

ابھی ان کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ انہوں نے محسوس کیا گویا کوئی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ ”اے ابوالعباس! تو نے آج جس پرہیز گاری، ہمت اور استغنا پر گھنٹوں وعظ کیا ہے افسوس کہ جب تیرے سامنے اس کی کوئی عملی شکل آئی تو تو محض نابلد نظر آنے لگتا ہے۔“

آپ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا۔ ”اے ابوالعباس! لعنت ہے تجھ پر کہ کتا تجھ سے زیادہ پرہیز گار نکلا۔“ اس کے بعد آپ بے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد آپ نے خلوت نشینی اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں پریشانی تھی کہ آخر ابوالعباس کو ہو کیا گیا ہے کہ ملنا جلنا اور بولنا ہی ترک کر دیا ہے۔

آخر ایک مرید نے آپ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ آپ نے اس کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر پہنچ کر یہ محسوس کیا کہ آپ ذرا دیر پہلے شاید رو رہے تھے۔ مرید نے پوچھا۔

”حضرت! آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”بحمد للہ، ٹھیک ہوں۔“

مرید نے کہا۔ ”حضرت! کیا ابھی ابھی اس ناچیز کی آمد سے پہلے آپ غمگین تھے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟“

مرید نے عرض کیا۔ ”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ آنکھوں کے نیچے غمگینی کے سیاہ حلقے اور نمی کو بہ آسانی دیکھ اور محسوس کر لیتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس دنیا میں خوش کون ہے؟ صرف وہ شخص جو اچھے برے کی تمیز نہیں کر سکتا۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”حضور! آپ نے چند دنوں سے جو روش اختیار کر رکھی ہے، اس سے مریدوں کو بڑی فکر لاحق ہو گئی ہے اور وہ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے بے چین ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ لن ترانیوں سے باز آجاؤں گا کیونکہ خاموشی میں عظمت ہے۔“

مرید نے کہا۔ ”آپ کس چیز کو لن ترانی فرما رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”وہ سب لن ترانی میں شمار ہوگا جو زبان سے تو نکل جائے مگر خود اس کے معیار پر پورا نہ اترے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں نے جن باتوں کی تلقین کی ہے، میں خود ان پر پورا نہیں اترتا تھا۔“

مرید نے کہا۔ ”یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بات جانتا ہوں، وہ یہ کہ آپ اگر یوں خلوت نشین رہے اور اپنے عاشقوں اور ارادت مندوں کو اپنے دیدار اور کلام سے محروم رکھا تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کی خلوت میں زبردستی داخل ہو جانے کی گستاخی کر بیٹھیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو باہر جا کر شائقین سے کہہ دے کہ میں نے اپنے رب کے ایما پر خلوت نشینی اور سکوت اختیار کیا ہے۔ اب جب وہی یہ حکم دے گا کہ میں باہر نکلوں اور لوگوں سے کلام کروں تو باہر آجاؤں گا۔“

مرید نے ضد سے کام لیا۔ ”حضرت! بحث و تکرار سے آپ کی سمع خراشی تو ضرور ہوگی لیکن میں اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے اطمینان کے لیے یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کو اپنے رب کے ایما کا علم کیونکر ہوا؟“

آپ نے کتے والا واقعہ سنا کر فرمایا۔ ”اس دن میں نے پرہیز گاری، ہمت اور استغنا پر جو کچھ کہا تھا، بعد میں مجھ کو یہ بتایا گیا کہ میں اپنے وعظ میں جو لاف گزاف مارتا رہا ہوں اور جو لن ترانیاں ہانکی ہیں، ان کے اصل مفہوم سے ایک کتا مجھ سے زیادہ واقف ہے مجھ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ چنانچہ اب میں اتنا خوف زدہ ہو چکا ہوں کہ باہر نکلنے اور بات کرنے کی ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”لیکن آپ کے مرید آپ کی یہ باتیں نہیں مانیں گے اور آپ کو اس حجرے سے باہر نکلنا اور لوگوں سے کلام کرنا پڑے گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ دیا کہ میں اپنے رب کے حکم پر ہی نکلوں گا اور کلام کروں گا تم لوگ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ مجھ کو معاف کر دے اور مجھ کو میرے کلام کے مطابق بنا دے۔“

مرید باہر آ گیا اور اپنی گفتگو سے سب کو مطلع کر دیا۔ لوگ بہت آزردہ ہوئے اور بہتوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ آپ باہر نکل کر شرف کلامی نہیں بخشیں گے۔

اس بات کو ہفتوں گزر گئے۔ آپ اپنے حجرے میں معتکف رہے۔ لوگوں کو یہ انتظار تھا کہ آخر یہ تعطل دور کس طرح ہوگا۔ آخر ایک دن حجرے میں آپ نے ایک روشنی سی محسوس کی۔ آپ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور غشی کے عالم میں آپ نے سنا کوئی کہہ رہا ہے۔

”اے ابوالعباس! تجھ کو اس بات کا اتنا اثر نہیں لینا چاہیے تھا۔“

انہوں نے کہا۔ ”میں شرمندہ اور نادم ہوں اے میرے رب! مجھ کو باہر نکلتے اور لوگوں سے کلام کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گا اور لوگوں کو تعلیم و تلقین کس طرح کروں گا؟“

آواز آئی۔ ”تجھ کو جو علم دیا گیا ہے اور جو طاقتیں ملی ہیں، ان کی نشر و اشاعت بھی تجھ کو سونپی گئی ہے۔ تو حجرے سے باہر نکل اور حسب سابق اپنا کام شروع کر دے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے میرے رب! میں اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری استدعا ہے کہ مجھ کو میرے کلام کے مطابق اعمال رکھنے کی توفیق بھی مرحمت ہو اور آئندہ کی پشیمانیوں سے محفوظ رکھ۔“

اس بار انہیں سختی سے حکم دیا گیا۔ ”اے ابوالعباس! اب زیادہ قیل و قال نہ کر اور باہر نکل کر تشنگانِ علم کی پیاس بجھا ورنہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے تجھے جو کچھ دیا گیا ہے اس کو چھین لیا جائے کیونکہ جو تجھ کو بخشا جا سکتا ہے وہ سلب بھی کیا جا سکتا ہے۔“

آپ کو ایک جھٹکا سا لگا اور آپ ہوش میں آ گئے۔ اسی وقت حجرے سے باہر نکلے اور لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! میں تم میں دوبارہ آ گیا ہوں اور اسی طرح تم میں اٹھوں بیٹھوں گا اور کلام کرتا رہوں گا جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔“

لوگوں نے خوشی میں نعرے لگائے اور احتراماً کھڑے ہو گئے، ہر ایک کے چہرے سے یہی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ روز عید ہے اور وہ سب مل جل کر عید کی خوشیاں منا رہے ہیں۔

☆☆☆

آپ کے پاس ایک اجنبی شخص آیا۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور نہایت دلچسپی اور محبت سے کہا۔ ”آ بھائی بیٹھ جا بول، کیسے آنا ہوا؟“

اس شخص نے کہا۔ ”بعض خیالات مجھ کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں ایک پیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ذرا دیر بیٹھ جا۔ ابھی تیری بات سنتے ہیں۔ مجھ میں اتنا یارا کہاں تھا کہ صبر کر کے بیٹھ جاتا، چنانچہ میں آپ کے پاس آ گیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کچھ لوگوں کو مظاہر میں گم دیکھا ہے اور ان کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کیے خفا میں گم ہیں، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان میں بزرگ اور برتر کون ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! جو ظہور کو دوست رکھتا ہے وہ ظہور کا بندہ ہے اور جو خفا کو دوست رکھتا ہے، وہ خفا کا بندہ ہے لیکن جو خدا کا بندہ ہے اس کے لیے ظہور اور خفا دونوں ہی برابر ہیں۔“

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ”حضرت! مجھ کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اس ڈر کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! تو یہ بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھا لے کہ جس کی اللہ سے دوستی ہوگی، وہ موت سے ہرگز نہیں ڈرے گا لیکن جو جتنا دور ہوگا، وہ موت سے اتنا ہی خوف زدہ ہوگا چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس طرح خود کو کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، پتا چل جائے گا کہ اپنے دعوے میں وہ کتنا سچا ہے یا کتنا جھوٹا ہے۔“

وہ شخص مطمئن اور آسودہ سا ہو گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔ ”اب میں اس در کا ہو گیا کیونکہ آسودگی اسی در سے ملتی ہے۔“

جب وہ چلا گیا تو ایک مرید نے کہا۔ ”حضرت! یوں تو ہر روز آپ کے پاس کوئی نہ کوئی اجنبی آتے جاتے ہیں لیکن آپ ان پر

اتنی جلدی توجہ نہیں فرماتے جس طرح آج اس شخص پر فرمائی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں، اس کا ایک خاص سبب تھا، یہ شخص پہلے ایک دوسرے پیر کے پاس گیا تھا۔ اس پیر نے اس سے کہہ دیا کہ چند گھنٹے انتظار کر، اس کے بعد تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔ یہ شخص جس کرب اور بے چینی کا شکار تھا، اس میں چند گھنٹے انتظار کا یارا نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس کی طرف فوراً ہی متوجہ ہو جانا پڑا۔"

ایک شخص نے دبی آواز میں کہا۔ "حضرت! اس طرح تو اس پہلے پیر کی مذمت ہو گئی جس کے پاس یہ اجنبی شخص آیا تھا اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دوسروں سے افضل اور برتر ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے جو بات کہی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو طمانیت اور آسودگی جہاں سے بھی ملے، حاصل کر لے۔ تم لوگ میری صحبت میں ہو اور یہیں رہو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تمہیں کوئی اور میٹھے پانی کا چشمہ میسر آ جائے تو وہاں نہ جاؤ۔ تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔"

ایک دن ایک مرید آپ کے لیے کھانا لایا۔ وہ کھانے کو اس طرح چھپا کر لایا تھا کہ دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔

کافی رات گئے جب لوگ چلے گئے تو یہ بیٹھا رہ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ "تیرا کوئی کام ہے مجھ سے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تو، میں تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ آپ کے لیے جو کچھ لایا ہوں، لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ کی خدمت میں ادب سے پیش کروں۔"

آپ نے پوچھا۔ "تو کیا لایا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ کھانا ہے جو میں آپ کو کھلا کر واپس جاؤں گا۔"

آپ نے ناگواری سے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتا کہ تو کھانا چھپا کر کیوں لایا؟"

اس نے جواب دیا۔ "بس یونہی، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہوں۔"

آپ نے افسوس کیا۔ "تو نے بہت برا کیا۔ تیرے خیالات فاسدانہ ہیں اور میں ایسا کھانا کسی حال میں نہیں کھاؤں گا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو۔"

اس شخص نے بڑی کوشش کی کہ آپ کھانا کھائیں لیکن آپ نے نہیں کھایا، کھانا واپس کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک دوسرے شخص نے سب کے سامنے اعلان کیا۔ "حضرت کے لیے آج میں کھانا لاؤں گا۔"

آپ نے اس شخص کو منع فرمایا۔ "تو یہ کیسا مہمل اور بے ہودہ اعلان کر رہا ہے۔"

اعلان کرنے والے نے کہا۔ "حضرت! اس میں بے ہودگی کیسی؟ میں واقعی کھانا لاؤں گا، میں جھوٹا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "جس طرح میں وہ کھانا نہیں کھاتا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو، اسی طرح میں وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا جس کا اس طرح اعلان کیا گیا ہو۔"

اس شخص نے بڑی منت سماجت کی لیکن آپ نہیں مانے اور وہ کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک ایسا شخص آپ کے پاس آیا جس کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اس کی آمد کا ایسا شہرہ ہوا کہ آپ کے مریدوں میں بس یہی چرچا ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے لیکن وہ شخص آیا اور آپ کے انتظار میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں نے خبر دی اور کہا۔ "حضرت! یہ پرہیزگار شخص آپ سے ملاقات کا متمنی ہے لیکن آپ اس سے معلوم نہیں مل کیوں نہیں رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں مل لوں گا، جلدی کس بات کی ہے؟"

کسی نے کہا۔ "وہ شخص واپس جانا چاہتا ہے۔"

آپ اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی لیکن دوسروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی کہ آپ اس عالم اور زاہد سے تپاک اور جوش سے نہیں مل رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ عالم تھا کہ وہ شخص اگر کوئی بات کرتا تھا تو آپ اس کا مختصر جواب دے دیتے تھے، اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہ کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عالم چلا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ "افسوس کہ اگر اس شخص کے دل میں اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا غرور نہ ہوتا تو میں اس سے اس طرح ملتا کہ اس

کی دوسری کوئی مثال نہ ملتی مگر اس کے مغرور دل نے مجھ کو اس سے دور ہی دور رکھا۔"

مریدوں کو جو اس کا علم ہوا تو اس عالم کے پاس گئے کہ اس کا تاثر معلوم کریں۔ اس عالم نے آپ کے مریدوں کو دیکھتے ہی ان کا مذاق اڑایا، کہا۔ "افسوس کہ میں نے تو ابو العباس کا بڑا نام سنا تھا لیکن جب ان سے ملا تو مجھے اپنی برتری اور ان کی کمتری کا لمحوں ہی میں انکشاف ہو گیا۔ بفضلِ خدا میں ان سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں۔"

چند دنوں بعد ایک ایسا شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا جو اپنے برے افعال کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس نے آپ کے مریدوں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بھائیو! میں حضرت ابو العباس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھے شرفِ باریابی بخشیں گے؟"

ایک مرید نے آپ سے اس کے لیے اجازتِ ملاقات چاہی تو ابو العباس کو اس آنے والے پر بہت پیار آیا، بولے۔ "اس کو فوراً بلاؤ۔ میں اس سے ابھی اسی وقت ملوں گا۔"

اس آنے والے کو فوراً ہی آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ آپ نے اس کو بڑے تپاک سے لیا۔ "ہاں بھائی کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! خیریت سے تو ہوں۔ بس آپ کے پاس آتے ہوئے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے آیا ہوں۔"

آپ نے پوچھا۔ "کیوں، یہاں آتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہوتا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ میں ایک گناہ گار انسان، آپ خاصۂ خاصان، معلوم نہیں شرفِ باریابی ملے یا یوں ہی ناکام واپس آنا پڑے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "میرے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا امیر کا قصر نہیں، درویش کی کٹیا ہے اور وہ لوگ جنہیں اپنے گناہوں کا احساس ہے اور اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں، ان کے لیے تو میری کٹیا کا در ہر وقت کھلا رہتا ہے۔"

آنے والا آپ کی باتیں سن کر رونے لگا، بولا۔ "حضرت! آپ میرے حق میں دعا کیجیے کہ میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید گناہوں سے محفوظ رہوں اور خدا میری توبہ قبول کرے۔"

آپ نے فرمایا۔ "خدا تیری ندامت اور پشیمانی دیکھ رہا ہے، اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔"

آپ اس کو بڑی دیر تک تسلیاں دیتے رہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے رہے اور آخر میں کہا۔ "اور جب تو یہ محسوس کر لے کہ خدا نے تیری توبہ قبول کر لی ہے اور خدا کی توفیق سے تو نے سیدھی راہ اختیار کر لی ہے تو یہیں سے تو گویا ایک پل صراط پر کھڑا ہو جائے گا کیونکہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے پہلو میں، اس سے متصل شیطان بھی آن موجود ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تقویٰ اور..... پرہیزگاری پر فخر اور غرور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سارا کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے اور آدمی ایک ایسی دلدل میں اتر جاتا ہے کہ بس اس دلدل سے خدا ہی نکالے تو انسان نکل سکتا ہے ورنہ ہر راہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔"

اس نے روتے ہوئے کہا۔ "حضرت! میں تو آپ کے قدموں میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور ہر قدم پر آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں کیونکہ کسی راہنمائی کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔"

اس کے بعد وہ شخص آپ ہی کے پاس رہ گیا۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس شخص میں بزرگی اور عظمت کے آثار محسوس کیے جانے لگے۔ اس میں عاجزی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا تھا اور احتیاط اور عاجزی کا دامن ہر وقت پکڑے رہتا۔

☆☆☆

شہر میں ایک ایسے شخص کا بڑا چرچا تھا جو حج کر کے واپس آیا تھا اور بہت عالم مشہور تھا۔ آپ کے مرید بھی اس کی شہرت سے خاصے متاثر تھے اور آپ سے دبی زبان میں خواہش کرتے رہتے تھے کہ اس شخص سے ایک بار ملنا ضرور چاہیے۔

آپ نے عاجز آ کر پوچھا۔ "تم لوگ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

ایک مرید نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ وہ بہت عالم شخص ہے۔ اس کی علمیت کا آس پاس کوئی جواب نہیں۔"

آپ نے پھر پوچھا۔ "اس کے علاوہ اور کچھ؟"

مرید نے جواب دیا۔ ''اور یہ کہ وہ حج کر کے آیا ہے اور وہاں سے متعلق بڑی اثر انگیز باتیں کرتا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تب پھر میں اس سے ضرور ملوں گا۔ تم سب بھی میرے ساتھ ہی چلو۔''

لوگ ہنسی خوشی تیار ہو گئے اور کچھ دیر بعد آپ ان سب کے ساتھ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عالم کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو بہت خوش ہوا اور پھولا نہ سمایا۔

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ خانۂ خدا اور دیارِ حبیب ﷺ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کی۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''بڑی دشوار گزار راہیں تھیں اور راستے میں بھی رہزنوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''دیارِ حبیب پہنچ کر شاید ہی کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو رکھ پاتا ہو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا مزہ آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی نئے شہر میں جائیے دل خوش ہو جاتا ہے۔''

آپ نے مزید فرمایا۔ ''حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔''

جواب ملا۔ ''بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم گھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''جناب کا حج کیسا رہا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جناب! بڑا سستا سماں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔''

آپ نے افسوس سے کہا۔ ''اے شخص! تو نے میری ہر بات کا عجیب بے تکا جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیارِ حبیب میں آدمی وفورِ جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے اور تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایک مدینے پر ہی کیا موقوف، ہر نئی جگہ پر طبیعت خوش ہوتی ہے۔ میں نے کہا حرم پاک میں داخل ہو کر اس کے زمانے، فاصلے سمٹ کر خیالوں میں قید ہو جاتے ہیں اور آدمی وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے جو حرم پاک کی تعمیر اور اس کے نشیب و فراز سے متعلق ہے لیکن تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ تجھ کو حجاج کے ہجوم سے وحشت ہونے لگی تھی اور اب سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ حج کیسا تھا؟ تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ بڑا سستا سماں تھا۔ پانی کی بہتات تھی اور تجھ کو وہاں کی ایک ایک چیز کے نرخ ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تیرے حج میں وہ کون سا جذبہ شامل ہے جس کی میں تعریف کروں، وہ کون سا عشق تھا جس کا ہم سب احترام کریں؟''

اس شخص نے کہا۔ ''حج میں جذبے یا عشق کا کیا کام؟ میرے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نے حج کر لیا جب کہ دوسرے بہت سے لوگ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی اور وجہ فخر سمجھتا ہوں۔''

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ ''میرا خیال ہے بقیہ باتیں نماز کے بعد ہو جائیں گی، آؤ پہلے ہم سب نماز پڑھ لیں۔''

اس شخص نے فوراً جواب دیا۔ ''بے شک، بے شک۔ پہلے نماز پڑھ لیں۔''

وہ شخص فوراً وضو کے لیے بھاگا۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ آپ نے دیکھا وضو میں وہ بار بار ہاتھ دھو رہا ہے پھر چہرہ دھویا تو تین کے بجائے چار مرتبہ دھویا اور جب ایک بار زیادہ کا خیال آیا تو دوبارہ دھونے لگا اور پانچ مرتبہ دھو گیا۔ پھر غلطی کا احساس ہوا تو تیسری بار چہرے پر پانی پھیرنے لگا اس طرح مسلسل وسوسوں میں مبتلا رہا۔

آپ نے فرمایا۔ ''مغرب کا وقت تنگ ہوتا ہے، خدا کے لیے وضو سے جلد از جلد فارغ ہو جا تاکہ نماز میں تاخیر نہ ہو۔''

بہ مشکل وضو کر کے آیا اور امام کی جگہ جا کھڑا ہوا۔ آپ کسی اعتراض کے بغیر اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلی رکعت میں ہی اس نے تین سجدے کیے۔ یہاں تک کہ نماز کے ختم ہوتے ہوتے اس نے کئی سجدے غلط کیے۔

آپ نے دوبارہ نماز ادا کی اور اپنے مریدوں سے فرمایا۔ ''تم سب اس کے کس علم کی تعریفیں کیا کرتے تھے؟ اس علم کی جو سہو اور وسوسوں کا شکار ہے۔ جس شخص کو وضو اور نماز کے پانچ وقتی معمولات میں وسوسوں نے تنگ کر رکھا ہو، میں اس کی علمیت پر کبھی یقین نہیں کروں گا۔ اس کا علم بھی اسی طرح سہو اور وسوسوں میں مبتلا ہوگا۔''

آپ نہایت مایوس اور افسردہ اپنے حجرے میں واپس پہنچے اور مریدوں سے کہا۔ ''میں تم لوگوں کے کہنے پر اس شخص کے پاس چلا گیا تھا، ورنہ مجھ کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ میں تمہیں یہ باتیں پہلے ہی بتا سکتا تھا لیکن اس تجربے اور مشاہدے سے پہلے تم لوگ شاید میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔''

مریدوں نے بالاتفاق عرض کیا۔ ''ہمیں آپ کی ہر بات پر یقین ہے چنانچہ اگر آپ ہمیں یہ باتیں پہلے بتا دیتے تو ہم سب اس شخص کے پاس ہرگز نہ جاتے۔''

آپ کے مریدوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے یہ زعم ہو گیا تھا کہ اس نے آپ سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ ابو العباس کے علاوہ کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے آپ کے پاس آنا بند کر دیا اور اس کا امیدوار ہوا کہ کوئی خود اس کے پاس پہنچے اور اسی ادب و احترام کا مظاہرہ کرے جس کا ابو العباس کی مجلسوں میں ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ ایک عرصے بعد وہ آپ کی خدمت میں آیا اور چند مسائل بھی اپنے ساتھ لایا۔ آپ نے ایک نظر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ ''تو کہاں چلا گیا تھا؟ خیریت تو ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں موجود تو اسی شہر میں تھا لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں، میں خود مستغنی ہو چکا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! تو نے یہ کیسی بات کہہ دی؟''

اس شخص نے پوچھا۔ ''کیسی بات؟ کون سی بات؟ میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جہاں تک استغنا کا سوال ہے، اس دنیا کا کوئی شخص بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کا تو کر رہا ہے۔'' وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! کیا تو جانتا ہے کہ جب یہ زمین معرضِ وجود میں آئی تھی تو اس کا کیا حال تھا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''نہیں حضرت! آپ ہی بتائیں گے تو بات معلوم ہو جائے گی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وجود میں آتے ہی زمین کی بے چینی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے چینی کو پہاڑوں کے بوجھ سے دبا دیا۔ بعینہٖ یہی حال انسانی نفس کا ہے، خدا نے جب نفس کو پیدا کیا تھا تو یہ بھی بہت بے چین تھا۔ خدا نے اس کو بھی عقل کے پہاڑ سے دبا دیا۔''

آپ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپ نے ہجوم دیکھا۔ کوئی موٹا تازہ شخص وعظ کرنے میں مشغول تھا اور سامعین دین و دنیا سے بیگانہ اس کا وعظ سننے میں مشغول تھے۔ آپ اس کا وعظ سننے لگے۔ آپ کے پاس جو شخص کھڑا تھا، واعظ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار واعظ کو دیکھتا اور زیر لب کچھ کہہ کر رہ جاتا۔

آخر آپ نے پوچھا۔ ''اے شخص! تو کس کرب و اذیت میں مبتلا ہے کہ وعظ بھی غور سے نہیں سن رہا؟''

اس نے آپ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ واعظ کی فربہی اور تر و تازگی میری طرح دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دے گی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہاں میرے سوا ایک بھی صاحبِ نظر نہیں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تیری بات نہیں سمجھا کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب! میں واعظ میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا، جو اس کے زہد اور تقویٰ کی گواہی دیتی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔''

اس شخص نے یہ بات اتنی آہستگی سے کہی تھی کہ کسی اور کے سننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ واعظ نے دور ہی سے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''اے شخص! جو مجھے سرگوشی میں جھوٹا کہہ رہا ہے ذرا سامنے تو آ تاکہ میں بھی اس سچے اور ایماندار شخص کی شکل دیکھ لوں۔''

معترض اس للکار سے حیرت زدہ بھی ہوا اور خوفزدہ بھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا۔ ''حضرت! اس شخص کو میرے اعتراض اور شبہے کا کس طرح علم ہو گیا؟''

اور آپ کے بجائے اس سوال کا جواب بھی اس واعظ نے دیا۔ ''او چھوٹے سر والے! تو نے میرے موٹاپے پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ میں کیسا اپنے رب کا عاشق ہوں کہ میرا موٹاپا میرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے حالانکہ میرے دل میں

جو عشقِ الٰہی موجزن ہے، اس نے تیری سرگوشی کو میرے دل تک پہنچا دیا۔"

آپ نے معافی چاہی۔ "اے واعظ! جب تو اپنے رب کا اتنا بڑا عاشق بامراد ہے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا کیونکہ سب کچھ اپنے سینے میں چھپا کر لے جانا، یہ عاشقوں کی شان اور حوصلے کے خلاف ہے۔ اپنے علم اور بصیرت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔"

واعظ نے دور ہی سے جواب دیا۔ "جناب! آپ تو یہ نہ کہیے۔ آپ کا جو مقام ہے اس سے میں واقف ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! میں نادم اور شرمندہ ہوں گو کہ تیرے مرتبے اور بزرگی کا ہر ایک کو علم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود دلوں پر تیری زبان کا زور نہیں چل رہا۔ اپنے وعظ میں اثر بھر دے تاکہ جو بھی تیرا وعظ سن کر اٹھے، اپنے آپ میں نہ رہے۔"

واعظ نے جواب دیا۔ "اے ابوالعباس! اگر یہ بات اپنے بس کی ہوتی تو آپ کی مجلس کے لوگ آپ کی صحبت سے ہرگز مستغنی نہ ہونے لگتے۔ جس دل میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے میری باتوں کا اتنا ہی اثر قبول کر لیتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اثر پذیری کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔"

آپ یہاں سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے پھر واپس قاہرہ آ گئے۔

ایک دن آپ بڑے جذبے اور جوش میں تھے، اپنے مریدوں سے پوچھا۔ "کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھے فتی (جوان مرد) اور فتوت (جوانمردی) کا مطلب سمجھا دے۔"

کئی نے لب کھولنا چاہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ایک نے سب کی یہ کیفیت محسوس کر لی، بولا۔ "حضرت! ہم میں کئی ایسے ہیں جو آپ کے سوال کا جواب دے سکتے ہیں لیکن آپ کا رعب ان پر غالب ہے اور ان میں اتنی قوت بھی نہیں کہ آپ کے سامنے لب ہلا سکیں شاید اگر وہ ایسا کر سکتے تو یہی فتی اور فتوت کہلاتے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات ہرگز نہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صاحب فتوت تھے، انہوں نے حسی بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے لوگو! تمہارے سامنے بھی پانچ بت ہیں۔ پانچ معنوی بت اگر تم ان بتوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ تو فتی کہلاؤ۔"

کسی نے سوال کیا۔ "پانچ معنوی بت کون کون سے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "پہلا بت نفس، دوسرا ہوا و ہوس، تیسرا شیطان، چوتھا شہوت اور پانچواں دنیا ہے۔"

لوگوں نے نعرۂ تحسین و آفریں بلند کیا اور بڑی دیر تک بے حال رہے۔ آپ فتوت اور فتی پر بڑی دیر تک بولتے رہے۔

☆☆☆

آپ ایک عرصے تک اپنی تعلیمات اور تشریحات سے لوگوں کی تشنگی بجھاتے رہے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے پر کھلی تنقید کر دیا کرتے تھے، چنانچہ کسی فقیہ کو دیکھتے اور اس سے چند باتیں بھی کر چکتے تو بڑے افسوس سے فرماتے کہ صحیح معنوں میں فقیہ وہ ہے جس کے دل کا حجاب دور ہو چکا ہو۔"

مختلف صوفیوں اور عالموں کے بارے میں سوالات لے کر لوگ حاضریاں دیتے اور آپ ان سب کو اپنے مدلل اور... دل نشیں جواب سے خاموش اور مطمئن کر دیتے۔

آپ آخری عمر میں زندگی سے بےزار ہو گئے تھے اور جب 686ھ میں آپ نے وصال فرمایا تو ہر طرف ایک کہرام مچ گیا۔ آپ کے عقیدت مند روتے روتے بے حال ہو گئے لیکن وہ آفتابِ عظمت و بزرگی ایک بار جو فنا کی وادی میں اترا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ یوں تو سبھی کو مرنا ہے اور ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن ابوالعباس کی وفات آفتاب کے غروب ہو جانے کی طرح تھی۔ چاروں طرف غموں کی بدلیاں چھا گئیں اور لوگ اپنے دامنوں اور رداؤں میں منہ چھپا چھپا کر رو لیا کرتے تھے۔

کہانی کے تاریخی مآخذ

تاریخ دعوت و عزیمت	الکامل	طبقات ناصری	طبقات الکبریٰ	الطبری	التنبیہ والاشراف
سید ابوالحسن ندوی	ابن اثیر	منہاج سراج	علامہ عبدالوہاب	ابی جعفر جریر الطبری	المسعودی

ناقابلِ معافی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

مغربی معاشروں کے جدید ایجادات اور دریافتوں کا انداز تو انسان اپنا لیتا ہے لیکن ان کی ترقیوں کا راز جان کر بھی اس سے نظریں چرا لیتا ہے کیونکہ ... ان پر عمل کرنے کا مطلب خود کو نظم و ضبط اور قوانین کا پابند بنانا ہوتا ہے جبکہ ہمارے یہاں کیسا نظم و ضبط اور کیسے قوانین۔ یہاں تو حلوا کھانا اچھا لگتا ہے اور کڑوا بادام تھوکنا پڑتا ہے۔

ایک مضبوط معاشرے کے منظم اصول اور اس کے اثرات و ثمرات کا احوال



نکولس ریگالو واسگیو یونان سے آیا تھا۔

مجھے ای میل کے ذریعے پیغام ملا کہ نکولس کو... ائرپورٹ سے لینا ہوگا۔ میں اس وقت مانسہرہ میں تھا جہاں ہم لوگوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا اور جہاں سے مختلف کام کر رہے تھے۔ مانسہرہ میں ہم نے دو کیمپ بنائے تھے تاکہ متاثرین زلزلہ وہاں رہیں، کیمپ میں ان کے کھانے پینے کا بھی انتظام تھا۔ بیس ہزار خیمے ہم لوگ بانٹ چکے تھے اور اب ایک کیمپ اسپتال کا بندوبست کرنا تھا۔

نکولس یونان کے کسی چھوٹے سے قصبے سے آ رہا تھا۔ مجھے الفریڈو بین کا سی کا ای میل آیا پھر فون آیا کہ ایک

اقوال زریں

☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔
☆ کم بولنا عقلمندی ہے۔
☆ مصیبت کا شکوہ نہ کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت برستی ہے۔

مرسلہ: محمد صفدر معاویہ، خانیوال

چھوٹے سے ٹاؤن میں زلزلہ زدگان کے لیے کچھ امداد جمع کی گئی ہے۔ نکولس اس ٹاؤن میں میئر کا الیکشن لڑنے والا تھا اور بہت زیادہ مقبول بھی تھا۔ اس نے امدادی مہم خود ہی منظم کی تھی جس کے بعد لوگوں نے اسے امداد دینا شروع کردی۔ جب امداد جمع ہوگئی تو ٹاؤن ہال میں باضابطہ میٹنگ ہوئی اور نکولس ریگالو اوسٹگیو نے ذمّے داری لی کہ تمام رقم خود پاکستان کے شمالی علاقوں میں جاکر امدادی کام کرنے والوں کو دے گا۔ ٹاؤن ہال میں موجود لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں۔ نکولس کی شان میں تقریریں کی گئیں جو اپنا وقت نکال کر اسلام آباد جانے کے لیے تیار تھا کہ امدادی رقم زلزلہ زدگان تک پہنچا دے۔

یہ ساری باتیں مجھے الفریڈو بین کاسی نے بتائیں۔ الفریڈو میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں لندن کے ایک فلیٹ میں ایک ساتھ مقیم رہے تھے۔ وہ ایک پب میں کام کرتا تھا اور میں چیئرنگ کراس کے علاقے میں ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بیرا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہے تھے۔ وہ انگلش لٹریچر پڑھنے آیا تھا اور میں سوشیالوجی میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی خوب بنتی تھی۔

یونانی لوگ بھی خوب مسالے دار کھانا کھاتے ہیں۔ تیز مرچیں، بہت سارا گوشت، ان کی اپنی ایک خاص قسم کی پیاز ملی ہوئی روٹی ہوتی ہے، اوپر سے شراب کے گلاس، نہیں بلکہ جار۔ الفریڈو کو میرے پکائے ہوئے چاول اور پاکستانی ہوٹلوں کا نان بہت پسند تھا۔ ہم دونوں کی خوب دوستی تھی۔ دونوں ساتھ گھومے، ساتھ ہی بہت سی شراب بھی پی اور بہت سی لڑکیوں سے دوستیاں بھی کیں۔ میرے عشق عام طور پر ناکام ہوجاتے تھے اور الفریڈو کی تلاش میں لڑکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ پیدائشی عاشق تھا اور کمال کا رومان پرور۔

پاکستان واپس آنے سے چھ ماہ پہلے میں الفریڈو کے ساتھ یونان بھی گیا، اس کے ماں باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی سے ان کے گاؤں جاکر ملا۔ وہ بڑے گرم جوش لوگ تھے، بہت پیار سے ملے اور ایسے ہی خاطر کی جیسے ایبٹ آباد میں میرے گھر والے کرتے۔

الفریڈو نے تو مجھ سے اور اپنی بہن سے کہا بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں، ڈیٹنگ کریں اور مجھ سے اس نے ہنس کر کہا کہ یونان والے مجھے داماد بنالیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی اتنا ہی پاگل ہوں جتنا کہ یونانی پاگل ہیں۔

شاید اس کی بہن کو میں نہیں بھایا اور باوجود اس کی خوب صورتی، گرم جوشی، دلچسپی اور جاذب نظری کے میں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرسکا کہ پاکستان واپس جانے کا پروگرام ختم کردوں اور یونان کا داماد بن جاؤں۔

وہ ایک ہفتے کی دلچسپ ملاقات تھی۔ شاید ہلکا سا شعلہ دونوں طرف جلا، الفریڈو نے ہوا دینے کی کوشش بھی کی مگر یہ شعلہ آگ نہیں بن سکا۔ میں واپس لندن پھر لندن سے ایبٹ آباد آگیا۔ ایبٹ آباد میں ہی میں ایک تنظیم میں شامل ہوگیا اور علاقے کی ترقیاتی سرگرمیوں کے کاموں میں لگ گیا۔

الفریڈو سے میری ملاقات، ای میل اور کبھی کبھی فون پر ہوتی رہتی تھی۔ پھر اچانک یہ زلزلہ آگیا۔ ہمارے علاقے میں ایسے ہنگامی حالات کبھی نہیں آئے، میں نے زندگی میں ایسی افراتفری نہیں دیکھی، دیکھتے دیکھتے ایبٹ آباد، مانسہرہ، بالاکوٹ، مظفر آباد، بشام میں دنیا بھر کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پاکستانی اداروں کے علاوہ فرانس کے ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم کے ڈاکٹر، کینیڈا اور امریکا کے فوجیوں کا میڈیکل کیمپ، روس، یوکرین کے ڈاکٹر اور نرسیں، ترکی، ایران، سعودی عرب اور امارات کی ٹیم اور نہ جانے کون کون سی تنظیمیں آتی چلی گئیں۔

میں سب سے زیادہ کیوبا کی ٹیم سے متاثر ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ آگئے تھے اور انہوں نے کئی گروپوں کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر، نرس، سرجن، کارپینٹر، آپریشن تھیٹر، ٹیکنیشن، ڈسپنسر، فارماسسٹ، پلاسٹر کرنے والے، صفائی کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ کہیں بھی رہنے کو تیار تھے، کسی بھی جگہ پر اپنے ٹینٹ لگا کر گرم ٹھنڈے پانی کی فکر سے بے نیاز۔ خدمت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اگر کچھ کر رہے تھے تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہمارے اپنے لوگ تھے، ہم نہیں کرتے تو کون کرتا۔ کیوبا سے کیا تعلق تھا ہمارا، انہیں کیوں فکر تھی ہماری۔

ان ہنگامی حالات میں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے پاکستانی ڈاکٹر دو دن بھی کام نہیں کرسکے کہ انتظامات اچھے نہیں ہیں، پانی گرم نہیں ہے، رات بڑی ٹھنڈی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور کچھ لوگ تو صرف تصویریں کھنچوانے آئے اور ٹیلی وژن پر ماہر بن کر ایسی باتیں کرتے تھے کہ مجھے غصہ کم اور ہنسی زیادہ آتی اور اپنی قوم کے پڑھے لکھے لوگوں کی حرکتوں اور ذہنی افلاس کو دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔

ہماری حکومتوں نے پچاس برسوں میں نہ پانی مہیا کیا، نہ سیوریج سسٹم اور نہ ہی پرائمری ہیلتھ کیئر۔ ہمارا علاقہ تو سیر و تفریح کی ایک ایسی جگہ تھی جسے ایک اغوا شدہ طوائف کی طرح لوٹا گیا ہو۔ عوام کی قسمت جیسی پہلے تھی اب بھی ویسی ہے۔ اب زلزلے کے بعد اربوں کی امداد آگئی تھی اور حکومت امداد کو اپنے طریقے سے خرچ کر رہی تھی، اسی طریقے سے جیسے حکومتیں کرتی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں پلاننگ کرنے والوں سے کہتا کہ کچھ نہ کریں صرف صاف پانی اور سیوریج کا نظام بنا دیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پکی پکی سڑکیں پہنچا دیں، بیسک ہیلتھ یونٹ کی بلڈنگیں نہ بنائیں، پرانی بلڈنگوں کو ہی مرمت کرکے وہاں ڈاکٹر اور نرسوں کا انتظام کردیں۔ مگر یہ سارے کام تو بہت ہی چھوٹے کام تھے اور حکومتیں چھوٹے کام نہیں کرتی ہیں۔ ان کے بڑے کام ہوتے ہیں، میگا پروجیکٹ، موٹر وے، ایٹم بم، کالاباغ ڈیم وغیرہ وغیرہ۔

نکولس ائرپورٹ پر آسانی سے مل گیا، وہ چھوٹے قد کا، موٹا سا گورا چٹا آدمی تھا، بولتا بہت تھا اور اس کی انگلش بھی اچھی تھی۔ میں اسے ائرپورٹ سے سیدھا مانسہرہ لے جانا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ اسے میریٹ ہوٹل سے ہوکر جانا ہے۔ ہم لوگوں نے میریٹ میں چائے پی۔ نکولس نے کاؤنٹر پر کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر ہم لوگ مانسہرہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ رات تنظیم کے دفتر کے مہمان خانے میں گزری تھی۔

نکولس نے بتایا کہ الفریڈو آج کل بڑا صحافی بن گیا ہے۔ اس نے اپنے شہر کے بہت سارے قصے سنائے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح سے الفریڈو نے اسے کہا تھا کہ پاکستان کے لیے پیسے جمع کرے اور اس طرح سے الیکشن سے پہلے ہی وہ توجہ کا مرکز بن گیا اور اب الیکشن میں اس کی کامیابی یقینی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چھوٹے سے ساحلی شہر کے لوگوں نے کئی طریقوں سے زلزلہ زدگان کے لیے چندہ جمع کیا۔ پورٹ کے ملازمین اور اسکول ٹیچروں نے ایک دن کی تنخواہ دی، اسکول میں بچوں نے پیسے جمع کیے، شہر کے ہر دکاندار نے ایک ایک دن کی آمدنی کا تیس فیصد دیا اور اب اس کے پاس ستانوے ہزار یورو تھے جس کو اس نے یہاں خرچ کرنا تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے ناشتے کی میز پر ہی کرلیں۔

ایک چھوٹے سے یونانی شہر میں پاکستان کے زلزلہ زدگان کے لیے اتنی رقم بھی جمع ہونا بڑی بات تھی۔ اس نے الفریڈو کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ سیاست میں جانے

کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کی حیثیت بہت مضبوط ہے کیونکہ اس کا نام ایک ایماندار صحافی کی طرح جانا جاتا ہے۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

اخبارات میں خبر تھی کہ مانسہرہ سے مظفر آباد کے راستوں پر ٹرک روک کر زبردستی امدادی سامان چھین لیا گیا ہے۔ ایک ناظم نے سامان اپنے گھر پر اتار لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جب لاکھوں لوگ زلزلے کا شکار ہو گئے ہوں، زندہ جسم ملبوں کے گھپ اندھیروں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے ہوں، انسان، انسان کو لوٹے یہ تو بڑا اندھیرا ہے۔

شام کو عجیب بات ہوئی، میں نے نکولس کے لیے مری بیئر کی کچھ بوتلوں کا انتظام کر دیا تھا جنہیں اس نے اچھے یونانیوں کی طرح پانی سمجھ کر خوب پیا۔

شام کو اس نے فرمائش کر دی کہ کسی لڑکی کا بندوبست کیا جائے۔ میں سمجھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تو اس نے کہا کہ لڑکی کا مطلب ہے کہ کسی طوائف کا انتظام ہو۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے سختی سے کہا کہ وہ ایسی فرمائش نہ کرے تو بہتر ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسی وقت الفریڈو کو فون بھی کیا اور اسے نکولس کی فرمائش بتائی۔

الفریڈو نے فون بند کر کے مجھے خود ہی فون کیا اور دوسری طرف سے اس کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی اور اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔ اسے کہہ دو کہ تم طوائف کا بندوبست کر سکتے ہو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مجھے اس کے ہنسنے پر تھوڑی حیرت ہوئی۔

دوسرے دن نکولس نے کچھ اور ہی فرمائش کر ڈالی۔ اس نے کہا کہ دو دن اس نے کام دیکھ لیا ہے، دو دن میں وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ جتنی رقم اس کے پاس ہے اس سے ہم لوگ مزید ٹینٹ خرید لیں اور اس کا انتظام چلائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کسی بھی ٹینٹ بستی کے سامنے اس کی تصویر لے لی جائے۔ دوسری فرمائش یہ تھی کہ اسے ستانوے ہزار یورو وصول کرنے کی رسید دی جائے جبکہ وہ ہمیں چوالیس ہزار یورو دے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے رات پھر الفریڈو کو فون کیا۔ میں نے طوائف کے سلسلے میں اس کے رویّے کی شکایت بھی کی اور نکولس کا نیا مطالبہ بھی بتایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے الفریڈو کی زبان کسی نے کاٹ دی ہے۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا کہ نکولس کو جعلی رسید دینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ نکولس کی میمانداری بھی بند کر دی جائے۔ یہ رویّہ بالکل بھی قابلِ قبول نہیں تھا۔

الفریڈو نے زیادہ بات نہیں کی مگر اس کے لہجے کا غصہ بتا رہا تھا کہ اسے بہت افسوس ہوا ہے۔ اسی وقت میں نے نکولس کو ٹیکسی کرا دی۔ اس نے میرے اس یکایک فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا مگر الفریڈو کے فون کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ فوراً ہی اسلام آباد چلا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میریٹ ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

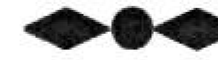
اسے میں نے ایک ہفتے بعد میریٹ ہوٹل میں ہی دیکھا۔ میں ڈبلیو ایچ اے کی ایک میٹنگ ختم کر کے باہر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے وہ نظر آیا ایک نئی ناظم کے ساتھ۔ ان کے ساتھ دو عجیب قسم کی عورتیں بھی تھیں۔ بڑے بے ڈھنگے طریقوں سے وہ سب ہنس رہے تھے، مجھے یقین تھا کہ ان سب نے چڑھائی ہوئی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آیا، ہاتھ ملایا اور بولا کہ میں نے پیسے ان لوگوں کو دے دیے ہیں۔ مجھے رسید بھی مل گئی ہے اور آج رات میں واپس جا رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کیا کہتا، گڈ لک بول کر آ گیا۔ میں اس ناظم کو جانتا تھا، اس کے بہت سے قصے مشہور تھے۔

دو ماہ بعد الفریڈو کا فون آیا، اس نے معافی مانگی کہ اس نے نکولس کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ فرشتی! طوائفوں... کی بات اور ہے، میرے یا تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے لوگ اپنا جسم بیچنا بند نہیں کریں گے۔ یہ تو چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اگر پاکستان جا کر وہ کسی طوائف کے ساتھ وقت گزارتا ہے تو کسی کو بھی تکلیف نہیں ہونی چاہیے لہٰذا میں نے تمہاری بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن نکولس نے جو جعلی رسید کی بات کی؛ وہ قابلِ برداشت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔

اس نے مجھے ہنس کر بتایا کہ مقبول ہونے کے باوجود نکولس میئر کا الیکشن ہار گیا ہے۔ الفریڈو نے ہی اس کے خلاف مہم چلائی تھی، لوگ ہر بات معاف کرنے کو تیار تھے لیکن یہ انہیں منظور نہیں ہوا کہ مالی بدعنوانی میں اس کا ساتھ دیں۔ لوگوں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالا۔ وہ اپنے شہر کا میئر کسی بدعنوان کو کیسے بناتے۔

مجھے نکولس کے ساتھ بیٹھا ہوا ناظم یاد آ گیا جس نے اسے جعلی رسید بھی دی، طوائفیں بھی مہیا کیں اور الیکشن بھی جیت گیا تھا۔



چھان بین

تنویر ریاض

جس طرح ایک دنیا انسان کے اندر اور دوسری باہر آباد ہوتی ہے اسی طرح سرحدوں کے اس طرف اور اس کی دوسری جانب زندگی کا رنگ ڈھنگ بھی نرالا ہوتا ہے۔ اس نے مغربی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس کی رنگینیوں میں گم ہو گئی... اس کے باوجود کوئی ایک رنگ بھی اس کی شناخت نہ بن سکا حتیٰ کہ عاشقوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو گئی مگر کوئی ایک نام بھی آخری نہ ہو سکا۔

جیون ساتھی کی تلاش اور چھان بین میں جیون تمام کرنے والی ایک دوشیزہ کی سراغ رسانی

جب لینا نے جیری کو اس کے اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے باہر کھڑی ارغوانی رنگ کی وین میں سوار ہوتے دیکھا تو اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اس وین کی ڈرائیور والی سائڈ پر سفید رنگ سے میڈولارک نرسری لکھا ہوا تھا۔

یہ واقعی غور طلب بات تھی کہ جیری اس وین میں کیوں سوار ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے اس نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کی سیڈان کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لینا نے اس وین کو بھی اپنے ذہن میں موجود دوسرے سوالوں کی فہرست میں شامل



کرلیا جن کے جوابات ابھی ملنا باقی تھے۔ وہ ابھی تک جیفری کی بہت سی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی مثلاً جب اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں کافی کی میز پر مختلف نوعیت کے رسالوں کا ڈھیر بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ ان تین تصویروں کے بارے میں بھی جاننا چاہتی تھی جن میں وہ ایک چھوٹے سے طیارے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت بتاتا تھا جبکہ اس کے اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر کرائے کا تھا۔ اس کا اندازہ لینا کو اس وقت ہوا جب وہ اپنے چشمے کا کیس اٹھانے کے لیے فرش پر جھکی تو اس کی نظر کاؤچ کے نیچے لگے ہوئے کمپنی کے اسٹیکر پر پڑی اور اب یہ نرسری وین کا معاملہ سامنے آگیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا کاروبار ہو لیکن جیفری نے کبھی اس کے بارے میں بتایا نہیں۔ جیفری سے اس کی ملاقات کو دو مہینے سے بھی کم کا عرصہ ہوا تھا لیکن اس دوران ایسی بہت سی باتیں سامنے آگئیں جن کی چھان بین ضروری تھی۔

جونہی جیفری کی وین روانہ ہوئی، لینا نے بھی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا پھر اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ ایک بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے اور اگر وہ اس کا تعاقب جاری رکھتی تو اسے اپنے کام پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ ویسے بھی اسے اس تعاقب کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا۔ لہٰذا اس نے وین کا پیچھا کرنے کے بجائے اس کا لائسنس نمبر سیٹ پر رکھے ہوئے پیڈ پر لکھ لیا۔ وہ اس نمبر کے ذریعے وین کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن فی الحال اسے یہ کاغذ اس فائل میں لگانا تھا جو اس نے مسٹر جیفری جیمس جونیئر کے نام سے کھولی تھی۔

☆☆☆

آٹھ مہینے پہلے اس نے بوائے فرینڈ نمبر سولہ یعنی سام کی فائل بند کر دی تھی۔ وہ چھوٹا ہونے کے علاوہ بڑبولا بھی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کے حد درجہ بڑھے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ مثلاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہ پیشہ ور کار ریس ڈرائیور رہ چکا ہے، کسی طرح بھی ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اگر اس کا دعویٰ سچ ہوتا تو وہ ڈنر کے بعد کار چلاتے ہوئے ایک حادثے سے بال بال نہ بچتا۔ اگر عین وقت پر دوسری کار کا ڈرائیور ہوشیاری نہ دکھاتا تو دونوں کاروں کا ٹکرانا یقینی تھا لیکن اس وقت تک اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ پہلی ملاقات میں قائم ہونے والے تاثر پر بھروسا کر سکے کیونکہ ماضی میں بھی اس طرح کے تجربات ناکام ثابت ہوئے تھے۔ اگر اس میں لوگوں کو سمجھنے کی پرکھ ہوتی تو صرف چوبیس سال کی عمر میں وہ سترھواں تعلق قائم نہ کر رہی ہوتی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک اس نے جتنے لوگوں سے بھی دوستی کی، ان سب نے اس سے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپایا جس کی وجہ سے ہر تعلق ٹوٹتا چلا گیا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کاش اس کے پاس ایسا آلہ ہوتا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے بھید جان سکتی۔ اس طرح کم از کم وہ ان بے نتیجہ تعلقات سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

بوائے فرینڈ نمبر چودہ یعنی جیک کی مثال سامنے تھی۔ اس نے لینا سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں لیکن لینا نے باتوں باتوں میں بہت کچھ جان لیا۔ مثلاً اس کے ایک دوسری عورت سے بھی تعلقات تھے اور اس نے وقتی طور پر سینڈی سے ملنا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ حیران تھی کہ جیک ایک جانب تو اس سے تعلق قائم کیے ہوئے تھا اور دوسری جانب دوبارہ سینڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ اسے بعد میں کسی اور ذریعے سے معلوم ہوئی کہ اسے بلیاں پسند نہیں تھیں بلکہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا جبکہ لینا کو اپنی پالتو بلی ''فی'' سے بہت پیار تھا اور جتنی دیر وہ گھر پر رہتی فی اس سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہ ہوتی۔ یہ بات اگر وہ خود لینا سے کہہ دیتا تو شاید اسے زیادہ صدمہ نہ ہوتا لیکن افسوس اس وقت ہوا جب اس نے منگنی کی پارٹی میں دوسرے لوگوں سے یہ بات کہی۔ لینا جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اس نے محض اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ جواز تلاش کیا ہے۔

کچھ اسی طرح کا معاملہ بارھویں نمبر کے بوائے فرینڈ راجر کا تھا۔ جیک کے برعکس اس کا صرف ایک ہی راز تھا اور اسی لیے لینا کو اس کی فائل دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ اسے یاد رکھ سکے۔ اس نے لینا سے یہ بات چھپائی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس ایک خامی کے علاوہ ان کا تعلق ٹھیک ٹھاک انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اور اس وقت وہ سوچا کرتی تھی کہ شاید راجر سے ملنے کے بعد اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے وہ ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر پاتا جس پر وہ خفا ہو جاتی۔ یہ بھید اس وقت کھلا جب راجر نے فون کر کے اسے مطلع کیا کہ وہ وعدے کے مطابق اس کے ساتھ ڈنر نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ لینا کو اپنی شام ضائع ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ بوریت دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلی اور بلا ارادہ ہی شاپنگ مال کی طرف چل دی۔

جہاں اس نے راجر کو اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ سچ بیان کر دیتا تو وہ کاؤنٹی ریکارڈ آفس کا چکر لگانے سے بچ جاتی۔ جہاں اس نے راجر کی شادی کا سرٹیفکیٹ تلاش کر لیا۔ اسی طرح رجسٹرار کے دفتر سے بھی تصدیق ہو گئی کہ راجر جس مکان میں رہتا تھا، وہ راجر پیٹن اور جین تھامس پیٹن کی مشترکہ ملکیت ہے۔

ماضی کے انہی تجربات کی روشنی میں اس نے فیصلہ کیا کہ گھر واپس جانے سے پہلے وہ ایک چکر ساتویں اسٹریٹ پر واقع کیپولاگ کے دفتر کا بھی لگا لے۔ جیفری کا کہنا تھا کہ وہ اسی سوفٹ ویئر کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں اس وین کو تلاش کیا لیکن اس کی جگہ اسے جیفری کی سفید سیڈان کھڑی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید وین کمپنی کی ہو پھر اسے خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ دفتر میں ہے یا نہیں۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سڑک کے آخری کونے پر واقع شاپنگ مال میں گئی جہاں سے اس نے سیل فون کے ذریعے اس کا نمبر ملایا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆☆☆

لینا تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچی جو پام کے درختوں سے گھری ایک پرانی عمارت میں تھا۔ بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے اپنی پالتو بلی فی کے پاس رکی جس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس نے عقبی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں لکھنے کی میز اور ایک فائل کیبنٹ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے یہ میز لیونگ روم میں رکھی ہوئی تھی لیکن اکثر اس کے دوست کافی پینے یا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے ساتھ چلے آتے تو اسے یہ پریشانی لاحق ہو جاتی کہ کہیں وہ ان فائلوں کو نہ پڑھ لیں جس میں اس نے ان کے بارے میں تمام تفصیلات لکھ رکھی ہیں، ویسے تو وہ اپنی فائلیں تالے میں رکھتی تھی لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ میز پر کوئی کاغذ رکھا رہ جائے جس پر کسی بارے کے میں کوئی خاص بات درج ہو جیسا کہ کئی مہینے پہلے بوائے فرینڈ نمبر سولہ یعنی سام کی آمد کے موقع پر ہوا تھا۔

وہ ڈنر کے بعد اس سے معذرت کر کے باتھ روم تک گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ سام اس کی میز کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ایک کاغذ پر یونائیٹڈ ائیر لائن کا فون نمبر درج کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگلے روز صبح فون کر کے وہ تصدیق کرے گی کہ آیا وہ واقعی بزنس ٹور پر میکسیکو جا رہا ہے۔ راجر والے تجربے کے بعد وہ کسی پر اتنی آسانی سے بھروسا نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی سام کا رہن سہن اسے کھلتا تھا۔ اس کی تنخواہ بیس ہزار ڈالرز سالانہ تھی لیکن وہ قیمتی سوٹ پہنتا اور رینج روور جیسی مہنگی گاڑی اس کے استعمال میں تھی۔ وہ اس معمولی تنخواہ میں یہ سب کیسے افورڈ کر رہا تھا۔ کیا اس کا گزارہ ادھار پر تھا یا اس کا کوئی اور بھی ذریعہ آمدنی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بوائے فرینڈ کوئی غیر قانونی کام کرے۔

سام میکسیکو ضرور گیا لیکن کمپنی کے کام سے نہیں جیسا کہ اس نے لینا کو بتایا تھا بلکہ وہ منشیات کی تجارت کرتا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی اور سام کے ساتھ تعلق کے نتیجے میں وہ بھی صرف پولیس ہی نہیں بلکہ ایف بی آئی کی نظروں میں بھی مشتبہ قرار پائی۔ وہ خود ڈیلیوری سروس میں کام کرتی تھی اس لیے پولیس کو شبہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی... آلۂ کار بن سکتی ہے جو منشیات لے جانے اور اس کی سپلائی کا کام کرتا ہو۔ وقتی طور پر تو وہ پولیس اور ایف بی آئی کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی سام اور اس کا مختصر تعلق بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

لینا نے میز کے اوپر لگے ہوئے باکس میں سے ایک نیا فولڈر نکالا۔ اس پر ایک لیبل چپکایا اور جیفری جیمس جونیئر نمبر سترہ کے الفاظ لکھ دیے۔ پھر اس نے رائٹنگ پیڈ سے ایک کاغذ پھاڑا اور اس پر وین سے متعلق وہ تمام تفصیلات لکھ دیں جو اس نے اپنی کار میں رکھے ہوئے پیڈ پر درج کی تھیں پھر اس نے جیفری کے دفتر جانے اور وہاں پارکنگ لاٹ میں وین کے بجائے اس کی سیڈان کار کی موجودگی کے بارے میں بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس نے جیفری سے متعلق وہ چھوٹی موٹی باتیں بھی لکھ دیں جو وہ اب تک نوٹ کرتی آئی تھی لیکن وہ اتنی اہم نہ تھیں کہ ان کی وجہ سے جیفری کی فائل کھولی جائے۔ آخری نکتہ جو اس نے تحریر کیا، وہ اس فون کال کے حوالے سے تھا جو اس نے دوپہر پونے تین بجے سیل فون سے کی تھی اور اس کے جواب میں استقبالیہ کلرک نے کہا تھا۔ ''نہیں، جیفری جیمس جونیئر نام کا کوئی شخص یہاں کام نہیں کرتا۔''

لینا کو جیفری سے ملتے ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس مختصر مدت کے دوران کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے۔ رات کو اسے جیفری کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔ جیفری نے بتایا تھا کہ اسے دیر تک دفتر میں کام کرنا ہوگا۔ اس لیے

بہتر ہوگا کہ وہ کسی ریستوران میں ملیں۔ لینا نے آخری بار آئینہ دیکھ کر اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ سیاہ چست لباس میں وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی پھر وہ دل ہی دل میں ان سوالوں کو دہرانے لگی جو وہ ڈنر کے دوران اس سے کرنے والی تھی مثلاً یہ کہ ان دنوں وہ کس سوفٹ ویئر منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ اس کا جہاز کہاں کھڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسے ہی وہ ریستوران کی پارکنگ لاٹ میں پہنچی، اسے جیری کی سیڈان نظر آگئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے حلیے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے سیدھا یہاں چلا آیا ہے۔ لینا کو دیکھ کر وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کرلیا۔ ''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔'' وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

''اوہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہیں کم ازکم اتنی فرصت تو مل گئی کہ میرے ساتھ ڈنر کرنے چلے آئے۔''

ایک لڑکی نے انہیں ان کی میز تک پہنچا دیا۔ لینا اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج کا دن کیسا گزرا؟''

''ہمیشہ کی طرح مصروف، سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی اور تم کیا کرتی رہیں؟''

''میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے...... ویسے تمہاری کمپنی کمپیولاگ کیا کرتی ہے؟''

وہ خودکلامی کے انداز میں اسے کمپنی کی مصنوعات وہاں... کام کرنے والوں کی تعداد اور ... ہارڈ ویئر کے بارے میں بتانے لگا، ان میں سے کچھ نام اسے جانے پہچانے لگے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ ان کے بارے میں پہلے بھی ریڈیو پر سن چکی ہے۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل کر کے آیا تھا اور لینا دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی معترف ہوگئی۔ اس نے کمپیولاگ کے بارے میں مزید کچھ سوالات کیے پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کتنی بار اپنے جہاز کے ذریعے سفر کرنا ہوتا ہے؟''

''ہفتے میں ایک یا دو بار۔ جب کام سے تھوڑی فرصت مل جائے۔ تمہارے لیے کیا منگواؤں؟''

''ابھی نہیں۔'' وہ بولی۔ ''کیا ذاتی جہاز رکھنا مہنگا شوق نہیں؟''

''ہاں۔ اس کے ایندھن، دیکھ بھال اور پارکنگ فیس پر ہی کافی خرچ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے لیے بھنے ہوئے پارچے اور چپس منگوالوں۔''

لینا نے مینیو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں کی ہر چیز ہی اچھی ہوتی ہے، چونکہ جہاز رکھنا کافی مہنگا ہے اسی لیے تمہیں دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔''

جیری کی بھویں تن گئیں اور لینا کو یوں لگا شاید اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جیری جہاز کی ملکیت اور دیر تک کام کرنے کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کا مقصد اس کی دل آزاری نہیں تھا۔ اس لیے بات بناتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ تم کبھی مجھے اپنے ساتھ فلائنگ پر لے چلو؟''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ یقیناً میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ کیا تم نے یہاں کی سامن مچھلی کبھی کھائی ہے؟''

''ہاں اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارا جہاز کہاں کھڑا ہوا ہے؟''

''مقامی ایئرپورٹ پر، میرے لیے وہ جگہ مناسب ہے۔'' اس نے مینیو تہ کیا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھے اپنے دن کے بارے میں بتاؤ۔''

کوئی جواب دینے سے پہلے لینا نے بقیہ سوالات پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ماضی کے تجربات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ چھان بین میں بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اس ماہر آثار قدیمہ کی طرح جو مسلسل کھدائی کرتا ہے اور زمین کی تہیں صاف کر کے ماضی کے نشانات تلاش کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ حال کی حقیقت جاننے کے لیے تحقیق کر رہی تھی۔ جب وہ کھانے کا آرڈر دے چکے تو وہ اسے اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ کہاں کہاں گئی اور اس نے کیا چیزیں لوگوں کو پہنچائیں، وہ بڑے شوق سے سنتا رہا۔

جب بیرا بل لے کر آیا تو وہ وائن کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے جیری کے چہرے کا جائزہ لیا اور فیصلہ کرلیا کہ کل اس کی چھٹی ہے۔ اس لیے وہ اس کا جہاز دیکھنے ضرور جائے گی۔

☆☆☆

رات کو سونے سے پہلے اس نے پڑھنے کے لیے ایک کتاب کھولی۔ وہ اکثر خاتون جاسوسوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی اور ان کتابوں سے اسے بعض اوقات بڑے اچھے آئیڈیاز مل جاتے تھے مثلاً روپ بدلنے کے لیے وگ کتنی کارآمد ثابت ہوتی ہے اور کس طرح سرکاری فائلوں سے کسی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس نے جیری کی کافی کی میز پر بھی اس طرح کے جاسوسی ناول دیکھے تھے۔ ممکن ہے کہ اسے بھی جاسوسی کا شوق ہو۔ ویسے وہ ... مطالعے کا شوقین معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے وہ اسے لائبریری میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ جب اسے یہ پرانی بات یاد آئی تو اس نے بستر پر پڑی فائل اٹھالی اور اس میں اس ملاقات کی تفصیل تلاش کرنے لگی۔

جیری سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ لائبریری میں میکسیکو کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی تھی۔ وہ اس شہر کے بارے میں جاننے کے لیے.... بے چین تھی جہاں سام پکڑا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں نقشے پر ان راستوں پر گردش کر رہی تھیں جن کا تذکرہ اخبارات میں سام کی گرفتاری کے بعد آیا تھا۔ اس نے وہ تمام تراشے کاٹ کر سام کی فائل میں لگا دیے تھے۔ جیری اس وقت لائبریری کے اس حصے میں تھا جہاں جغرافیے سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس سے کئی مرتبہ گزر چکا تھا بلکہ ایک مرتبہ تو ان دونوں کا ٹکراؤ بھی ہوگیا۔ جیری نے بڑی شائستگی سے اس سے معذرت کی اور بولا کہ کیا وہ میکسیکو کے سفر کا ارادہ رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھنے لگے اور چند دنوں بعد نوبت ڈنر اور ڈرنک تک جا پہنچی۔

لینا شروع شروع میں کافی محتاط تھی۔ اس نے جیری کو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی تفصیل بتائی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ایسے مقامات کا انتخاب کرتی جو نسبتاً محفوظ ہوں اور جہاں سے کسی خطرے کی صورت میں نکلنا آسان ہو۔ جیری کے معاملے میں اس کی خاص طور پر یہ کوشش تھی کہ وہ پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرلے۔ اس کے بعد ہی اسے پیش قدمی کا موقع دے گی۔ جیری جیسے لوگ بہت آہستہ آہستہ کھلتے ہیں اور وہ مطمئن تھی کہ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

لینا نے بلیک ایوی ایشن کا بورڈ دیکھا اور اپنی گاڑی مقامی ائرپورٹ کے توسیعی حصے میں واقع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کردی۔ اس نے اخبار میں فلائنگ کے تربیتی کورس کا اشتہار دیکھا تھا اور اگر کوئی اس سے یہاں آنے کی وجہ پوچھتا تو وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ بھی اس کورس میں شرکت کرنا چاہتی ہے۔ کار سے باہر آنے سے پہلے لینا نے اپنی وگ درست کی جس نے اس کے سنہری بالوں کو چھپا لیا تھا۔ سیمنٹ سے بنے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اسے چھوٹے جہاز کھڑے ہوئے نظر آئے۔ سناٹے میں اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ عام طور پر اونچی ایڑی کے جوتے نہیں پہنتی تھی لیکن اس وقت اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قد میں مزید تین انچ کا اضافہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس روپ میں جیری بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

رن وے بالکل خالی تھا اور چند ادھیڑ عمر کے افراد ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ وہ ان کھڑکیوں کی جانب بڑھی جہاں سے جہازوں کا نظارہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا۔ اس نے انہیں قطار در قطار دیکھنا شروع کیا۔ پہلے وہ ان جہازوں کو تلاش کرنے لگی جو سفید رنگ کے تھے اور ان پر نیلے رنگ کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں پھر اس نے ان جہازوں پر لگے نمبر پڑھنا شروع کیے۔ اسے جس نمبر کے جہاز کی تلاش تھی، وہ تیسری قطار میں نظر آگیا۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی جیکٹ پر لگے ہوئے بیج پر لکھا ہوا تھا ''بلیک فلائنگ سروس۔ ٹیڈ۔''

''اوہ ہاں۔'' وہ تھوڑا سا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تربیتی کورس میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں تمہیں معلوماتی کتابچہ دیتا ہوں۔ اس میں تمہیں ساری تفصیل مل جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے اپنے چھوٹے سے کیبن کی جانب اشارہ کیا۔

''ایک اور سوال؟''

''ہاں۔۔ہاں۔ پوچھو۔''

''کیا یہ سب جہاز تربیتی مقاصد کے لیے ہیں یا ان میں کوئی ذاتی طیارہ بھی ہے؟'' اس نے رن وے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس میں دونوں طرح کے طیارے ہیں، زیادہ تر جہاز لوگوں کے ذاتی استعمال میں ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک تربیتی مقاصد کے لیے کرائے پر بھی دے دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی دیکھ بھال کے اخراجات پورے ہوسکیں۔''

''اس جہاز کے بارے میں کیا کہو گے جس پر سفید اور نیلی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ میں اس.... لیے پوچھ رہی ہوں کہ میرے ڈیڈی بھی اسی طرح کے جہاز میں مجھے

فلائنگ کے لیے لے جاتے تھے۔"

"یہ شیرون تھارٹن کا ذاتی جہاز ہے جسے وہ خود ہی استعمال کرتی ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ اس جہاز کو کرائے پر نہیں دے گی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ایک کمپنی کی مالک ہے لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کئی ایسے جہاز ہیں جو کرائے پر مل سکتے ہیں۔"

"کیا وہ کسی دوسرے شخص کو بھی اپنا جہاز اڑانے کی اجازت نہیں دیتی؟" لینا نے پوچھا۔

"کبھی کبھار خاندان کے لوگوں کو یہ موقع مل جاتا ہے۔"

لینا کو یقین تھا کہ اس کے پاس جہاز کا جو نمبر ہے وہ غلط نہیں ہوسکتا۔ اس نے یہ نمبر جیری کے کمرے میں آویزاں تصویر سے ذہن نشین کیا تھا۔

جب لینا کیبن سے باہر آئی تو اس نے ایک عورت کو اس جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لمبے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا بند گلے کا سوئٹر، خاکی پتلون اور کینوس شوز پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر لینا کو جیری کی یاد آگئی۔ لینا نے اپنے حواس پر قابو پایا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے پرس میں چابیاں تلاش کررہی ہو۔ جب وہ عورت اس کے قریب سے گزر گئی تو اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"گڈ مارننگ۔ ٹیڈ!"

"تم کیسی ہو مس تھارٹن؟" ٹیڈ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

☆☆☆

اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر لینا نے وگ اتاری اور اپنے بال سنوارنے لگی پھر اس نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ تازہ دم ہونے کے بعد وہ اپنی میز پر گئی تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا، اس کا اندراج کر سکے۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہوگیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، وہ اپنی فائلوں کو ترتیب سے رکھنے کی عادی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میز کی دراز کو ایک انچ کھلا چھوڑ دیتی تھی تاکہ اگر کسی نے اسے چھیڑا ہو تو پتا چل جائے۔ اس نے جلدی سے فائل کیبنٹ کھولا تاکہ دیکھ سکے کہ نمبر سترہ کی فائل اسی جگہ پر ہے جہاں وہ رکھ کر گئی تھی۔

فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے اسے ایک معمولی سی شکن نظر آئی۔ وہ ایک نئی فائل تھی اور اس پر ایسے کسی نشان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گزشتہ شب اس نے یہ فائل اپنے بستر پر رکھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کی بلی کا پنجہ اس پر پڑ گیا ہو۔ بلی کا خیال آتے ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں چلی گئی۔ ورنہ فے تو اسے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آجاتی۔ اس نے فے کو پکارا تو بستر کے نیچے سے اس کے کھسکنے کی آواز آئی۔

لینا نے اسے پچکارا تو اس نے بستر کے نیچے سے جھانکنا شروع کیا پھر آہستہ آہستہ اس کا دھڑ باہر آنے لگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ فے کبھی اس طرح نہیں چھپتی تھی جب تک وہ خوفزدہ نہ ہو یا کوئی یہاں نہ آیا ہو لیکن ایسا کون ہے جو ان فائلوں تک پہنچنا چاہے گا؟ کوئی بھی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔

"یہ انتہائی نامعقول حرکت ہے۔" وہ اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولی پھر کچن میں آکر اسے رات کی بچی ہوئی مچھلی کھلائی اور سوچنے لگی کہ ابھی اسے مزید جاسوسی کہانیاں پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ آئندہ کبھی فائل کیبنٹ کو تالا لگانا نہیں بھولے گی۔

اپنی میز پر واپس آکر وہ ایک بار پھر جیری کی فائل دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیری نے اس سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ طیارہ اس کی ملکیت نہیں تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے جہاز کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہوگئی ہو۔ اس نے اس نمبر کو دوبارہ چیک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کیمبولاگ میں کام نہ کرنے والی بات اسے کھٹک رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اس کمپنی کے لیے کام کرتا ہو اور اپنی وین کے ذریعے ان کا سامان لے جاتا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مقام پر کام کرتا ہو اور استقبالیہ کلرک اسے نہ جانتی ہو، یہ بات وہ آسانی سے یا استقبالیہ کلرک کو دوبارہ فون کرکے معلوم کرسکتی تھی۔

فائل بند کرکے اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اگلے روز جیری کا تعاقب کرے گی۔ اگر وہ اپنے ٹرک میں گئی تو پہچان لی جائے گی۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی سفید رنگ کی چھوٹی کار استعمال کرسکتی تھی جس پر کوئی بھی توجہ نہ دیتا۔ وہ اس کار میں بیٹھ کر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر بھی انتظار کرسکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہاں سے کھسک بھی سکتی تھی۔ بہرحال اسے اگلے روز کچھ سوالات کے جوابات درکار تھے۔

☆☆☆

وہ ہیمپشائر اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی ویلنگٹن جانے کے لیے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ کررہی تھی کہ اس نے جیری کو اپنے اپارٹمنٹ کے پارکنگ لاٹ میں اسی وین کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اسی لیے وقت سے پہلے آگئی تھی تاکہ اس کے نکلنے سے

پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اب اگر وہ اپنے منصوبے کے مطابق ویلنگٹن جانے کے لیے بائیں جانب مڑتی تو اسے جیری کے سامنے سے گزرنا پڑتا اور اگر وہ اپنی وین پارکنگ لاٹ سے نکال رہا ہوتا تو اس سے ملنے کا بھی امکان تھا۔

اس نے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ ترک کردیا اور انتظار میں رہی کہ دائیں جانب کا ٹریفک گزر جائے تو وہ ہیمپشائر اسٹریٹ پر سیدھی چلتی رہے گی۔ جیسے ہی آخری کار گزری، اس نے اپنا اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا۔ عین اسی وقت ایک کار اس کے عقب میں آگئی اور اس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجانے لگا وہ بہت جلدی میں تھا اور اس سے ایک سیکنڈ بھی انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اپنی گاڑی آخری کار کے پیچھے لگالی۔ جب وہ چوراہا پار کررہی تھی تو اس نے اسی گاڑی کے ہارن کی آواز دوبارہ سنی۔ اب وہ بے صبرا ڈرائیور اس کے بائیں ہاتھ سے گزر رہا تھا۔ عین اسی وقت لینا کی نظر جیری پر گئی جو اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے یوٹرن لیا اور آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئی ہیمپشائر اسٹریٹ پر آگئی۔ اسے سڑک کے کنارے کچھ جھاڑیاں نظر آئیں۔ جہاں وہ بآسانی اپنی کار کھڑی کرسکتی تھی اور وہاں اس کے دیکھ لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جیری نے اسے دیکھ لیا ہوگا، اس نے اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جیری اس وقت اس کی آمد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، لہٰذا اس نے اسے نہیں دیکھا ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر جیری کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وین کی اگلی نشست پر ایک لیپ ٹاپ اور ایک سوٹ کیس رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے جینز، شرٹ اور ٹینس شوز پہن رکھے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کام پر نہیں بلکہ کہیں اور جارہا ہے۔ وہ اپنے گردوپیش سے خاصا محتاط نظر آرہا تھا اور وین کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ پارکنگ لاٹ کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے لینا کو شک گزرا کہ شاید وہ دیکھ لی گئی ہے۔

جیری نے وین اسٹارٹ کی اور پارکنگ لاٹ سے باہر آگیا۔ لینا نے بھی اپنی کار دائیں جانب موڑی اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ جیری کی وین اور اس کی گاڑی کے درمیان دو کاریں تھیں جو آگے چل کر دائیں جانب مڑ گئیں اور جب وہ ایک سگنل پر رکے تو لینا کی کار جیری کی وین کے بالکل پیچھے تھی۔ وہ تھوڑا سا پسنجر سیٹ کی

کھجور

☆ جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔
☆ توانائی فوری طور پر بحال کرتی ہے۔
☆ کمزوری دور کرتی ہے۔
☆ رنگ نکھارتی ہے۔
☆ خون پیدا کرتی ہے۔ دانتوں اور مسوڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔
☆ سر درد کے لیے مفید ہے۔
☆ زخموں کے لیے مفید ہے۔
☆ بلغم کو خارج کرتی ہے۔
☆ دل کے امراض کو رفع کرتی ہے۔
☆ معدے کے زخموں کے لیے مفید ہے۔
☆ قبض کا بہترین علاج ہے۔
☆ پیٹ کے کیڑے مارتی ہے۔

کھجور کھانے والے کی نظر کمزور نہیں ہوتی اور سب سے بڑھ کر کھجور کھانا سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

مرسلہ۔ رانا شاہد، سید اشریف (پھالیہ)

جانب جھک گئی اور سر پر رکھی ٹوپی آگے کرلی۔ اسے امید تھی کہ اگر جیری نے اپنی وین میں لگے بائیں جانب کے شیشے میں دیکھا تب بھی وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔

وہ جیری کی وین کا پیچھا کرتے ہوئے ساتویں اسٹریٹ پر واقع کیمبولاگ کے دفتر تک جاپہنچی۔ جیری نے اپنی وین پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور تبھی لینا کی نظر وین کی دائیں جانب لکھی ہوئی عبارت پر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بھی میڈولارک نرسری کے الفاظ تحریر ہوں گے لیکن وہاں عبارت مختلف تھی۔ اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ جیری جیمس تھارٹن سینئر اور اس کے نیچے چھوٹے حروف میں میڈولارک نرسری کے الفاظ درج تھے۔

اسے یاد آیا کہ ٹیڈ نے جہاز کی مالکن کا نام شیرون تھارٹن بتایا تھا جبکہ وین پر جیری جیمس تھارٹن سینئر کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ جس شخص سے ملاقاتیں کررہی تھی اس کا نام جیری جیمس جونیئر تھا۔ اگر اس کے نام میں تھارٹن کا اضافہ کردیا جائے تو ان تینوں کے بیچ ایک تعلق بنتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک پرانی وین تھی جو یقیناً ان کے باپ کی ملکیت رہی

ہوگی۔ شیرون اس کی بہن ہوگی۔ ٹیڈ نے بتایا تھا کہ اس کی اپنی ایک کمپنی بھی ہے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اسے اپنے کام پر پہنچنا تھا۔ وہ گھر واپس آئی تو اسے یاد آیا کہ اب جیفری سے اس کی ملاقات اگلے روز رات سے پہلے نہیں ہوسکتی کیونکہ انہوں نے پہلے سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یونیفارم تبدیل کرنے کے دوران اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ شام کو گھر واپس آنے کے بعد جیفری کے لیے چاکلیٹ کیک تیار کرے گی اور اسی بہانے آج رات ہی اس سے ملنے چلی جائے گی اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیلی فون کرکے اسے بتادے کہ شام کو اس کے لیے چاکلیٹ کیک لے کر آئے گی۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری جانب سے ایک گھسی پٹی آواز سنائی دی۔ ”یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے براہ کرم صحیح نمبر ملائیں۔“ لینا نے دو تین بار وہ نمبر ڈائل کیا لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا۔ یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو اس نے جیفری کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت لینا کو کام پر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے وہ جیفری کے اپارٹمنٹ پر نہیں رک سکی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ لنچ کے وقفے میں اسے چیک کرے گی۔

☆☆☆

اس نے اپنا ٹرک پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر واقع جیفری کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس کا پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا اور وہاں کوئی سامان نظر نہیں آرہا تھا، پھر اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

”میں اس عمارت کا منیجر ہوں۔“ وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میں جیفری جیمس سے ملنے آئی تھی۔“

”وہ آج صبح یہاں سے چلے گئے، انہیں اپنی نئی ملازمت پر پہنچنے کی جلدی تھی، کیا تم یہ اپارٹمنٹ لینا چاہ رہی ہو؟“

”نہیں، کیا مجھے اس کا نیا پتا معلوم ہوسکتا ہے؟“

”نہیں۔ انہوں نے چھ ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کردیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے نیا پتا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”اوہ۔ میں سمجھ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نیچے آگئی۔

لینا اپنے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں صبح کے وقت جیفری کی وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چھ گھنٹے پہلے جیفری کو دیکھا تھا لیکن اب وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ملے گا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ لنچ کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے کام پر روانہ ہوگئی۔

جب اس نے گزشتہ چند روز میں رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید پہلی بار ایسا ہوگا جب تعلق ختم ہوجانے کے باوجود بھی اس کی چھان بین جاری رہے گی۔ اگر واقعی وہ تعلق ختم ہوچکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تحقیقات جاری رہنی چاہئیں۔ وہ ایک بار پھر ائرپورٹ جائے گی اور اس وقت تک وہاں انتظار کرے گی جب تک شیرون نہ آجائے۔ وہ اس سے اس کے جہاز اور جیفری کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

”یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا۔“ شیرون نے ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ”میں کسی نہ کسی طرح مسٹر جیفری جیمس جونیئر کی حقیقت معلوم کرکے ہی رہوں گی۔“

پارکنگ لاٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا جہاں جیفری رہا کرتا تھا۔ اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے کسی کی اصلیت جاننے کی خواہش اس کے دل میں جوش مار رہی ہو۔

☆☆☆

امریکی ائرلائن کے جمبو 747 میں دوسری قطار والی نشست پر بیٹھا جیفری جیمسن تھارٹن جونیئر اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کررہا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لینا ڈون ووڈ... کو سام کے منشیات کے کاروبار کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ لہٰذا کیس نمبر 248 سرکاری طور پر بند کیا جاتا ہے۔“

جیفری نے فائل کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا اور لیپ ٹاپ بند کردیا۔ اسے یہ سوچ کر ہی شرم محسوس ہورہی تھی کہ لینا کسی جرم میں شریک ہوسکتی ہے۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ

چاہنے لگا تھا لیکن سام اور میکسیکو حکومت کے افسران کے درمیان رابطوں کا پتا چلانا بھی ضروری تھا۔ ایف بی آئی والے اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ سام اس چین کی آخری کڑی تھا۔ آج شام تک لینا کو سرکاری طور پر خط مل جائے گا جس میں اسے سرکاری طور پر اطلاع دی جائے گی کہ سام کے ساتھ اس کا کاروباری تعلق ثابت نہیں ہوسکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی ایک خط کے ذریعے اسے مطلع کردے گا کہ اسے دوسرے شہر میں نئی ملازمت مل گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح لینا مطمئن ہوجائے گی۔

اس کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ لینا اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی۔ جس طرح وہ ائرپورٹ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کررہی تھی۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ اپنے کام میں بے حد مشاق ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کے گزشتہ تجربات ہوں۔ جیفری گزشتہ دو برس سے ایف بی آئی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اور جب اس کے پاس لینا کی فائل آئی تو اس نے یہی مناسب جانا کہ لینا کی حقیقت جاننے اور سام سے اس کا کاروباری تعلق معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ خود سام کی جگہ لے اور لینا کا بوائے فرینڈ بن کر در پردہ اس کے بارے میں چھان بین کرے۔ اس بہانے اسے لینا کے اپارٹمنٹ میں جانے کا موقع ملا۔ اسے امید تھی کہ وہاں سے اسے کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا جس سے ظاہر ہوسکے کہ لینا، سام کے ساتھ منشیات کے کاروبار میں شامل تھی پھر اس نے ایک دن لینا کی غیر موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی اور وہ تمام فائلیں دیکھ ڈالیں جو لینا نے اپنے سابق بوائے فرینڈز کے بارے میں بنا رکھی تھیں، سام کی فائل میں اس کی عادات واطوار کے بارے میں تفصیلات، کچھ ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کے نمبر اور اس کی گرفتاری کے بعد شائع ہونے والے مضامین کے تراشوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ ملی۔ وہیں ایک فائل اس کے بارے میں بھی تھی جس سے وہ جان گیا کہ لینا اس کے بارے میں بھی چھان بین کر رہی ہے۔ واقعی وہ مہم جو فطرت رکھتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ لینا اس کی گرل فرینڈ نہیں بلکہ ایک مشتبہ لڑکی تھی جس کے بارے میں چھان بین کرنے کے لیے اسے یہ ذمے داری سونپی گئی تھی۔ یہ تحقیقات مکمل ہوچکی تھیں اور اب وہ اپنے ہیڈکوارٹر واپس جارہا تھا۔ البتہ صبح روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی بہن کے دفتر ضرور گیا تھا تاکہ بتاسکے کہ یہاں اس کا کام ختم ہوچکا ہے اور وہ اپنی دوسری ذمے داری سنبھالنے واپس جارہا ہے۔ اس نے اپنی بہن کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے اپنا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ شیرون کو بھی حقیقت نہیں بتاسکتا تھا۔ لہٰذا اس نے اسے ایک من گھڑت کہانی سنا کر مطمئن کردیا۔ اس میں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ سچ جاننے کے بعد شیرون کے دل میں لینا کے خلاف برائی بیٹھ جاتی اور وہ اس بات پر ناراض ہوسکتی تھی کہ لینا اس کی ٹوہ لینے کے لیے ائرپورٹ کیوں گئی جبکہ لینا نے پس پردہ رہ کر تمام چھان بین کی تھی۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ وہ بھی پس پردہ رہ کر لینا کے بارے میں چھان بین کرسکتا تھا۔ اس کا تعاقب کرکے معلوم کرسکتا تھا کہ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے اور اس کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں گھر کی تلاشی لے کر سام اور اس کے روابط کے بارے میں معلوم کرسکتا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس طرح غائب ہوجانے پر وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی، یقیناً وہ اسے بھی دھوکے باز اور فریبی ہی سمجھے گی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے لینا سے مل لیتا اور اسے کوئی بھی کہانی سنا کر وقتی طور پر مطمئن کرلیتا۔ اس طرح کم از کم آئندہ ملنے کی گنجائش تو باقی رہتی۔ لیکن وہ اس طرح کیوں سوچ رہا تھا؟ کیا واقعی وہ لینا سے محبت کرنے لگا تھا؟ اسے لگا جیسے واقعی وہ اس کے دل میں جگہ بنا چکی ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ واپس جاکر لینا کو اصل حقیقت سے آگاہ کردے کیونکہ وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ یہ اس کے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ لینا سب کچھ جاننے کے بعد اس سے نفرت کرنے لگتی اور وہ کبھی یہ گوارا نہ کرتا کہ لینا جیسی خوب صورت لڑکی اس سے نفرت کرے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ اس سارے قصے کو ایک خوب صورت خواب سمجھ کر بھلادے۔ اس نے تکیے سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور اپنے نئے کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کا کام ہی نہیں بلکہ محبوب مشغلہ بھی تھا۔ وہ ہر تحقیقات کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتا اور اسے مکمل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ اب وہ لینا کی طرف سے مطمئن ہوگیا تھا۔ جانتا تھا کہ چند روز بعد لینا کی میز پر ایک نئی فائل کا اضافہ ہوجائے گا اور وہ اپنے اٹھارویں بوائے فرینڈ کے بارے میں چھان بین کررہی ہوگی۔



بے ثمر مسافت

سلیم فاروقی

کہتے ہیں کہ صحبتوں سے شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن... جب شخصیت ہی پیاز کے چھلکوں کے مانند پرت پرت ڈھکی ہو تو کیسے کوئی تہ میں چھپی اصلیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ بھی اندر سے اتنا ہی گہرا تھا جیسے سمندر... اس کے احساسات میں جتنے مدوجذر، جذبات میں تلاطم اور خیالات میں بھنور تھے اتنا ہی وہ سمندر کی سطح کے مانند پُرسکون نظر آتا تھا... برسات کی بوندوں کی طرح کسی کی خاموش چاہت میں بھیگا ہوا کچی مٹی کے گھر میں رہ کر خوابوں کا تاج محل بنانے والا جب سمت بدل کر چلا تو قدموں کی لرزش میں منزل کے گم ہوجانے کا خدشہ نمایاں تھا۔ شومئی قسمت کہ ان بدلتی رتوں میں بہکی صحبتوں نے اپنا رنگ جمایا اور اسے کسی اور ہی منزل کا راہی بنا دیا۔ پھر تو شعور کی دنیا میں جو ناممکن تھا وہ سب کچھ بہ آسانی لاشعوری طور پر رقم ہوتا چلا گیا۔ اگر اس پر ماں کی دعا کا آنچل سایا نہ کرتا تو زمانے کی تپتی دھوپ اسے جلا کر خاک کر ڈالتی۔

منچلی چاہتوں، ادھوری رفاقتوں اور مکمل رقابتوں کی لہولہو داستان

ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سے مجھے عجیب سی وحشت، بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے اور میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا ہوں۔ مجھے یہ آواز بہت دور، ماضی کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ کیفیت ناقابلِ برداشت ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنی اس ذہنی کمزوری پر قابو پالیا۔ بے چینی اور اضطراب کا احساس اب بھی ہوتا ہے لیکن صورتِ حال اتنی ہولناک نہیں ہوتی۔

میں گزشتہ سات برس سے امریکا میں تھا۔ وہاں تو ٹرین میں سفر کرنا ہر شخص کی مجبوری ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا تھا لیکن ٹرین کا سفر میرے لیے خوش گوار نہیں ہوتا تھا۔ سفر کے دوران خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے پہلے اخبار اور رسائل کا سہارا لیا پھر میں نے اپنے سیل فون میں ہینڈ فری لگا لیا اور خاصی تیز آواز میں گانے سننے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ آہستہ آہستہ میری وحشت ختم ہوگئی اور میں ٹرین میں سفر کرنے لگا۔

میں انجینئر تھا اور امریکا کی ایک معروف انڈسٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ بی ای کی ڈگری ہونے کے باوجود مجھے یہاں نئے سرے سے انجینئرنگ کرنا پڑی تھی، کیونکہ ہمارے ملک کی بیچلرز ڈگری وہاں کے بیشتر اداروں میں قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو میں اس صورتِ حال سے گھبرا کر وہاں سے لوٹ آتا یا پھر ان کے معیار کے مطابق وہاں کی کسی یونیورسٹی سے بی ای کرتا۔ واپس آنے کا تو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد تو مجھے امریکا آنے کا موقع ملا تھا۔

ابا جی نے چلتے وقت اچھی خاصی رقم میرے حوالے کردی تھی۔ وہ پاکستان ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ رقم کہاں سے قرض لی تھی۔

''اجنبی ملک ہے، اجنبی جگہ ہے۔'' اباجی نے کہا۔ ''ایسے میں خدانخواستہ تمہیں کوئی ضرورت پیش آگئی تو کس سے مانگو گے؟''

''لیکن اباجی، یہ رقم تو نورین کے لیے تھی۔ وہ......''

''اللہ مالک ہے بیٹا۔'' اباجی نے کہا۔ ''پھر جب تک نورین کی شادی ہوگی تم بھی انشاء اللہ وہاں سیٹ ہو چکے ہوگے۔ کیا تم اپنی بہن کی شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے؟''

''میں اسی لیے تو سات سمندر پار جا رہا ہوں اباجی۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ آپ لوگوں کی خدمت کر سکوں۔'' اپنی شادی کے ذکر پر نورین شرما گئی تھی۔ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ عمر میں پورے دس سال چھوٹی تھی۔

اس دن میں دفتر سے واپس آ رہا تھا اور ہیڈ فون حسب معمول میرے کانوں میں ٹھنسا ہوا تھا کہ اچانک سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں اباجی کا نام تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔

''السلام علیکم اباجی!'' میں نے ہیڈ فون کا بٹن آف کرنے کے بعد کہا۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام بیٹا۔'' اباجی نے کہا لیکن ان کی آواز میں وہ والہانہ پن نہیں تھا جو میں سننے کا عادی تھا۔ میرا اسٹاپ بھی آچکا تھا۔ میں نے بریف کیس اٹھایا اور ٹرین سے باہر نکل آیا۔

''سب خیریت تو ہے اباجی؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔'' اباجی کا لہجہ کھوکھلا تھا۔ ''بس تمہاری ماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔''

''کیا ہوا ہے اماں کو؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''بیٹا اسے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ بخار کی حالت میں بار بار تمہارا نام لے رہی تھی کہ صفدر کو بلالو۔'' میں.... بے چین ہو گیا۔ میرا دل ان جانے وسوسوں سے دھڑکنے لگا۔

اباجی جیسے سمجھدار آدمی سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محض اماں کے بخار کی وجہ سے مجھے ٹیلی فون کر دیں گے۔ اماں جی تو اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بہت بیمار ہوئی تھیں لیکن مجھے اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب وہ صحت یاب ہو جاتی تھیں۔

''اباجی!'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''آپ مجھ سے کچھ چھپایئے مت، مجھے بتایئے کہ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری بات کرایئے ان سے۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا، وہ اس وقت تو راجا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے، ابھی آئے گی تو بات بھی کرادوں گا۔''

''اباجی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے اباجی کا نمبر کئی مرتبہ ملایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ نیٹ ورک کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ چھوٹے سے دو کمروں کا وہ اپارٹمنٹ میں نے اپنے ایک پاکستانی دوست لطیف کے ساتھ مل کر لیا تھا۔ لطیف وہاں کی ایک آئل کمپنی میں سپروائزر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔

''کیا بات ہے صفدر؟'' اس نے پوچھا۔ ''تو اتنا پریشان کیوں ہے؟''

''یار، ابھی کچھ دیر پہلے اباجی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے مزید تفصیل پوچھنا چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ اب نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے۔''

''پریشان مت ہو یار۔'' لطیف نے کہا۔ ''ماں جی انشاء اللہ خیریت سے ہوں گی۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے تو کیا ہوا۔ تو لینڈ لائن سے ٹیلی فون کرلے۔''

''ہاں یار! پریشانی میں مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔

''تو فکر مت کر۔ میں پرسوں پاکستان جا رہا ہوں، تیرے گھر جا کر سب کی خیریت معلوم کرلوں گا۔''

میں تو گویا اس کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے بریف کیس صوفے پر اچھالا اور ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اباجی کے سیل فون پر کال کروں پھر مجھے نورین کا خیال آیا۔ نورین مجھے صحیح صورتِ حال بتا سکتی تھی۔

میں نے نورین کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب میری نورین سے بات ہو سکتی تھی۔ تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد نورین نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو۔''

''رینو! میں صفدر بول رہا ہوں۔''

''السلام علیکم بھیا۔'' اس نے کہا۔ ''بڑی عمر ہے آپ کی۔ میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔''

''رینو! اماں کی طبیعت کیسی ہے؟ ذرا ان سے بات کراؤ۔'' میں نے کہا۔

''بھیا...... وہ اماں کی طبیعت...... ٹھیک ہے...... وہ......''

''مجھ سے جھوٹ مت بولو رینو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اماں کی طبیعت کیسی ہے؟''

نورین اچانک رونے لگی اور بولی۔ ''بھیا...... اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں لیکن ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔''

''اماں اسپتال میں ہیں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''ان کے ساتھ کون ہے؟''

''میں، اباجی اور راجا بھائی ہیں۔'' اس نے بتایا۔ راجا ہمارا پڑوسی تھا اور وہ ہمارے گھر کا بہت خیال رکھتا تھا۔

''بھیا...... اباجی کو مت بتایئے گا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ وہ آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن اماں بار بار آپ کا نام لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اپنے بیٹے کو فوراً یہاں بلالیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امریکا میں ہیں تو اس نے کہا کہ ٹیلی فون پر بیٹے سے ان کی بات کروادیں۔ اباجی نے آپ کا نمبر ملایا اور آپ سے بات کر ہی رہے تھے کہ اماں جی بے ہوش ہو گئیں۔''

''اماں اتنی بیمار ہیں اور اباجی اسے معمولی بخار کہہ کر مجھے بہلا رہے تھے؟ میں پاکستان آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ لطیف اس وقت پاکستان جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ وہ بہت غور سے میری باتیں بھی سن رہا تھا۔

''کیا ہوا صفدر؟'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''سب خیریت تو ہے؟''

''اماں کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اللہ رحم کرے گا۔'' لطیف نے کہا۔ ''لیکن تو دل چھوٹا مت کر۔ تو نے تو عورتوں کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیے۔''

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ''لطیف! میں بھی تیرے ساتھ ہی پاکستان چلوں گا۔''

''تو پہلے چھٹی تو لے لے۔''

''میں چھٹی لے لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تو اس فلائٹ میں ایک سیٹ مزید بک کروالے جس سے تو جا رہا ہے۔''

''یار! میں کوشش کرتا ہوں۔'' لطیف نے کہا۔ ''اس فلائٹ میں اب شاید ہی سیٹ ملے۔ میں نے تو ایک ہفتے پہلے سے سیٹ کنفرم کروالی تھی۔''

''تو بات تو کر۔ اس فضائی کمپنی میں تیرا کوئی دوست بھی تو ہے۔ ورنہ میں کسی دوسری فلائٹ سے جاؤں گا۔'' لطیف نے اسی وقت اپنے دوست سے بات کی اور تھوڑی بحث کے بعد بالآخر وہ سیٹ کنفرم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

''یار! تو پہلے چھٹی تو لے لیتا۔'' لطیف نے کہا۔ ''اگر تجھے چھٹی نہ ملی تو؟''

''تو پھر میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔ ملازمت تو مجھے دوسری بھی مل جائے گی لیکن ماں نہیں ملے گی۔'' میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا۔ وہ نورین کا فون تھا۔

''ہاں نورین!'' میں نے کہا۔ ''کیسی ہیں اماں؟''

''اماں کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔''

''اماں جی سے بات کراؤ میری۔'' میں نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اباجی کی آواز آئی۔

''ہاں صفدر بیٹا! اب تمہاری ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔ یہ رینو تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔''

''اباجی! اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے اور آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟'' میں نے شکایت کی۔

''دل کا دورہ کہاں، انجائنا کا معمولی سا اٹیک تھا بیٹا۔'' اباجی نے کہا۔

''میں پاکستان آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم پاکستان ضرور آؤ۔'' اباجی نے کہا۔ ''تمہیں دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ماں اب بالکل ٹھیک ہے۔'' پھر وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ میری جاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔

میری وہ رات بہت بے چینی اور اضطراب میں گزری۔ صبح آفس پہنچتے ہی میں نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست دے دی۔ کمپنی کا جی ایم خاصا معقول آدمی تھا۔ وہ میرے کام سے خوش بھی تھا پھر میں نے گزشتہ پانچ برس میں کوئی چھٹی بھی نہیں لی تھی۔ اس نے میری چھٹی منظور کرلی۔ اماں کی حالت بہتر ہونے کی خبر سن کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک دن تھا۔ میں نے اباجی، اماں اور رینو کے لیے بہت سارے تحفے خریدے۔ راجا اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی اور خالہ، ثمرہ، اس

کے شوہر اور بچے کے لیے بھی بہت سے تحفے خریدے اور روانگی کو تیار ہوگیا۔

جہاز میں سوار ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ فلائٹ براہِ راست اسلام آباد کی نہیں ہے بلکہ کراچی جارہی ہے۔ یہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم کراچی سے اسلام آباد کے لیے دوسری پرواز پکڑ سکتے تھے۔ لطیف کو کراچی میں کچھ کام تھا اسی لیے وہ اس فلائٹ میں آیا تھا۔

کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسلام آباد قومی ائرلائن کے پائلٹس نے ہڑتال کررکھی تھی اس لیے اس دن کوئی بھی پرواز نہیں تھی۔ اس دن کیا دوسرے دن بھی کسی پرواز کا ملنا مشکل تھا۔

لاؤنج میں اسلام آباد اور لاہور کے بہت سے مسافر حیران و پریشان بیٹھے تھے۔

''یار صفدر!'' لطیف نے کہا۔ ''اس فلائٹ کے چکر کو چھوڑ، ہم لوگ ٹرین کے ذریعے پنڈی چلتے ہیں۔ اس طرح کم سے کم کل تک پنڈی پہنچ جائیں گے۔ پائلٹ تو اپنی ہڑتال نہ جانے کب تک جاری رکھیں۔''

''یار! جیسا میں پاکستان کو چھوڑ کر گیا تھا اب بھی یہاں کے حالات ویسے ہیں بلکہ مجھے تو پہلے سے بھی بدتر لگ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بدتر؟'' لطیف نے کہا۔ ''بدترین، خبریں تو کچھ ایسی ہی قسم کی سننے کو ملتی ہیں۔'' لطیف نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی والے سے اسٹیشن چلنے کی بات کی تو اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ اس نے ہمیں موٹی آسامی سمجھ کر ڈالرز میں کرایہ مانگا۔

''او بھائی تو ہوش میں تو ہے؟'' لطیف نے کہا۔ ''تو پاکستان میں ہے یا امریکا میں؟''

''ناراض کیوں ہوتے ہو بادشاہو؟'' ڈرائیور نے کہا۔ ''آپ... کرایہ پاکستانی کرنسی ہی میں دے دینا۔'' پھر اس نے ہمارے سامان پر نظر ڈالی۔ ''آپ کے پاس تو بہت سامان ہے۔''

''تو پھر؟'' لطیف نے آنکھیں نکالیں۔

''کچھ نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا اور اتر کر ہمارا سامان ڈکی اور گاڑی کی چھت پر بنے ہوئے اسٹینڈ میں رکھنے لگا۔

اس وقت ٹریفک پولیس کا ایک اہل کار وہاں پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے چہرے پر بارہ بجنے لگے۔

''میٹر ڈاؤن کرلو۔'' اس نے ڈرائیور سے کہا اور اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! اگر یہ آپ سے زیادہ کرایہ مانگے تو آپ اس کی شکایت کرسکتے ہیں۔ کل سے اس کا داخلہ ائرپورٹ کی حدود میں بند ہوجائے گا۔''

ٹیکسی ائرپورٹ سے باہر نکلی تو ڈرائیور نے کہا۔ ''میرا میٹر خراب ہے جنابِ عالی! آپ جو مناسب سمجھو دے دینا۔''

میں نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس سے پوچھا۔ ''اس وقت لاہور کے لیے ہمیں کوئی گاڑی ملے گی؟''

''ایک گھنٹے بعد کراچی ایکسپریس جائے گی۔'' ڈرائیور نے کہا۔ میں مطمئن ہوگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ لاہور سے کوچ کے ذریعے جہلم جاؤں گا۔ جہلم سے چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہمارا گاؤں تھا۔ لطیف کا گاؤں مخالف سمت میں تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو مجھے ایک دفعہ پھر وہی مناظر یاد آگئے جو میں بچپن سے جوانی تک دیکھتا آیا تھا۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر چہل پہل کم ہوتی تھی لیکن بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر تو نفسانفسی کا عالم ہوتا تھا۔ مسافروں کی چیخ و پکار بچوں کا رونا، مردوں کی گھبراہٹ اور قلیوں کی بھاگ دوڑ۔ ابھی گاڑی آنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا لیکن اسٹیشن پر ایسا رش تھا جیسے وہاں کوئی جلسہ ہو رہا ہو۔

اچانک گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پھر مجھے ٹرین کے پہیوں کی مخصوص گڑگڑاہٹ سنائی دی تو مجھ پر ایک دم وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہی کیفیت جو پاکستان چھوڑنے سے قبل تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں تاکہ وہ آواز میرے کانوں میں نہ پڑے۔ میرا سانس پھولنے لگا اور وحشت کے باعث پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ میں وہاں سے بھاگنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ لطیف کی آواز آئی۔ ''صفدر! کہاں جارہے ہو؟'' میں نے وحشت زدہ انداز میں گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی گھبرا گیا۔

''تم ٹھیک تو ہو صفدر؟'' وہ گھبرا کر بولا۔

''یار! مجھے...... کچھ عجیب سی وحشت ہورہی ہے۔ میں......''

لطیف نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ہاتھ سے میرے چہرے کا پسینا صاف کیا پھر نزدیکی اسٹال سے کولڈ ڈرنک لاکر مجھے دی اور بولا۔ ''یہ پی لو اور تسلی رکھو یار۔ اماں جی بالکل خیریت سے ہوں گی۔'' وہ بےچارہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے اماں کی وجہ سے پریشانی ہے۔

''ہاں یار۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگایا اور بولا۔ ''پریشان مت ہو یار! اللہ سب خیر کرے گا۔''

مجھے اس گڑگڑاہٹ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سوجھا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس میں ہینڈ فری لگا کر ہیڈ فون کانوں میں لگا کر فل والیوم میں گانا چلا دیا۔

لطیف بہت غور سے میری حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرین کی گڑگڑاہٹ ختم ہوچکی تھی، اب بھی میرے کانوں میں ہیڈفون لگا ہوا تھا اس لیے مجھے باہر کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اسی وقت قلی آگیا اور لطیف سے کچھ کہنے لگا پھر اس نے ہمارے سوٹ کیس اور بڑے بڑے دو بیگ اٹھا لیے۔ چھوٹے بیگ اور بریف کیس ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے بہت مشکل سے اپنا بیگ اور بریف کیس اٹھایا ہوا تھا۔ لطیف نے وہ بھی میرے ہاتھ سے لے لیا اور کچھ بولا جو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن میں اس کی تقلید میں قلی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لطیف نے زائد رقم دے کر اے سی کلاس میں دو سیٹیں حاصل کی تھیں۔ ہم سیٹوں پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ میری حالت بھی اب کافی بہتر تھی۔ ابھی گاڑی کھڑی تھی اس لیے میں نے کانوں سے ہیڈفون نکال لیے۔

''یار! تجھے کیا ہوگیا تھا؟'' لطیف نے کہا۔

''اصل میں مجھے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے عجیب سی وحشت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

لطیف نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''ٹرین کی آواز سے وحشت......؟ لیکن یار! تیری تو زندگی اس آواز کو سنتے ہوئے گزری ہے۔ تیرے ابا جی اسٹیشن ماسٹر تھے نا؟''

''ہاں یار۔'' میں نے کہا۔ ٹرین نے ہارن بجایا تو میں نے لطیف سے کہا۔ ''یار! میں بہت تھکن محسوس کررہا ہوں۔ کچھ دیر آرام کروں گا۔'' یہ کہہ کر اوپر والی برتھ پر چڑھ گیا اور ہیڈفون دوبارہ کانوں میں ٹھونس لیے کیونکہ گاڑی نے رینگنا شروع کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ماضی کی فلم چلنے لگی اور میں آنکھیں بند کرکے نہ چاہتے ہوئے بھی ان مناظر میں کھو گیا۔

☆☆☆

ابا جی اسٹیشن ماسٹر تھے اس لیے مختلف شہروں میں ان کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ گاؤں میں ہماری تقریباً پچیس ایکڑ زمین اور ایک مکان تھا۔ وہ مکان اکثر بند ہی رہتا تھا۔ ابا جی کبھی چھٹی پر گاؤں آتے تو ہمارا مکان کچھ دن کے لیے آباد ہوجاتا تھا۔ ابا جی انتہائی اصول پرست اور دیانت دار انسان تھے۔ میں نے انہیں کبھی کوئی نماز یا روزہ قضا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں بھی ان ہی کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ یوں ہمارے گھرانے کو خاصا دین دار... کہا جاسکتا ہے۔ جب تک میں اسکول میں تھا، پنج وقتہ نماز کا عادی تھا۔ نورین نے تو بہت چھوٹی عمر میں نماز پڑھنا سیکھ لی تھی اور اماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی نماز کی پابندی کرتی تھی۔

اس ماحول میں بھلا اوپر کی آمدنی کا کیا سوال تھا۔ ابا زیادہ تر بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر ہی رہے لیکن وہ ملازمت بھی عبادت سمجھ کر کرتے تھے ورنہ میں جانتا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے اختیارات کیا ہوتے ہیں اور وہ چاہے تو اس کی اوپر کی آمدنی بہت ہوسکتی ہے۔

ابا جی کی قلیل تنخواہ میں بھی اماں گزارہ کرلیتی تھیں۔ ابا جی نے زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ یہاں سے بھی سال کے سال کچھ رقم اور اناج وغیرہ آجاتا تھا۔ قلیل آمدنی کے باوجود ابا جی نے کبھی مجھے کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میرے پاس اچھے سے اچھا لباس تھا، قیمتی گھڑی تھی اور بہترین سائیکل تھی۔ اس دور میں سائیکل رکھنا بھی بہت بڑی بات تھی۔ جس کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی، اسے تو لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا شمار اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

ہر باپ کی طرح ابا جی کی بھی یہ خواہش تھی کہ میں بہترین تعلیم حاصل کروں۔ میں نے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو ابا جی اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اسٹیشن پر ڈھیروں مٹھائی تقسیم کی۔ ہم لوگ ان دنوں لاہور میں تھے۔ ابا جی مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے، جبکہ مجھے آرمی میں جانے کا شوق تھا۔

میں نے ابا جی کی خواہش پر انٹرمیڈیٹ میں بھی پری انجینئرنگ کے مضامین رکھے تھے اور میرے نمبرز بھی بہت اچھے آئے تھے لیکن میں نے انجینئرنگ کالج میں داخلہ لینے کے بجائے آرمی میں درخواست دے دی۔ اب یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ آرمی میں میرا انتخاب نہ ہوسکا۔ مجھے آج تک اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مجھے کس بنیاد پر مسترد کیا گیا۔ میں پڑھنے میں ذہین تھا، میری انگلش بھی بہت اچھی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح انگلش لینگویج سینٹر تو ہوتے نہیں تھے۔ میں نے انگلش میں اپنے طور پر محنت کی تھی۔ اپنے انگلش کے ٹیچر سے روزانہ ان کے گھر پر پڑھنے جایا کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ مجھ سے انگلش میں بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم دوسروں سے بھی انگریزی میں بات کیا کرو۔ یہ مت سوچو کہ تم غلط بول رہے ہو یا صحیح، بس بولتے رہو۔ تمہاری انگریزی رواں ہوگی تو صحیح انگریزی بھی بولنے لگو گے۔

میں کالج میں اپنے دوستوں سے بھی انگلش میں بات کرتا تھا۔ وہ لوگ پہلے تو میرا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ بھی انگریزی میں بات کرنے لگے۔

فوج میں نہ جانے کا مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میرا دل ہر کام سے اچاٹ ہوگیا۔ میں سارا سارا دن آوارہ گھومتا رہتا۔ لاہور کا اسٹیشن کافی بڑا ہے۔ میں اسٹیشن پر چلا جاتا اور مختلف پلیٹ فارمز پر گھومتا رہتا۔ وہاں جتنے اسٹال والے تھے سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ میں رات گئے گھر میں داخل ہوتا اور دیر تک فلمی میگزین پڑھتا رہتا یا پھر ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا اور چار چار بجے تک ٹی وی دیکھتا رہتا پھر میں دوسرے دن بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ اٹھنے کے بعد میرا پھر وہی معمول ہوتا۔ میں منہ دھو کر ناشتا کرتا، بہترین کپڑے پہنتا اور آوارہ گردی کے لیے نکل جاتا۔ کبھی مال روڈ، کبھی انارکلی اور کبھی یوں ہی کسی پارک میں جا بیٹھتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ پارک میں بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے۔ میرے لیے سب سے دلچسپ وہ مالشیے تھے جو ایک اسٹینڈ پر مختلف تیلوں کی شیشیاں سجائے انہیں کھڑکاتے پھرتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے مالش بھی کرواتے تھے۔ پھر وہ کن میلیے تھے جو سر پر کپڑا اس انداز میں باندھتے تھے کہ ٹوپی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے پاس میلا سا ایک تھیلا بھی ہوتا تھا جس میں روئی، تیل اور چھوٹی موٹی شیشیوں میں خود ساختہ دوائیں ہوتی تھیں۔ وہ نہ صرف کانوں سے میل نکالتے تھے بلکہ اس شخص کو میل کی چھوٹی سی گولی دکھا کر کہتے تھے کہ آپ کے کان سے یہ میل نکلا ہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ کسی آدمی کے کان میں اتنا میل کیسے ہوسکتا ہے؟

ایک دن میرے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ میں کان صاف کروانے بیٹھ گیا۔ کن میلیے نے بہت مہارت سے سلائی میرے کان میں ڈالی اور اسے اندر دور تک لے گیا۔ مجھے بہت اچھا لگا لیکن میری نظر اس کے ہاتھوں پر تھی... بہ ظاہر میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن آنکھیں بہت خفیف سی کھول کر اس کے ہاتھوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اس نے مختلف قسم کی سلائیاں میرے کانوں میں ڈال کر گھمائیں پھر اس نے بہت چابک دستی سے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے ایک سلائی نکالی لیکن اس کے ساتھ ہی میل کی ایک چھوٹی سی گولی بھی نکال لی اور بولا۔

''دیکھیے بابو صاحب! آپ کے کان میں کتنا میل تھا۔ آپ کو کم سے کم ہفتے دس دن میں ایک دفعہ کان ضرور صاف کروانا چاہئیں۔''

''بکواس کرتے ہو تم...'' میں بپھر کر بولا۔ ''تم نے یہ میل میرے کانوں سے نکالا ہے؟''

''تو کیا یہ میں نے اپنے کانوں سے نکالا ہے؟'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں چیخ کر بولا۔ ''میں نے کل ہی ایک ای این ٹی سرجن سے اپنے کانوں کی صفائی کروائی ہے۔'' میں نے بھی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ''کیا تم اس ڈاکٹر سے بھی زیادہ ماہر ہو؟''

''کان صاف کروانے کے بعد آپ بہانے بنا رہے ہیں۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''پیسے تو تمہیں دینا ہی پڑیں گے۔''

''میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔ تم بے وقوف بناتے ہو لوگوں کو۔''

''سیدھی طرح سے پیسے نکال۔'' وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک تھپڑ رسید کردیا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ پڑا۔ ہمیں لڑتا دیکھ کر آس پاس کے دو تین کن میلیے اور مالشیے وہاں پہنچ گئے اور سب کے سب ایک دم مجھ سے لپٹ گئے۔

وہیں پارک کے ایک گوشے میں میری عمر کے کچھ لڑکے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پٹتا دیکھ کر وہ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا ڈپٹ کر بولا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑو اسے، ایک آدمی کو قتل کراتے آدمی مار رہے ہو؟'' اس لڑکے کی آواز سن کر ان لوگوں نے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے، کلائیوں اور چہرے پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر میرا جائزہ لیا پھر درشت لہجے میں بولا۔ ''کیوں مار رہے تھے اسے؟''

''انو بھائی! اس نے کان صاف کروائے اور پیسے بھی نہیں دے رہا ہے۔'' وہ کن میلیا بولا جس نے میرے کان صاف کیے تھے۔

''یہ جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے میرے کانوں سے نہیں بلکہ اپنے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے میل نکالا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو اس کا

کپڑا اتار کر دیکھ لیں۔ اس میں اب بھی میل کی گولیاں ہوں گی۔''

''اپنے سر سے کپڑا اتارو۔'' انو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سادہ لباس پولیس آفیسر ہے۔

''غلطی ہوگئی انو بھائی۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے معاف کردیں۔''

''معافی ان صاحب سے مانگو۔'' انو نے حکم دیا۔ ''اور ہمارے لیے گرما گرم چائے اور سموسے لے کر آؤ۔''

کن میلیا میری طرف گھوما اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''مجھے معاف کردیں۔'' پھر وہ تیزی سے چلا گیا۔

انو نے مجھ سے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں۔'' وہ مجھے ایک طرف لے گیا جہاں پانی کا نلکا لگا ہوا تھا۔ اس نے میرا منہ دھلوایا، میرے کپڑے صاف کیے اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہاں اس کے چار پانچ دوست پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ وہ سبھی اپنے حلیوں سے آوارہ اور نکمے لگ رہے تھے۔ انو البتہ خاصے معقول لباس میں تھا۔

اس نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ ''یہ مراد ہے، یہ عقیل ہے، یہ اشرف ہے لیکن ہم اسے شرفو کہتے ہیں اور یہ خالد ہے۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''میرا نام انور ہے لیکن لوگ مجھے انو کہتے ہیں، آپ کا کیا نام ہے؟''

''منصور۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ انو سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لاہور کا بہت خطرناک غنڈا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کو لوٹا تھا، ان پر تشدد کیا تھا اس پر کئی لڑکیوں کے اغوا اور زیادتی کا بھی الزام تھا لیکن اب تک کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہوسکا تھا اس لیے وہ آزادانہ شہر میں دندناتا پھرتا تھا۔

بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنی گرل فرینڈز سے ملوایا۔ ان میں سے ایک لڑکی فوزیہ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہوگئی۔ اس کا تعلق اوسط درجے کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ وہ گھر سے ملازمت کرنے نکلی تھی تاکہ اپنے بوڑھے والد کا ہاتھ بٹا سکے لیکن نہ جانے کیسے انو کے ہتھے چڑھ گئی۔ انو اس سے چھوٹے موٹے کام لیتا تھا اور اسے خاصا معقول معاوضہ دیتا تھا پھر فوزیہ کے بعد شہناز، سلمٰی اور عذرا میری زندگی میں آئیں۔ ان لڑکیوں کا انو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ میری دوست تھیں اور میری مردانہ وجاہت پر مرمٹی تھیں۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پہنچنے کو کہتا پھر خود بھی اسٹیشن پہنچ جاتا۔ لاہور اسٹیشن پر بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں کوئی بھی نہیں جاتا۔ مختلف ویران جگہوں پر بوگیوں کے ناکارہ ڈبے کھڑے ہوتے تھے۔ میں چونکہ ایس ایم کا بیٹا تھا اس لیے اگر کوئی مجھے اس طرف جاتے دیکھ بھی لیتا تو... بازپرس نہ کرتا۔ دو چار دفعہ بوگیوں کے ناکارہ ڈبے استعمال کرنے کے بعد تو میں بے خوفی سے یہ کام کرنے لگا۔

اب اکثر انو بھی وہیں آجاتا تھا۔ کبھی اس کے دوست بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر تاش کھیلتے، سگریٹ پیتے اور ایک دوسرے کو لڑکیوں کے قصے چٹخارے لے لے کر بتاتے۔ جی ہاں، انو کی صحبت میں رہ کر میں سگریٹ بھی پینے لگا تھا اور کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا تھا۔ اب میں اس کے ساتھ مختلف وارداتوں میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ میں فطرتاً نڈر تھا اور انو کے ساتھ رہ کر میں لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی طاق ہوگیا تھا۔

لاہور ہی میں میری ایک خالہ بھی رہتی تھیں۔ برسوں پہلے کسی بات پر اماں کے تعلقات ان سے خراب ہوچکے تھے اس لیے امی ان سے ملتی نہیں تھیں۔ میں بچپن میں ایک دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کا بہت بڑا گھر تھا۔ خالو خاصے دولت مند آدمی تھے۔ وہ بزنس کرتے تھے اور اس وقت ان کی آمدنی میرے اندازے کے مطابق لاکھوں میں تھی۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ اب تو مجھے ان کے نام یاد تھے نہ چہرے۔

ایک دن میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ اباجی بہت افسردہ اور پریشان گھر میں داخل ہوئے۔ اماں بھی انہیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔ ''کیا ہوا، خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے نسیمہ۔'' اباجی نے افسردگی سے کہا۔ ''تم پنڈی چلنے کی تیاری کرو۔''

''یااللہ خیر۔'' اماں گھبرا کر بولیں۔ ''بھائی جان کے یہاں تو سب خیریت ہے؟'' پنڈی میں میرے ماموں نثار رہتے تھے۔ وہ امی اور خالہ سے بڑے تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے، مجھ سے تو خاص طور پر بہت محبت کرتے تھے۔

''بھائی نثار......'' اباجی کہتے کہتے رک گئے۔

''کیا ہوا بھائی جان کو؟'' اماں روہانسی ہوگئیں۔

''بھائی نثار...... اب اس دنیا میں نہیں رہے۔'' اباجی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہائے میرا ویر۔'' اماں نے کہا اور چکرا کر گرنے ہی والی تھیں کہ میں نے لپک کر انہیں تھام لیا اور اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ خود میرا دل بھی غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ نورین بھی غم

سے نڈھال تھی۔

ہم لوگ اسی دن پنڈی پہنچ گئے۔ ماموں سفرِ آخرت کے لیے تیار تھے۔ شام تک میں اپنے محبت کرنے والے ماموں کو منوں مٹی تلے دبا کر واپس آگیا۔ ماموں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر مجھے مزید اذیت ہو رہی تھی۔ وہاں خالہ زینت بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی۔ خاندان کے کچھ بزرگوں نے اماں اور خالہ زینت کی صلح کروا دی پھر تو وہ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر یوں بلک بلک کر روئیں کہ وہاں موجود ہر آدمی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ بھائی کی جدائی کا غم تھا یا بہن سے برسوں نہ ملنے کا صدمہ...... دونوں رو رو کر نڈھال ہو گئیں تو پھر مامی نے ان دونوں کو سنبھالا۔

زینت خالہ کی دونوں بیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں لیکن میں نے ابھی تک کسی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کس کے گھر سے کھانا آگیا۔ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن دوسروں کے اصرار پر مجھے دسترخوان پر بیٹھنا پڑا۔ ابھی میں نے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ میرے منہ میں آگ سی لگ گئی۔ قورمے میں اتنی مرچیں تھیں کہ میرے حلق سے لے کر کانوں تک میں آگ لگ گئی۔ میں نے گھبرا کر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اسی وقت ایک خوب صورت ہاتھ میری طرف بڑھا۔ اس میں پانی کا گلاس تھا۔ میں نے گلاس لے کر پانی دینے والی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بلا کی حسین اور پُرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔ اسے دیکھ کر میں پانی پینا بھول گیا۔ وہ ایک عجیب شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ میں چند لمحوں تک گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا پھر مجھ میں دوسرا لقمہ لینے کی جرأت نہ رہی اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

شام تک ماموں جان کے تمام دوست احباب اور ان کی فیملیز چلی گئیں۔ اماں نے مجھے بلایا۔ وہ اس وقت بھی زینت خالہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ''صفدر!'' اماں نے کہا۔ ''تم نے انہیں پہچانا؟'' انہوں نے خالہ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے خالہ زینت کو برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن نہ پہچاننے کا کیا سوال تھا۔ میں نے کہا۔ ''اماں! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ خالہ زینت ہیں۔''

''ارے، یہ صفدر ہے؟'' خالہ نے کہا۔ ''ماشاء اللہ یہ تو اپنے اباجی سے بھی لمبا ہو گیا۔''

''اور ہینڈسم بھی۔'' میرے پیچھے سے کسی لڑکی کی آواز آئی لیکن وہاں خاندان کی کئی لڑکیاں تھیں اس لیے مجھے علم نہ ہو سکا کہ یہ جملہ کس کا تھا۔

''ثمرہ!'' خالہ نے کسی کو آواز دی۔ ''اِدھر آؤ۔'' وہی شعلہ جوالہ چہکتی ہوئی وہاں آگئی۔ ''یہ تیری نسیمہ خالہ کا بیٹا صفدر ہے۔'' خالہ نے کہا۔ ''اور یہ میری بڑی بیٹی ثمرہ ہے۔''

ثمرہ نے بے نیازی سے مجھے دیکھا پھر رسمی انداز میں سلام کر کے امی ہی کے پاس بیٹھ گئی۔

''نورین سے تو تم مل ہی چکی ہو۔'' خالہ نے کہا۔

''امی، میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔'' اچانک خوب صورت سی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ اس کے چہرے اور سراپا دونوں میں ثمرہ کی شباہت تھی لیکن حسن، دلکشی اور بانکپن میں ثمرہ اس سے کہیں آگے تھی۔

''میں خود اپنا تعارف کروا دیتی ہوں۔'' اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ ''صفدر بھائی! میں آپ کی کزن یعنی خالہ زاد ورشا ہوں۔'' اس کے انداز میں بچکانا پن تھا۔ یہ ثمرہ سے میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی مجھے گویا گھائل کر دیا تھا۔

ہم لوگ ماموں جان کے سوئم کے بعد واپس آگئے البتہ اماں وہیں رک گئی تھیں۔ لاہور آنے کے بعد میری نظروں میں وہی منظر گھومتا رہتا کہ ثمرہ مجھے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے پانی کا گلاس پیش کر رہی ہے۔ چند دن بعد اماں بھی لوٹ آئیں اور نورین بھی۔ چند ہی دنوں میں وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ میں نے کچھ دن تو ماموں جان کی موت کا سوگ منایا پھر میرے وہی معمولات شروع ہو گئے۔

ایک دن رات گئے میں گھر میں داخل ہوا تو اباجی کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں اپنا نام سن کر چونک گیا۔ اباجی کہہ رہے تھے۔ ''تم کس منہ سے صفدر کا رشتہ لے کر زینت کے یہاں جاؤ گی۔ صاحب زادے سوائے آوارہ گردی کے اور کرتے بھی کیا ہیں؟ یوں بھی بھائی مشتاق کاروباری آدمی ہیں۔ وہ بھلا یہ گھاٹے کا سودا کیوں کرنے لگے؟''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا صفدر تو لاکھوں میں ایک ہے...... شہزادہ لگتا ہے بالکل۔''

''کوئی بھی ذی ہوش شخص کسی کنگال شہزادے کو اپنی بیٹی نہیں دیتا۔ ثمرہ تو پھر خوب صورت ہے۔ دولت مند باپ کی بیٹی ہے اور ایف ایس سی کر رہی ہے۔ ہاں اگر صاحبزادے میرے مشورے پر عمل کرتے اور انجینئرنگ پڑھ رہے ہوتے تو اس صورت میں شاید یہ رشتہ لے جانے پر میں بھی اعتراض نہ کرتا اور عین ممکن ہے کہ صفدر کے تابناک مستقبل کو دیکھ کر بھائی مشتاق بھی انکار نہ کرتے۔''

میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آگیا۔

وہ رات میں نے گویا انگاروں پر گزاری۔ اباجی واقعی سچ کہہ رہے تھے۔ میں آخر تھا بھی کیا؟ ایک آوارہ اور لفنگا جو سگریٹ پیتا تھا اور لڑکیوں کی عزت بھی پامال کرتا تھا۔ اباجی کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ ان کے علم میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ میں جرائم کی راہ پر بھی چل پڑا ہوں اور اپنے ساتھ ہر وقت پستول بھی رکھتا ہوں۔

میں رات بھر سگریٹ پھونکتا رہا اور ثمرہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اذانِ فجر بلند ہوئی تو میں نے برسوں بعد نمازِ فجر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر برا کام چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دوں گا اور خود کو ثمرہ کے قابل بناؤں گا۔ صبح کی نماز کے بعد اباجی واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس دن میں نے اباجی کے ساتھ ہی ناشتا کیا اور ان سے کہا۔ ''اباجی! کیا اب بھی میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو سکتا ہے؟''

اباجی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولے۔ ''بیٹا! ایک سال تو تم نے آوارہ گردی میں ضائع کر دیا ورنہ تمہارے نمبر تو ایف ایس سی میں اتنے اچھے تھے کہ تمہیں انجینئرنگ میں داخلہ بہت آسانی سے مل جاتا۔''

''اباجی! اگر کوئی طالبِ علم بیمار ہو جائے تو کیا اس پر تعلیم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''لیکن بیٹا! تم تو بیمار نہیں تھے۔ میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر یونیورسٹی میں اگر گنجائش بھی ہو تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگیں گے۔ تمہیں میڈیکل سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟''

''اباجی! میرے ایک دوست کے بھائی ڈاکٹر ہیں، میں ان سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لے لوں گا۔'' میں نے کہا حالانکہ میرا ایسا کوئی دوست نہیں تھا جس کے بھائی ڈاکٹر ہوں لیکن میں سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتا تھا۔

''ویسے تمہیں بروقت خیال آیا ہے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے شروع ہونے ہی والے ہوں گے۔''

میں اسی دن یونیورسٹی چلا گیا اور جا کر پرنسپل صاحب سے ملا۔ وہاں میرے اعتماد سے زیادہ میری انگریزی بولنے کی صلاحیت کام آئی۔ میں نے بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی پاس کیا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے بھی یہی کہا کہ میں گزشتہ سال عین اس وقت بیمار پڑ گیا تھا جب داخلے ہو رہے تھے۔

پرنسپل صاحب نے کہا۔ ''آپ جیسے بہترین طالبِ علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دے کر مجھے خوشی ہوگی۔ آپ اپنی بیماری کا میڈیکل سرٹیفکیٹ تو لا ہی سکتے ہیں؟''

''شیور سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں کل ہی آپ کو سرٹیفکیٹ لا دوں گا۔''

''کل نہیں، آپ سات تاریخ کو اپنے کاغذات مجھے لا کر دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کا ایڈمیشن ہو جائے۔''

میں نے اس روز انو سے کہا۔ اس نے مجھے شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ لا دیا اور بولا۔ ''تو پانچ مہینے تک بیمار رہا ہے۔ تیرے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور چکر بھی آتے تھے لیکن اب علاج کے بعد تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔''

یوں میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو گیا۔ یہ گویا ایک معجزہ تھا ورنہ انجینئرنگ اور میڈیکل میں تو اچھے سے اچھے طالبِ علم کو ایڈمیشن نہیں ملتا۔ یہ شاید میری اس دعا کا اثر تھا یا اباجی کی دیانت داری کا......

میں دوبارہ پھر اسی شد و مد سے پڑھنے لگا۔ میں نے سب آوارہ لڑکوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ میں نے کسی بھی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ بس ایک انو سے میری دوستی تھی۔ وہ بھی میری مجبوری تھی۔ میں اس سے دوستی ختم کرتا تو وہ میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہاں، اس نے مجھ پر اتنا کرم ضرور کیا کہ وہ میری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ اسٹیشن کی ناکارہ بوگیوں والا ٹھکانا اب ختم ہو گیا تھا۔

میں اب اکثر خالہ زینت کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ ان کا محل نما گھر اب پہلے سے زیادہ آراستہ تھا۔ خالو مشتاق کے پاس جدید ماڈل کی ہنڈا سٹی تھی۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس سائیکل تھی۔ مجھے وہاں سائیکل پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے میں بسوں میں دھکے کھاتا ہوا وہاں جاتا تھا اور کچھ فاصلے پر اتر کر ٹیکسی لے لیتا تھا تاکہ وہاں رہنے والوں کو میری کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔

میں جب بھی خالہ کے گھر جاتا، ثمرہ بہت کم میرے سامنے آتی تھی۔ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ بے نیازی سے سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی۔ اس کے

برعکس رمشا بہت باتونی اور شوخ لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی۔ میں بھی اسے بچی سمجھ کر ہی بات کرتا تھا۔ وہ اس وقت آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

میں اس دن یونیورسٹی سے واپس آیا ہی تھا کہ خالہ زینت آگئیں۔ حسب معمول رمشا ان کے ساتھ تھی، ثمرہ نہیں آئی تھی۔ اماں نے بہت والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا پھر شکایتاً بولیں۔ ''باجی! کیا ثمرہ آدم بیزار ہوگئی ہے یا تم نے اسے پردہ کرانا شروع کردیا ہے؟''

''ارے نسیمہ! اس لڑکی پر تو پڑھائی کا بھوت سوار ہے۔ وہ کالج میں اول پوزیشن لینے کی تیاری کررہی ہے۔''

میں خالہ زینت سے مل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رمشا میرے پیچھے پیچھے ہی آگئی۔ اس نے چہک کر کہا۔ ''ہیلو کزن! کیسے ہیں آپ؟''

''رمشا! میں تم سے پورے گیارہ سال بڑا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم تو مجھ سے یوں بات کرتی ہو جیسے میرے برابر کی ہو۔'' میں نے کہا۔

رمشا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''آپ مجھ سے گیارہ سال بڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اور اگر آپ کو مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو میں بھی آئندہ بات نہیں کروں گی۔''

''اوہو، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ سے گیارہ سال چھوٹی ہوں تو کیا ہوا۔ کیا میں بزرگوں کی طرح آپ کا احترام کروں؟''

اسی وقت نورین اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی اور بولی۔ ''تم یہاں گھسی بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں تلاش کررہی ہوں۔'' پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''بھیا! ذرا خالہ جان کے ڈرائیور کو بھی چائے وغیرہ دے آئیں۔'' میں خالہ کے ڈرائیور کو چائے دینے گیا تو گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ گاڑی تو نہیں تھی جو خالو مشتاق کے استعمال میں رہتی تھی۔

خالہ جان تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اماں سے بولیں۔ ''نسیمہ! کبھی تم بھی ہماری طرف آجاؤ۔ میرا بھانجا تو اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔''

''میں بھی آؤں گی باجی۔'' اماں نے کہا۔ ''بس گھر کے بکھیڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔'' میرا دل چاہا کہہ دوں کہ آپ کی طرح ہمارے گھر میں نوکر نہیں ہیں لیکن میں یہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد اماں گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئیں۔ نورین ہنستی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی۔ ''بھیا! آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ آپ آئس کریم کھلانے کا وعدہ کریں تو بتاؤں گی۔''

''تجھے آئس کریم کھانا ہے تو ویسے ہی کھالے۔ بہانے بازیاں کیوں کررہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس واقعی ایک خبر ہے۔ آپ سنیں گے تو اچھل پڑیں گے۔'' اس نے کہا۔

''چل پھر تیری آئس کریم پکی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اگر وہ خبر تیری دوسری باتوں کی طرح فضول ہوئی تو آئس کریم نہیں ملے گی۔''

''اماں اور خالہ آپ کی شادی کی بات کررہی تھیں۔'' نورین مسکرا کر بولی۔

''میری شادی کی بات؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں، وہ دونوں تو بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں لیکن میں اس وقت برآمدے میں تھی اس لیے ان کی باتیں سن لیں۔''

''ارے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ اماں کو تو کب سے میری شادی کی فکر ہے۔'' میں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

''نئی بات یہ ہے کہ وہ دونوں آپ کی اور ثمرہ باجی کی شادی کی بات کررہی تھیں۔''

میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔ ''میری اور ثمرہ کی شادی؟''

''دیکھا، کیسے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔''

''پوری بات بتا۔'' میں نے اس سے کہا۔

''پوری بات تو بتادی۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

''مجھے تفصیل سے بتا، وہ کیا باتیں کررہی تھیں؟''

''وہ......'' نورین سوچتے ہوئے بولی۔ ''اماں نے خالہ جان سے کہا کہ باجی، آپ کو یاد ہے میں نے ثمرہ کو بچپن ہی میں صفدر کے لیے مانگ لیا تھا۔ خالہ جان نے کہا ہاں مجھے یاد ہے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ ثمرہ کی شادی صفدر سے کردوں لیکن صفدر اپنے پیروں پر تو کھڑا ہوجائے۔ ملک صاحب کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔'' وہ خالو مشتاق کو ملک صاحب کہتی تھیں۔

''صفدر بیٹا انجینئر بن جائے گا تو وہ بھی انکار نہیں کریں گے۔ صفدر کو ناپسند تو وہ نہیں کرتے۔''

نورین کی باتیں سن کر میرا دل گویا بے قابو ہوا جارہا تھا۔ منزل خود ہی میرے نزدیک آرہی تھی۔

میں نے رینو کو چڑانے کے لیے کہا۔ ''یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے اور ثمرہ جیسی تو نہ جانے کتنی لڑکیاں یونیورسٹی میں میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔''

''اب آپ اپنے وعدے سے پھریں مت۔'' نورین نے کہا۔ ''ہاں اگر آپ کو ثمرہ باجی پسند نہیں ہیں تو آپ اماں سے انکار کردیں۔''

''اماں کی پسند ہے وہ۔ میں بھلا کیسے انکار کرسکتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''خبر تو ایسی کوئی خاص نہیں ہے لیکن آئس کریم تو تجھے کھلانی ہی پڑے گی۔'' اس دن کے بعد تو میں ثمرہ کے عشق میں مزید ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میں اب لاشعوری طور پر خالہ جان کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن ثمرہ کا رویہ عجیب تھا۔ وہ کبھی سامنے آجاتی تو بہت شائستہ انداز میں سلام کرلیتی ورنہ میرے سامنے نہ آتی۔ چاہے میں گھنٹوں وہاں بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کا یہ رویہ عجیب سا لگتا تھا۔ مجھے تو اپنی مردانہ وجاہت پر بہت ناز تھا۔ کوئی بھی لڑکی مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی پھر ثمرہ ایسا کیوں کررہی تھی؟ کیا اسے بھی علم ہوگیا تھا کہ خالہ جان اس کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں؟ کیا وہ مجھ سے شرماتی ہے یا پھر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟ اس کے برعکس رمشا ہمیشہ میرے اردگرد منڈلاتی رہتی۔ میں اس سے ثمرہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ مجھے معلوم ہوجاتا کہ ثمرہ کو کون سا رنگ پسند ہے تو وہی رنگ میری پسند بھی بن جاتا۔ کریلوں سے مجھے شدید چڑ تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ قیمہ اور کریلے ثمرہ کی پسندیدہ ڈش ہے تو میں قیمہ اور کریلے بہت رغبت سے کھانے لگا۔ رمشا نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ ثمرہ باجی کو سفید کاٹن کا کلف دار شلوار سوٹ پسند ہے تو میں ان کے یہاں سفید براق کاٹن کی کلف دار شلوار قمیص پہن کر جانے لگا۔

میں جتنا اس کے نزدیک ہونا چاہ رہا تھا، وہ اتنا ہی مجھ سے کتراتی تھی۔ ثمرہ نے بی ایس سی کیا تو واقعی اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ میں یہ خبر سنتے ہی بازار کی طرف بھاگا اور اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسوں سے ثمرہ کے لیے انتہائی خوب صورت اور قیمتی گھڑی خریدی اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

اس دن میری قسمت اچھی تھی کہ ثمرہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں مجھے سلام کیا اور اندر کی طرف جانے لگی تو میں نے پہلی دفعہ اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے رک کر بیزاری سے میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''جی، کہیے؟''

''ثمرہ! میں تمہیں امتحان میں کامیابی کی مبارک باد دینے آیا ہوں اور تم اندر جارہی ہو۔''

''جی بہت شکریہ۔'' یہ کہہ کر وہ پھر اندر جانے کے ارادے سے پلٹی۔

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''اپنا تحفہ تو لیتی جاؤ۔'' میں نے خوب صورت پیکنگ میں لپٹا ہوا گھڑی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔

''سوری صفدر بھائی۔'' اس نے کہا۔ ''میں...... یہ گفٹ......'' اسی وقت خالہ جان آگئیں، وہ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔

میں نے خالہ جان کو سنانے کے لیے کہا۔ ''بھئی یہ تمہاری کامیابی کا انعام ہے۔ تم اسے لینے سے انکار کررہی ہو۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے گھڑی کا ڈبا میرے ہاتھوں سے لے لیا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے پھر کہا اور اپنا لایا ہوا مٹھائی کا ڈبا کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ ''خوشی کے موقع پر تو منہ میٹھا کرتے ہی ہیں نا!'' اس نے پھر خالہ کی طرف دیکھا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اوہو، مٹھائیاں کھلائی جارہی ہیں؟'' رمشا نے کہا۔

''میں بھی تو امتحان میں پاس ہوئی ہوں، میرا گفٹ کہاں ہے؟'' اس نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا۔

''تم نے کوئی پوزیشن نہیں لی ہے۔'' خالہ جان نے اسے گھورا۔

''اچھا تو تحفہ لینے کے لیے پوزیشن لینی پڑتی ہے۔'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے، اب میں بھی آپ کو پوزیشن لے کر دکھاؤں گی۔'' وہ یہ کہہ کر پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

''عجیب اول جلول لڑکی ہے۔'' خالہ جان نے کہا۔ ''ثمرہ والی تو کوئی بات بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ جتنی بردبار ہے۔ یہ اتنی ہی شوخ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔''

''خالہ جان! رمشا ابھی بچی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بڑی ہوگی تو یہ بھی ثمرہ کی طرح بردبار ہوجائے گی۔'' میں پھر وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ اب میں سارا دن بھی یہاں بیٹھا رہوں تو ثمرہ میرے سامنے نہیں آئے گی۔

میں نے اس دن ایک کام اور کیا تھا۔ گھڑی کے ساتھ ایک کاغذ پر ایک شعر بھی لکھ دیا تھا۔ ''مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں...... تب خاک کے پردے سے

انساں نکلتے ہیں۔'' میں نے ہمت کر کے یہ شعر ثمرہ کو دے تو دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ اس پر کچھ اثر ہوگا بھی یا نہیں۔ رمشا نے بتایا تھا کہ ثمرہ باجی شاعری کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اگر اسے شعر و شاعری کا شوق تھا تو یقیناً یہ شعر بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا اور میرا شکوہ بھی۔

میں ان دنوں انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں تھا اور ثمرہ ماسٹر .... کررہی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میرے امتحانات ختم ہوئے تو مختلف کمپنیوں سے ملازمت کی پیشکش ہونے لگی۔ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ابا جی نے بھی یہی کہا تھا۔ ''بیٹا! جلدی مت کرنا۔ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اپنے اساتذہ سے مشورہ بھی ضرور کرنا۔''

☆☆☆

ان ہی دنوں میرے دل پر گویا بجلی گر پڑی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ خبر سن کر میں زندہ کیسے رہا۔ میرے دل کی حرکت بند کیوں نہ ہوگئی۔ ابھی میں نے ملازمت کی بھی نہیں تھی کہ اماں سے صبر نہ ہوسکا۔ وہ ثمرہ کا رشتہ لے کر خالہ جان کے یہاں پہنچ گئیں۔

انہوں نے رشتے کی بات کی تو مشتاق خالو نے انتہائی رعونت سے انکار کردیا اور بولے۔ ''معاف کرنا نسیمہ! تم میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ میری بیٹیاں عیش و آرام اور ناز و نعم کی عادی ہیں۔ تمہارا بیٹا ان کے اخراجات کہاں سے پورے کرے گا؟''

''میرا بیٹا اب ماشاء اللہ انجینئر ہوجائے گا۔'' اماں نے فخر سے کہا۔

''تب بھی کتنا کمالے گا؟'' خالو مشتاق نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس کی تنخواہ سے میری بیٹی کے دو جوڑے بھی نہیں آئیں گے۔ انسان کو رشتہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی کرنا چاہیے۔ آپ بھی کسی کلرک یا اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کا رشتہ دیکھیں۔''

اماں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کرسکتی تھیں۔ وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ خالہ جان انہیں روکتی ہی رہ گئیں لیکن اب رکنے کا کیا جواز تھا؟

یہ سب تفصیل مجھے نورین نے بتائی تھی۔ وہ اماں کے ساتھ گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن رک گئی ہو اور ذہن مفلوج ہوگیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے زندگی کا احساس ہوا تو مشتاق خالو کی باتیں یاد کر کے میرا خون کھولنے لگا۔ انکار کرنے کے اور بھی بہت سے مہذب طریقے ہوتے ہیں۔ انہیں اماں کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

میں اسی وقت گھر سے نکل گیا اور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں اسی دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا جہاں سے ثمرہ کی یک طرفہ محبت کھینچ کرلے گئی تھی۔ یہ میری یک طرفہ محبت ہی تو تھی ورنہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک میں اسے اپنے عشق میں گرفتار کرچکا ہوتا پھر اس کا دولت مند باپ میری ماں کی بے عزتی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ لڑکی تن کر اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہوجاتی لیکن ثمرہ نے تو کبھی مجھ سے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی۔ کھل کر بات کرنا تو دور کی بات ہے، اس نے تو اس پورے عرصے میں مجھ سے صرف چند جملے ہی بولے ہوں گے۔

میں جتنا ثمرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میرے تصور میں اماں کا بے بس چہرہ تھا۔ جب مشتاق خالو نے انہیں دھتکارا ہوگا تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

میں شام تک اسٹیشن پر یوں ہی غیر ارادی طور پر بھٹکتا رہا اور وہاں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں کئی لڑکیاں بے انتہا خوب صورت تھیں لیکن ان میں ثمرہ جیسی کوئی نہیں تھی۔

رات کو میں تھکا ہارا گھر آرہا تھا کہ انو مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک ہوٹل میں چلا گیا اور بولا۔ ''کیا بات ہے صفدر...... تو کچھ پریشان ہے؟''

میں اپنے دل کا حال کہہ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ انو نے پوچھا تو میں نے اسے سب کچھ بتادیا۔

''یار! اس گنجے کی یہ مجال۔'' خالو مشتاق گنجے تھے۔ انو بھی انہیں جانتا تھا۔ ان کا گاڑیوں کا ایک شوروم بھی تھا۔ انو ان سے بھتا لیا کرتا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انو میرا دوست ہے ورنہ وہ بہت پہلے میرا داخلہ اپنے گھر میں بند کرچکے ہوتے۔

''یار! ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''یار! اس حرام زادے نے دولت کے نشے میں ڈوب کر اماں کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تو ان کی یہ بے عزتی برداشت کرلے گا؟''

''وہ تو مجھے برداشت کرنا پڑے گی۔'' میں نے

کہا۔ ''اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میں اس مشتاق کو گولی ماردوں؟''

''اسے مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔'' انو نے کہا۔ ''ورنہ اسے تو میں کل ہی گولی ماردوں گا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہے، میں اس کے ساتھ ایسا کروں گا کہ وہ اپنی موت آپ مرجائے گا۔''

''کیا کرے گا تو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس کی بیٹی کو اٹھالوں گا۔ کیا نام بتایا تو نے ثمرہ؟''

''تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔'' میں نے بھڑک کر کہا۔

''یار! پوری بات سنے بغیر بیچ میں مت بول۔'' انو نے کہا۔ ''کوئی بھی لڑکی ایک دو رات گھر سے باہر رہے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ تو فکر مت کر اس کی عزت پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔ میں اسے صرف دو دن تک رکھنے کے بعد دوبارہ گھر چھوڑ دوں گا پھر وہ گنجا اس کی شادی تجھ سے کرنے پر راضی ہوگا...... میں اس کے جاننے والوں میں یہ مشہور کروادوں گا کہ سیٹھ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''لیکن یار! میرا دل نہیں مانتا۔'' میں نے کہا۔ ''ثمرہ تو یہ بے عزتی برداشت ہی نہیں کرسکے گی۔''

''اس میں ثمرہ کی بے عزتی کہاں ہوگی۔'' انو نے کہا۔ ''وہ تو بہت آرام سے بڑی حفاظت میں رہے گی۔''

''انو! یہ کام بہت خطرناک ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا خطرناک ہے یار؟'' انو نے منہ بنا کر کہا۔ ''تو کیا مجھے جانتا نہیں ہے۔ کیا میں نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کیے اور اب تو میں نے پورا ایک گینگ بنالیا ہے۔ اب اس شہر پر تیرے بھائی کا راج ہے۔'' اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''کوئی الو کا پٹھا دولت کے نشے میں چور ہوکر میری ماں کی بے عزتی کردے، میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں نے تجھے دوست کہا ہے تو تیری ماں میری ماں بھی تو ہوئی۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں خود انتقام کی آگ میں سلگا ہوا تھا اس لیے مجھے اس کی ہر بات ٹھیک لگ رہی تھی۔

''اب تو مجھے اس کے اسکول کا پتا بتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اسے راستے ہی سے اغوا کرلوں گا۔''

''یار، وہ اسکول میں نہیں کالج میں پڑھتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بس میں یا پیدل نہیں جاتی ہے بلکہ ان کا ڈرائیور ہوتا ہے، وہ گاڑی میں جاتی ہے۔''

''تو ڈرائیور کہاں کا رستم ہوگا۔ میں گاڑی روک کر سرعام اسے اٹھوالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کا جھٹکا بھی کردوں گا تاکہ اس سیٹھ کے دل پر دہشت طاری ہوجائے۔''

''نہیں یار۔'' میں نے کہا۔ ''کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈرائیور ہی تو گھر جا کر اس کے اغوا کی خبر دے گا۔''

''چل، تو کہتا ہے تو ڈرائیور کو بخش دیتا ہوں۔'' میں نے اسے ثمرہ کے کالج کا پتا بتادیا۔ خالو مشتاق کے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور اسے بتایا کہ ان کے پاس کس میک اور ماڈل کی اور کس رنگ کی گاڑیاں ہیں۔

''بس تو اب بے فکر ہوجا۔'' انو نے کہا۔ ''کل کا سورج اس سیٹھ کے لیے بدنامی اور رسوائی لے کر آئے گا۔''

''لیکن یار ایک بات کا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''ثمرہ کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی عزت پر ذرا بھی آنچ نہیں آنی چاہیے۔''

''تو فکر مت کر یار۔'' انو نے ہنس کر کہا۔ ''وہ آخر بھابی ہے میری۔ بھابی تو بہن کی طرح ہوتی ہے۔ میں اسے بہت باعزت طریقے سے لے جاؤں گا اور انتہائی باعزت طریقے سے چھوڑ بھی دوں گا۔''

انو سے مل کر میرا دل کچھ ہلکا ہوگیا تھا اور میرے دل میں ایک مرتبہ پھر ثمرہ کی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی تھی۔ اس کی محبت تو میرے دل پر نقش تھی لیکن اسے وقتی طور پر مایوسی کے اندھیروں نے نگل لیا تھا۔ اب انو نے امید کی کرن دکھائی تو مجھے ثمرہ کا حصول اس مرتبہ ممکن نظر آنے لگا۔ بھلا ایسی لڑکی سے کون شادی کرتا جو گھر سے دو راتیں باہر گزار کر آتی۔ وہ بھی اغوا ہوکر۔ ایسے میں جب میں اس کے لیے رشتہ بھیجتا تو اس کا مغرور باپ اسے ہی قبول کرنے میں عافیت سمجھتا۔ ثمرہ کی نظروں میں میری عزت بڑھ جاتی کہ میں سب کچھ جانتے بوجھتے اسے اپنا رہا ہوں۔ میں مطمئن ہوکر گھر آگیا لیکن اس رات...... مجھے نیند نہیں آئی۔ اس رات مجھے بے چینی اور اضطراب تو تھا لیکن مایوسی اور بے چارگی نہیں تھی۔

میں رات کو دیر تک جاگتا رہا اس لیے دن چڑھے تک سوتا رہا۔ اچانک ابا جی کی گھبرائی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔

''تم ابھی نورین کو لے کر فوراً باجی کے گھر چلی جاؤ۔ نہ جانے بے چاری کی کیا حالت ہوگی۔''

میں آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر آیا اور ابا جی سے

پوچھا۔ ”کیا ہوا اباجی! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ”صفدر بیٹا! آج صبح کچھ لوگوں نے رمشا کو اغوا کرلیا ہے۔“

”رمشا کو اغوا کرلیا ہے؟“ میرے ذہن میں گویا کسی نے ہتھوڑا رسید کردیا۔ ”رمشا کو کون اغوا کرسکتا ہے اباجی؟“

”یہاں تو اب اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں معمول کی بات بن کر رہ گئی ہیں بیٹا۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے باجی نے خود ٹیلی فون کیا تھا۔“ اباجی نے کہا۔ ”وہ بے چاری تو صحیح طرح بات بھی نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کا ڈرائیور رمشا کو اسکول لے کر جا رہا تھا۔ آج ثمرہ کی طبیعت خراب تھی اس لیے وہ کالج نہیں گئی تھی ورنہ دونوں بہنیں ساتھ جاتی ہیں۔“

”اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی۔“ اماں نے کہا۔ ”ورنہ اغوا کرنے والے تو دونوں لڑکیوں کو لے جاتے۔“ نورین بُری طرح رو رہی تھی۔ اس دوران میں رمشا سے اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ وہ تھی بھی تو اس کی ہم عمر۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ انو نے کیا غضب کردیا۔ اس نے رمشا کو اغوا کیوں کیا پھر مجھے خود ہی خیال آیا کہ اس میں انو کا بھی کیا قصور؟ وہ نہ ثمرہ کو پہچانتا تھا نہ رمشا کو۔ رمشا اسکول کے لیے نکلی ہوئی تو وہ یہی سمجھا ہوگا کہ یہ ثمرہ ہے۔ اس نے اسی کو اغوا کرلیا۔

”صفدر بیٹا!“ اباجی نے کہا۔ ”تم بھی خالہ کے پاس چلے جاؤ۔ انہیں اس وقت تسلی کی ضرورت ہے بیٹا۔ میرا اے ایس ایم آجائے تو میں بھی آتا ہوں۔“

عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ انو کی غلط فہمی کی وجہ سے میرا مقصد بھی پورا نہیں ہوا اور وہ معصوم بچی بھی اذیت سے گزر رہی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ میں فوراً انو سے ملوں لیکن فی الحال اس سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ نہ جانے اس وقت کہاں ہوگا؟ اس وقت سیل فون اتنے عام نہیں ہوئے تھے۔ ہاں پاکستان میں دولت مند لوگوں نے سیل فون خرید لیے تھے جنہیں وہ ہاتھوں میں لے کر چلتے تھے۔ گویا اس کی نمائش کر رہے ہوں۔ میرا اس وقت خالہ جان کے گھر جانا ضروری تھا۔

میں اماں اور نورین (رینو) کو لے کر خالہ جان کے گھر روانہ ہوگیا۔ وہاں عجیب کہرام مچا ہوا تھا۔ ہم سے پہلے وہاں خالو مشتاق کے بھائی اور ان کے بیٹے موجود تھے۔ خالو مشتاق بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے بہت سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ واقعہ کہاں پیش آیا خالو..... ڈرائیور کیا کہتا ہے؟“

”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔“ خالو نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ آج شام تک اغوا کرنے والوں کو ڈھونڈ نکالے گی۔“

”میرا ایک دوست ایس پی کرائمز ہے۔“ مشتاق خالو کا ایک بھتیجا بولا۔ میں اسے پہلے بھی کئی تقریبات میں دیکھ چکا تھا لیکن اس سے میرا تعارف نہیں تھا۔ میں نے بھی اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ یوں بھی عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی وہی رعونت تھی جو عموماً دولت مند لوگوں کے چہروں پر نمایاں ہوتی ہے۔

اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی تو وہاں موجود ہر شخص چونک کر ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگا۔ خالو مشتاق نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا اور بولے۔ ”ہیلو..... کون..... تم ذلیل آدمی..... کیا سنوں؟ ہاں بولو..... اچھا پھر..... کیا کہا..... پچیس لاکھ روپے..... ورنہ کیا کرو گے؟ کہاں پہنچاؤں..... ہیلو..... ہیلو!“ انہوں نے ریسیور پٹخ دیا۔ شاید دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی تھی۔

”کیا ہوا چچا جان؟“ ان کے بھتیجے نے پوچھا۔

”اسی ذلیل آدمی کا ٹیلی فون تھا جس نے رمشا کو اغوا کیا ہے۔“ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں چونک اٹھا۔ یہ تو ہمارے پلان میں شامل نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”کہہ رہا تھا کہ کل تک پچیس لاکھ روپے کا انتظام کرلو ورنہ تمہاری بیٹی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔“ خالو مشتاق کا بھتیجا اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔

”کسے ٹیلی فون کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں ایس پی رضا کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ ساجد نے کہا۔ ”اسے ساری صورتِ حال بتاتا ہوں۔“

”اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“

”ارے یہ اچکے اس قسم کی دھمکیاں تو دیتے ہی ہیں۔“ ساجد نے کہا۔ ”میں رضا کو ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔“

”ابھی ذرا ٹھہر جائیں۔“ میں نے اچانک کہا۔

”کیوں؟“ ساجد نے میری طرف گھوم کر پوچھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر شبہ ہوگیا ہو۔

"وہ لوگ پھر کب ٹیلی فون کریں گے؟"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ پھر ٹیلی فون کریں گے؟" ساجد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو سامنے کی بات ہے ساجد صاحب۔" میں نے کہا۔ "ابھی انہوں نے صرف رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ یہ بات تو کوئی کم عقل آدمی بھی بتا سکتا ہے۔" ساجد نے مشتاق خالو کی طرف دیکھا۔

"ہاں، صفدر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی صرف یہی بتایا ہے کہ رمشا ان کے قبضے میں ہے اور پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ بعد میں ٹیلی فون کریں گے۔"

"تو کیا اس وقت تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں؟" ساجد نے کہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہا تھا۔

"تو پھر کیا کریں گے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ مجھے تو اس سے پہلے ہی چڑ تھی۔ "نکل جائیں رمشا کی تلاش میں اور لے آئیں اسے۔"

"میں نے رضا کو ٹیلی فون کیا ہے۔" ساجد نے کہا۔

"تمہیں جلدی کیا تھی؟" خالو مشتاق نے اسے جھڑک دیا...۔ "رضا بھی کیا کرلے گا؟ کیا تم پولیس کی کارکردگی سے واقف نہیں ہو۔ ان لوگوں کا دوسرا ٹیلی فون آنے دو پھر کچھ سوچیں گے۔" اسی وقت ڈرائنگ روم میں ایک باوردی ایس پی داخل ہوا۔ اس نے کمرے میں موجود ہر شخص کا جائزہ اس انداز سے لیا جیسے اغوا کنندہ ان ہی لوگوں میں سے کوئی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص اس کے احترام میں نہ جانے کیوں کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ پولیس کا ایک افسر تھا، کوئی صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم نہیں تھا کہ لوگ اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ خالو مشتاق البتہ پہلے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ایس پی ہے جس پر ساجد اچھل رہا ہے۔

"کچھ معلوم ہوا؟" اس نے ساجد سے پوچھا۔

"معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے ایس پی صاحب۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے گھوم کر ناگواری سے مجھے دیکھا۔ وہ چہرے سے ہرگز ایس پی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس کے جسم پر وردی نہ ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ وہ پولیس کا کوئی معمولی حوالدار یا اے ایس آئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہ وقار نہیں تھا جو افسروں کے چہروں پر ہوتا ہے، چہرے پر یوں بھی خباثت برس رہی تھی۔

اس نے تلخ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میں مشتاق ملک صاحب کا بھانجا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ساجد! تم نے رضا کو یہاں کیوں بلایا ہے؟" خالو مشتاق نے کہا۔ "وہ بھی وردی میں۔ اغوا کرنے والے... گھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم نے پولیس سے رابطہ کر لیا ہے تو وہ رمشا کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"تو کیا آپ انہیں پچیس لاکھ روپے دے دیں گے؟" ساجد نے بھی تلخ انداز میں کہا۔

"پچیس لاکھ؟" رضا نے پوچھا۔

"ہاں، اغوا کرنے والوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے فون کر کے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔" ساجد نے کہا۔ "انہوں نے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اس بارے میں پولیس کو اطلاع نہ دی جائے ورنہ رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔"

"یہ تو کسی پیشہ ور گینگ کا کام ہے۔" رضا نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "ایسے لوگوں کی ہسٹری پولیس کے پاس بھی ہوتی ہے۔ میں ابھی آفس جا کر معلوم کرتا ہوں کہ اس قسم کی وارداتوں میں کون سے گروہ ملوث ہیں۔ آپ فکر مت کریں مشتاق صاحب، میں ان لوگوں تک جلد ہی پہنچ جاؤں گا۔" وہ اپنی چھڑی ہلاتا ہوا روانہ ہو گیا۔

مجھے اب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ لوگ انو تک پہنچ ہی نہ جائیں۔ اس کا بھی تو پولیس ریکارڈ ہو گا پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ انو تو آج تک کبھی گرفتار ہی نہیں ہوا، کبھی جیل نہیں گیا۔ اس کا ریکارڈ پولیس کے پاس کب ہو گا؟ پولیس والوں نے ایک ظلم یہ کیا تھا کہ ڈرائیور کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ ورنہ میں اس سے کچھ معلومات حاصل کرتا کہ اغوا کرنے والے کتنے آدمی تھے؟ ان کے حلیے کیسے تھے؟ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کارروائی میں انو بھی موجود تھا یا نہیں؟ خالو مشتاق تو کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر انو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہو گا۔ اس کے تو کئی ٹھکانے تھے۔ میں اس کے ایک ٹھکانے کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس نے بھی اس واردات میں حصہ لیا ہے تو وہ اس وقت اپنے کسی بھی ٹھکانے پر نہیں ہو گا۔ وہ کسی ایسی جگہ ہو گا جہاں اس نے رمشا کو رکھا ہو گا۔ یہ سوچ کر ہی میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک ریسٹوران میں جا بیٹھا۔

میں نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ میری نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہن رکھی تھی اور چہرے ہی سے اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اسے گھورتے ہوئے پایا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی جوابی طور پر اسے گھورنے لگا۔

وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے بے اختیار اپنے نیفے پر ہاتھ مارا لیکن عرصہ ہوا میں پستول رکھنا چھوڑ چکا تھا، اس لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اس کرخت چہرے والے نے کرسی کھینچی اور میرے سامنے بیٹھ گیا پھر وہ انتہائی بے تکلفی سے بولا۔ "کیا حال ہے؟"

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ارے یار، ایسی بھی کیا بے مروتی۔" اس نے مکروہ انداز میں کہا۔ "تم انو بھائی کے دوست ہو نا؟"

"کون انو بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"تم انو بھائی کو نہیں جانتے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "تمہاری یادداشت تو بہت کمزور ہے۔"

"مطلب کی بات کرو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یار! ایک دفعہ انو بھائی تم سے ملنے یونیورسٹی گئے تھے الیکشن کے زمانے میں۔" اس نے گویا مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔ "میں بھی اس دن ان کے ساتھ تھا۔"

مجھے یاد آ گیا کہ یونیورسٹی یونین کے الیکشن کے موقع پر انو میرے پاس آیا تھا۔ میں نے خود تو الیکشن میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن میں اپنے ایک دوست کے پینل کو سپورٹ کر رہا تھا۔ انو اسی سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ مجھے اس کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟

اچانک پولیس کا ایک اے ایس آئی وہاں آ گیا اور بولا۔ "بالے چل، ذرا میرے ساتھ تھانے چل۔"

"کیوں جناب، اب میں نے کیا کر دیا ہے؟"

"یہ تو تھانے چل کر ہی معلوم ہو گا۔" اے ایس آئی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔"

"مجھے......؟" میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ "مجھے کیوں؟"

"یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا۔" اس نے کہا۔

"تم ہوش میں تو ہو۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟"

"آپ بالے کے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے......"

"کون بالا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے بالے کی طرف اشارہ کر دیا۔

"یہ...... یہ تو یہیں بیٹھا تھا۔ یہ کوئی فائیو اسٹار ہوٹل نہیں ہے آفیسر کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ کر ان کے ساتھ بیٹھیں۔" اسی وقت ایک اور صاحب بھی آ کر وہاں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ صاحب بھی تو یہاں بیٹھے ہیں۔ انہیں بھی تھانے لے چلو۔"

"تم ان صاحب کو جانتے ہو۔" اس نے بالے سے پوچھا۔

بالے نے انو کے خوف سے یا پھر واقعی سچ بولتے ہوئے کہا۔ "نہیں صاحب! میں انہیں نہیں جانتا۔ میں تو یہاں چائے پینے آیا تھا۔"

"معاف کرنا جناب۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "میں نے فضول میں آپ کو پریشان کیا۔"

"ویسے معاملہ کیا ہے آفیسر؟" میں نے بھی مسکرا کر پوچھا۔ "یہ بھی مجھے کرمنل تو نہیں دکھائی دے رہا۔"

"جناب! اس کی مسکین شکل پر مت جائیں۔" اے ایس آئی نے کہا حالانکہ بالے کی شکل پر مسکینیت کے بجائے خباثت تھی۔ "یہ بہت اونچی چیز ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ اس کے ساتھیوں نے سیٹھ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔" میں بری طرح چونک اٹھا۔

"سیٹھ مشتاق کی بیٹی؟" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے اغوا کیا ہے اسے؟"

"پولیس کو یہی شبہ ہے جناب۔" اس نے کہا۔

ایسے موقع پر پولیس والے اتنی بات نہیں کرتے لیکن وہ اے ایس آئی یا تو ضرورت سے زیادہ باتونی تھا یا پھر وہ مجھ سے بدکلامی کرنے کے بعد اپنی خفت مٹا رہا تھا۔

بالے نے جاتے جاتے مجھے اشارے سے بتایا کہ میں اس کے بارے میں انو کو بتا دوں۔ میں اس کے اشارے سے بہرحال یہی سمجھا تھا۔ اب مجھے ایک نئے خدشے نے گھیر لیا تھا۔ اگر پولیس انو کے ساتھیوں تک پہنچ گئی تو انو بھی گرفتار ہو سکتا تھا۔ وہ گرفتار ہوتا تو میں بھی گرفتار ہو جاتا۔ وہ بھلا اپنی زبان بند کیوں رکھتا۔

میں جانے اس ریسٹوران میں کتنی دیر تک بیٹھا رہا اور اس دوران میں چار کپ چائے پی گیا پھر وہاں سے اٹھ کر میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ اسٹیشن وہ واحد جگہ تھی جہاں پہنچ کر مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ لوگوں کی بھاگ دوڑ اور قلیوں کی چیخ پکار میں وقتی طور پر میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔

میں ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر چکر لگا آیا۔ پلیٹ فارم نمبر سات پر زیادہ رش نہیں تھا۔ وہاں سے اس وقت نہ کوئی ٹرین جانے والی تھی نہ آنے والی تھی۔ میں پلیٹ فارم کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال لیا۔ میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا تھا لیکن اس وقت میں نے ریلوے کے ایک اسٹال سے خاص طور پر سگریٹ کا پیکٹ خرید لیا تھا۔

میں نے سگریٹ کا کش لگایا ہی تھا کہ ایک بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی آ کر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر پگڑی تھی اور شلوار قمیص کے ساتھ ملتانی کھسے پہن رکھے تھے۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ آدمی میری طرف کھسکتا ہوا بولا۔ ”کام ہو گیا ہے صفدر۔“

میں اس کی آواز سن کر یوں اچھلا جیسے میرا پاؤں جلتے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ وہ انو تھا، صرف مونچھوں اور پگڑی سے اس کی تو پوری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

میرے اچھلنے پر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ ”یہ حلیہ میں نے صرف تمہاری وجہ سے بنایا ہے تاکہ اگر کوئی مجھے تمہارے ساتھ دیکھے تو تم پر کسی قسم کا شبہ نہ کرے۔“

”لیکن یار! تم نے تو غلط لڑکی کو اٹھا لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ثمرہ تو بڑی ہے اس سے۔“

”ہاں یار، مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔“

”اور یہ تاوان کا چکر کیوں چلا دیا تم نے؟“ میں نے کہا۔ ”اس لڑکی کو خاموشی سے واپس کر دو۔“

”صفدر!“ انو ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ایک گینگ بنا لیا ہے۔ اس میں شہر کے بہت سے خطرناک بدمعاش بھی ہیں۔ وہ ویسے تو مجھے اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض اوقات بہت سرکش بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کیس کے بعد میں ان سب سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ ان میں سے دو آدمیوں کا خیال ہے کہ جب ہم نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لے ہی لیا ہے تو پھر اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”یار! وہ میری نہیں مانتے۔ میں اس موقع پر ان سے بگاڑ بھی نہیں سکتا۔“ انو نے کہا۔

”دیکھو انو!“ میں نے کہا۔ ”میں نے تم پر اعتبار کر کے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ میں اپنے ساتھیوں سے نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے بتاؤ تم لوگوں نے رمشا کو کہاں رکھا ہے؟“

”یار صفدر! اتنے جذباتی مت بنو۔“ انو نے کہا۔ ”میں خود ہی اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔ تم جذبات میں آ کر بنا بنایا کھیل بگاڑ دو گے۔“

”کھیل......!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ کھیل ہے؟ ایک بات اور سن لو۔ پولیس کا ایس پی رضا تمام مجرموں کا ریکارڈ چھان رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے خلاف وہ کچھ ثابت نہیں کر سکے گا لیکن اگر تمہارے ساتھیوں کا ریکارڈ اس کے پاس ہوا تو وہ ان تک ضرور پہنچ جائے گا۔“

انو نے چونک کر مجھے دیکھا پھر تشویش سے بولا۔ ”یار! یہ تو بہت بری خبر سنائی ہے تم نے۔ ان لوگوں کا ریکارڈ تو پولیس کے پاس موجود ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ جیل جا چکے ہیں۔ اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے جلد ہی کرنا ہو گا۔“

”بس تم اتنا کرو کہ رمشا کو اس کے گھر پہنچا دو، اسی میں بہتری ہے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ انو نے کہا۔ ”اس وقت تو وہ پچیس لاکھ روپے کے لالچ میں اندھے ہو رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ رمشا کے کروڑ پتی باپ سے انہیں اتنا پیسا ضرور ملے گا۔“

”لیکن اگر وہ پکڑے گئے تو؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”پھر تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں گا اور تم بھی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ”پولیس کو آخر میرے بارے میں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پولیس تشدد کے آگے میں کب تک ٹھہر سکوں گا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”اب اس کا ایک ہی حل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ رمشا کہاں ہے؟ میں خود ان لوگوں کو ٹھکانے لگا دوں گا ورنہ نہ صرف شہر میں بلکہ پورے خاندان میں میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ میری برسوں کی محنت اکارت چلی جائے گی۔ مجھے تو پھر کہیں ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ اباجی اور ماں تو شاید اس صدمے سے مر ہی جائیں یا پھر وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”صفدر! مجھ پر بھروسا کرو۔“ انو نے مجھے تسلی دی۔

”میں کوشش کروں گا کہ وہ لوگ آج ہی رمشا کو چھوڑ دیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ ایک پولیس والا بھاگتا ہوا اس طرف آ رہا ہے۔“

اس وقت تک وہ پولیس والا ہم تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں اکثر یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرے دوست امجد علی گردیزی ہیں۔“

”تم جانتے نہیں کہ اسٹیشن کے اس علاقے میں آنا منع ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں ایس ایم صاحب کا بیٹا ہوں۔ ان ہی کی اجازت سے یہاں بیٹھ کر پڑھتا لکھتا ہوں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”تم ایس ایم صاحب کے بیٹے ہو؟“ سپاہی کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”دھیان رکھنا، یہاں کوئی اجنبی نہ آنے پائے۔ یہاں پرانی بوگیوں میں سے اکثر لوگ مختلف چیزیں نکال کر لے جاتے ہیں۔“

”ریلوے کے ملازمین ہی ایسا کرتے ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کوئی باہر کا آدمی تو اس طرف نہیں آتا ہے۔“

پولیس والے کے جانے کے بعد انو بھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”فکر مت کرو صفدر! میں کوشش کروں گا کہ رمشا آج ہی گھر پہنچ جائے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں بھی ٹہلتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اماں اور رینو ابھی تک خالہ جان کے گھر سے واپس نہیں آئی تھیں۔ دروازے پر تالا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اباجی بھی خالہ جان کے گھر گئے ہیں یا پھر اپنے دفتر میں ہوں گے۔ میرے پاس بھی گھر کی ایک چابی تھی۔ میں اکثر راتوں کو دیر سے آتا تو خاموشی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو جاتا تھا۔

میں گھر میں چلا گیا۔ وہاں ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ گھر میں ویسے بھی خاموشی ہی رہتی تھی۔ اماں اپنے کام میں مصروف رہتی تھیں اور رینو اپنی پڑھائی میں لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ انسانوں کی محض موجودگی سے بھی گھر کے ماحول بدل جاتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ مجھے اباجی کی غیر موجودگی کے سلسلے میں بھی ہو چکا تھا۔ وہ جب تک اپنے کمرے میں موجود رہتے تھے گھر میں عجیب سی رونق کا احساس ہوتا تھا، تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے کیے پر پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا۔ آخر مجھے انو کی باتوں میں آنے کی کیا ضرورت تھی اس وقت تو جذبات میں آ کر میں نے ہامی بھر لی تھی۔ اب مجھے یہ خوف تھا کہ اگر انو کے ساتھی پکڑے گئے تو میرا مستقبل تو برباد ہو جائے گا۔ اباجی اور اماں سے بھی میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤں گا۔ اپنی پیاری بہن رینو کا چہرہ دیکھنے کو ترس جاؤں گا۔ ظاہر ہے اس واقعے کے بعد میں کس منہ سے اباجی کا سامنا کر سکتا تھا؟

میرا سر درد سے پھٹنے لگا تو میں نے اٹھ کر ایک کپ چائے بنائی اور ڈسپرین کی دو گولیاں چائے کے ساتھ کھا لیں۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے ایک کتاب اٹھالی لیکن مجھے کسی طرح چین ہی نہیں مل رہا تھا۔ آخر میں نے دوبارہ خالہ جان کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہاں اب بھی وہی سوگ کا ماحول تھا اور رو رو کر خالہ جان اور ثمرہ کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ میں نے ایک نظر ثمرہ پر ڈالی۔ وہ اس عالم میں مجھے پہلے سے بھی زیادہ حسین لگی لیکن اب میں اس کے بارے میں مزید نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اب میری پہنچ سے مزید دور ہو گئی تھی۔ اس نے حسب عادت مجھے سلام کیا لیکن اٹھ کر جانے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اماں اور رینو کے علاوہ اور کئی خواتین آیت کریمہ کے ورد میں مصروف تھیں۔ میں خود کو لعنت ملامت کرتا ہوا وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ خالو مشتاق نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔

”مشتاق!“ ان کے بڑے بھائی اشتیاق نے کمرے کی گمبھیر خاموشی کو توڑا۔ ”ان لوگوں کی طرف سے ابھی تک فون نہیں آیا؟“ خالو مشتاق جواب میں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انہوں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو...... ہاں میں ہی بول رہا ہوں۔ رمشا تو خیریت سے ہے؟ پولیس کو...... نہیں میں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی...... میں جھوٹ...... وہ ایس پی رضا میرے بھتیجے کا دوست ہے اس لیے...... نہیں میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہاں...... کیا...... فوری طور پر رقم کہاں سے لاؤں؟ میں کہہ تو رہا ہوں کہ پولیس اس معاملے میں انوالو نہیں ہے۔ اچھا...... بولو...... چلو مجھے یہ بھی منظور ہے۔ میں کل صبح تک رقم کا بندوبست کر لوں گا...... رمشا سے میری بات تو کروا دو...... اچھا...... میں...... ہیلو ...... ہیلو۔“ انہوں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور ساجد کو گھورتے ہوئے بولے۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ پولیس کو اس معاملے میں انوالو کرو۔ اب وہ لوگ پچاس لاکھ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں پچاس لاکھ بھی دے دوں گا لیکن اب وہ ہمیں دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اب پولیس نے مداخلت کی تو وہ رمشا کو قتل کر کے اس کی لاش ہمارے گھر کے سامنے پھینک دیں گے۔"

"لیکن چچا جان میں نے تو......"

"رہنے دو۔" انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ "تم نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے ایس پی رضا کو اس کیس میں انوالو کرلیا۔ اب اگر رمشا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مشتاق۔" ان کے بھائی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "ساجد تمہارا دشمن نہیں ہے۔ اسے رمشا سے کوئی دشمنی ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔"

"یہ بھلائی ہو رہی ہے میرے ساتھ؟" خالو مشتاق نے درشت لہجے میں کہا۔ "رمشا کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ نکما ایس پی تو بہت وعدے کر کے گیا تھا کہ وہ شام تک ان لوگوں تک پہنچ جائے گا پھر اب کیا ہوا؟"

"وہ تو اپنی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت بھی آپ کا ٹیلی فون آبزرویشن پر ہے اور یہاں سے ہونے والی تمام گفتگو ایس پی آفس میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔" ساجد نے کہا۔ "رضا بہت ذہین پولیس افسر ہے اور......"

"تم نے کس کی اجازت سے میرا ٹیلی فون آبزرویشن پر لگوایا ہے؟" خالو مشتاق گرج کر بولے۔ "تم کیا چاہتے ہو کہ وہ لوگ رمشا کو قتل کر دیں؟"

"تم اس وقت پاگل ہو چکے ہو۔" ان کے بھائی نے کہا۔ "تمہارے ساتھ تو بھلائی کرنا ہی نہیں چاہیے۔" پھر وہ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ "رضا کو ابھی اور اسی وقت منع کرو کہ وہ کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔ اس سے کہو کہ وہ مشتاق کے فون کو آبزرویشن سے ہٹا دے۔"

"ڈیڈی! اس سے تو رمشا کی جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔" ساجد نے کہا۔

"تو رمشا کا باپ نہیں ہے۔" اس کے باپ نے گرج کر کہا۔ "کیا تو چاہتا ہے کہ مشتاق تجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اس دور میں تو کسی کے ساتھ بھی ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی رضا کو ٹیلی فون کر اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کر۔"

"بھائی جان! آپ فضول میں بات بڑھا رہے ہیں۔" خالو مشتاق نے کہا۔

"میں بات کو بڑھا رہا ہوں۔" وہ گرج کر بولے۔ "تم نے دس آدمیوں کے سامنے میرے بیٹے کی تذلیل کر دی۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے، تین بچوں کا باپ ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔"

ساجد نے ٹیلی فون پر کسی کے نمبر ڈائل کیے اور بولا۔

"ہیلو رضا! میں ساجد بول رہا ہوں۔ یار، چچا جان نہیں چاہتے کہ پولیس اس کیس میں مداخلت کرے۔ سارا سیٹ اپ ختم کر دو، ریکارڈنگ روک دو اور ان کے ٹیلی فون سے آبزرویشن ہٹا دو...... یار جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو...... ہاں، جب انہیں احساس نہیں ہے تو میں کیوں سر کھپاؤں۔ تم بھی صبح سے مصروف ہو گھر جا کر آرام کرو۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ "میں نے رضا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مزید کوئی کارروائی نہ کرے۔ اب آپ جائیں اور آرام کریں۔"

"اب چلو یہاں سے۔" اشتیاق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

"پلیز ایسے موقع پر آپس میں تو تعلقات خراب مت کریں۔" میں نے کہا۔ "ساجد صاحب نے تو اپنے طور پر بالکل درست فیصلہ کیا تھا لیکن......"

"میں نے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔" خالو مشتاق نے انتہائی حقارت سے کہا۔ ابا جی بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

ان کے بھائی اپنے بیٹے کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ ابا جی نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ چند منٹ بعد ابا جی بھی باہر آ گئے اور مجھے لان کے ایک سنسان گوشے میں لے گئے۔ میں حیران تھا کہ ابا جی مجھ سے کیا بات کرنے والے ہیں۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "صفدر! تجھے اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو نے دیکھا بھائی مشتاق نے تجھے کس طرح ذلیل کر دیا۔"

"وہ تو اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہیں ابا جی۔ انہوں نے تو اپنے بھائی اور بھتیجے کو بھی ناراض کر دیا۔ میں نے تو ان کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ آپ فکر مت کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔"

وہ واپس اندر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر خود کو ملامت کرنے لگا۔ میرے باپ کو میری عزت کا اتنا خیال تھا کہ وہ مشتاق کی درشت کلامی بھی برداشت نہیں کر سکے۔ کل جب انہیں یہ علم ہوگا کہ ان کا بیٹا اس اغوا کا ذمے دار ہے تو

ان کا کیا حال ہوگا۔ میں نے دل سے دعا کی...۔ "یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرما دے اور میری عزت رکھ لے۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ رمشا کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھنا میرے مالک۔" دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"یا اللہ! تو ہم سب پر رحم فرما۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔

اسی وقت مجھے خالو مشتاق کی آواز سنائی دی۔ "صفدر! تم رو رہے ہو؟"

"مجھے رمشا کی طرف سے بہت پریشانی ہے خالو۔" میں نے کہا۔ "وہ معصوم بچی ہے، نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔"

"چلو، اندر چلو۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ میں نادم سا ان کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ وہ تو شکر ہے کہ دعا کے ابتدائی جملے میں نے بلند آواز میں نہیں کہے تھے ورنہ خالو مشتاق مجھے ابھی پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اندر اب صرف خالو مشتاق کے ایک پڑوسی اور ابا جی بیٹھے تھے۔ باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ خالو شاید انہی لوگوں کو رخصت کرنے باہر آئے تھے۔ وہ مجھے لان میں روتا دیکھ کر میری طرف آ گئے تھے۔ کمرے میں ایک مرتبہ پھر جان لیوا سناٹا طاری ہو گیا۔ صرف دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

"میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اب ان بدبختوں نے پچاس لاکھ کا مطالبہ کر دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ کل تک اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟" پچاس لاکھ اس دور میں آج کے کم سے کم پانچ کروڑ کے برابر تھے۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "ہم بھی انہیں رقم نہیں دیں گے۔ میں ابھی مارکیٹ جا کر نوٹوں کے سائز کے کاغذ کٹوا لیتا ہوں۔ ہم ان کاغذوں کی گڈیاں نوٹوں کی طرح بنائیں گے بس ان کے اوپر اور نیچے ہزار روپے کا صرف ایک نوٹ ہوگا۔"

"وہ لوگ پروفیشنل ہیں بیٹا۔" خالو مشتاق نے نرم لہجے میں کہا تو ابا جی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "پہلے وہ اپنی تسلی کریں گے۔"

"ایسی وارداتوں میں اغوا کرنے والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ نوٹ گننے بیٹھ جائیں۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ خالو مشتاق نے ریسیور اٹھا لیا اور بولے۔ "ہیلو! ہاں میں سن رہا ہوں...... اچھا...... پھر...... لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد تم لوگ مجھ سے دھوکا نہیں کرو گے۔ اچھا...... لیکن مجھے ایک دن کی مہلت اور دے دو...... میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اتنی ہی رقم مزید جمع کرنے میں مجھے کچھ تو وقت لگے گا...... کیا...... ہاں، وہ تو ابھی دے سکتا ہوں...... کہاں...... ٹھیک ہے۔" انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا پھر ابا جی سے بولے۔ "میں نے کہا تھا نا کہ جرائم پیشہ لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اب صرف پچیس لاکھ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ مجھے رقم کا بریف کیس لے کر مال روڈ پر جانا ہوگا۔ وہیں ان کا کوئی آدمی مجھ سے بریف کیس لے لے گا۔"

شاید انو نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مزید رقم کا مطالبہ نہ کریں۔

"لیکن بھائی مشتاق۔" ابا جی نے کہا۔ "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد وہ رمشا کو بہ حفاظت ہمارے حوالے کر دیں گے؟"

"میں نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا۔" خالو مشتاق نے کہا۔ "انہوں نے کہا کہ ضمانت ہماری زبان ہے۔ آپ کو اسی پر اعتبار کرنا ہوگا۔"

"رقم انہوں نے کب مانگی ہے؟" ابا جی نے پوچھا۔

"وہ کل گیارہ بجے مجھے بتائیں گے کہ مجھے کس وقت گھر سے نکلنا ہوگا اور مال روڈ پر کس طرف پیدل چلنا ہوگا۔ انہوں نے انتہائی سختی سے کہا ہے کہ اگر پولیس کا یا کوئی مشتبہ شخص میرے آس پاس بھی ہوا تو وہ مجھ سے رقم لیے بغیر لوٹ جائیں گے۔"

"اس کے لیے مال روڈ کا علاقہ تو مناسب نہیں ہے۔" ابا جی نے کہا۔ "وہ صرف دھوکا دے رہے ہیں۔ کل وہ کسی ایسے مقام کا تعین کریں گے جہاں عام لوگوں کا گزر نہ ہو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رقم ملتے ہی آدھے گھنٹے کے بعد رمشا گھر پہنچ جائے گی۔"

خالو مشتاق کے پڑوسی منظور صاحب نے کہا۔ "اب ان کی طرف سے کوئی ٹیلی فون نہیں آئے گا۔ آپ صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"آرام کیسے کر لوں منظور صاحب۔" خالو مشتاق کے لہجے میں عجیب سا کرب تھا۔ "میری بچی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ آپ بھی تو کئی گھنٹوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں صبح پھر حاضر ہو جاؤں گا۔'' وہ تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ خالو مشتاق نے انہیں باہر تک رخصت کرنا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور پھر بوجھل قدموں سے باہر نکل گئے۔

''ابا جی!'' میں نے کہا۔ ''آپ بھی گھر جا کر آرام کریں۔ میں یہاں موجود ہوں۔''

''گھر جانے کی کیا ضرورت ہے بیٹا۔'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''بھائی جی یہیں آرام کر سکتے ہیں۔'' انہوں نے اصرار کر کے ابا جی کو ایک بیڈ روم میں بھیج دیا پھر خود وہ اس کمرے میں چلے گئے جہاں خالہ جان اور اماں وغیرہ بیٹھی تھیں۔

''کچھ معلوم ہوا؟'' خالہ جان نے پوچھا۔ ''میں تو پردے کی وجہ سے وہاں آ بھی نہیں سکتی تھی اور کوئی بھی مجھے کچھ بتانے یہاں نہیں آیا۔''

خالو مشتاق نے انہیں مختصراً بتایا کہ اغوا کنندگان سے کیا بات ہوئی ہے پھر وہ اماں سے بولے۔ ''نسیمہ! میں اس دن کے رویے کی وجہ سے تم سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ شاید مجھے تمہارا دل دکھانے کی سزا ملی ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی جان۔'' اماں نے کہا۔ ''آپ بڑے ہیں۔ میں نے تو آپ کی بات کا برا نہیں مانا۔ مجھے وقتی طور پر تو افسوس ہوا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ آپ کی بات ٹھیک ہی ہے۔''

''صفدر بیٹا۔'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''اب تم بھی سو جاؤ۔''

''میں آپ کے ساتھ ہی بیٹھوں گا خالو جان۔'' میں نے کہا۔ ''آپ چاہیں تو سو جائیں۔ ان بدبختوں کا ٹیلی فون تو کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔''

''یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ وہ ٹیلی فون کہاں سے کرتے ہیں۔''

''یہ تو رضا نے معلوم کر لیا ہوگا لیکن اس قسم کے لوگ کبھی ایک جگہ سے ٹیلی فون نہیں کرتے۔ وہ جگہ بدل بدل کر بات کرتے ہیں تاکہ پولیس ان کا سراغ نہ لگا سکے۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک میری نظر ثمرہ کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں اور خالو مشتاق ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں نے خالو مشتاق سے کہا۔ ''آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں اور کچھ کھا لیں۔ میں کھانا منگواتا ہوں۔''

''نہیں، اس وقت کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔'' پھر انہوں نے ملازم کو بلا کر کافی بنانے کو کہا اور خود باتھ روم میں چلے گئے۔

☆☆☆

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خالو مشتاق کو بہ اصرار میں نے سونے کے لیے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا اور میں خود ٹیلی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو۔'' میں نے کہا۔

''کون بول رہا ہے؟'' دوسری طرف سے مجھے انو کی آواز سنائی دی۔

''تمہیں کس سے بات کرنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟'' دوسری طرف سے انو نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''میں صفدر بول رہا ہوں، مشتاق صاحب کا بھانجا۔'' میں نے کہا۔ ''مشتاق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔'' مجھے اس کے عقب میں ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تو میں چونک اٹھا۔ کیا انو مجھے اسٹیشن سے فون کر رہا تھا؟

''مجھے بات تو مشتاق صاحب ہی سے کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔ اب انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی پریشان مت ہوں۔ صبح رمشا گھر پہنچ جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ٹیلی فون اس وقت بھی آبزرویشن پر ہے لیکن تم لوگ میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکو گے۔''

''تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، میں صبح دس بجے پھر ٹیلی فون کروں گا۔'' اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا کہہ رہا تھا وہ؟'' خالو مشتاق کی آواز سن کر میں چونک اٹھا۔ وہ شاید ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اٹھ گئے تھے۔ ان حالات میں گہری نیند کب آتی ہے۔

''اس نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ لوگ صبح دس بجے پھر ٹیلی فون کریں گے۔''

خالو مشتاق اپنا سر پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''یہ لوگ بھی لوگوں کو نفسیاتی طور پر اتنا مفلوج کر دیتے ہیں کہ انسان کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ ان لوگوں نے اس وقت صرف ہمیں ذہنی اضطراب

میں مبتلا کرنے کے لیے ٹیلی فون کیا تھا تاکہ ہم صبح تک جاگتے رہیں اور کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہیں۔''

''خالو ایک بات بتائیے، جب آپ کی ان لوگوں سے بات ہوئی تو کیا آپ نے پس منظر میں کسی ٹرین کی آواز بھی سنی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

خالو مشتاق چند لمحے سوچتے رہے پھر بولے۔ ''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جب میری ان سے بات ہوئی تو میں نے پس منظر میں ٹرین کا ہارن یا کوئی گڑگڑاہٹ سنی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اسٹیشن کے نزدیکی علاقے سے ٹیلی فون کر رہے ہیں۔''

''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''وہ کہیں سے بھی ٹیلی فون کر رہے ہوں، مجھے خیریت سے میری بچی مل جائے۔''

☆☆☆

صبح دس بجے ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس وقت خالو مشتاق وہیں تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا اور بولے۔ ''ہیلو...... ہاں، میں بول رہا ہوں...... اچھا کہاں...... پلیٹ فارم نمبر پانچ پر...... ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں...... لیکن تم لوگ بھی اپنی زبان کا پاس رکھنا۔ میری بیٹی مجھے مل جانی چاہیے۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھ سے بولے۔ ''ان لوگوں نے اب مجھے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر بلایا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر پانچ ٹی اسٹال کے سامنے والی بینچ پر۔'' وہ بیگ اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

ابا جی بولے۔ ''پلیٹ فارم نمبر پانچ پر؟ میں ابھی وہاں کے اسٹاف کو ٹیلی فون پر بتا دیتا ہوں کہ وہ پلیٹ فارم نمبر پانچ کو گھیر لیں۔ سب قلیوں کو وہاں لگا دیں۔ قلیوں پر کون شبہ کرے گا۔''

''بھائی جی۔'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''میں اس وقت کسی بھی طرح کا خطرہ مول لینے کی حالت میں نہیں ہوں۔ پچیس لاکھ تو میں پھر دو تین مہینے میں کما لوں گا لیکن مجھے میری بچی نہیں ملے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' ابا جی نے کہا۔

''خالو، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بیٹا، ان لوگوں نے سختی سے منع کیا ہے کہ کوئی مشتبہ آدمی وہاں نظر نہ آئے۔''

''میں پلیٹ فارم نمبر پانچ کی طرف نہیں جاؤں گا بلکہ دور رہ کر دیکھوں گا۔ ابا جی کی تو ڈیوٹی بھی وہیں ہوتی ہے۔ نہ ان پر کوئی شبہ کرے گا نہ مجھ پر۔'' وہ بہ مشکل تمام ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہوئے۔

مجھے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے عجیب سی گھبراہٹ اور اضطراب کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

میں اسٹیشن پر اتر کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ ابا جی اپنے دفتر کی طرف بڑھ گئے۔ میں دیوانہ وار گھر کی طرف بھاگا اور بکس میں رکھا ہوا اپنا پستول نکال لیا۔ میں نے پستول رکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن اسے ضائع نہیں کیا تھا۔ میں نے پستول کا میگزین چیک کیا پھر ایک فالتو میگزین بھی جیب میں ڈال لیا اور دوبارہ اسٹیشن کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے یقین تھا کہ رمشا وہیں کہیں ہوگی۔ یہ بات مجھے اسی دن سمجھ لینی چاہیے تھی جب انو بدلے ہوئے روپ میں مجھے ملا تھا۔

میں پلیٹ فارم پر داخل ہوا تو مجھے کہیں سے لگاتار دو فائر ہونے کی آواز سنائی دی پھر دو فائر مزید ہوئے۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا کہ میں کسی پل پر چڑھ کر پلیٹ فارم نمبر پانچ کا جائزہ لے سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر میں پل پر چڑھ گیا۔ اچانک پل پر مخالف سمت سے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو آدمی بھی تھے۔ وہ دونوں اس لڑکی کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ اسے پکڑنے ہی والے تھے کہ اس نے اچانک پل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اسی وقت مجھے ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں... آدمی واپس بھاگے اور کسی پلیٹ فارم پر اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں بھی دیوانہ وار اس پلیٹ فارم کی طرف بھاگا جہاں اس لڑکی نے چھلانگ لگائی تھی۔ جب وہ پل کا جنگلا پکڑ کر اس پر چڑھ رہی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ رمشا ہے۔ نیچے پہنچ کر میرے اندیشوں کی مزید تصدیق ہو گئی۔ وہ رمشا ہی تھی۔ ٹرین کے بھاری پہیوں نے اسے بری طرح کچل دیا تھا لیکن اس کا معصوم چہرہ اب بھی محفوظ تھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور صدمے سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے زوردار چکر آیا اور میں دھڑام سے پلیٹ فارم کے پختہ فرش پر گر پڑا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ریلوے کے ایک ویٹنگ روم میں تھا۔ ابا جی اور خالو مشتاق بھی وہیں بیٹھے تھے۔ خالو مشتاق بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ان کی

حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میرا احساسِ جرم اور احساسِ ندامت مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میں خالو مشتاق سے لپٹ کر اس بری طرح رویا کہ نڈھال ہوگیا۔ یہ رمشا کی موت سے زیادہ پچھتاوے کے آنسو تھے۔

پولیس نے رمشا کی لاش وہاں سے اٹھالی تھی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادیا تھا پھر مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اسٹیشن کے دور افتادہ گوشے میں آخری پلیٹ فارم پر پولیس کو تین لاشیں مزید ملی تھیں۔ انہیں گولی مار کے قتل کیا گیا تھا۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش انو کی بھی تھی۔ پھر ساری صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔

انو نے ان لوگوں پر زور دیا ہوگا کہ وہ رمشا کو غیر مشروط طور پر رہا کردیں۔ ان لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ وہ دونوں آدمی انو کی گولیوں سے ہلاک ہوئے ہوں گے پھر ان کے کسی آدمی نے انو کو گولیاں ماردی ہوں گی۔ ان کے آپس کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر رمشا وہاں سے بھاگ نکلی ہوگی۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ پچیس لاکھ روپے کا چیک ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر رمشا نے پل کے جنگلے پر چڑھ کر چھلانگ کیوں لگادی؟ وہ بدمعاش لوگ اسے پکڑنے میں کامیاب بھی ہوجاتے تو تب بھی وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ پل پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے رمشا کو نہیں لے جاسکتے تھے پھر میں بھی اس پل پر موجود تھا۔ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟

جب انو اور دوسرے لوگوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں اس ریوالور سے ہلاک ہوئے تھے جو انو کے ہاتھ میں تھا۔ انو پر جس ریوالور سے گولیاں چلائی گئی تھیں، پولیس کو وہ ریوالور نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انو پر فائر ان دونوں ہی نے کیے تھے جو رمشا کا تعاقب کررہے تھے۔

☆☆☆

رمشا کی موت کے بعد میں بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کہ ایک معصوم لڑکی میری خواہشات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ مجھے ہر لحہ رمشا کی کٹی پھٹی لاش کا خیال رہتا تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری دنیا کو آگ لگادوں۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے نزدیک تھا اس لیے رات دن وہاں ٹرینوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔

رمشا کے تعاقب میں جو آدمی تھے، وہ میرے لیے اجنبی تھے لیکن ان کے چہرے میرے ذہن پر نقش ہوچکے تھے۔ وہ نہ صرف رمشا کے قاتل تھے بلکہ انو کے قاتل بھی تھے۔ میں ان سے رمشا کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

میں انو کے ساتھ رہ کے اس کے کئی ٹھکانوں سے واقف ہوگیا تھا۔ ایک دن میں انو کے ایک ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ بہ ظاہر چھوٹا سا چائے کا ایک ہوٹل تھا۔ اس کا مالک دلاور تھا۔ اس نے ہوٹل کے عقبی حصے میں ایک ہال بنا رکھا تھا جہاں لوگ کیرم اور تاش وغیرہ کھیلتے تھے۔ اس ہال کی دائیں جانب دو کمرے تھے جہاں انو اور اس کے ساتھی بیٹھتے تھے۔ وہ لوگ عموماً اس جگہ کسی واردات کی منصوبہ بندی کرتے تھے اور وہیں لوٹے ہوئے مال کا بٹوارا بھی ہوتا تھا۔ زیورات اور قیمتی اشیا دلاور خرید لیتا تھا اور اس کے بدلے میں نقد رقم ادا کردیتا تھا۔ انو کے دو تین ٹھکانے اور بھی تھے لیکن میں نے سب سے پہلے اس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا۔

کاؤنٹر پر اس وقت دلاور کے بجائے ایک نوعمر لڑکا بیٹھا تھا۔ میں اس لڑکے کو بھی پہچانتا تھا۔ دلاور کی عدم موجودگی میں وہی کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا، میں بے نیازی سے ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

ہال میں اس وقت کچھ لوگ کیرم کھیل رہے تھے اور ایک طرف تاش کی بازی جمی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہاں کیرم پر بھی جوا ہوتا ہے اور تاش پر بھی لیکن نقد رقم کبھی سامنے نہیں ہوتی تھی۔

وہاں اس وقت مجھے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ میں مایوس ہوکر باہر آگیا اور ایک طرف بیٹھ کر انو کے کسی آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے یکے بعد دیگرے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔

میں مایوس ہوکر اٹھنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے دروازے پر ایک موٹر سائیکل آکر رکی۔ اس کی عقبی سیٹ پر ساجد بیٹھا تھا۔ لوگ اسے بجو کہتے تھے۔ وہ اس گینگ کا آدمی تھا جو اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں کرتا تھا۔ انو بعد میں اسی گینگ میں شامل ہوگیا تھا۔ میں نے بجو کو ایک دو مرتبہ انو کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ انتہائی اوباش لڑکا تھا اور بات بات پر پستول نکال لیتا تھا۔ بجو موٹر سائیکل سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ موٹر سائیکل والا اسے چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ ممکن

ہے وہ بھی اسی گینگ کا آدمی ہو لیکن میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے اب بے تابی سے بجو کا انتظار تھا۔ وہ ضرور ان بدمعاشوں کو جانتا ہوگا جو انو اور رمشا کی موت کے ذمے دار تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن پسٹل موجود نہیں تھا۔ میں تو بلا ارادہ اس طرف آگیا تھا۔

مجھے آدھ گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے بجو باہر آتا دکھائی دیا۔ باہر آکر اس نے سگریٹ سلگایا اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہوگیا۔ میں کچھ فاصلے سے ہو کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا رخ پرانے لاہور کی طرف تھا۔ میں بہت محتاط انداز میں اس کا پیچھا کررہا تھا۔ بھاٹی گیٹ سے وہ اندر ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہوگیا۔ دو تین گلیاں طے کرنے کے بعد بجو ایک پرانے اور بوسیدہ سے مکان کے سامنے رکا۔ مکان کا دروازہ مقفل تھا۔ بجو نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

میں اب مزید انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے بجو کی کرخت آواز سنائی دی۔

”بجو، دروازہ کھول یارا!“ میں نے آواز بدل کر کہا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ بجو مسلح ہوگا، اس کے باوجود میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ دروازے کے قریب قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر بجو نے دروازہ کھول دیا۔

وہ اس وقت خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور اندر داخل ہوگیا۔ بجو اس وقت بنیان اور دھوتی میں تھا اور شاید سونے کی تیاری کررہا تھا۔ اس نے بھنا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”کون ہے اوئے تو؟“ اچانک اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی اور وہ حیرت سے بولا۔ ”اوئے تو یہاں کیا کررہا ہے؟“

”مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے بجو!“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا پسٹل چارپائی پر تکیے کے ساتھ پڑا تھا۔

وہ اچانک پلٹا اور لپک کر پسٹل اٹھانا چاہا لیکن میں نے اسے موقع نہ دیا اور اس کی پشت پر لات رسید کردی۔ وہ لڑھک کر فرش پر گرگیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کا پسٹل اٹھا لیا اور اس کا رخ بجو کی طرف کردیا پھر میں درشت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا بجو ورنہ میں کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

بجو وہیں ساکت ہوگیا اور بولا۔ ”تو آخر چاہتا کیا ہے؟“

”میں جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتانا۔“ میں نے کہا۔ ”انو کو کس نے قتل کیا ہے؟“

”اوئے، تو کیا دلاور کے گینگ میں شامل ہوگیا ہے؟“

میں نے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے پر زوردار لات ماری اور بولا۔ ”تجھ سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، وہ بتا۔“ پھر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”ہاں، میں دلاور کے ساتھ کام کررہا ہوں۔ بس اب کوئی سوال مت کرنا۔ بتا انو کو کس نے قتل کیا ہے؟“

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ کسی نے پشت سے مجھ پر ڈنڈے سے وار کیا تھا۔ وہ ڈنڈا میرے بجائے بجو کے سینے پر پڑا اور حملہ آور اپنی ہی جھونک میں بجو پر گر پڑا۔ پسٹل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا اب سنبھل گیا تھا اور دوبارہ ڈنڈا سنبھال رہا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے پر لات رسید کردی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے جھک کر اسے دبوچ لیا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اس کے بڑے بڑے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر فرش پر دے مارا۔

اچانک پشت سے مجھے بجو کی غراہٹ سنائی دی۔ ”بس کر اوئے ہیرو، ورنہ میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بجو مجھ پر پستول تانے کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پسٹل محض دھمکانے کو نہیں نکالتا بلکہ فائر بھی کردیتا ہے۔ میں خاموشی سے کھڑا ہوگیا۔

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب بتا، تجھے دلاور نے میرے پیچھے کیوں بھیجا ہے؟“

”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟“ میں نے بے ساختہ اس کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بہت پرانی چال تھی لیکن وہ دھوکا کھا گیا اور اچانک پلٹ کر دیکھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا ورنہ میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ہی جست میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر آگیا اور اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ میں بھاگنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے وہاں سے رکشا پکڑا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں اب دلاور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ انو سے دلاور کا نام سنا تھا لیکن کبھی اسے

دیکھا نہیں تھا۔ بجو کے لہجے سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ دلاور سے خوف زدہ ہے۔ شاید وہ انتہائی بڑا بدمعاش تھا۔

ہاسٹل پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا رزلٹ آچکا ہے اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ عام حالات میں مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس خبر سے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ میرا دوست وحید بھی پاس ہوگیا تھا۔ وہ اب ہاسٹل چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب میرا بھی ہاسٹل میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں گھر آگیا۔ ابا جی اس وقت آفس میں تھے۔ اماں اور رینو گھر میں موجود تھیں۔ جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا ہے تو خوشی کے مارے وہ زارو قطار رونے لگیں، پھر اسی وقت وضو کرکے شکرانے کے نفل ادا کرنے کھڑی ہوگئیں۔ ابا جی گھر لوٹے تو وہ بھی یہ خبر سن کر خوش ہوگئے۔

ہمارا گھر ریلوے لائن کے بالکل نزدیک ہی تھا۔ اچانک ٹرین کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ میں ایک دم حواس باختہ ہوگیا۔ ابا جی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہوگئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کیے اور گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر میں شاید چیخنے لگا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ ابا جی، اماں اور رینو وہاں موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اماں نے کہا۔ ”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”اب کیسی طبیعت ہے پتر؟“ ابا جی نے پوچھا۔

”مجھے کیا ہوا تھا ابا جی؟“ میں نے پوچھا۔

”تو کسی چیز سے ڈر گیا تھا بیٹا!“ اماں نے کہا۔ ”میں آج ہی شاہ جی سے تیرے لیے تعویذ لے کر آؤں گی۔ تجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“

مجھے سب یاد آگیا کہ میں ٹرین کی آواز سن کر وحشت زدہ ہوگیا تھا۔ مجھے تو خود اپنی ہی نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش نے ایک معصوم لڑکی کو نگل لیا تھا۔ میں گھر واپس آیا تو پھر وہی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے گھر تو ریلوے لائن کے نزدیک ہی تھا۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کانوں میں روئی ٹھونس کر سوگیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو ابا جی آفس جاچکے تھے۔ میں ناشتا کرکے گھر سے نکل گیا۔ میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دی تھی لیکن اب کئی دنوں سے پینے لگا تھا۔ میں سگریٹ ہمیشہ اسٹیشن کے ایک مخصوص اسٹال سے لیتا تھا کیونکہ وہاں ادھار سگریٹ، پان وغیرہ مل جاتا تھا۔

میں سگریٹ سلگا کر مڑا ہی تھا کہ میری نظر ایک شناسا چہرے پر پڑی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا لیکن میں نے اسے اکثر انو کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس سمت سے آرہا تھا جہاں ریلوے کی پرانی بوگیاں کھڑی تھیں۔ میں انو کے ساتھ اکثر ان ہی بوگیوں میں سے ایک بوگی میں جا بیٹھتا تھا۔ وہ آدمی تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے آواز دی۔ ”سنو!“

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور رک گیا۔ ”جی فرمایئے؟“ اس نے پوچھا۔ شاید وہ مجھے پہچانا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”یار! مجھے پہچانا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات تھے۔ واقعی وہ مجھے نہیں پہچانا تھا۔

”تم انو کے دوست ہو نا؟“ میں نے اچانک کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی۔ ”ہاں...... میں انو کا دوست ہوں۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”اب مجھے یاد آرہا ہے کہ میں نے تمہیں انو کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”کہیں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں یہاں اپنے ایک دوست کو ریسیو کرنے آیا تھا۔ وہ کراچی سے آنے والا ہے لیکن ابھی تک آیا نہیں ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی ٹرین کراچی سے نہیں آتی ہے۔ میری تو عمر اس پلیٹ فارم پہ گزری تھی لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آؤ یار، چائے پیتے ہیں۔“ میں نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے پلیٹ فارم سے باہر ایک ہوٹل پر لے گیا۔ میں نے چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوا لیے۔

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر میں نے اچانک پوچھا۔ ”تم بجو کو جانتے ہو؟“

”اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار دکھائی دیے۔ ”انو کی موت میں اس کا ہی ہاتھ ہے۔“

”یار! میں نے تو سنا ہے کہ انو کو کسی اور نے مارا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا قاتل ایک مرتبہ مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا۔“

”انو کو عابد نے مارا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ وہ اس دن کے بعد سے نظر نہیں آیا ہے۔ عابد، بجو کا آدمی ہے۔ بجو، انو کے ساتھ شامل ضرور تھا لیکن اس کی بھی انو سے بنی نہیں۔“

”معاف کرنا یار!“ میں نے کہا۔ ”میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”تو میں نے کب پوچھا ہے۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میرا نام اکمل ہے۔“

”میں صفدر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اکمل! تم عابد کا حلیہ بتا سکتے ہو، ممکن ہے میں نے بھی اسے دیکھا ہو؟“

”وہ گٹھے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا گورا چٹا آدمی ہے۔“

مجھے ایک دم یاد آگیا کہ رمشا کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ میں نے اکمل سے پوچھا۔ ”یار، کچھ اندازہ ہے کہ یہ عابد اس وقت کہاں ہوگا؟“

”اندازہ ہوتا تو میں وہاں جا کر اس کا کام تمام کردیتا۔“

میں اس کے ساتھ مزید کچھ دیر بیٹھا، پھر اس سے آئندہ ملاقات کا وعدہ کرکے اٹھ گیا۔

دوسرے دن میرا ہاسٹل والا دوست وحید واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ میں نے وہ رات ہاسٹل میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور ایک پی سی او سے ابا جی کو فون کردیا کہ میں آج رات اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں رات گئے تک ماضی کی باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہوکر لاری اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں گھر پہنچا تو رینو نے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ مجھے دیا اور بولی۔ ”بھیا! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہے۔“ لفافے پر کراچی کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا پتا چھپا ہوا تھا۔ اس میں میرا اپائنٹمنٹ لیٹر تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ امتحانات کے بعد میں نے اور وحید نے اس کمپنی میں ملازمت کی درخواست بھیج دی تھی۔ بڑے بڑے ادارے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کو اپنے طور پر بھی پیشکش کرتے ہیں۔

”کس کا خط ہے بھیا؟“ رینو نے پوچھا۔

”مجھے کراچی کی ایک فرم میں جاب مل گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ میرے لیے بے معنی ہوکر رہ گیا تھا۔ میرا کراچی جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رینو نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے بجو کا منحوس چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر آیا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ میں دہاڑ کر بولا۔

اس نے ایک دم اپنا پسٹل نکال لیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر رینو نے فلک شگاف چیخ ماری۔

اچانک کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آگئے۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا بھی وہی تھا جو رمشا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی گنز تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بے اختیار جیب پر ہاتھ مارا لیکن میرا پسٹل موجود نہیں تھا۔

”آواز نکالی تو ابھی چھلنی کردوں گا۔“ عابد نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”تجھے میری تلاش تھی نا۔ اب میں تیری بہن کو لے جاؤں گا، پھر میرے ساتھ ساتھ اسے بھی تلاش کرتے رہنا۔“

رینو ایک مرتبہ پھر دہشت زدہ ہوکر چیختی ہوائی کمرے سے باہر نکل آئیں۔ گھر میں سج بدمعاش دیکھ کر وہ بے ہوش ہوکر گر پڑیں۔ ”اگر تو نے میری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھا بھی تو میں تیرے ٹکڑے کردوں گا۔“

”اچھا!“ عابد نے کہا۔ ”چل پھر کردے ٹکڑے!“ وہ رینو کی طرف بڑھا تو میں بھی گن کی پروا کیے بغیر اس پر جھپٹا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے رقص کرنے لگے اور میں دھڑام سے زمین پہ جا گرا۔

میں پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ مجھے رینو کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس کی چیخیں معدوم ہوگئیں۔

میں ہمت کرکے کھڑا ہوگیا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا تاکہ اپنا پسٹل لے لوں۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں پسٹل اٹھانے کے لیے جھکا تو مجھے چکر سا آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے سر پر ہاتھ لگایا تو مجھے علم ہوا کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔

میں نے اماں کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا اور خود دیوانہ وار

گھر سے باہر نکلا۔
رینو کی مزاحمت کے باعث وہ لوگ زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ عابد نے رینو کو کندھے پر اٹھالیا تھا۔ بجو اور دوسرا بدمعاش آگے آگے گن لیے چل رہے تھے۔
میں نے چیخ کر کہا۔ ”میری بہن کو چھوڑ دے کمینے!“
اچانک بجو نے پسٹل کی نال میری طرف کی اور فائر کردیا۔
میں نے گولی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ میرے بجائے گولی بجو کو لگی تھی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ فوراً ہی دوسرا فائر ہوا اور عابد کا ساتھی کرب ناک انداز میں چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔
عابد نے گھبرا کر رینو کو نیچے پھینک دیا اور بوکھلا کر مجھ پر فائر کرنا چاہا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی ایک اور فائر ہوا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی اور وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا۔
پھر ایک دیوار کی اوٹ سے اکمل نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کی نال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ اس دوران میں رینو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔
وہاں اردگرد لوگوں کا مجمع لگتا جارہا تھا۔ اکمل دوڑ کر میرے نزدیک آیا اور بولا۔ ”صفدر! تم بہن کو لے کر گھر جاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں بھی شبہے میں گرفتار کرلے۔“
وہ تینوں میرے سامنے مردہ پڑے تھے۔ میرے سینے میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ آخر اکمل نے انو اور رمشا کے قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔
پھر وہاں پولیس اور ریلوے کا دوسرا عملہ ایک ساتھ پہنچا۔ میں رینو کو لے کر گھر میں چلا آیا تھا اور میں نے اپنا پسٹل بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا دیا تھا۔
ریلوے کے عملے کے ساتھ ابا بھی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ بدمعاشوں نے رینو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ حواس باختہ سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک اماں بھی ہوش میں آچکی تھیں۔ وہ بھی بری طرح سہمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بری طرح روتی ہوئی رینو سے لپٹ گئیں اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔ ”تو ٹھیک تو ہے بچی؟“
”یہ بالکل ٹھیک ہے اماں!“ میں نے جواب دیا۔
دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھ سے پہلے ہی ابا جی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔ ابا جی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایس ایم صاحب! آپ کی بچی کا بیان بھی لینا پڑے گا۔“
”ضرور بیان لو لیکن اسے ذرا سنبھلنے تو دو۔ ابھی تو اس کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہے۔“
”بیان میں نہیں لوں گا بلکہ متعلقہ تھانے کا کوئی افسر لے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔
”رینو بیٹا! سب کچھ سچ سچ پولیس کو بتادینا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“ ابا جی نے کہا۔ ”گھبرانا مت۔“
اکمل کو پولیس نے ہتھکڑی ڈال دی تھی اور اب اسے وہاں سے لے جارہے تھے۔
”صفدر! تم گھر سے مت نکلنا، میں ابھی آتا ہوں۔“ ابا جی نے کہا اور باہر نکل گئے۔
”یہ کون لوگ تھے بیٹا؟“ اماں نے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا؟“
اماں کو معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے گھر میں داخل ہونے والے تینوں بدمعاش مرچکے ہیں۔
آدھے گھنٹے بعد خالو مشتاق اور خالہ زینت بھی وہاں پہنچ گئے۔ اماں جی نے انہیں ٹیلی فون کرکے بلایا تھا۔
انہوں نے ہم سے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ چلو۔ میں نے سرور بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ پولیس کا جو آدمی بھی رینو بیٹا کا بیان لینے آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں۔“
وہ اصرار کرکے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔
پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ان کے تعلقات تھے اس لیے ہمیں بالکل پریشانی نہیں ہوئی۔ اکمل نے بیان دیا تھا کہ مرنے والوں سے اس کی دشمنی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ وہ واپس جارہا تھا کہ اس کی نظر ان تینوں بدمعاشوں پہ پڑی۔ وہ ایک لڑکی کو اٹھا کرلے جارہے تھے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھ پر فائر کردیا۔ اپنے دفاع کے لیے مجھے بھی فائرنگ کرنا پڑی اور وہ تینوں مارے گئے۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ رینو کا بھائی اس سے پہلے ان سے التجا کررہا تھا کہ میری بہن کو چھوڑ دو۔
اس کے بیان کی تائید محلے والوں نے بھی کی۔
یوں کسی جھگڑے میں پڑے بغیر ہماری جان چھوٹ گئی۔ بجو، عابد اور ان کے ساتھی کی موت کے بعد مجھے کسی حد تک سکون مل گیا تھا اور میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں کراچی چلا







جاؤں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اباجی بھی اب ریٹائر ہونے والے تھے۔ گھر کی ذمے داریاں اب مجھے ہی اٹھانا تھیں۔

اباجی نے فی الحال دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لی تھی۔

ایک دن اباجی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اماں کو بتایا۔ ''بھائی مشتاق نے فوراً ہم لوگوں کو بلایا ہے۔''

''خیریت تو ہے؟'' اماں گھبرا گئیں۔

''ہاں خیریت ہے۔'' اباجی نے جواب دیا۔ ''وہ ثمرہ کی شادی اپنے ایک دوست کے بیٹے سے کر رہے ہیں۔ وہ معروف ارب پتی صنعت کار شہریار کا بیٹا ہے۔''

''اللہ مبارک کرے۔'' اماں نے کہا۔ ''ہم سب شادی میں جائیں گے۔''

''اماں، میں تو ملازمت کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو اتنی دور کیوں جا رہا ہے؟'' اماں نے پوچھا۔ ''یہاں تیرے لیے کوئی ملازمت نہیں ہے کیا؟''

''نہیں اماں!'' میں نے کہا۔ ''تمام بڑی بڑی فرمز کراچی اور لاہور میں ہیں۔ مجھے دوبارہ ایسا موقع اتنی جلدی نہیں ملے گا۔''

''تم کراچی ضرور جاؤ بیٹا!'' اباجی نے کہا۔ ''لیکن ثمرہ کی شادی کے بعد۔ ورنہ زینت بہن اور بھائی مشتاق یہی سمجھیں گے کہ تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔''

ان کی بات معقول تھی اس لیے میں نے کراچی جانے کا پروگرام کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیا۔

ثمرہ کی شادی کے بارے میں سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اچانک میرے ذہن کی اسکرین پر رمشا نمودار ہوئی۔ ''صفدر بھائی! اپنی خواہش کے لیے آپ نے میری جان لے لی لیکن میری قربانی بھی آپ کے کام نہ آ سکی۔'' وہ روتے روتے پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے لیکن اس کے قہقہے میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ پھر انو، اکبر، عابد، بجو اور ان کے دو ساتھی میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ''ہم بھی تمہاری خواہش کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تم نے اپنی محبت پانے کے لیے ہماری جان لے لی لیکن حاصل کیا ہوا؟'' انو نے کہا۔

''میں نے کسی کی جان نہیں لی...... کسی کی جان نہیں لی......'' اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا، اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

برات کا استقبال کرنے والوں میں خالو مشتاق کے ساتھ میں اور اباجی بھی موجود تھے۔

جہانگیر خاصا وجیہہ اور دراز قد نوجوان تھا۔ ثمرہ کی طرح اس کا رنگ بھی سرخ و سفید اور بال سیاہ تھے پھر ثمرہ میری آنکھوں کے سامنے جہانگیر کی بی ایم ڈبلیو کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گئی۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح ہال میں واپس آ گیا۔ میں نے ثمرہ کو اپنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا لیکن میرے ہاتھ کیا آیا؟ محرومیاں اور ناکامیاں! میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں میں نے جلدی سے صاف کر لیا۔

اچانک جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں... بے اختیار اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کا وہی ماحول تھا، وہی گہما گہمی تھی لیکن اتنے عرصے میں بہت سے چہرے بدل گئے تھے۔ ہاں اسٹال والے سب میرے شناسا تھے۔ ہر شخص مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔

میں پلیٹ فارم پر ٹہلتا ہوا بے اختیار اس طرف جا نکلا جہاں ریلوے کی ناکارہ بوگیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میرے قدم خود بہ خود اس بوگی کی طرف اٹھ گئے جو دوسری ناکارہ بوگیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہی بوگی جو کبھی میرا ٹھکانا تھی۔

میں غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کر اس بوگی میں داخل ہو گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اپنا لائٹر روشن کیا اور اس سیٹ کی طرف چل دیا جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کئی خوب صورت لڑکیاں اس سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ انو بھی اکثر میرے ساتھ اسی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے سیٹ کے نیچے کی طرف کوئی بیلٹ سی نظر آئی۔ میں نے جھک کر بیلٹ پکڑی اور اسے باہر گھسیٹ لیا۔ وہ کوئی اسکول بیگ تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رمشا کا اسکول بیگ تھا۔ وہ بیگ تین مہینے تک اسی طرح وہاں پڑا رہا تھا۔ لگتا تھا اس دوران میں کوئی اس بوگی میں آیا ہی نہیں ورنہ وہ قیمتی بیگ وہاں نہ ہوتا۔ میں نے غیر شعوری طور پر وہ بیگ اٹھایا اور اسے کندھے سے لٹکا کر باہر نکل آیا۔

وہاں سے میں سیدھا ویٹنگ روم میں پہنچا۔ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم کا بیرا ابھی مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں اکثر اسے پانچ دس روپے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ''صفدر بابو! ویٹنگ روم کھول دوں کیا؟''

''ہاں غلام حسین۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا ویٹنگ روم کھول دو۔ میں کچھ دیر یہاں آرام کروں گا۔''

اس نے ویٹنگ روم کھولا تو میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ''آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔''

میں نے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر رمشا کا بیگ کھول لیا۔ اس میں اس کی کتابیں، کاپیاں اور دوسری چیزیں تھیں۔ میں نے اس کی ایک کتاب نکالی تو اس پر خوش خط انگریزی میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ''رمشا مشتاق......'' اس میں سے اچانک کچھ کاغذ نکل کر باہر گر پڑے۔ میں نے جھک کر وہ کاغذ اٹھا لیے۔

میں نے یونہی ان کاغذات کی تہیں کھولیں تو مجھے رمشا کی تحریر نظر آئی۔ اس نے انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ ہیڈنگ پر میری نظر پڑی۔ ''پولیس کے لیے۔''

اس کے نیچے لکھا تھا۔ ''مجھے امید تو نہیں ہے کہ میری یہ تحریر پولیس تک پہنچے گی لیکن میں پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ شاید پہنچ ہی جائے۔ میں صبح اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ اس دن میرا ٹیسٹ تھا اور میں نے بہت اچھی طرح ٹیسٹ کی تیاری کی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے دہرا رہی تھی کہ اچانک گاڑی رک گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سڑک پر ایک دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ چھتر ماڈل کی کرولا تھی۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی کہ میں اس کا نمبر نہ دیکھ سکی۔ اس گاڑی کے ساتھ تین آدمی کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور گاڑی کا شیشہ ہٹا کر بولا۔ ''یار، یہ گاڑی تو سائڈ میں لگاؤ۔ راستہ بند ہو گیا ہے۔''

اچانک سائڈ میں سے دو آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ ان میں سے ایک میری طرف آیا۔ دوسرا ڈرائیور کی طرف چلا گیا پھر اس نے ڈرائیور کے سر پر گن کا بٹ مار کے بے ہوش کر دیا اور جھک کر مجھ سے بولا۔ ''اگر تو نے آواز نکالی تو تجھے بھی گولی مار کر ڈھیر کر دوں گا۔ دروازہ کھول اور خاموشی سے نیچے آ جا۔''

میں اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ فوراً دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ باہر کھڑے ہوئے آدمی نے مجھے بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر اس پرانی کرولا میں بٹھا دیا جو وہاں کھڑی تھی پھر دوسرا آدمی میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے میرے دوپٹے سے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور گاڑی تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ جو آدمی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا اس نے کہا۔ ''اس لڑکی کا خیال رکھنا، اسے تکلیف مت ہونے دینا۔ یہ میرے دوست کی امانت ہے۔''

''کون سا دوست؟'' یہ سوال شاید ڈرائیور نے کیا تھا۔ ''وہ صفدر......؟''

''ہاں صفدر۔'' پہلے آدمی نے جواب دیا۔

''یار انو! وہ تجھے کب کا چھوڑ گیا ہے۔ تیری ابھی تک دوستی ہے اس سے؟''

''وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا ہے بلکہ میں نے ہی اسے چھوڑ دیا۔''

''بات تو ایک ہی ہے۔'' ڈرائیور ہنس کر بولا۔ ''ویسے یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، بالکل گڑیا کی طرح ہے۔''

''اکو......!'' انو نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا نا کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی مت کرنا۔''

''ارے استاد! تم تو فضول میں گرم ہو رہے ہو۔ میں تو لڑکی کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔''

''انو بھائی! یہ تو مکھن ملائی ہے۔'' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

مجھے ان لوگوں کی باتوں سے گھن آ رہی تھی اور میں شدید خوف زدہ تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''تم پریشان مت ہو۔'' یہ آواز انو کی تھی۔ ''تمہارے باپ سے ہمیں کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔ وہ سیدھی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کام ہوتے ہی تمہیں واپس گھر چھوڑ دیں گے۔ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔'' پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''بس اب رونا بند کر دو۔''

گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر وہ رک گئی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ وہ لاہور کا کوئی مضافاتی علاقہ تھا۔ وہاں دور تک کھیت تھے۔ ان ہی کھیتوں کے سرے پر ایک کچا سا مکان تھا۔ وہ لوگ مجھے اسی مکان میں لے گئے۔ میں خوف سے لرز رہی تھی کہ نہ جانے وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ خاص طور پر اکو تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔

اس کچے مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پلنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ انو نے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا اور بولا۔ ''تم گھبراؤ مت، میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ منگواتا ہوں۔''

وہ سارا دن روتے ہوئے گزر گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا

کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ وہ لوگ بار بار کسی صفدر کا نام لے رہے تھے۔ یہ نام تو میرے دل کی دھڑکن تھا۔ مجھے اس پر صفدر بھائی یاد آتے تھے۔ وہ کتنے ڈیشنگ اور ہینڈسم ہیں۔ میں عمر میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے دل کی بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو وہ سمجھتے ہی نہیں تھے، عجیب بدھو تھے۔ شاید انہیں کبھی کسی لڑکی سے محبت ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں ان سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کردوں لیکن ہر بار میری زبان گنگ ہوجاتی اور میں ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ میں نے اکثر یہ بھی سوچا کہ میں رینو سے اپنے جذبات کا اظہار کردوں لیکن اس کے سامنے بھی صفدر بھائی کا نام لیتے ہوئے میری زبان گنگ ہوجاتی۔

پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ صفدر بھائی مجھ میں کم اور باجی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ باجی شاید انہیں ناپسند کرتی تھیں یا ممکن ہے وہ بھی انہیں پسند کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ باجی اپنے دل کی بات نہ کبھی مجھے بتائیں گی نہ صفدر بھائی کو بتا پائیں گی۔ کاش اس وقت صفدر بھائی یہاں آجائیں تو وہ ان بدمعاشوں کو سیدھا کردیں۔ روتے دھوتے پورا دن گزر گیا۔ میں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں حالانکہ اس انو نے بہت کوشش کی کہ میں کچھ کھالوں، کم سے کم دودھ ہی پی لوں لیکن میں نے انکار کردیا۔

رات کو بہت مشکل سے میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس اور دودھ کا ایک گلاس پیا۔ ویسے مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بیگ میں لنچ باکس بھی تو ہوگا۔ میرا بیگ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میں نے جلدی سے بیگ کھولا اور لنچ باکس نکال لیا۔ اس میں سینڈوچز، فرنچ فرائز اور مایونیز تھا۔ میں نے خوب ڈٹ کر سینڈوچز کھائے اور تب جا کر میری جان میں جان آئی۔ لیکن یہ میں کیا لکھ گئی۔ صفدر بھائی کو معلوم ہوگا تو کتنی شرمندگی ہوگی اور ثمرہ باجی تو مجھے تھپڑ ماردیں گی۔ ماردیں ...... کم سے کم میں نے اپنی محبت کا اظہار تو کردیا اور اگر یہ تحریر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو ...... تو بھی کیا ہے جب صفدر بھائی کو معلوم ہوگا، باجی کو معلوم ہوگا، مما اور پاپا کو معلوم ہوگا تو پولیس والوں سے کیا شرمانا لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ پاپا تو خالہ نسیمہ کو اتنا بے عزت کرچکے ہیں۔ اب تو شاید صفدر بھائی بھی ہمارے گھر کبھی نہ آئیں لیکن انہیں معلوم تو ہوجائے گا کہ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو ان کے لیے جان تک دے سکتا ہے۔ رات کو اچانک فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ لوگ بہت عجلت میں وہاں سے بھاگے لیکن میں اپنا بیگ اٹھانا نہیں بھولی۔ اس مرتبہ پھر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور سفر شروع ہوگیا۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح کچھ اور ڈاکو بھی وہاں چھپے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہی لوگوں کے لیے آئے تھے۔ جب پولیس اور ان ڈاکوؤں کا مقابلہ ہورہا تھا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں میں ان کا ایک آدمی شامل تھا۔ اسی خوف سے وہ فرار ہوگئے تھے۔

اس مرتبہ وہ مجھے کسی ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے مجھے برقع پہنا کر اوپر سے نقاب بھی ڈال دیا تاکہ کسی کو میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی نظر نہ آسکے۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں اندھوں کی طرح ان کے ساتھ چل دی۔ دس منٹ تک چلنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹرین میں سوار ہونے کو کہا۔ لگتا تھا اب وہ ٹرین کے ذریعے مجھے کہیں لے جارہے ہیں۔

بوگی میں پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں سے پٹی کھول دی۔ میں اس انتظار میں تھی کہ ٹرین چلے تو مجھے معلوم ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن میں انو سے کہہ کر انہیں کھلوا سکتی تھی۔ ان سب لوگوں میں وہی مجھے سب سے زیادہ شریف اور ہمدرد لگتا تھا۔

وہ بوگی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بہت دیر بعد میں مجھے احساس ہوگیا کہ یہ بوگی کبھی نہیں چلے گی۔ مجھے ٹرین کے انجن کا ہارن اور چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن وہ دوسری ٹرینیں ہوتی تھیں۔

جب ایک دن اسی طرح گزر گیا تو انو نے مجھے بتایا کہ یہ بوگی کبھی نہیں چلے گی کیونکہ یہ بالکل الگ تھلگ کھڑی ہے۔

''انو بھائی!'' میرے منہ سے بے اختیار اس کے لیے بھائی کا لفظ نکل گیا۔ ''آپ مجھے گھر کب پہنچائیں گے؟''

''تم پریشان مت ہو گڑیا، ہم آج ہی تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔'' وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ بوگی میں تھوڑی دیر بعد کچھ اندھیرا چھا گیا۔ اچانک مجھے بوگی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اگر ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہ باندھے ہوتے تو میں کب کی وہاں سے نکل کر بھاگ چکی ہوتی۔ کوئی بہت آہستگی سے اندر آگیا۔

''کون ہے؟'' میں نے خوف زدہ ہوکر پوچھا۔

''ڈرو مت۔'' مجھے اکو کی آواز سنائی دی۔ اس کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر میرے بالکل نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔ ''رمشا! یہی نام ہے نا تمہارا؟ تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم کتنی حسین ہو۔ اتنی حسین کہ تمہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ تم میلی نہ ہوجاؤ۔'' وہ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ تم کیسی بے ہودہ باتیں کررہے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''انو بھائی کہاں ہیں؟''

''بھاڑ میں گئے انو بھائی۔'' وہ بھڑک کر بولا اور میرے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھ گیا۔ ''تم بس یہاں آج رات کی مہمان ہو۔ کل تمہیں تمہارے گھر پہنچادیں گے۔''

''سچ کہہ رہے ہو تم؟''

''ہاں، اکو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اسے اتنی آسانی سے اپنے نزدیک نہیں آنے دیتی پھر...... پھر اس نے ...... میری عزت ...... مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا آدمی آگیا اور بولا۔ ''واہ اکو! اکیلے ہی اکیلے۔ ارے یار ہمارے بدن میں کیا کانٹے ہیں۔ لیکن تم نے بہت غلط کیا، انو بھائی کو معلوم ہوگا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''اس انو سے میں خود نمٹ لوں گا۔ میں خود بھی اس سے الگ ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''ارے یار تو پھر ہم کیوں پیاسے رہیں۔'' اس نے کہا پھر اس نے اکو کے ساتھ مل کر میرے ساتھ ...... میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مرجاؤں، رو رو کر میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہوگئے تھے۔ میں تو اب کسی قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ ان لوگوں نے مجھے میری ہی نظروں میں گرادیا تھا۔

ان دونوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے انو بھائی کو کچھ بتایا تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ لوگ مجھے جان سے ماردیں۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھے پانی پلایا اور بوگی سے باہر نکل گئے پھر وہاں انو بھائی بھی آگئے۔ وہ لوگ بوگی کے باہر تھے اور کسی بات پر بحث کررہے تھے۔

انو بھائی نے کہا۔ ''پچیس لاکھ کافی ہیں۔ اب زیادہ لالچ مت کرو۔ پچاس لاکھ اکٹھے کرنے میں اس کا باپ ایک اور دن لگادے گا۔ یہاں ہر طرف خطرہ ہے۔ اس دوران میں یہاں پولیس بھی پہنچ سکتی ہے۔'' کافی بحث کے بعد وہ لوگ پچیس لاکھ پر راضی ہوئے۔ انہوں نے میری رہائی کے لیے پچیس لاکھ روپے مانگے تھے۔ صبح وہ لوگ مجھے ڈیڈ کے حوالے کرنے والے تھے۔

انو بھائی نے بوگی میں آکر میرے ہاتھ کھولے اور مجھے کھانے کو دیا اور خود باہر چلے گئے۔

صبح ہوتے ہی میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی یہ سارے واقعات لکھ دیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں انو بھائی کو بھی سب کچھ بتادوں گی پھر وہ لوگ شاید مجھے گولی ماردیں گے۔ میں اب بے آبرو ہوکر مزید جینا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس سے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید رمشا کو مزید کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بیگ کی ایک کتاب میں رکھ کر بیگ کو سیٹ کے نیچے دھکیل دیا ہوگا۔ مجھے خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے انو کو بھی سب کچھ بتادیا ہوگا۔ اسی بات پر انو سے ان لوگوں کا جھگڑا ہوا ہوگا اور بات فائرنگ تک پہنچ گئی ہوگی۔ رمشا کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پیر بھی کھول لیے ہوں گے اور بوگی سے نکل کر بھاگی ہوگی تاکہ وہ اسے گولی ماردیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لوگ گولی مارنے کے بجائے اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے تو اس نے ریلوے کے پل پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگادی۔

''صاحب چائے۔''

یہ سن کر میں بری طرح اچھل پڑا۔ وہ ویٹنگ روم کا بیرا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ''صفدر صاحب! آپ رو رہے ہیں؟'' خط پڑھتے ہوئے بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے تھے۔

اچانک مجھے کسی ٹرین کا ہارن سنائی دیا اور اس کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ کانوں تک پہنچی تو میں وحشت زدہ ہوکر وہاں سے بھاگا۔ بیرا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

میں یوں وہاں سے بھاگا تھا جیسے فرشتۂ اجل میرے پیچھے لگا ہو۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس سے انارکلی جانے کو کہا۔ میں فوری طور پر ان آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا ورنہ انارکلی میں اس وقت کیا ہوتا۔ رمشا کا بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے انارکلی سے پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں اس بیگ کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا ورنہ وہاں سے سیدھا ماڈل ٹاؤن ہی جاتا۔

وہاں ایک جگہ مجھے کچھ انگارے نظر آئے۔ سردی بہت شدید تھی۔ شاید وہاں چوکیدار نے الاؤ روشن کیا تھا جو اب تقریباً بجھ چکا تھا۔ میں نے پہلے بیگ سے ایک کاپی نکال کر راکھ کے اس ڈھیر میں پھینکی۔ راکھ کے نیچے اب بھی چنگاریاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں کاپی سلگنے لگی۔ میں نے دوسری کاپی نکال کر اس سے پنکھے کا کام لیا اور اس سے آگ کو جھل کر مزید آگ بھڑکا دی پھر میں ایک کے بعد دوسری کاپی اور کتاب اس الاؤ میں ڈالتا رہا اور خود اس پتھر پر بیٹھ گیا جو شاید چوکیدار نے اپنے لیے رکھا تھا۔

اب آگ خوب بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے ایک ساتھ اس میں بچی ہوئی کتابیں اور کاپیاں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب جل کر خاکستر ہو گئیں۔ اب مسئلہ اس بیگ کا تھا۔ وہ خالص چمڑے کا بیگ تھا اور جلنے میں کافی وقت لیتا۔ میں نے وہ بیگ بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھی آگ پکڑ لی۔ جلد ہی وہ بیگ ناقابلِ شناخت ہو گیا۔ اب یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ اس الاؤ میں بیگ جل رہا ہے لیکن اب وہ ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔ وہ صفحات البتہ اب تک میری جیب میں تھے جو رمشا نے آخری وقت میں لکھے تھے۔ میں نے وہ صفحات احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔

رات خاصی ہو چکی تھی لیکن مجھے وہاں سے ماڈل ٹاؤن کے لیے ٹیکسی مل گئی۔ وہ شادی کا گھر تھا۔ ابھی تک وہاں سب جاگ رہے تھے۔ ثمرہ کی چچازاد، رینو، اماں اور خالہ جان بھی وہاں موجود تھے۔ اباجی، خالو مشتاق اور ان کے کوئی اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

''صفدر بیٹا!'' خالو مشتاق نے کہا۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔'' مجھے اچانک رمشا کا کٹا پھٹا جسم اور اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط یاد آ گیا۔ میرا دل بھر آیا اور میں خود پر ضبط نہ کر سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''ارے، ارے...... کیا ہوا صفدر بیٹا؟'' خالو نے پوچھا۔

''خالو، میرا وہ دوست ایک حادثے میں مر گیا۔'' میں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ خالو نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا اور دلاسا دینے لگے۔

''صبر کرو بیٹا۔ رونے کے بجائے اپنے اس دوست کے لیے دعا کرو۔''

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میری وہ دوست رمشا تھی۔ وہ پاگل لڑکی مجھے اتنا چاہتی تھی۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا تو شاید میں اسے پیار سے سمجھاتا لیکن اب تو وہ سمجھنے سمجھانے کی حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد کئی شادیوں میں، خاندان کی دوسری تقریبات میں ثمرہ سے میرا سامنا ہوا۔ وہ شادی کے بعد کچھ اور نکھر گئی تھی۔ وہ اپنی قیمتی بی ایم ڈبلیو سے اترتی تو وہاں موجود تمام خواتین کا حسن ماند پڑ جاتا۔ وہ کسی مہارانی کی طرح نپے تلے قدم رکھتی ہوئی اندر داخل ہوتی اور خالہ جان یا اماں کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ مجھے پہلے کی طرح سلام بھی کرتی تھی لیکن اب فرق یہ پڑا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگتی نہیں تھی بلکہ مجھ سے اچھی خاصی باتیں بھی کر لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید احساسِ کمتری ہوتا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ اب میں بھی خالو مشتاق اور ثمرہ کو ان کے ہم پلہ ہو کر دکھاؤں گا مگر جائز طریقے سے۔

اس دوران میں ثمرہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں اس دن آفس سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ کو گھورا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کاظمی صاحب کا ٹیلی فون ہوگا اور وہ مجھے فوری طور پر بلا رہے ہوں گے۔ کاظمی صاحب میرے باس تھے اور اکثر ضروری پروجیکٹس پر بات چیت کرنے کے لیے انہیں یہی وقت ملتا تھا۔ میں نے بریف کیس رکھ کر ریسیور اٹھا لیا اور آہستہ سے بولا۔ ''ہیلو۔''

''السلام علیکم!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ وہ آواز سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ ثمرہ کی مترنم آواز تھی۔

''ثمرہ تم......؟'' میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے، اس وقت کیسے فون کیا؟''

''کیوں صفدر بھائی! کیا میں آپ کو فون نہیں کر سکتی؟'' اس کے منہ سے بھائی کا لفظ سن کر مجھے شاک سا لگا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ہاں کر تو سکتی ہو لیکن کرتی نہیں ہو اس لیے کہہ رہا ہوں۔''

''وہ اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو میرے بیٹے دانیال کا عقیقہ ہے اور آپ کو ضرور آنا ہے۔''

''ماشاء اللہ! دانیال بیٹا ایک سال کا ہو گیا؟ بہت

مبارک ہو۔''

''خیر مبارک لیکن آپ آ رہے ہیں نا؟''

''لیکن تمہیں میرا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کا نمبر کیا خفیہ ہے؟'' وہ مسکرائی۔ ''ارے بھئی خالہ نسیمہ سے ملا ہے اور کہاں سے ملے گا۔ آپ آیئے گا ضرور، خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں بہت دیر تک ریسیور ہاتھ میں پکڑے اسے گھورتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ماؤتھ پیس سے اس کی سانسوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ یقیناً اماں نے اس سے کہا ہوگا کہ تم خود فون کر لو۔ ہمارے کہنے سے تو وہ شاید نہ آئے۔

ثمرہ کے بیٹے دانیال کے عقیقے میں اتنا اہتمام تھا کہ کسی شادی یا ولیمے کی تقریب میں بھی کیا ہوگا۔ خالہ کا پورا گھرانا بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اس تقریب میں ثمرہ کے شوہر جہانگیر سے بھی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ خاصا عدیم الفرصت شخص تھا اور دن رات پیسا کمانے اور کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف رہتا تھا۔ ثمرہ کی شادی کے بعد میں آج اسے دیکھ رہا تھا ورنہ خاندان میں کئی تقاریب ہوئی تھیں جن میں صرف ثمرہ ہی شریک ہوتی تھی، وہ یا تو ملک سے باہر ہوتا تھا یا پھر شہر سے باہر۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے بیٹے کے عقیقے کے موقع پر اپنی تمام کاروباری مصروفیات ترک کر دی تھیں۔

اس سے بات کر کے مجھے مزید احساسِ کمتری ہوا۔ اگر اس کی روزانہ کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو وہ بھی میری ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھا۔ میں جس فرم میں کام کرتا تھا، اس کے چیئرمین سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ ان کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں جھوٹی سچی باتیں بتاتا رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی اس ملٹی نیشنل کمپنی کے سی ای او سے میری دو چار ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ میں اس کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بھی جہانگیر کی طرح ایک کروڑ پتی شخص ہے اور بس۔

پھر جہانگیر مجھے اپنے غیر ملکی دوروں اور بزنس کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ میرے پاس اتنی دولت تو نہیں تھی لیکن معلومات اس سے کہیں زیادہ تھیں، پھر مجھ میں دوسروں کی باتیں سننے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بولتا رہا اور میں دل ہی دل میں مرعوب ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے ثمرہ کے لیے وہ کتنا وقت نکال پاتا ہوگا۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ بھی لیا۔ ''جہانگیر صاحب! آپ اتنی بزی لائف میں سے گھر والوں کے لیے وقت کیسے نکال پاتے ہیں؟'' میری بات پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

اس تقریب کے بعد میرا احساسِ محرومی مزید بڑھ گیا۔ انتہائی مہنگے ترین علاقے میں جہانگیر کا وسیع و عریض بنگلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ دو ایکڑ سے زیادہ ہی ہوگا۔ وسیع و عریض لان اتنا بڑا تھا کہ وہاں دو ہزار سے زیادہ کرسیاں آ سکتی تھیں۔ اس کا کار پورچ بھی اتنا بڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی پارکنگ لاٹ کا گمان ہوتا تھا۔ مہمانوں کی روانگی کے بعد ثمرہ نے ضد کر کے ہم لوگوں کو روک لیا۔ یوں بھی رات کافی ہو چکی تھی اور واپس جانے میں خاصی دقت ہوتی۔ اس رات مجھے اس کا محل نما گھر اندر سے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں اوپر نیچے آراستہ بیڈ رومز تھے۔ مہمانوں کے لیے علیحدہ سے انیکسی تھی لیکن وہاں جہانگیر کے کاروباری اور غیر ملکی مہمان ٹھہرتے تھے۔

دس پندرہ رومز کے علاوہ وسیع و عریض اور جدید ترین اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ جہانگیر کا بیڈ روم بھی شاندار تھا۔ اس کے علاوہ اس محل میں ایک اسٹڈی روم بھی تھا۔ ہر موضوع کا پورشن علیحدہ تھا۔ ان کتابوں میں مارکیٹنگ، اکنامکس، سیاسیات، تاریخ، اردو اور انگریزی ادب پر ایسی کتابیں تھیں کہ انہیں دیکھ کر مجھے رشک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

میں نے ثمرہ سے پوچھا۔ ''کیا جہانگیر صاحب کو مطالعے کا بہت شوق ہے؟'' ثمرہ عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

''جہاں تک مجھے علم ہے، مطالعے کا شوق تمہیں تھا۔ خاص طور پر اردو ادب سے لگاؤ تھا تمہیں؟'' میں نے کہا۔

''وہ تو اب بھی ہے مجھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے تو لکھنے کا شوق بھی تھا لیکن زندگی نے مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنے لیے بھی کچھ وقت پس انداز کر سکوں۔''

میں نے سوچا کہ جہانگیر اتنی دولت کما کر کیا کرے گا؟ جہاں تک مجھے علم ہے شادی کے بعد اس نے صرف پہلے پندرہ دن ثمرہ کے ساتھ ہنی مون منایا تھا اور ثمرہ کو سوئٹزرلینڈ، اٹلی، لندن اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کروائی تھی۔ اس کے بعد شاید کئی کئی دن اس کی ثمرہ سے ملاقات نہ ہوتی ہوگی۔ اس کی مصروفیات تو کچھ ایسی ہی تھیں۔

میں نے کراچی آ کر نہ صرف امریکا کی کئی کمپنیوں

میں ملازمت کے لیے درخواست بھی بھیجی بلکہ مختلف یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ کرلیا۔ ان دنوں کمپیوٹر پاکستان میں آچکا تھا لیکن ابھی وہ صرف دفتروں اور دولت مند گھرانوں تک ہی پہنچا تھا۔

میں نے کمپیوٹر کے ذریعے ہی امریکا اور یورپ کی دوسری کمپنیوں کو ملازمت کے سلسلے میں ای میل کی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں ایک سال گزر گیا۔ میں ہر مہینے پابندی سے اماں اور ابا جی سے ملنے بھی جاتا تھا۔ رینو نے ایف اے کرلیا تھا اور اب وہ بی اے میں پڑھ رہی تھی... ابا جی مجھے دیکھ کر اتنے خوش ہوتے تھے کہ میں اس خوشی کو صرف محسوس کرسکتا تھا، بیان نہیں۔ اماں ہر دفعہ یہی کہتی تھیں کہ میں تیرے لیے چاندسی دلہن لاؤں گی لیکن ابھی تک انہیں اپنی وہ چاندسی بہو کہیں ملی نہیں تھی۔ میرا تو شادی کا... فی الحال کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

آخر ایک دن میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے امریکا کی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ وہاں میری تنخواہ اور دیگر مراعات اتنی تھیں کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کمپنی کی طرف سے بنگلا تھا، کار تھی اور طبی سہولیات تھیں۔ جتنا میں یہاں رہ کر سال بھر میں کماتا، وہاں صرف ایک مہینے میں کما لیتا۔ اب مسئلہ صرف اماں اور ابا جی کو راضی کرنے کا تھا۔

میں نے اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں اپنا سب سامان سمیٹ کر لاہور روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

"دیکھو بیٹا! تم کراچی گئے تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم سے دور ہو لیکن اپنے ملک میں تو ہو۔" ابا جی نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد میں ابا جی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ میں امریکا جانا چاہتا ہوں۔

"یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے پتر؟" انہوں نے کہا۔ "کیا تم نے انجینئرنگ کی ڈگری اس لیے لی تھی کہ وہ غیروں کے کام آئے؟"

میں ابا جی کو کیسے سمجھاتا کہ میں ثمرہ کی ضد پر زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتا ہوں۔ ابا جی کی بات درست تھی۔ مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا تھا۔

"ابا جی!" میں نے کہا۔ "میں صرف دو سال وہاں لگاؤں گا اور کچھ پیسے کما کر اپنے ملک لوٹ آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!" ابا جی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "تو نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم تجھے کیسے روک سکتے ہیں؟" ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ "جا اپنی یہ خواہش بھی پوری کرلے۔"

"صفدر! تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟" اماں نے کہا۔

"آپ لوگ تو عیش کریں گے عیش!" میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

"نہیں چاہئیں ہمیں عیش!" اماں نے کہا۔

"اسے مت روکو نسیمہ!" ابا جی نے کہا۔ "اس نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم بھلا اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں۔ جاؤ بیٹا، خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔"

☆☆☆

امریکا پہنچ کر شروع میں تو مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ پھر میں نے بھی خود کو اس اجنبی ماحول میں ڈھال لیا۔ وہیں میری ملاقات لطیف سے ہوئی۔ اس کا تعلق بھی پاکستان میں جہلم سے تھا۔ جلد ہی ہم دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ لطیف کسی آئل فیلڈ پر کام کر رہا تھا۔ میرے پاس خاصا بڑا اپارٹمنٹ تھا اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔

☆☆☆

اچانک مجھے کسی نے جھنجوڑا تو میں چونک اٹھا۔ لطیف مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے ہیڈ فون کانوں سے نکالتے ہوئے کہا۔

"اب اترو، ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔" میں جلدی سے نیچے اتر آیا پھر ہم کوچ کے ذریعے اپنے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابا جی گاؤں منتقل ہوچکے تھے۔ گاؤں کی حالت بھی بدل چکی تھی۔ وہاں پختہ سڑک بن گئی تھی اور اس سڑک پر تانگوں کے ساتھ ساتھ رکشا بھی چلنے لگے تھے۔ میں نے بھی رکشا ہی لیا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اماں تو جہلم کے اسپتال میں ہوں گی یا ممکن ہے گھر چلی گئی ہوں۔

میں نے سیل فون نکال کر رینو کا نمبر ملایا تو اس نے فوراً ہی کال ریسیور کرلی۔ "السلام علیکم بھیا!"

"وعلیکم السلام۔" میں نے کہا۔ "رینو! اب اماں کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے بھیا۔ ابھی ڈاکٹر انہیں دو تین روز مزید

اسپتال میں رکھیں گے۔"

"تم اس وقت اسپتال میں ہو؟"

"جی بھیا۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا اماں سے میری بات کرواؤ۔"

"اماں...... تو اس وقت سو رہی ہیں بھیا۔" اس نے کہا۔

"اچھا میں تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔" میں نے کہا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں جہلم پہنچ گیا ہوں۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ سارا سامان گھر میں چھوڑ کر اسی رکشے میں واپس جہلم چلا جاؤں گا۔ گھر کی چابی راجا کے گھر والوں کے پاس تو ہوگی۔ چابی نہ بھی ہوتی تو میں سامان راجا کے گھر رکھ دوں گا۔

میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو مجھے گھر کی حالت دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ ابا جی نے اسے شاید نئے سرے سے بنوایا تھا یا پھر اس میں کچھ ردوبدل کروایا تھا۔

راجا کے گھر میں صرف خالہ امینہ تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میرا سامان رکھ لیں، میں ابھی جہلم واپس جا رہا ہوں۔ میں سامان وہاں رکھ کر اسی ٹیکسی سے جہلم کے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچا۔

رینو اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خاصی بڑی ہوگئی تھی اور اب دبلی پتلی رینو کی جگہ ایک خوب صورت دوشیزہ کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔

"تم رو کیوں رہی ہو رینو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "اماں تو ٹھیک ہیں؟"

"ہاں بھیا! اماں بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔"

"اب آنسو بہانا چھوڑ موٹی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت ابا جی بھی آگئے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہوگئے تھے اور خاصے بوڑھے لگ رہے تھے۔ میں والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ابا جی میری پشت سہلاتے رہے۔

"اب آپ کیوں رو رہے ہیں موٹے آلو؟" رینو نے منہ بنا کر کہا تو بے اختیار مجھے ہنسی آگئی پھر راجا مجھ سے گلے ملا۔

میں نے کہا۔ "راجا! تیرا شکریہ میں کس منہ سے ادا کروں۔ تو نے میرے ماں باپ کی بہت خدمت کی ہے۔"

"صفدر! اگر تو ایسی باتیں کرے گا تو میں تیرے گھر آنا چھوڑ دوں گا۔"

"ارے نہیں، تو تو میرا بچپن کا یار ہے۔"

میں نے ابا سے کہا۔ "ابا! آپ اب گھر چلے جائیں۔ میں اماں کے پاس رہوں گا۔"

"تو بہت لمبا سفر کر کے آیا ہے بیٹا۔" اباجی نے کہا۔ "گھر جا کر آرام کر۔"

میں نے ابا کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر میں ڈاکٹر سے ملا اور اس سے اماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اماں کو دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا لیکن انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا اس لیے انہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑا۔ اب وہ خیریت سے ہیں اور آج شام تک انہیں ڈسچارج بھی کر دیں گے۔

مجھے دیکھ کر تو اماں اتنی خوش ہوئیں کہ گویا دوبارہ جی اٹھیں۔ انہوں نے عادت کے مطابق میری پیشانی پر بوسہ دیا پھر پہلے کی طرح مجھے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔

ڈاکٹروں نے شام تک انہیں ڈسچارج کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے گویا عید کا دن تھا۔ اماں کی طبیعت بھی حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی تھی۔ میں نے سب لوگوں کو اپنے لائے ہوئے تحفے بانٹے اور لمبی تان کر سو گیا۔

دوسرے دن اماں کی حالت مزید سنبھل گئی اور انہوں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے پراٹھے بنانے جا رہی تھیں، میں نے اور رینو نے ان کی خوشامد کر کے انہیں روکا۔

مجھے اچانک ان تحفوں کا خیال آیا جو میں ثمرہ، جہانگیر اور دانیال کے لیے لایا تھا۔ میں اسی دن اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میں نے اماں کو اسپتال سے گھر لاتے وقت جہلم کے ایک رینٹ اے کار والے سے ایک مہینے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لے لی تھی۔

ثمرہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہانگیر بھی اس وقت گھر میں موجود تھا لیکن صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ اسے ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا اس لیے معذرت کر کے چلا گیا۔ میں نے ثمرہ کو اپنے لائے ہوئے تحفے دیے تو اس نے ہنس کر کہا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی صفدر بھائی؟"

"میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود ہے بلکہ اس سے کہیں قیمتی چیزیں ہیں لیکن گفٹ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔" پھر میں نے دانیال کو چاکلیٹ کا بکس اور بہت سارے کھلونے دیے، کچھ نئے گیمز کی سی ڈیز تھیں۔ وہ انہیں لے کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت پیارا بچہ تھا۔ اس میں ثمرہ اور جہانگیر دونوں کی شباہت تھی اور وہ دونوں ہی خوب صورت تھے۔

اچانک ڈرائنگ روم میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ تین، ساڑھے تین سال کی ایک بچی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اچانک رمشا یاد آ گئی۔ وہی ناک نقشہ، وہی بال، وہی آنکھیں۔

میں نے ثمرہ سے پوچھا۔ "ثمرہ......یہ......یہ......"

"یہ رمشا ہے۔" ثمرہ نے مجھے حیران کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے دیکھ کر مجھے رمشا یاد آئی تھی۔ یہ ثمرہ کی چھوٹی بیٹی تھی۔

"اوہو، مجھے اس کے بارے میں تو معلوم ہی نہ تھا۔" میں نے کہا۔ "سوری گڑیا! میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہ لا سکا لیکن میں تمہیں یہیں سے بہت اچھے اچھے کھلونے لا دوں گا۔"

"انکل! آپ بھی کھلونوں سے کھیلتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹا انکل اتنے بڑے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بڑے کیا کھلونوں سے کھیلتے ہیں؟"

"مما! انکل کو کچھ چائے وغیرہ تو پلائیں۔" دانیال نے کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

"ہاں بیٹا! میں نے رحیمہ سے کہہ دیا ہے۔ وہ چائے لا رہی ہوگی۔" پھر وہ مجھ سے بولی۔ "ایک بات بتائیں صفدر بھائی۔ آج کل ہر آدمی پیسے کے پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے؟"

"اس لیے کہ پیسا ہی اس دور کی سب سے بڑی قوت ہے۔" میں نے کہا۔

"گویا آپ بھی لوگوں کے اس قبیل میں شامل ہو گئے ہیں جن کے لیے پیسا رشتوں ناتوں سے زیادہ اہم ہے؟"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں صرف اتنا کمانے گیا تھا کہ جس سے زندگی میں آسانی پیدا ہو سکے۔ مجھے پیسے کی ضرورت تھی، ہوس نہیں۔" میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ اسی پیسے کی ہوس نے تو مجھے کئی سال تک پاکستان نہیں آنے دیا۔

"تم سناؤ ثمرہ، کیسی زندگی گزر رہی ہے؟"

"کیسی گزر سکتی ہے؟" ثمرہ نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ "جہانگیر نے مجھے دنیا کا ہر عیش، ہر آرام مہیا کیا ہے پھر ان کا سب سے بڑا احسان تو میرے یہ دو ننھے کھلونے ہیں۔"

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ ثمرہ کے چہرے پر عجیب سی افسردگی تھی۔ شاید وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں تھی یا شاید کوئی اور بات ہو۔

اماں کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ میں انہیں اور رینو کو لے کر لاہور چلا آیا تا کہ میرے ساتھ ساتھ اماں اور رینو کی ملاقات بھی ان سے ہو جائے۔ خالہ جان اور خالو مشتاق دونوں پہلے کے مقابلے میں خاصے بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے لیکن اب بھی وہ بزنس میں مصروف تھے۔ ہم لوگ کچھ دن وہیں ٹھہرے، میں نے اماں، خالہ اور رینو کو خوب سیر کروائی۔ اباجی وہیں جہلم میں تھے۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ چار دن بعد جب ہم واپس گاؤں پہنچے تو اماں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دن پہلے بہت بیمار تھیں۔

میں کچھ دن گاؤں میں رہا پھر میرا رخ ایک دن لاشعوری طور پر ثمرہ کے محل کی طرف ہو گیا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا پھر ایک کمرے سے دانیال بھاگتا ہوا آیا اور میری ٹانگ سے لپٹ گیا۔ "انکل! آپ تو اس دن کے بعد آئے ہی نہیں۔"

"بیٹا وقت ہی نہیں ملا۔"

"یہی بات پاپا کہتے ہیں تو مما کی اور ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔" دانیال نے کہا۔

"تمہارے مما اور پاپا کہاں ہیں؟"

"مما، پاپا اپنے دوست کی شادی میں کراچی گئے ہیں۔"

"اور تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ گئے؟"

"ہم لوگ اکیلے کب ہیں۔" رمشا نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ "آیا اماں ہیں، رحیمہ ہے، گل چاچا اور خان بابا ہیں۔"

"یار! ہم ذرا تمہاری ممی کی لائبریری دیکھ لیں؟" میں نے کہا۔

"دیکھ لیں انکل۔" اس نے کہا۔

میں اسٹڈی روم کی طرف بڑھا تو اس نے کہا۔ "مما کی لائبریری تو ادھر ہے۔" اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو، پھر ادھر ہی چلتے ہیں۔" وہ مجھے چھوٹے سے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس میں ایک طرف آرام دہ کاؤچ پڑا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ بھی تھا اور ایک رائٹنگ چیئر تھی۔ کرسی کے سامنے کونے میں ایک رائٹنگ ٹیبل تھی اور اس کے اوپر دیوار میں کچھ ریک لگے تھے۔ اس میں میر تقی میر سے لے کر فیض، فراق، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے دیوان اور کلیات موجود تھے۔

دانیال نے کہا۔ "انکل! اوپر والی کیبنٹ میں میری بال پڑی ہے۔ مما نے مجھ سے چھین کر وہاں ڈال دی تھی۔ پلیز مجھے وہ بال اتار دیں۔"

"لیکن ایک شرط پر، تم لوگ مما کو نہیں بتاؤ گے کہ وہ بال میں نے اتار کر دی ہے۔"

"نہیں کہوں گا، پرامس۔" اس نے کہا۔

میں رائٹنگ ٹیبل پر احتیاط سے چڑھا اور چھت سے لگے ہوئے اس دیوار گیر کیبنٹ تک پہنچ گیا۔ اس میں میگنیٹک دروازے لگے تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کر کھولا تو حیران رہ گیا۔

اس میں ثمرہ کی بہت سی ڈائریاں پڑی تھیں۔ مجھے وہ ڈبا بھی نظر آیا جو میں نے میٹرک پاس ہونے پر ثمرہ کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک گیند بھی پڑی تھی۔ میں نے گیند اتار کر دانیال کو دی اور اس سے کہا۔ "جاؤ بیٹا کھیلو لیکن لان میں ہی کھیلنا۔ کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ تمہاری مما مجھے بھی ڈانٹیں گی۔" وہ اپنی گیند لے کر خوشی خوشی باہر چلا گیا۔

میں نے بے اختیار وہ ڈائریاں اور گھڑی کا ڈبا نکال لیا۔ وہ بہت سی ڈائریاں تھیں۔ میں نے نو سال پہلے کی ڈائری نکالی اور اس کے بعد دو تین ڈائریاں نکالنے کے بعد موجودہ سال کی ایک ڈائری بھی نکال لی۔

کسی کی ڈائری پڑھنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رمشا کی جان بچا کے بیٹھا تھا۔

پہلے میں نے گھڑی کا وہ ڈبا کھولا۔ اس میں وہ گھڑی اسی حالت میں رکھی تھی لیکن اس میں سے وہ شعر غائب تھا جو میں نے ثمرہ کو لکھ کر دیا تھا۔

پھر میں نے نو سال پرانی ڈائری کھولی تو اس میں سے وہی پرچہ نکل کر باہر گر پڑا جس پر میں نے شعر لکھا تھا۔

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں۔ تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں!

اسی کے نیچے اس نے لکھا تھا۔ "میں نے تمہیں سہل کب جانا تھا صفدر! میں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہاری پوجا کرتی تھی۔"

میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکنے لگا پھر میں نے ڈائری کھولی، صفحات پلٹتے ہوئے میں نے ان پر سرسری نظر ڈالی۔ روزمرہ کی باتیں تھیں۔

ایک صفحے پر لکھا تھا۔ "جہانگیر کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ صفدر کو اجڑا ہوا دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن پاپا کو تو بیٹی سے زیادہ پیسا عزیز تھا۔"

میرے ہاتھ پیر بے قابو ہو رہے تھے۔ سر میں

دھماکے سے ہونے لگے۔ ثمرہ، وہ مغرور سی ثمرہ مجھے اتنا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال کی ڈائری میں پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا۔

"آج جہانگیر کی شرافت کا پول کھل گیا۔ وہ پیسا کمانے کا تو جنونی ہے ہی، عورتوں کا بھی دیوانہ ہے۔ راتوں کو وہ کاروباری میٹنگوں میں نہیں بلکہ اپنی محبوباؤں سے ملنے جاتا تھا پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ دل چاہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت اسے چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن میرے بچوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔"

موجودہ سال کی ڈائری میں لکھا تھا۔ "اب جہانگیر کے ساتھ زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اسے نہ جانے کہاں سے علم ہو گیا ہے کہ خالہ نسیمہ صفدر کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میں اس سے لڑتی ہوں تو وہ مجھے صفدر کا طعنہ دیتا ہے۔ مہذب نقاب میں چھپا ہوا حیوان!! اسے تو اپنے بچوں کا بھی خیال نہیں ہے۔ کاش...... کاش میں اس وقت خود میں اتنی جرأت پیدا کر سکتی جب صفدر کا رشتہ میرے لیے آیا تھا...... پاپا مجھے بے شرم اور بے حیا ہی تو کہتے لیکن اب...... اب تو جہانگیر مجھے شراب پینے پر بھی مجبور کرتا ہے۔"

ایک اور صفحے پر لکھا تھا۔ "آج جہانگیر نے مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ڈانس نہ کرنے پر بھری محفل میں ذلیل کر دیا پھر گھر آ کر اس نے زبردستی شراب کی بوتل میرے حلق میں انڈیل دی۔ ورنہ دہ کہیں کا۔ میں اب اس کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہوں گی۔"

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔ میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے سب ڈائریاں سمیٹیں۔ گٹھڑی کا ڈبا اور تمام ڈائریاں اسی طرح اوپر چڑھ کر کیبنٹ میں رکھیں۔ میز کا وہ حصہ صاف کیا جہاں میرے چڑھنے سے جوتوں کے نشانات بن گئے تھے اور بوجھل قدموں سے باہر آ گیا۔

اسی وقت مجھے دانیال نظر آیا۔ وہ مجھ سے بولا۔ "انکل! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"بیٹا! میں گھر جا رہا ہوں۔ آپ ذرا مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں۔"

اس نے مستعدی سے کہا۔ "ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر بھاگ گیا۔

میں نے وہ گیند اٹھائی اور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ثمرہ کی نظر اس گیند پر پڑے اور وہ سمجھ جائے کہ اس کے کیبنٹ کو کسی نے ہاتھ لگایا ہے۔

دانیال پانی لے کر آیا تو میں نے پانی پیا اور اس سے بولا۔ "دانیال بیٹا! اب میں اس وقت آؤں گا جب تمہاری مما اور پاپا آ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر میں بوجھل قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا پھر نہ جانے کس طرح میں گاڑی ڈرائیو کر کے گاؤں پہنچا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میرا پورا وجود بری طرح جھلسنے لگا تھا۔ مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔

اماں ساری رات میرے سرہانے بیٹھی رہیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔ صبح تک میری طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس دن ہم سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے کہ اچانک خالہ زینت گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا باجی؟" اماں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"نسیمہ! جہانگیر نے ثمرہ کو طلاق دے دی اور بچے بھی اس کے حوالے کر دیے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ امی اور رینو بھی یہ خبر سن کر بری طرح رونے لگیں۔

"نسیمہ! اب میری ثمرہ کا کیا ہوگا؟ کیا تم......"

اماں نے میری طرف دیکھا، پھر ان کے چہرے پہ ناگواری کی شکنیں نمودار ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اماں جواب میں کیا کہنے والی ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "خالہ جی! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں......"

خالہ نسیمہ نے روتے ہوئے مجھے گلے لگایا اور بولیں۔ "بیٹا! تو نے ثابت کر دیا کہ انسان دولت سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔"

"اب بس کریں باجی!" اماں نے کہا۔ "اس موقع پر اپنے ہی تو کام آتے ہیں۔"

پھر ثمرہ سے میری شادی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دو پیارے پیارے بچے بھی مل گئے ہیں۔ میرے آنگن میں ہر طرف بہاریں رقص کرتی ہیں لیکن یہ پچھتاوا اب بھی میری جان نہیں چھوڑتا کہ اس میں بے چاری رمشا کا کیا قصور تھا؟ وہ کس گناہ کی پاداش میں ماری گئی؟ میری جلد باز اور کھلنڈری طبیعت نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی سکت تک چھین لی تھی...... کاش میں اچھی صحبت اختیار کرتا تو میرے دوست بھی مجھے کوئی نیک مشورہ دیتے...... یا مجھے ایسا کوئی گھناؤنا قدم اٹھانے سے روک دیتے...... میری غلط صحبت ہی رمشا کی قاتل بن گئی۔